مقالہ

ریاست جموں و کشمیر میں غیر افسانوی ادب کا تنقیدی تجزیہ

برائے

پی ایچ۔ڈی (اردو)

(2022)

مقالہ نگار

سارہ بتول

اندراج نمبر: A171548 (17PHUR007HY)

نگراں

ڈاکٹر بی بی رضا خاتون

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو

اسکول برائے السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی حیدر آباد-32

مقالہ

ریاست جموں و کشمیر میں غیر افسانوی ادب کا تنقیدی تجزیہ

برائے

پی ایچ۔ڈی (اردو)

(2022)

مقالہ نگار

سارہ بتول

اندراج نمبر: A171548 (17PHUR007HY)

نگراں

ڈاکٹر بی بی رضا خاتون

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو

اسکول برائے السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی حیدر آباد-32

THESIS

RIYASAT JAMMU O KASHMIR MEIN GHAIR AFSANWI ADAB KA TANQEEDI TAJZIA

SUBMITTED IN THE PARTIAL FULFILLMENT OF THE REQUIREMENTS FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY
In URDU (2022)

By

SARA BATOOL
Enrollment No. A171548 (17PHUR007HY)

UNDER THE SUPERVISION OF
DR. BI BI RAZA KHATOON
(Asst. Professor)

DEPARTMENT OF URDU
School of Languages, Linguistics and Indology
MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY
Gachibowli, Hyderabad - 500032

DECLARATION

I do hereby declare that this thesis entitled **"RIYASAT JAMMU O KASHMIR MEIN GHAIR AFSANWI ADAB KA TANQEEDI TAJZIA"** is an original research carried out by me. No part of this thesis has been published, or submitted to any University/Institution for the award of any Degree/Diploma.

Research Scholar

SARA BATOOL
Enrollment No: A171548 (17PHUR007HY)

Place: HYDERABAD

Date: ……………….

मौलाना आज़ाद नेशनल उर्दू यूनिवर्सिटी مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

(A Central University Established by an Act of Parliament in 1998)

Accredited with "A" Grade by NAAC

DEPARTMENT OF URDU

CERTIFICATE

This is to certify that thesis entitled "Riyasat Jammu o Kashmir Mein Ghair Afsanwi Adab Ka Tanqeedi Tajzia" *submitted in partial fulfillment for the award of the degree of Doctor of Philosophy (Ph.D.) in the Department of Urdu, School of Languages, Linguistics and Indology, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad, is the result of the original research work carried out by* ***SARA BATOOL (A171548)*** *under my supervision and to the best of my knowledge and belief, the work embodied in this thesis does not form part to any thesis/dissertation/project already submitted to any other University/Institution for the award of any degree/diploma.*

Supervisor
Dr. Bi Bi Raza Khatoon
Asst. Professor
Dept. of Urdu (MANUU)

Head
Department of Urdu
MANUU

Dean
School of Languages, Linguistics & Indology
MANUU

Place: HYDERABAD

Date: ………………

پیش لفظ

ی جموں وکشمیر د کے نقشے پ ا ایسی ی اور خطہ ہے جو تین مختلف جغرافیائی اکائیوں اور خطوں پ مشتمل ہے۔ جموں وکشمی اعظم ایشیا کے عین وسط میں او صغیر کے انتہائی شمال میں واقع ہے۔ اس اعتبار سے اسے ایشیا کا دل او صغیر کا ج بھی کہا جا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے جموں وکشمیر نہای ہی اہم خطہ ہے۔ اس کی سرحدیں ، چین، افغا ن پ کستان اور روس ملک صوبہ ہما چل اور پنجاب سے ملتی ہیں۔ پہاڑوں کے ل قراقرم، ہمالیہ، ہندوکش میں گھرے ہوئے اس خطے کے شمال میں وسط ایشیا کی جکستان اور چین کا علاقہ سنکیا (uyghur) جسے ایسٹ کمنستان ی اغورستان بھی کہا جا ہے۔ اس کے شمال مشرق میں تبّت، شمال مغرب میں افغا ن، مغرب میں پ کستان اور جنوب میں ہما چل اور پنجاب کے صوبے واقع ہیں۔ اس ی کی سرحدیں ۵۰۷ میل چین کے ساتھ ۷۰۰ میل پ کستان کے ساتھ اور ۱۵۰ میل افغا ن کے ساتھ ملتی ہیں۔ افغا ن میں واقع خطہ واخان (Wakhan corridor) کی ا تنگ پٹی ی جموں وکشمیر کو وسط ایشیا کی ی جکستان سے ا کرتی ہے۔ آب ہوا اور جغرافیائی لحاظ سے جموں وکشمیر کی ی کو چار ڈ ن میں تقسیم کیا ی ہے۔

۱۔ جموں ۲۔ کشمیر ۳۔ لداخ ۴۔ گلگت بلتستان

(نوٹ: یہاں پ ضمناً ا ت کی وضا ضروری ہے کہ ی جموں وکشمیر سے مراد ۱۹۴۷ء سے قبل کی غیر متنازعہ اور متحدہ جموں وکشمیر لیا ی ہے)

جموں وکشمیر اپنے جغرافیائی محل وقوع، تہذ ی ریخ، خوبصورت لینڈ اسکیپ اور قدرتی مناظر کی وجہ سے خاص اہمیت ر ہے۔ جموں وکشمیر کو اس کے ملکوتی حُسن کی وجہ سے د ئے ادب میں بھی طلسماتی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بلند لا پہاڑ، دیو قامت اشجار، بہتے تے جھرنے، خوش ر اور خوش الحان ے اور د خوبصورت مظاہر فطرت پہلی ہی میں دل کو موہ ہیں۔ لیکن ریخ کے اوراق پلٹنے سے ازہ ہوجا ہے کہ کس طرح وقت کے ساتھ ساتھ جارح قوتوں اور غیر مقامی قوتوں نے اس خطے کو اپنے اپنے مقصد اور حکمرانی کے لیے استعمال کیا اور ر ی پ ظلم وستم ڈھاتے رہے ہیں۔ بعد ازاں جموں وکشمیر کے قدرتی حسن کے ساتھ اس کے معاشرے کی مذکورہ سیاسی اور سماجی صورت حال اور تہذ نی گی، ادب کی مختلف اصناف میں بیان ہونے لگی جس نے رفتہ رفتہ ا مستقل موضوع

کی شکل اختیار کر لی۔ کسی قوم کی سیاسی، تہذیبی اور نفسیاتی کیفیات کا جائزہ لینے کے لیے اس قوم کے ادب کا تجزیہ اہم نتائج تک رسائی کا باعث ہے۔ یہی وہ خیال ہے جس کی بنیاد پر جموں وکشمیر میں تخلیق کردہ ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو کے تمام اصناف میں یہاں کے ادیب اپنی قدرت کے کمالات انجام دے رہے ہیں۔ چونکہ راقمہ کا موضوع ''ریاست جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب کا تنقیدی تجزیہ'' ہے۔ اس لیے اس مقالے میں ریاست جموں وکشمیر میں تخلیق کردہ غیر افسانوی ادب کے دائرے میں آنے والی تمام اصناف ادب جیسے سوانحی ادب، انشائیے، خاکے، سفرنامے اور رپورتاژ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اب تک ریاست جموں وکشمیر میں تخلیق ہونے والے غیر افسانوی ادب کے تمام اصناف پر کلی طور پر تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے میں نے مقالے میں جموں وکشمیر میں تخلیق کردہ غیر افسانوی ادب کے تمام اصناف کا جائزہ لے کر اس کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حصولِ مقصد میں آسانی کے لیے مقالے کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول۔ ''افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب: تعریف و تفہیم: اس باب میں افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب کی تعریف و تفہیم پر بحث کے ساتھ ساتھ دونوں اصناف کے مابین اشتراکات و افتراقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم۔ ''ریاست جموں وکشمیر کی صورتحال'': اس باب میں ریاست جموں وکشمیر کی جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی، سیاسی، سماجی، معاشرتی اور ادبی و لسانی صورت حال پر گفتگو کی گئی ہے۔ کسی بھی قوم کی پوری تاریخ و سیاسی تاریخ پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں اس تہذیب و معاشرت کے عروج و زوال اور عمرانیات اور تہذب کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ جموں وکشمیر کی پوری تاریخ کی داستان بھی اس لیے دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ ریاست مختلف ادوار اور مختلف سلطنتوں، حکمرانوں، راجاؤں کے دور اقتدار کے سرد و گرم، رحم و کرم اور ظلم و ستم کی داستان رقم کرتی ہوئی آئی ہیں اور یہاں کے عوام تین بالکل مختلف جغرافیائی، تہذیبی، تاریخی، لسانی، نسلی اکائیوں میں ایک ہی ریاست میں پچھلے ڈیڑھ سو سال سے رہ رہے ہیں۔ جموں و کشمیر کی تاریخ پر بے شمار کتب تحریر کی جا چکی ہے۔ اس لیے اس باب میں نہایت اختصار سے ریاست جموں وکشمیر کی وجہ تسمیہ، جغرافیہ، اور تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں یہاں کی سماجی تہذیبی اور سیاسی زندگی کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ بھی ادبی زندگی اور لسانی صورتحال کا جائزہ لیا گیا ہے تاکہ ان رویوں اور کیفیتوں کا جائزہ لیا جا سکے جو ادب کا موضوع ہیں۔

□ب سوم۔ ''□ □ جموں وکشمیر میں سوانح نگاری'': اس□ب میں□ □ جموں وکشمیر میں سوانح نگاری کی روا□ اور اس کی آغاز وارتقا□ بحث کی گئی ہے۔ یہ□ب مندرجہ ذیل تین ذ□ ابواب□ مشتمل ہے:

(الف) خودنو□ □ وآپ □۔ (ب) سوانح نگای (ج) س□ □ □۔

یہاں جملہ اصناف کی تعریف، فنی د□ ہ کار، آغاز وارتقا□ اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے جموں وکشمیر میں سوانح نگاری کا آغاز وارتقا، روا□ اور موجودہ صورت حال کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت وافادی□ اور ادبی قدر و قیمت کے حوالے سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔

□ب چہارم۔ ''□ □ جموں وکشمیر میں خاکہ نگاری'': اس□ب میں□ □ جموں وکشمیر میں خاکہ نگاری کا جا□ ہ لیا □ ہے۔ جس میں یہاں تخلیق کردہ خاکوں کی جملہ اصناف کا زمانی اعتبار سے تقسیم کر کے درج ذیل طر□ سے ابواب بندی کی گئی ہے۔

(الف) ابتدا سے ۱۹۶۰ء

(ب) ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء

(ج) ۱۹۸۰ء سے□ حال

ان ابواب میں جموں وکشمیر میں خاکہ نگاری کی آغاز وارتقا، روا□، صورت حال ان ادوار میں□ □ جموں وکشمیر میں تح□ ہونے والے مطبوعہ وغیر مطبوعہ خاکوں کا تفصیل سے تحقیقی ت تج□ تی مطالعہ کیا □ ہے۔

□ب پنجم: ''جموں وکشمیر میں ا□ ئیہ نگاری'': یہ□ب تین ذ□ ابواب□ منقسم ہے:

(الف) ابتدا سے ۱۹۶۰ء

(ب) ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء

(ج) ۱۹۸۰ء سے□ حال

اس□ب میں□ □ جموں وکشمیر میں ا□ ئیہ کے آغاز اور اس کی روا□□ بحث کے ساتھ ابتدائی□ م کے ا□ ئیوں کا تجزیہ کیا □ ہے۔ ابتدائی دور کے لگ بھگ اکیس ا□ ئیہ نگاروں کے ا□ ئیوں کا تنقیدی تجزیہ کیا □ ہے۔ پنڈت سالگ رام کول سالک، پنڈت وش□ تھ درماہ، قیس شیروانی، پنڈت□ ائن جو رینہ عنقا، شاہد کا□ ی، دیہاتی

کا□ ی، □ اغ حسن حسرت، شمیم احمد شمیم □ وفیسر زماں آزردہ، منصور احمد منصور وغیرہ کے□ م قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے□ □ میں صنف ا□ ئیہ کی□ دڈالی اور اس کی آبیاری کر کے اسے اس مقام □ □ □ ۔

□ ب ششم'' □ □ جموں و کشمیر میں سفر□ مہ نگاری'': یہ□ ب مندرجہ ذیل تین ذ□ ابواب □ مشتمل ہے جو زمانی اعتبار سے□ □ □ □ □ ہے۔

(الف) ابتدا سے ۱۹۶۰ء

(ب) ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء

(ج) ۱۹۸۰ء سے□ حال

اس میں □ □ جموں و کشمیر میں سفر□ مہ نگاری اور اس کے آغاز و ارتقا اور روا□ □ بحث کی گئی ہے۔ اس □ ب میں □ □ میں سفر□ مہ نگاری کی روا□ اور اس کے آغاز و ارتقا کا جا□ ہ □ کے ساتھ ابتدائی دور کے سفر□ موں کا تجزیہ کیا□ ہے۔ ابتدائی□ م کے سفر□ مہ نگاروں میں سالک، فوق، پیرزادہ محمد عارف وغیرہ اہم ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء □ کے سفر□ موں میں تقسیم ہند کے کرب اور اپنے بچھڑے ہوئے عز□ وں سے ملنے کی□ پ ہر ا□ سفر□ موں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ۱۹۸۰ء سے□ حال جتنے بھی سفر□ مے تخلیق ہوئے ہیں ان میں نئی امید، نئی □ گی اور د□ کو ا□ نئے□ ئے سے دیکھنے اور اپنے تجر□ وں کے ذریعہ دکھانے کی کوشش□ آتی ہے۔ اکیسویں صدی میں پوری د□ میں □ □ ت کے انقلاب□ □ ہوئے ہیں۔ پچھلے صدی کے مقابلے □ کچھ تیز رفتاری کے ساتھ□ ل رہے ہیں۔ □ □ کے سفر□ مہ نگار بیرون□ □ ، بیرون ملک کے مختلف گوشوں میں سفر کر کے وہاں کی تہذ□ وثقافت□ ریخ اور معاشرے کو اپنے قلم کے ذریعہ دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں وہ کامیاب□ آتے ہیں۔

□ ب ہفتم'' □ □ جموں و کشمیر میں رپو□ ژنگاری'': اس□ ب میں □ □ جموں و کشمیر میں رپو□ ژنگاری کی آغاز و ارتقا اور روا□ □ روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوران تحقیق یہ جان کر کافی مایوسی ہوئی کہ□ □ جموں و کشمیر میں اس صنف کی طرف□ تو کم توجہ دی گئی ہے□ کوئی مکمل طر□ سے اس میں زور آزمائی نہیں ہوئی ہے۔ البتہ ا□ خوش آئند□ ت یہ سامنے آتی ہے کہ محمود ہاشمی نے ''کشمیر اداس ہے'' لکھ کر اس کمی کا ازالہ کیا ہے۔ 'کشمیر اُداس ہے' □ □ میں تحر□ ہونے والی واحد مکمل رپو□ ژ ہے جس میں مصنف نے ا□ مخصوص دور جو□ □ جموں و کشمیر کی سیاسی□ ریخ کے لیے نہا□

اہم ہے کہ جمانی کی ہے۔اس میں تقسیم ہند کے سانحے سے درپیش مسائل اوراس کے نتیجے میں کی شورہ
سیاسی صورتحال اور شیخ محمد عبداللہ کی تحری اور حکومت ہند کے ساتھ الحاق،غرض اس دور کی ہرای سیاسی وسماجی صورتحال
کا جائزہ لیا ہے۔ہاشمی چو اس دور میں کشمیراور جموں میں ہوم گارڈز میں کام کررہے تھے۔توانہوں نے
کے عوام رنے والی اذیتوں ، درپیش مسائلوں اور صورتحال کا جائزہ ہوئے یہ کتاب تخلیق کی جوز حقائق
ای مکمل رپو ژ ہے۔

جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب کے تنقیدی تجزیہ سے جو خاص ت سامنے آتی ہیں۔ان کی مختصر
طور یہاں ہی کی جائے گی۔ میں 'غیر افسانوی ادب' کی ریخ،آغاز وارتقا،روای اورموجودہ صورت
حال تسلی بخش ہے۔غیر افسانوی ادب کے زمرے میں آنے والی تمام اصناف میں یہاں کے تینوں خطوں جموں، کشمیراور
لداخ کے قلمکار اس قدر مات ا م دے رہے ہیں۔ا ہم مجموعی طور تمام غیر افسانوی ادب کی مختلف اصناف
میں تحر ہونے والی تصنیفات کی ت کریں تو اس کی گنتی بے شمار ہیں لیکن میں اردو کی ابتدائی تشکیلی دور میں تحر
شدہ تصانیف کی بہت ہی کم تعداد ہم پہنچ ئی ہیں۔اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ڈ ہ دور حکومت میں اظہار
رائے پ بندی۔کتابوں کی اشا پ بندی صغیر کی سیاسی صورت حال اور کشمیر کی سیلاب کو ان میں سے بعض
وجوہات ہیں۔ جموں وکشمیر میں ''غیر افسانوی ادب کا تنقیدی تجزیہ'' کام کرنے سے قبل مجھے اس ت کا گمان
نہ تھا کہ تینوں خطوں کے اد اور قلمکار شاعری فکشن کے علاوہ بھی ان تمام اصناف میں اس قدر دلچسپی ر ہیں کہ
آج بے شمار بہترین کتابیں منظر عام آ چکی ہے۔کشمیر، جموں اور لداخ تینوں خطوں کے ادیبوں نے اس میدان میں
اپنا کمال دیکھ اور تیز رفتاری کے ساتھ ق رہے ہیں۔خودنو ،سوانح نگاری، خاکے، ا یئے ،سفر مے اور
رپو ژ تمام اصناف میں بہترین نمونے منظر عام آئے ہیں۔جیسا کہ میرا موضوع '' جموں وکشمیر میں غیر
افسانوی ادب کا تنقیدی تجزیہ'' ہے۔اس لیے میں مقیم ء کے علاوہ جموں وکشمیر سے تعلق ر والے ان
ادیبوں کی تصانیف کو بھی شامل کیا ہے جن کا تعلق سے ہیں اور تلاش معاش کے سلسلے میں بیرون مقیم
رہے۔

محاکمہ/ حاصلِ مطالعہ میں جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب کے مختلف اصناف کے فن،تعریف اوراس کے

آغاز وارتقا کا اجمالی جا□ ہ □ ہوئے□ □ میں ان اصناف کی نئی جہتوں، سمت ورفتار اور کے مقام ومرتبے اور ادبی وقار ومعیار□ بحث کی گئی ہے۔

مقالے کے آ□ میں ان کتب ورسائل کی فہر □ دی گئی ہے جن سے □□ مقالے کی تیاری میں استفادہ کیا □ ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی تحقیقی وعلمی کام حرفِ آ□ نہیں ہو□، اس میں تشنگی□ قی رہتی ہے۔ لہٰذا حتی الامکان کوششوں کے□ وجود مقالے میں کسی بھی فروگذا□ □ سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

□ سے پہلے رب ذوالجلال کے حضور میں لامتناعی سپاس شکر وعقیدت کا اظہار کرتی ہوں جس کی □ کی ہوئی توفیق کے طفیل میں اپنی کم مائیگی کے□ وجود یہ تحقیقی مقالہ مکمل کرنے کی قابل ہوئی۔

میری اولین نگراں مرحومہ□ وفیسر وسیم بیگم صاحبہ۔ اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ □ فرمائے۔ جن کی رہنمائی، حوصلہ افزائی اور دعاؤں سے مجھے پی ایچ ڈی میں داخلہ □ کے بعد تحقیقی کام کے ابتدائی دور میں بہت□ دہ مدد ملی۔

میں□ ے مؤ□ نہ□ از سے اپنی استاد اور نگراں ڈاکٹر بی بی رضا خاتون صاحبہ کی مشکور وممنون ہوں۔ جنہوں قدم قدم□ میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی بھی کی ہے اور انہوں نے میرے اس مقالے کو لفظ بہ لفظ□ ڑھا اور غلطیوں کی اصلاح کر کے اس کو ا□ وقار اور معیار بخشا۔

میں شعبۂ اردو کے تمام اسا□ ہ صاحبان کی مشکور وممنون ہوں جن میں سابق صدر شعبۂ اردو□ وفیسر نسیم الدین فریس صا □، □ وفیسر محمد فاروق بخشی صا □ □ وفیسر ابوالکلام صا □ □ وفیسر مسرت جہاں صاحبہ او□ وفیسر شمس الہدیٰ د□ □ دی صا □ کی بھی بے ممنون ہوں جنہوں نے مجھے تحقیق کے دوران اپنے مفید مشوروں اور شفقت سے نوازا ہے۔ اس کے علاوہ شعبہ ہٰذا کے اسا□ ان ڈاکٹر فیروز عالم صا □ اور ڈاکٹر ابو شہیم صا □ کی ممنون ہوں جنہوں نے اپنے مشوروں سے ہمیشہ راقمہ کی مدد کی۔

شعبہ اردو کے غیر□ ریسی عملہ کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے دفتری کاموں میں میرے ساتھ تعاون کیا۔ شعبۂ ہٰذا میں جن حضرات نے تحقیقی مواد اکھٹا کرنے میں میری بھرپور معاو□ کی ہے۔ ان کا میں فرداً فرداً شکریہ ادا کر□ اپنے

اہم فریضہ سمجھتی ہوں۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی لائبریری کے اسٹاف کا مشکور ہوں جنہوں نے ہمیشہ مطلوبہ کتابوں اور دیگر ضروری مواد تک رسائی آسان بنادی۔ یونیورسٹی کے دیگر تمام تر ریسی وغیرہ ریسی عملے کا میں شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں کیونکہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کیا ان کے حسن اخلاق نے ہمیں بے حد متاثر کیا ہے۔

کشمیر یونیورسٹی کی اقبال لائبریری کے عملے، جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی لائبریری اور سنٹرل لائبریری، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی کے اندرا گاندھی میموریل لائبریری، ایس پی ایس لائبریری سری نگر کے عملے کی صمیم قلب سے ممنون ہوں جنہوں نے لائبریری کے دروازے میرے لیے ہمیشہ کھلے رکھے۔ یہ ناسپاسی ہوگی اگر ریختہ فاؤنڈیشن کا شکریہ ادا نہ کروں۔ اسی کے طفیل ہی درمخطوطات تک میری رسائی ممکن ہو پائی۔

اپنے فیلو ریسرچ اسکالر فوزیہ حمزہ اس میدان میں قدم رکھنے کے بعد ابتدائی مراحل میں میری حوصلہ افزائی کرتی رہی اور مفید مشوروں سے بھی نوازتی تھی۔ ان کا شکریہ ادا نہ کرنا کفران نعمت ہوگی۔

ریسرچ میں داخلہ لینا آسان نہیں ہوتا۔ داخلہ سے لے کر مقالے کی تکمیل تک کا یہ سفر اور مرحلہ آزمائش، محنت طلب، جانفشانی اور حوصلہ شکنی سے پُر ہوتا۔ میرا یہ پی ایچ ڈی کا سفر بھی مشکلوں، رکیبوں اور آزمائشوں سے لبریز سفر تھا لیکن اس سفر میں جس شخص نے لمحہ لمحہ، قدم قدم پر میرا ساتھ دیا، حوصلہ افضائی کرتے رہے۔ وہ میرے لیے راہ میں رہبر بن گئے۔ میں صمیم قلب سے ان کی ممنون ہوں۔

میں اپنے والدین کی بے غرض محبتوں اور شفقتوں کی بے حد ممنون و مشکور ہوں، جن کی دعاؤں کا سایہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ ان کی دعاؤں کا ہی نتیجہ ہے کہ میں ہمیشہ زندگی کے سرد گرم سے محفوظ رہی۔ میں اللہ کی بارگاہ میں ان کی صحت، سکون اور درازی عمر کے لیے ہمیشہ دعا گو رہوں گی۔

میں خلوص دل کے ساتھ ادرا کبر غلام مہدی اور غلام حیدر صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے گھر سے ہزاروں میل دور ملک کی مختلف جامعات میں میری اعلیٰ تعلیم کو ممکن بنایا۔ حالانکہ جس علاقے اور سماج سے میرا تعلق ہے۔ یہاں لڑکیوں کو اس طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت بہت کم ملتی ہے۔ خصوصاً ریسرچ کے میدان میں جانے کی۔ میرے بھائیوں نے مجھے اس کے لیے نہ صرف اجازت دی بلکہ تمام اخراجات برداشت کرتے رہے۔ والد

صا □ کی پیرانہ عمری میں میرے بھائیوں نے خود سختیاں اور مشکلات□ دا ش □ کرتے ہوئے میرے لیے تمام آسائش اور آرام فراہم کیے۔ تحقیق کے دوران وہ دونوں میرے لیے ا□ مضبوط سہارا بنے رہے۔ ان کے بے پناہ احس□ ت نے مجھے□ ال□ رکیا۔ میں اپنی بہن رقیہ اور ہا□ ہ کی بھی ممنون ہوں جنہوں نے ہر ممکن مجھے سہارا□ ی۔□ ادر اصغر غلام حسین اور وسیم یحییٰ کی بھی مشکور ہوں جنہوں نے اس سفر میں میرا بھرپور ساتھ□ ی۔

اوراس کے علاوہ ان تمام خواتین وحضرات کی میں مشکور ہوں جو بلاواسطہ□ لواسطہ میرے لیے وسیلہ بنے۔

سارہ بتول

فہرست ابواب

تلخیص

ریاست جموں و کشمیر میں غیر افسانوی ادب کا تنقیدی تجزیہ

برائے

پی ایچ۔ڈی (اردو)(2022)

مقالہ نگار

سارہ بتول

اندراج نمبر: A171548 (17PHUR007HY)

نگراں

ڈاکٹر بی بی رضا خاتون

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو

اسکول برائے السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی حیدر آباد-32

تلخیص

ریاست جموں وکشمیر میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ اسلامی تہذیب کی داغ بیل پڑ گئی تھی ۔ چودھویں صدی میں رنچن شاہ کے قبول اسلام کے ساتھ اسلامی سلطنت کی داغ بیل پڑی ۔ چونکہ کشمیر پہلے سے ہی علوم وفنون کا مرکز تھا۔اسی زمانے میں مشرقی وسطیٰ اور دیگر ممالک سے مبلغین کے علاوہ علم وعرفان کے متلاشی بھی کشمیر کی طرف رخ کرنے لگے ۔اس طرح کشمیر مختلف تہذیبوں کی آماجگاہ بن گئی۔علم وادب کے سوتے پھوٹنے لگے ۔چونکہ اس دور میں فارسی زبان کا چلن تھا ریاست کے ادیبوں اور عالموں نے فارسی نثر ونظم دونوں میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔فارسی زبان اشرافیہ اوراہل علم طبقے تک ہی محدودتھی عوام کی اکثریت اس سے نابلد تھی۔کثیر اللسانی ریاست میں عوام ایک دوسرے کی زبان سے بھی نا آشنا تھےاور بیرونی دنیا کے اختلاط سے رابطے کے لیے ہندوستانی زبان کا استعمال ہونے لگا تھا۔ جسے عرف عام میں'' اردو '' کہا جاتا ہے۔جس کی وجہ سے عوام ایک دوسرے کوسمجھنے اورایک دوسرے کے قریب آنے لگے تھے۔انیسویں صدی کے آتے آتے اردو اپنی جڑیں مظبوط کر چکی تھیں اور یہ نہ صرف باقاعدعوامی رابطے کی زبان بن چکی تھی بلکہ افکاروخیالات کے اظہار کا وسیلہ بھی بنتی جارہی تھی۔ڈوگرہ حکمرانوں کے لیے یہ ایک خوش آئند بات تھی۔انہوں نے اس کی خوب پذیرائی کی۔دھیرے دھیرے ادبی اور غیرادبی تحریریں بھی منظر عام پر آنے لگیں۔رنبیر سنگھ کے دور حکومت تک اردو نے اپنی مستحکم جگہ بنالی تھی۔ ہر زبان کی طرح ریاست میں اردو کی تحریری روایت کا آغاز نظم سے ہوا۔اس کی شروعات میر پور (جو پاکستان کے زیر قبضہ کشمیر میں واقع ہے) کے غلام محی الدین میر پوری کی مثنوی'' گلزار فقیر'' سے ہوئی جو ۱۱۱۳ھ بمطابق 03-1702ء میں تحریر کی گئی۔نثری تحریر کا آغاز اس کے کافی عرصہ بعد کیا گیا۔ جو غیرادبی نثر کی صورت میں سرکاری اشتہارات ،اعلان ناموں اور فرامیں پر مشتمل ہیں۔محققین نے ریاست کی ابتدائی نثری تحریر مہتہ شیر سنگھ کے'' سفر نامہ بخارا'' کو مانا ہے جو 65-1864ء میں تحریر کردہ سرکاری وفد کے سفری روداداور کوائف پر مشتمل رپورٹ ہے۔ پنڈت ہر گوپال کول خستہ کے'' جغرافیہ کشمیر''(1975) اور' گلدستہ کشمیر''(1977) کو اولین مربوط نثری تحریر مانا گیا ہے۔اردو زبان کی مقبولیت کے پیش نظر ڈوگرہ سرکار نے اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا۔'' بدیا بلاس سبھا'' کے قیام کے ساتھ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا اور '' بدیابلاس''، اور'' رنبیر'' جیسے سرکار کی پشت پناہی میں شائع ہونے والے اخباروں نے اس کو مزید فروغ دیا۔ اگر چہ

اظہار خیال پر پابندی تھی اور پریس پر سرکاری اجارہ۔مگر اس کے باوجود درجنوں ادیبوں کے نام ملتے ہیں جنھوں نے بیرون ریاست شائع ہونے والے اخبارات کے ذریعے اپنی ادبی صلاحتیوں کا لوہا منوا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مختلف اصناف ادب کے فن پارے وجود میں آنے لگے۔ابتدائی دور کی تخلیقات میں پنڈت ہرگوپال کول خستہؔ کی 'جغرافیہ کشمیر'، 'گلدستہ کشمیر'۔ 'گلزارِفوائد'، سالگ رام کول سالکؔ کی 'گنجینۂ فطرت'،تحفۂ سالک'،محمد الدین فوقؔ کی 'تاریخ کشمیر'،'سیر شاہی کشمیر'، 'تاریخ اقوام کشمیر'اور'سفرنامہ کشمیر' وغیرہ اہم ترین تصنیفات ہیں۔چونکہ ادب سماج کا پرتو اور آئینہ ہوتا ہے اس لیے اس دور کی تحریریوں میں اس انتشار اور انارکی کے دور کی سیاسی،سماجی، معاشی اور معاشرتی صورتحال کی واضح جھلک دیکھنے کو ملتی ہیں۔

اردو کے تمام اصناف میں یہاں کے ادیب گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ چونکہ راقمہ کا موضوع'' ریاست جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب کا تنقیدی تجزیہ'' ہے۔اس لیے اس مقالے میں ریاست جموں وکشمیر میں تخلیق کردہ غیر افسانوی ادب کے دائرے میں آنے والی تمام اصناف ادب جیسے سوانحی ادب ، انشایئے ، خاکے ، سفرنامے اور رپورتاژ کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔اب تک ریاست جموں وکشمیر میں تخلیق ہونے والے غیر افسانوی ادب کے تمام اصناف پر کلی طور پر تحقیقی وتجزیاتی مطالعہ نہیں کیا گیا تھا۔اس لیے زیرنظر مقالے میں جموں وکشمیر میں تخلیق کردہ غیر افسانوی ادب کے تمام اصناف کا جائزہ لے کر اس کا مقام ومرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
حصولِ مقصد میں آسانی کے لیے مقالے کو سات ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول۔''افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب:تعریف وتفہیم:اس باب میں افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب کی تعریف وتفہیم پر بحث کے ساتھ ساتھ دونوں اصناف کے مابین اشراکات وافتراقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم۔''ریاست جموں وکشمیر کی صورتحال'': اس باب میں ریاست جموں وکشمیر کی جغرافیائی،تاریخی،تہذیبی،سیاسی ،سماجی،معاشرتی اورادبی ولسانی صورت حال پر گفتگو کی گئی ہے۔کسی بھی قوم کی پوری تاریخ وسیاسی تاریخ پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں اس تہذیب ومعاشرت کے عروج وزوال اور عمرانیات اور تہذب کا اندازہ ہوجاتا ہے۔جموں وکشمیر کی پوری تاریخ کی داستان بھی اس لیے دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہ ریاست مختلف ادوار اور مختلف سلطنتوں،حکمرانوں،راجاؤں کے دور اقتدار کے سرد وگرم ، رحم وکرم اور ظلم وستم کی داستانیں رقم کرتی ہوئی آئی ہیں اور یہاں کے عوام تین بالکل مختلف

جغرافیائی، تہذیبی، تاریخی، لسانی، نسلی اکائیوں میں ایک ہی ریاست میں پچھلے ڈیڑھ سو سال سے رہ رہے ہیں۔ جموں و کشمیر کی تاریخ پر بے شمار کتب تحریر کی جا چکی ہے۔ اس لیے اس باب میں نہایت اختصار سے ریاست جموں و کشمیر کی وجہ تسمیہ، جغرافیہ، اور تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں یہاں کی سماجی تہذیبی اور سیاسی زندگی کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ بھی ادبی زندگی اور لسانی صورتحال کا جائزہ لیا گیا ہے تاکہ ان رویوں اور کیفیتوں کا جائزہ لیا جا سکے جو ادب کا موضوع ہیں۔

باب سوم۔ ''ریاست جموں و کشمیر میں سوانح نگاری'': اس باب میں ریاست جموں و کشمیر میں سوانح نگاری کی روایت اور اس کی آغاز وارتقاء پر بحث کی گئی ہے۔ یہ باب مندرجہ ذیل تین ذیلی ابواب پر مشتمل ہے:

(الف) خودنوشت وآپ بیتی۔ (ب) سوانح نگای (ج) سرگزشت۔

یہاں جملہ اصناف کی تعریف، فنی دائرہ کار، آغار وارتقا پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے جموں و کشمیر میں سوانح نگاری کا آغاز وارتقا، روایت اور موجودہ صورت حال کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت وافادیت اور ادبی قدر و قیمت کے حوالے سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔

باب چہارم۔ ''ریاست جموں و کشمیر میں خاکہ نگاری'': اس باب میں ریاست جموں و کشمیر میں خاکہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں یہاں تخلیق کردہ خاکوں کی جملہ اصناف کا زمانی اعتبار سے تقسیم کر کے درج ذیل طریقے سے ابواب بندی کی گئی ہے۔

(الف) ابتدا سے ۱۹۶۰ء

(ب) ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء

(ج) ۱۹۸۰ء سے تا حال

ان ابواب میں جموں و کشمیر میں خاکہ نگاری کی آغاز وارتقا، روایت، صورت حال ان ادوار میں ریاست جموں وکشمیر میں تحریر ہونے والے مطبوعہ وغیر مطبوعہ خاکوں کا تفصیل سے تحقیقی ت تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

باب پنجم: ''جموں وکشمیر میں انشائیہ نگاری'': یہ باب تین ذیلی ابواب پر منقسم ہے:

(الف) ابتدا سے ۱۹۶۰ء

(ب) ۱۹۶۰ء سے۱۹۸۰ء

(ج)۱۹۸۰ء سے تا حال

اس باب میں ریاست جموں وکشمیر میں انشائیہ کے آغاز اوراس کی روایت پر بحث کے ساتھ ابتدائی ایام کے انشائیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ابتدائی دور کے لگ بھگ اکیس انشائیہ نگاروں کے انشائیوں کا تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے۔ پنڈت سالگ رام کول سالک، پنڈت وشوناتھ درماہ، قیس شیروانی، پنڈت نرائن جو رینہ عنقا، شاہد کاشمیری، دیہاتی کاشمیری، چراغ حسن حسرت، شمیم احمد شمیم، پروفیسر زماں آزردہ، منصور احمد منصور وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔جنہوں نے ریاست میں صنف انشائیہ کی بنیاد ڈالی اوراس کی آبیاری کر کے اسے اس مقام تک لایا۔

باب ششم ''ریاست جموں وکشمیر میں سفرنامہ نگاری'': یہ باب مندرجہ ذیل تین ذیلی ابواب پر مشتمل ہے جو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔

(الف) ابتدا سے۱۹۶۰ء

(ب) ۱۹۶۰ء سے۱۹۸۰ء

(ج)۱۹۸۰ء سے تا حال

اس میں ریاست جموں وکشمیر میں سفرنامہ نگاری اوراس کے آغاز وارتقا اور روایت پر بحث کی گئی ہے۔اس باب میں ریاست میں سفرنامہ نگاری کی روایت اوراس کے آغاز وارتقا کا جائزہ لینے کے ساتھ ابتدائی دور کے سفرناموں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ابتدائی ایام کے سفرنامہ نگاروں میں سالک،فوق، پیرزادہ محمد عارف وغیرہ اہم ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کے سفرناموں میں تقسیم ہند کے کرب اوراپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملنے کی تڑپ ہر ایک سفرناموں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔۱۹۸۰ء سے تا حال جتنے بھی سفرنامے تخلیق ہوئے ہیں ان میں نئی امید، نئی زندگی اور دنیا کو ایک نئے نظریے سے دیکھنے اوراپنے تحریروں کے ذریعہ دکھانے کی کوشش نظر آتی ہے۔اکیسویں صدی میں پوری دنیا میں جدیدت کے انقلاب برپا ہوئے ہیں۔پچھلے صدی کے مقابلے سب کچھ تیز رفتاری کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ریاست کے سفرنامہ نگار بیرون ریاست، بیرون ملک کے مختلف گوشوں میں سفر کر کے وہاں کی تہذیب وثقافت، تاریخ اور معاشرے کو اپنے قلم کے ذریعہ دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

باب ہفتم ''ریاست جموں وکشمیر میں رپورتاژ نگاری'': اس باب میں ریاست جموں وکشمیر میں رپورتاژ نگاری کی آغاز و ارتقا اور روایت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوران تحقیق یہ جان کر کافی مایوسی ہوئی کہ ریاست جموں وکشمیر میں اس صنف کی طرف یا تو کم توجہ دی گئی ہے یا کوئی مکمل طریقے سے اس میں زور آزمائی نہیں ہوئی ہے۔ ریاست میں اگر چہ رپورتاژ نگاری کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اور اگر بعض رپورتاژ لکھے بھی گئے ہیں تو وہ یا تو ادبی نوعیت اور پایہ کے نہیں ہیں یا وہ محض علٰحیدگی پسند عسکری تنظیموں کی سرگرمیوں پر مبنی رپورٹس ہیں۔ البتہ ایک خوش آئند بات یہ سامنے آتی ہے کہ محمود ہاشمی نے ''کشمیر اداس ہے'' لکھ کر اس کمی کا ازالہ کیا ہے۔ 'کشمیر اُداس ہے' ریاست میں تحریر ہونے والا واحد مکمل رپورتاژ ہے جس میں مصنف نے ایک مخصوص دور جو ریاست جموں وکشمیر کی سیاسی تاریخ کے لیے نہایت اہم ہے کی ترجمانی کی ہے۔ اس میں تقسیم ہند کے سانحے سے درپیش مسائل اور اس کے نتیجے میں ریاست کی شوریدہ سیاسی صورتحال اور شیخ محمد عبداللہ کی تحریک اور حکومت ہند کے ساتھ الحاق، غرض اس دور کی ہر ایک سیاسی وسماجی صورتحال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہاشمی چونکہ اس دور میں کشمیر اور جموں میں ہوم گارڈز میں کام کر رہے تھے۔ تو انہوں نے ریاست کے عوام پر گزرنے والی اذیتوں، درپیش مسائلوں اور صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کتاب تخلیق کی جو زمینی حقائق پر مبنی ایک مکمل رپورتاژ ہے۔ اور ریاست میں واحد رپورتاژ ہے جو مختلف اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ عالمی اردو ادب میں بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اور اردو کے کامیاب اور مکمل رپورتاژ میں یہ سر فہرست ہے۔ بقول ممتاز شیریں یہ ایک سچا اور بہترین رپورتاژ ہے۔

ریاست جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب کے تنقیدی تجزیہ سے جو خاص بات سامنے آتی ہیں۔ ان کی مختصر طور پر یہاں نشاندہی کی گئی ہے۔ ریاست میں 'غیر افسانوی ادب' کی تاریخ، آغاز وارتقا، روایت اور موجودہ صورت حال تسلی بخش ہے۔ غیر افسانوی ادب کے زمرے میں آنے والی تمام اصناف میں یہاں کے تینوں خطوں جموں، کشمیر اور لداخ کے قلمکار گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اگر ہم مجموعی طور پر تمام غیر افسانوی ادب کی مختلف اصناف میں تحریر ہونے والی تصنیفات کی بات کریں تو اس کی گنتی بے شمار ہیں لیکن ریاست میں اردو کی ابتدائی تشکیلی دور میں تحریر شدہ تصانیف کی بہت ہی کم تعداد ہم تک پہنچ پائی ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ڈوگرہ دور حکومت میں اظہار رائے پر پابندی۔ کتابوں کی اشاعت پر پابندی، برصغیر کی سیاسی صورت حال اور کشمیر کی سیلاب کو ان میں سے بعض

وجوہات ہیں۔ ریاست جموں وکشمیر میں ''غیر افسانوی ادب کا تنقیدی تجزیہ'' پر کام کرنے سے قبل مجھے اس بات کا گمان نہ تھا کہ تینوں خطوں کے ادیب اور قلمکار شاعری یا فکشن کے علاوہ بھی ان تمام اصناف میں اس قدر دلچسپی رکھتے ہیں کہ آج بے شمار بہترین کتابیں منظر عام پر آ چکی ہے۔ کشمیر، جموں اور لداخ تینوں خطوں کے ادیبوں نے اس میدان میں اپنا کمال دیکھایا اور تیز رفتاری کے ساتھ ترقی پا رہے ہیں۔ خودنوشت، سوانح نگاری، خاکے، انشائیے، سفرنامے اور رپورتاژ تمام اصناف میں بہترین نمونے منظر عام پر آئے ہیں۔ جیسا کہ میرا موضوع ''ریاست جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب کا تنقیدی تجزیہ'' ہے۔ اس لیے ریاست میں مقیم ادباء کے علاوہ جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے ان ادیبوں کی تصانیف کو بھی شامل کیا گیا ہے جن کا تعلق ریاست سے ہیں اور تلاش معاش کے سلسلے میں بیرون ریاست مقیم رہے۔

محاکمہ/ حاصلِ مطالعہ میں جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب کے مختلف اصناف کے فن، تعریف اور اس کے آغاز وارتقا کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے ریاست میں ان اصناف کی نئی جہتوں، سمت ورفتار اور کے مقام ومرتبے اور ادبی وقار ومعیار پر بحث کی گئی ہے۔

مقالے کے آخر میں ان کتب ورسائل کی فہرست دی گئی ہے جن سے زیرِ نظر مقالے کی تیاری میں استفادہ کیا گیا ہے۔

☆☆☆

ABSTRACT

RIYASAT JAMMU O KASHMIR MEIN GHAIR AFSANWI ADAB KA TANQEEDI TAJZIA

SUBMITTED IN THE PARTIAL FULFILLMENT OF THE REQUIREMENTS FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

DOCTOR OF PHILOSOPHY

In URDU (2022)

By

SARA BATOOL

Enrollment No. A171548 (17PHUR007HY)

UNDER THE SUPERVISION OF

DR. BI BI RAZA KHATOON

(Asst. Professor)

DEPARTMENT OF URDU

School of Languages, Linguistics and Indology

MAULANA AZAD NATIONAL URDU UNIVERSITY

Gachibowli, Hyderabad - 500032

□ب اول: افسانوی اور غیر افسانوی ادب: تعریف و تفہیم

الف: افسانوی ادب کی تعریف و تفہیم

ب: غیر افسانوی ادب کی تعریف و تفہیم

ج: افسانوی اور غیر افسانوی ادب میں افتراقات و اشتراکات

الف: افسانوی ادب کی تعریف و تفہیم

فکشن کا اردو مترادف ''افسانوی ادب'' لیا جاتا ہے اور اس میں عموماً افسانوی ادب کی چار اصناف داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ شامل ہیں۔ افسانوی ادب کی ان اصناف کا براہِ راست تعلق انسانی زندگی اور اس کے مختلف معاملات نیز متفرق مسائل کی ترجمانی سے ہے۔ یہ معاملات اور مسائل اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ تخلیقی ادب کا حصہ بنتے رہے ہیں۔ انسان جس طرح زندگی کو بسر کرتا ہے، سوچتا اور محسوس کرتا ہے، رہن سہن کے مختلف ماحول میں رہتا ہے، جن حالات و واقعات کا اسے سامنا کرنا پڑتا ہے یہ سب اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان اثرات کے نتیجے میں اس کی نفسیات، نصب العین، نظریہ حیات، نقطہ نظر اور رویہ تشکیل پاتا ہے۔ جس کا اظہار افسانوی ادب کی جملہ اصناف داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ کے موضوعات میں واضح انداز میں ہوتا ہے۔ افسانوی ادب یا فکشن کی جزئیات پر تبصرہ کرتے ہوئے بلراج کومل کا کہنا ہے:

> ''خالص لغوی مفہوم میں فکشن کے ذیل میں وہ بیانیہ تحریریں رکھی گئی ہیں جن میں تخیل اور تخلیقی سطح پر واقعات، مناظر اور کرداروں کی مدد سے زندگی کی نمائندگی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فکشن کے تحت آنے والی اصناف عام طور پر افسانہ، کہانی حکایت، داستان اور ناول ہیں۔ مختصر اور روایتی طور پر فکشن کی اولین خصوصیت بیانیہ کا تسلسل ہے۔ ایک واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یہ واقعہ دوسرے واقعے کو جنم دیتا ہے۔ دوسرا تیسرے کو اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کچھ واقعات انسانوں کے شعوری فیصلوں سے جنم لیتے ہیں جبکہ کچھ دوسرے واقعات انسانوں کے شعوری انتخاب اور غیر شعوری یا لاشعوری اعمال سے ماورا ہوتے ہیں۔ وہ یا تو فطری، سماجی اور معاشرتی تصادموں سے جنم لیتے ہیں یا ایک دوسرے کے [illegible]لیاتی ردعمل سے، جس کو سمت دیتے ہیں جس کو قابو میں لانے کی انسانی استعداد محدود ہوتی ہے۔ فکشن لکھنے والا ادیب عام طور پر منطق کا سہارا لیتا ہے۔ صورت حال کے مطابق کرداروں کا انتخاب کرتا ہے۔ وقت کے مسئلے سے دنوں، مہینوں، برسوں اور گھڑی کی سوئیوں کی رفتار کے مطابق نمٹتا ہے۔ نقطہ آغاز اور سلسلہ مدراج کا تعین کرتا ہے اور بالآخر نقطہ عروج پر پہنچتا ہے۔''[1]

کہانی کارکونقطہ عروج تک پہنچنے کے لیے جن مدراج اور مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس کے لیے اس کا متعلقہ صنف کے جملہ اجزائے ترکیبی، ساخت اور بناوٹ اور فنی پہلوؤں پر توجہ مرکوز رکھنا لازمی ہے کیوں کہ تمام تر تکنیک کے تجربات، ساخت اور بناوٹ کے دائرے کے اندر رہ کر کیے جاتے ہیں۔ اس لیے ایک اچھے اور سچے فنکار کا فن سے متعلق تمام رموز پر عبور ہونا ضروری ہے۔ فن پارے کی تکمیل تک کا سفر اس کو کس طرح طے کرنا چاہئے اس حوالے سے فاضل مصنف کا کہنا ہے:

''بیانیہ کی صورت بعض اوقات خط مستقیم کی بھی ہوسکتی ہے۔ اس عمل میں اکثر اوقات لکھنے والے کے سامنے ایک طے شدہ مقصد ہوتا ہے...... بعض اوقات محض تصویر کشی، بعض اوقات منظر نگاری، بعض اوقات کردار سازی، بعض اوقات معنی حیات کی تلاش...... دوسرے لفظوں میں لکھنے والے کے ذہن میں کوئی مخصوص موضوع ہوتا ہے جس کی تخلیقی تفہیم کے لیے وہ مختلف وسائل وضع کرتا ہے۔ بعض اوقات بظاہر بیانیہ تحریر مختلف مدراج سے گزرتی ہوئی غیر شعوری طور پر گہری علامتی معنویت اور ماورائیت اختیار کر لیتی ہے۔ پلاٹ، کردار، استعارہ، علامت، نقطۂ نظر، بیانیہ، منظر مسلسل، سیر بین کی تصویر...... فکشن ان سب کا سہارا لیتی ہے اور ہر لکھنے والا اپنے مخصوص نصب العین کے مطابق ان کے تناسب اور اپنی ردعمل کی تنظیم میں تبدیلیاں کرتا رہتا ہے۔''[۲]

مندرجہ بالا پیراگراف میں جس ''نصب العین'' کا ذکر کیا گیا ہے اس کے لیے مقصد، مقصدیت، افادیت اور مخصوص فلسفہ حیات جیسے الفاظ و اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے حصول کا فن کارانہ طریقِ عمل یہ ہے کہ مقصدیت کو ڈھنڈورا پیٹے بغیر خاموشی اور احتیاط سے کرداروں کی فطری نشوونما اور اخفا کے پردے میں رکھا جائے۔ کہانی کے فطری ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ عمل قاری پر منکشف ہونا چاہیئے اور فن پارے کے اختتام پر پڑھنے والا اس فلسفہ حیات کو جان پائے جو کہ مصنف کا مطمع نظر تھا۔ ہم یہ عمل سمندر کی سطح پر موجود طوفان کے نیچے موجود سکون کی طرح ہونا چاہیئے جو نظر آتے ہوئے بھی پانی کی تہہ میں تہ نشین اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

افسانوی ادب کے تخلیق کار خواتین وحضرات میں گہرے معاشرتی اور تہذیبی شعور کا ادراک اور اس کے اظہار کے سلیقہ کی اہمیت مسلمہ ہے۔ کیوں کہ ادب کے ذریعے تبدیلی کا عمل معاشرے کی بدصورتی کو دور کرنے اور خوبصورتی کو

بڑھانے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ ادب انسانی زندگی اور معاشرے کی آفاقی قدروں اور ابدی سچائیوں کے فروغ اور ترقی میں ہمیشہ معاون رہا ہے۔ اس حوالے سے افسانوی ادب کے کردار کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

> ''ان (افسانوی ادب) اصناف ادب کے فنکار انسانی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے گہرے معاشرتی اور تہذیبی شعور کا اظہار کرتے ہیں۔ اس شعور کا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا کہ زندگی کے ان پہلوؤں کی صرف ترجمانی ہو جائے۔ بلکہ اس کے خلاف وہ اپنے فن کے ذریعے معاشرتی اور تہذیبی اقدار کا صحیح شعور بھی عام کرتے ہیں اور اس طرح ان کے ہاتھوں زندگی کو بنانے اور اس کے منتشر پریشانہ گیسوؤں کو سنوارنے کا اہم کام بھی انجام پاتا ہے۔ فنی اور جمالیاتی اقدار کا صحیح احساس و شعور پیدا کرنا بھی ان اصناف ادب کا خاص میدان ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسانی زندگی کے ہر دور میں ان اصناف ادب نے جو اہم کارنامے انجام دیئے ہیں، ان کو سب ہی نے تسلیم کیا ہے۔''[۳]

عام نثری تحریروں اور ادبی نثر میں ایک خاص نوع کا فرق ہے۔ یہ فرق جہاں خصوصیات کے اعتبار سے مختلف افراد میں مختلف ہوتا ہے وہیں مختلف علوم کی نوعیت، مزاج اور ضرورت کے سبب بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی طرح سائنسی اور سماجی علوم کی علمی نثر اور خالص ادبی و تخلیقی نثر میں طرز اظہار کا واضح فرق پایا جاتا ہے۔ یہ فرق ان علوم کی بنیادی ضرورت کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ افسانوی ادب کی تحریر اور دیگر نثری تحریروں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ نیز افسانوی اسلوب کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے اس بارے میں بلراج کومل کا کہنا ہے کہ:

> ''خالص نثری تحریریں ہمارے واقعات اور عوامل کی دستاویزات ہیں۔ سائنس، معاشیات، عمرانیات اور دیگر علوم کے مجلّے ہیں۔ ان سب تحریروں کا بنیادی وصف منطقی ترتیب اور وضاحت ہے۔۔ جب کوئی نثری تحریر فکشن کی حدود میں داخل ہوتی ہے تو کئی سطحوں پر اس میں تغیرات پیدا ہوجاتے ہیں۔ خالص علمی نثری تحریر کا مقصد معانی کا میزان تیار کرنا ہے۔ فکشن کی سطح پر نثری تحریر کا مقصد معانی کا میزان تیار کرنے کے بجائے واقعات اور حالات کے تخلیقی اور تخیلی اظہار کو اس سطح پر پہنچانا ہے جس کے امکانی وجود کو پڑھنے والا رضا مندی سے

> قبول کر لے، بھلے ہی وہ واقعات وحالات پڑھنے والے نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے
> کانوں سے سنے نہ ہوں۔ ماحول، لہجہ اور تحریر کا مزاج کچھ اس قسم کا ہو کہ یہ غیر ممکن ہوتے
> ہوئے بھی ممکن نظر آنے لگے اور یہ پوری صورت حال معانی سے منور ہو جائے اور رویہ
> آغاز سے انجام تک کہنے کے بجائے نقش گری کا رہے۔''۴

کہانی اور زندگی کے گہرے تعلق کے بعد ادب اور سماج کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب کی تشکیل اور فن پارے کی تخلیق کے پس منظر میں ایک پورا سماجی منظر نامہ اور فطری محرکات، حرکی توانائی کا کام کرتے ہیں۔ لہٰذا انسان جس سماج میں رہتا ہے، اس سماج کی اہمیت اور اثرات سے کیوں کر انکار کر سکتا ہے جب ہم ان معاشرتی اقدار، مضبوط روایات اور عصری تبدیلیوں کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ جو سماجی حقائق، تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، معاشی اور دیگر اقدار کے فطری باہمی میل سے تغیر و تبدل کی شعوری و لاشعوری کوششوں سے ایک نئی فضا کو تخلیق کرتے ہیں۔ یوں ایک نیا سماج جنم لیتا ہے۔ اس نئے سماج کے اثرات ادب اور ادیب کے ہاں بھی جنم لیتے ہیں۔ لیکن فطرت کے اصول کے مطابق ہر ایک فرد اور موضوعِ تخلیق پر اثرات مختلف ہوتے ہیں۔ اس تبدیلی کا عمل اگر فطری انداز میں ہو تو پورے سماج کے ہر ہر رنگ اور زاویے پر اثر بھی فطری ہوگا۔ افراد، گھر، گلیاں، بازار، کارخانے، کھیت کھلیان، تعلقات رشتے الغرض ہر پہلو سے پرانے معاشرے کی جگہ ایک نیا معاشرہ تشکیل پانے لگتا ہے۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات میں ''ادب برائے زندگی'' کے متعلق مرتب کا کہنا ہے کہ:

> ''ادب کا اولین کام یہ ہے کہ وہ قارئین وسامعین کو مسرت بہم پہنچائے۔ ادب کا دوسرا فریضہ
> یہ ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں ہماری آگہی میں اضافہ کرے یعنی ہمیں اپنی ذات اور اپنے
> ماحول کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو۔ چنانچہ کسی نہ کسی شکل میں سماجی زندگی سے متعلق ادب کے
> لیے لازم ہے تو اس صورت میں اگر ادب سے زندگی کے حسن کو نکھارنے، اس کے معائب کو
> دور کرنے اور ایک بہتر زندگی کے لیے جدوجہد کرنے کی توقع کی جائے تو یہ کوئی بے جا توقع
> نہیں اور یہی ادب برائے ادب زندگی کا نظریہ ہے۔''۵

ادب اور زندگی کی طرح، ادب اور اسلوب کا بھی آپس میں قریبی تعلق ہے اور اسی تعلق کے تناظر میں اسلوب اور سماج کے گہرے روابط اپنے اثرات کے اعتبار سے انتہائی اہم ہیں جب ہم یہ امر ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ''ادب''

اور ''زندگی'' کی اصطلاحات اپنی کلی حیثیت میں وسیع تر مفہوم میں استعمال ہوتی ہیں۔ جب کہ ''اسلوب'' اور ''سماج'' کی اصطلاحات اس ''کل'' کے جز کے طور پر ہیں۔ لہٰذا جب 'کل' کا تعلق کافی حد تک لازم اور طے شدہ ہے تو 'جز' کا تعلق کیوں کر نہ ہوگا۔ اسلوب ادب کا جزو ہے اور سماج، زندگی کا۔ یوں ہر دو کا تعلق لازم و ملزوم ہے اور یہ اسلوب کیا ہے۔ اس حوالے سے منظر عباس نقوی لکھتے ہیں:

> ''ادائے خیالات اور اظہار جذبات کا ڈھنگ۔ اسلوب کی یہ تعریف نثر و شعر دونوں پر حاوی ہے۔ نثر اور شعر میں فرق یہ ہے کہ نثر سوچے سمجھے خیالات اور جچے تلے جذبات کا پیرائے ادا ہے اور شعر تخیل و جذبات کی ترجمانی کا وسیلہ۔ اس طرح اسلوب کی بھی دو قسمیں ہوئیں، نثری اسلوب اور شعری اسلوب۔ نثری اسلوب وہ ہے جس کا تعلق بنیادی طور پر ادائے خیالات سے ہو اور شعری اسلوب وہ ہے جو اظہار جذبات کے لیے مخصوص ہے۔ ادائے خیال سے مراد یہ ہے کہ مصنف کے ذہنی تجربات بے کم و کاست قاری کے ذہن تک منتقل ہو جائیں۔ اسی عمل کو اصطلاحی زبان میں ابلاغ خیال کہتے ہیں۔ ابلاغ ہی کی ضرورت سے مصنف کو وہ اسلوب بیان اختیار کرنا پڑتا ہے جو سریع الفہم، قطعی اور استدلالی ہو تاکہ اسے جن خیالات کا اظہار مقصود ہے یا جس واقعے یا کیفیت کو وہ بیان کرنا چاہتا ہے وہ پڑھنے یا سننے والے کے دماغ کو پوری طرح اپیل کر سکے۔''(۶)

مصنف، خیال اور قاری تینوں کا تعلق معاشرہ کی زندہ حقیقت سے ہے۔ یوں فن کار، فن پارہ اور مخاطب (یعنی قاری) زندگی اور سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کہ اسلوب کی تشکیل کے بنیادی عناصر میں بھی ان کا اہم حصہ ہے۔ مثلاً:

☆ مصنف

☆ ماحول

☆ موضوع

☆ مقصد

☆ مخاطب

جب ہم اسلوب اور اسلوب کی تشکیل کے عناصر کا جائزہ لیتے ہیں تو حیرت انگیز طور پر یہ پاتے ہیں کہ تمام تشکیلی

ا ا کا تعلق اہ را ادب، ز گی اور ماحول تے ہیں۔ مثلاً مصنف کا تعلق، ماحول کا تعلق (بلکہ ماحول، عہد، معاشرہ، سماج تو ا ہی اکائی کے مختلف م ہیں)، موضوع بھی ار د کی ز گی، افراد اور سماج سے ہی لیا جا ہے اسی لیے تو اجنبی نہیں ، مقصد اور مخاطب بھی معاشرے سے ڑے اور ماحول کا اہم حصہ ہی تو ہیں۔ یوں ادب، ز گی، سماج اور اسلوب کی تشکیل کا گہرا تعلق ہے۔ اس سلسلے میں فاضل مصنف لکھتے ہیں:

''ادب کے تخلیقی عمل کا تجزیہ کرنے سے ہم کو پتہ چلتا ہے کہ اسلوب بیان کی تشکیل میں پ چ عناصر کرم فرما ہوتے ہیں۔ مصنف، ماحول، موضوع، مقصد اور مخاطب۔ گ ی اسلوب کے تعین میں اس ت کو ادخل ہے کہ ت کون کہہ رہا ہے، کس زمانے میں کہہ رہا ہے، کیا کہہ رہا ہے، کیوں کہہ رہا ہے، اور کس سے کہہ رہا ہے؟''[۷]

یہاں نچوں ا اسے وقتی طور صرف کرتے ہوئے صرف دو یعنی ''ماحول'' اور ''مخاطب'' کی مختصر وضا جو منظر عباس ی کے اپنے الفاظ میں بیان کی گئی ہے، وہ کچھ اس طرح ہے:

''ماحول سے مراد اس عہد کا ادبی ذوق جس میں رے کی تخلیق ہوئی۔ یہ فرق اس عہد کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی م کی پیداوار ہے۔ مصنف کے مزاج میں لاکھ اد سہی لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے عہد کے مذاق کو کلیتہً ازکردے۔ ا وہ ایسا ک ہے تو اس کی قبولیت کا دا ہ بہت محدود ہو جائے گا۔''[۸]

اسلوب کی د ''ز ن'' ہے۔ ز ن ا نی ز گی کے لیے دی اہمیت کی حامل ہے۔ ز ن ا طرف ا ن کی ا ادی ز گی میں اہمیت ر ہے تو دوسری جا اجتماعی نیز معاشرتی حوالے سے بھی ا لازمی ضرورت بن جاتی ہے۔ ہمیں آپس میں تبادلہ خیالات، ا دوسرے ا ت در طر سے پہنچانے کی ضرورت یعنی مدعا ک سیل، اپنی صلا ، قابلیت، اہلیت، خیالات، ت وغیرہ کے اظہار اور بیان کے لیے ز ن سے بہتر اور کوئی واسطہ میسر نہیں۔ یوں ابلاغ کا دی ذریعہ ''ز ن'' قرا تی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ز ن وادب معاشرہ کی دی اکائیوں میں لازم اکائی بن جاتے ہیں۔ کیو معاشرہ مشترک عناصر ک اور تعلق کی تشکیل ہے اور ز ن ا اہم مشترک عناصر ہونے کے طے سماجی رویوں، تعلق اور عمل میں فعال کردار ادا کرتی ہے۔ لفظ، ز ن اور سماجی تعلق کے اسی پہلو ت کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی یوں لکھتے ہیں:

''لفظ انسان کے سماجی رشتے کا پہلا عمل ہے اور اسی لیے ''زبان'' انسان کی سب سے اہم سماجی سرگرمی ہے اور چونکہ ''ادب'' بھی لفظوں کی ترتیب و تنظیم سے وجود میں آتا ہے۔ اس لئے خود ''ادب'' بھی بنیادی طور پر ایک سماجی عمل ہے اور ہمیشہ سے ایک سماجی عمل رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سماجی عمل ادب کے وجود میں، اس کے مزاج میں، اس کے خون میں شامل ہیں اور یہی اس کا پہلا بنیادی رشتہ ہے۔ اسی رشتہ کی وجہ سے انسان ادب کے سماجی رشتوں کا سب سے اہم مظہر بن کر قوم کی روح کے اظہار کا سب سے مؤثر وسیلہ بن جاتا ہے۔ انسانی زندگی اور معاشرے میں چونکہ لفظ کی بنیادی اہمیت ہے اس لئے لفظ کے تعلق سے زبان کی اور زبان کے تعلق سے ادب کی بھی بنیادی اہمیت ہے۔''۹

فکشن میں تکنیک کی تنوع کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ مختلف ماہرین کی آراء کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تنوع ادیب کے ہاں شعوری اور فنی سطح پر باقاعدہ کاوش کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ہی مصنف کے مختلف افسانے تکنیک کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ افسانوی ادب میں بیانیہ تکنیک کی کثرت ہے۔ لیکن کوئی ادب پارہ بیانیہ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے تکنیک میں مختلف ہوسکتا ہے۔ مثلاً 'آنندی' (غلام عباس) 'حرام جادی' (حسن عسکری) 'ہماری گلی' (احمد علی) 'بالکونی' (کرشن چندر) 'شکوہ شکایت' (پریم چند) سب بیانیہ تکنیک میں لکھے گئے ہیں لیکن ان میں جو فرق ہے۔ اس کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ ''آنندی'' میں اجتماعی احساس اور وسعت کے ساتھ کہانی کا نکتہ آغاز کی جانب دائروں کی صورت مسلسل سفر ہے۔ ایسا طویل سفر جو کبھی ختم نہ ہو پائے گا۔ جبکہ 'حرام جادی' زمانی اعتبار سے چند گھنٹوں پر محیط ہے۔ اور کردار صرف دو عورتیں، ایک اہم دوسری کم اہم اور ذہنی تصورات کے حوالے سے داخلیت کی طرف مائل۔ 'ہماری گلی' میں خارجیت اور گردوپیش کے ماحول کی تصویر کشی نمایاں ہے۔ اور اس کی تکنیک میں رپورتاژ کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ اور خاکہ نگاری کا بھی۔ جبکہ 'بالکونی'' میں خاکہ نگاری اور مرقع نگاری کے علاوہ وقت کا نہ ختم ہونے والا احساس پایا جاتا ہے۔ 'شکوہ شکایت' میں پریم چند کا سادہ بیانیہ انداز اور خود کلامی کی تکنیک کو استعمال کیا گیا ہے۔

افسانوی ادب میں صیغہ (متکلم یا غائب) اور کیریکٹر (مرد یا عورت کی زبانی) کا فرق معمولی ہوتے ہوئے بھی تکنیک کے اعتبار سے غیر معمولی ہوتا ہے۔ تکنیک کے تنوع کے وسیع مضمون کو بلراج کومل نے ان چند سطور میں

دریا کوکوزے میں بند کرنے کے انداز میں بیان کیا ہے:

''فکشن لکھنے والوں کے قبیلے میں کچھ ایسے لکھنے والے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنی تحریروں میں ہر مقام پر موجود ہیں۔ کیونکہ وہ خود ماحول اور کرداروں کے بارے میں بار بار اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ کہیں کہیں پر یم چند اپنی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جو کچھ اس قسم کا طریق اختیار کرتے ہیں کہ وہ کرداروں اور واقعات کو اپنے فطری راستے پر چلنے کی اجازت دیتے ہیں اور عمل اور واقعہ اور مکالمہ کی مدد سے حالات، واقعات اور کرداروں کو فطری انداز میں پیش کر دیتے ہیں۔ (ایوان تورگنیف اس کی بہترین مثال ہے) کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو شعوری طور پر واقعات کا منطقی تسلسل درہم برہم کرتے ہیں اور کرداروں کو اس حد تک سنوار دیتے ہیں یا بدل دیتے ہیں یا مسخ کر دیتے ہیں کہ جانے پہچانے چہروں میں ان کی مماثلت تلاش کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسے لکھنے والوں کا مقصد غالباً بنیادی جوہر حیات یا معنی حیات تلاش کرنا ہوتا ہے۔''[۱۰]

افسانوی ادب کے فنی عناصر اور اس کی ترکیبی

افسانوی ادب کی تعریف و تفہیم، فنی لوازمات اور ان کی اہمیت کے مختصر جائزے کے بعد ذیل میں افسانوی ادب کی اصناف داستان، ناول، افسانہ اور ڈرامہ کے عناصرِ ترکیبی، اجزائے ترکیبی اور ارتقا کا اجمالی خاکہ پیش خدمت ہے۔

داستان

قصہ کہانی اور انسان کا باہمی تعلق قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ انسان قصہ کہنے اور کہانی سننے کا شوقین رہا ہے۔ کہانی اس کی زندگی، فطرت اور رگ و جاں میں شامل رہی ہے۔ پہلے زمانے میں انسان کے پاس وقت کی کثرت تھی۔ اس طویل وقت کو وہ کسی نہ کسی طرح گزارنے کا خواہاں تھا۔ ہم کہانی اس کا ایک اہم ذریعہ تھی اور آج بھی ہے۔ اس لیے

قدیم داستانیں طویل سے طویل تر ہوتی تھیں۔ قصہ گو یا کہانی سنانے کی غرض سے ایک ہی قصے میں دوسرے بہت سے مختلف قصے شامل کر دیا کرتا تھا۔ داستان گو عام لوگوں کو انسانی معاشرے کے مختلف النوع مسائل سے تھوڑے عرصے کے لیے لاتعلق کر کے حیرت انگیز، تخیل اور رومان پرور جادوئی دنیا میں لے جاتے تھے، جہاں کردار خارق عادت عناصر کی مدد سے اپنے خوابوں اور خواہشوں کی تکمیل کرتے اور دنیا کے غموں اور دکھوں سے آزاد ہو جاتے تھے۔ سامعین ان کرداروں کی حرکات و عمل میں خود کو شریک تصور کر کے تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی لیکن ناآسودہ خواہشات کو آسودگی مہیا کرتے اور خوش ہو جاتے تھے۔

داستان کے لفظی معنی قصہ یا کہانی کے ہیں۔ جب کہ اصطلاحی لحاظ سے اس سے مراد وہ قصہ کہانی ہے جو طویل ہو۔ اس میں رومانی کردار بھی ہوں اور مافوق الفطرت عناصر بھی۔ ایسی کہانی کا تعلق حقیقت سے کم اور خیالی زندگی سے زیادہ ہوتا ہے۔ ایسی کہانی عارضی طور پر پڑھنے والے کو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے دور لے جاتی ہے۔ ان داستانوں میں قدیم انسانی معاشروں کے عقائد و روایات، توہمات اور ضعیف الاعتقادی اور رسم و رواج کے ساتھ ساتھ انسان کی ناآسودہ آرزوؤں اور خوابوں کی تعبیر ہوتی ہے۔ یہ داستانیں علمی، ادبی، اساطیری اور معلوماتی اعتبار سے ہمیں بے پناہ مواد مہیا کرتی ہیں۔ داستانوں کے ذریعے اس دور کے مصنف اور داستان گو فن کار بہت سے دینی اور دنیاوی مقاصد حاصل کرتے تھے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے تو داستانیں قدیم طرز بیان اور اسلوب تحریر کے مختلف اور متنوع نمونے پیش کرتی ہیں۔ یہی داستانیں وقت کے ساتھ ساتھ آنے والے دور میں اردو ناول کی بنیاد بنیں اور کہانی کے نئے عہد کا آغاز ہوا۔

اردو داستان کی ساخت، انداز بیان اور عمومی مزاج اور خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے مرتب ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' نے لکھا ہے:

> ''داستان کسی خیالی اور مثالی دنیا کی وہ کہانی ہے جو محبت، مہم جوئی اور سحر و طلسم جیسے غیر معمولی عناصر پر مشتمل اور مصنف کے آزاد اور زرخیز تخیل کی تخلیق ہو...... داستانوں میں مافوق الفطرت اشیاء، واقعات، مقامات اور کرداروں کی کثرت ہوتی ہے۔ جادو کی چیزوں، جادو کے واقعات، طلسمی شہروں، طلسمی خاندانوں، جن بھوت اور پری جیسی مخلوق کا ذکر عام ہوتا ہے۔ علت اور معلول کا رشتہ قدم قدم پر ٹوٹتا ہے۔ آدمی بندر بن جاتا ہے اور بندر انسان۔ ان میں

گفتگو کرتا ہے۔ آدمی پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اپنے ت دہندہ کا انتظار کرتا ہے ۔ در کو ذرا سا ہلانے پر اشرفیوں کے سات ساتھ کنو نمودار ہو جاتے ہیں ۔ داستانوں کا دور چو عوام کا دور نہ تھا بلکہ بادشاہوں ، وزیروں، نوابوں ، شہزادوں اور شہزادیوں کا دور تھا۔ اس لئے داستان میں مرکزی اہمیت انہیں کو دی جاتی ہے ۔ بیشتر کردار مثالی ہوتے ہیں۔ داستان ولی افسانے کے عکس ہماری عملی اور خارجی د سے بلند ا خیالی اور مثالی د کی کہانی ہے جس میں مثالی کردار بستے ہیں اور مثالی واقعات پیش آتے ہیں۔ جو بلا آخر کسی مثالی نتیجے پہنچ جاتے ہیں۔''[11]

داستان کے اجزائے ترکیبی

داستان کی ساخت اور بناوٹ ان اجزا پر مشتمل ہے۔ مرکزی قصہ، تخیل، رومان، مافوق الفطرت عناصر اور تحیر، کردار نگاری، طوالت اور ضمنی پلاٹ، اخلاقی مقصد، اسلوب بیان اور تہذیب ومعاشرت کی عکاسی۔

ہر داستان میں مرکزی قصہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے کم وبیش تمام داستانوں کے مرکزی قصے کی فنی ساخت آپس میں گہری مماثلت رکھتی ہے۔ داستان کی ہیئت، ساخت اور مرکزی قصہ کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک اردو داستان کا تعلق ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کوئی مرکزی قصہ ہو۔ یہ قصہ خواہ اکہرا ہو یا قصہ در قصہ، اور خواہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتا ہو اس پر شاعرانہ تخیل کا دبیز پردہ پڑا رہنا ضروری ہے۔ اصل واقعہ یا محض حالات کو کر دینے سے داستان طرازی کا حق ادا نہیں ہوتا ۔ داستان کا مرکزی قصہ ہماری زندگی سے یقیناً تعلق رکھتا ہے لیکن زندگی کا نہیں دور کا ہے۔ داستان میں زندگی کی تصویر ہوتی ہے لیکن اس کا تعلق حال سے کم اور ماضی بعید سے زیادہ ہوتا ہے۔ داستانوں میں سامنے کے کرداروں سے حسن پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کو جاندار بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ایسے خیالی روں سے بنایا جائے جو بالعموم سننے والے کے ذہن وہوش کی رسائی سے باہر ہوں ۔ بعض لوگ داستانوں کے پلاٹ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ چو اس میں پڑھنے والے

کردار وواقعات فرضی ہوتی ہیں اس لئے ان میں زندگی کی حرارت باقی نہیں رہتی۔ یہ خیال درست نہیں ہے۔ یہ اعتراض ناول یا افسانے پر وارد ہوسکتا ہے۔ لیکن داستانوں کا فن اس تنقید کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ بقول کلیم الدین داستان میں تو قصداً ایک ایسی دنیا تخلیق کی جاتی ہے جو محض خیالی ہو، جو لازمی طور پر ہماری جانی ہوئی چوبیس گھنٹوں والی دنیا سے مختلف ہو۔ اس لئے اگر دیکھی ہوئی جگہوں، معمولی چیزوں اور جانے پہچانے لوگوں کا ذکر ہو تو پھر داستان کی فضا پیدا نہیں ہوسکتی۔ داستان کی فضا میں دوری کا وجود ضروری ہے یہ دوری دو قسم کی ہوتی ہے زمانی ومکانی۔ عموماً داستانوں میں دونوں طرح کی دوری پائی جاتی ہے۔''۱۲؎

طوالات، ضمنی واقعات، دلچسپی کے دیگر عناصر اور رومانی عناصر کی موجودگی داستان کی اہم خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں۔ داستان گو ان جزئیات کی تعبیر وتشریح بڑی باریک بینی سے کرتے اور قاری کو اس رومان پرور فضا کا اسیر بنا دیتے۔ داستان کی ان دیکھی دنیا سامعین کو کچھ اس طرح اپنے حصار میں لے لیتی کہ وہ دعا کرتے کہ داستان کبھی ختم نہ ہو۔ اس حقیقت سے متعلق فاضل [illegible]د لکھتے ہیں:

''داستان کی دوسری فنی خصوصیت اس کی طوالت ہے۔ اکہرے اور مختصر قصے کو فنی حیثیت سے داستان کا نام دینا مناسب نہیں ہے۔ اس میں قصہ در قصہ اور پیچ در پیچ کا ہونا ضروری ہے۔ داستان کو طول دینے کے لیے فنکار مرکزی داستان کو ضمنی داستانوں کی مدد سے ٹھہرائے رکھتا ہے لیکن فن کا کمال یہ ہے کہ یہ ٹھہراؤ سامعین یا قارئین پر گراں نہیں گزرتا بلکہ اس سے وہی لطف وحظ محسوس ہوتا ہے جو محبوب کے انتظار سے وابستہ خیال کیا جاتا ہے۔ چونکہ داستان کا اصل کمال یہی ہے کہ وہ طویل ترین ہونے کے باوجود ذہن وگوش کے لیے بار نہ بن پائے اس لیے داستان طراز نت نئے نئے واقعات ومہمات اس طور پر سامنے لاتا ہے کہ سننے والے قصہ سے اکتانے کے بجائے اس کے نہ ختم ہونے کی دعا مانگتے رہتے ہیں۔ مرکزی قصہ کو طول دینے کے جو ضمنی قصے ان میں لائے جاتے ہیں ان کے موضوعات کچھ ایسے متنوع ہوتے ہیں کہ سننے والے کی دلچسپی کسی مقام پر بھی ختم نہیں ہوتی۔''۱۳؎

حیرت اور مافوق الفطرت عناصر ہر داستان کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان داستانوں پر جادوگری کا

گمان ہوتا ہے جہاں طلسم، جادو، جن پری اور غیبی امداد کے حیرت انگیز معاملات معمول کی زندگی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ عناصر صرف اردو داستان کا خاصہ نہیں ہیں بلکہ دنیائے ادب کی اکثر زبانوں کی بیشتر قدیم داستانوں اور اساطیر میں یہ رنگ اور انداز پایا جاتا ہے۔ یوں مختلف کردار خاص طور پر ہیرو کے ساتھ جڑے واقعات میں تحیر اور خارق عادت عناصر، قاری کو مبہوت کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> ''داستانوں کے ترکیبی عناصر میں مافوق فطرت عنصر کی شمولیت اور اس کے اثرات کو بھی نظر انداز کیا جا سکتا ہے داستانوں میں اس عنصر کا دخل ضروری نہ سہی پھر بھی دنیا کے مختلف ادبوں میں بہت کم ایسی کہانیاں یا داستانیں ملیں گی جو مافوق فطرت سے خالی ہوں۔ اردو کے بعض ناقدین داستانوں میں مافوق فطرت عنصر کے شمول کو ممدوح خیال نہیں کرتے۔ خود مولانا حالی نے منظوم داستانوں کے لئے اہم شرط یہ لگائی ہے کہ جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اس کی بنیاد ممکن اور فوق العادت باتوں پر نہ رکھی جائے۔ اگرچہ قصوں اور کہانیوں میں ایسی باتیں بیان کرنے کا دستور نہ صرف ایشیا میں بلکہ کم و بیش تمام دنیا کے قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔''[۱۴]

زبان و بیان میں تنوع اردو داستان کا خاصہ رہا ہے۔ ہر دور، ہر زمانے، ہر عہد، اور ہر مقام میں مختلف ہے۔ داستان نویسوں نے اپنے عہد کی ضرورتوں کے حوالے سے داستانی اسلوب میں زبان و بیان کے تجربات ضرور کیے ہیں۔ یہ تجربات مشکل گوئی سے سادہ نگاری اسلوب کی جانب سفر کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں ہم عام طور پر داستانوں میں مخفی اور مسجع نگارش کارنگ پاتے ہیں ہے۔ رنگین اور پر تکلف انداز تحریر کے مقابلے میں سادہ اور دلکش طرز بیان میں کیا فرق ہے اور کیا اہمیت ہے۔ اس حوالے سے فاضل مصنف لکھتے ہیں:

> ''داستان کی آخری اور سب سے اہم شرط، داستان کا بیان ہے۔ بیان جس قدر سادہ، مربوط، مسلسل، موثر اور دلکش ہوگا۔ داستان اس قدر مقبول ہوگی۔ اسی لئے کہ داستان بنیادی طور پر لکھنے لکھانے کا ہنر، نہیں اور سنانے کا فن ہے۔ ظاہر ہے کہ حسن بیان کے بغیر کامیاب نہیں ہوتا اور اگر ہم داستان کے سلسلے میں غالب کا یہ قول تسلیم کرلیں کہ داستان طرازی منجملہ فنون سخن ہے سچ ہے کہ دل بہلانے کے لئے اچھا فن ہے تو پھر طرز بیان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی

ہے۔ اس لئے کہ موضوع و مواد سے بے نیاز ہو کر محض ہیئت سے کسی کا دل بہلانا
آسان نہیں ہے۔ یہ طرز بیان ہی کا فرق ہے جو داستانوں کے فنی ادبی مراتب میں فرق پیدا
کرتا ہے ورنہ معنوی اعتبار سے گلزار نسیم و سحر البیان، فسانہ عجائب، باغ و بہار میں کچھ ایسا
فرق نہیں ہے۔''۱۵

داستان کی اہمیت کے دیگر عوامل میں کردار نگاری، تہذیب و معاشرت کی عکاسی، مقصدیت اور ایک حد تک
حقیقی زندگی سے تعلق بھی شامل ہے۔ ان داستانوں میں عام طور پر جو ماحول، تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور رویے
دکھائے جاتے ہیں ان میں تخیل کی رنگینی اور مبالغہ آرائی کے باوجود اس دور کی حقیقی زندگی کے بیشتر پہلو بھی مل جاتی
ہیں۔ اس دور کے مشاغل اور معمولات کی عکاسی کے علاوہ ان داستانوں کی ادبی اہمیت بھی ہے۔ داستان کی ادبی اہمیت
کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''یہ ٹھیک کہ ان داستانوں کی فضا تخیلی اور طلسمی ہے لیکن یہ چیزیں بھی یکسر بے جان و بے
مصرف نہیں۔ یہ فضا تو ان میں جان بوجھ کر پیدا کی گئی ہے اس فضا میں پہنچ کر صرف کھوتے
نہیں ہیں بلکہ پاتے بھی ہیں۔ اس سے ہماری قوت متخیلہ کو مدد ملتی ہے اور ہمارے غور و فکر و علم کا
دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ تخیل کے دبیز پردے اٹھا کر دیکھیں تو ان داستانوں کے پس منظر میں
بہت سے واقعات کا ایک اہم سلسلہ نظر آئے گا اس لئے ہر افسانہ محض افسانہ نہیں ہو سکتا۔
افسانے کی بناء رکھنے کے لیے کسی نہ کسی حقیقت کا ہونا ضروری ہے۔ یہ داستانیں بہرنوع
انسانی ذہن کی تخلیقات ہیں اور انسانی ذہن، آسمان کی طرف اٹھنے کی کوشش کے باوجود زمین
سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اس کی بات تخیلی ہو کر بھی محض تخیلی نہیں ہو سکتی۔ ان میں زندہ
زندگی کی گہما گہمی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ان داستانوں میں جس دنیا کا ذکر ہو وہ
ہمارے سامنے کی دنیا سے قدر مختلف ہو لیکن اس اختلاف سے داستان اور زندگی کا تعلق ختم نہیں
ہوتا۔ داستان کی بناء خلا میں نہیں رکھی گئی۔ وہ انسانی ذہن کی تخلیق ہونے کی حیثیت سے ہمیں
زمانہ قدیم و بعید کے انسان کی یاد دلاتی ہیں۔ ان کے اعتقادات و میلانات پر روشنی ڈالتی
ہیں۔ ان کے انداز غور و فکر سے آشنا کرتی ہیں، ان کی سادہ لوحی، بے چارگی، مردانگی،

معصومیت، [illegible]سی، قوت تسخیر، فتح وکامرانی کے قصے سناتی ہیں۔ ان کے ذوق وشوق، مشاغل ومعملات، خیر وشر کے لمحات میں ہمارا دل بہلاتی ہیں وہ تھوڑی دیر کے لئے ہمیں دنیا کی ناخوشیوں سے نجات دلاتی ہیں۔ اسی صورت میں داستانوں کو ادبی نقطۂ نظر کے لحاظ سے کم مایہ خیال کرنا کہاں تک درست ہوگی۔''۱۶

داستان کا ارتقا

اردو داستان کے ابتدائی دکنی دور سے جس سفر کا آغاز ہوا اس کی ایک اہم منزل فورٹ ولیم کالج کلکتہ قرار پائی اور اس ادارے کے زیر اہتمام مقدار ومعیار کے حوالے سے داستان کا ادبی اعتبار قائم ہوا اور ان میں سے اہم ترین داستان میر امن دہلوی کی ''باغ و بہار'' قرار پائی ہے ہم تقریباً اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی اہم داستانیں تحریر کی گئیں۔ خاص طور پر فسانہ عجائب قابل ذکر ہے۔ داستان کے ارتقاء کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

''دنیا کی دوسری ترقی یافتہ اور شائستہ زبانوں کی طرح اردو میں بھی داستان کا سراغ ابتدائی دور سے ہی ملتا ہے ''کدم راؤ پدم راؤ'' جسے اردو کا پہلا منظوم داستان خیال کیا جاتا ہے۔ ۸۶۵ھ مطابق ۱۴۶۰ء کے قریب یعنی آج سے پورے پانچ سو سال پہلے وجود میں آئی ہے۔ لیکن آج نثری داستانوں کا آغاز ''نو طرز مرصع'' کی تمثیل کو نظر انداز کرکے ۱۷۷۵ء یعنی فارسی قصہ چہار درویش کے اردو ترجمہ سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد سرسید کی تحریک علی گڑھ تک مختصر اور طویل سینکڑوں داستانیں لکھی گئیں۔ ان داستانوں میں جنہیں شہرت وقبولیت حاصل ہوئی باغ و بہار، آرائش محفل، رانی کیتکی کی کہانی، فسانہ عجائب، گل صنوبر، سروش سخن، طلسم حیرت، داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ آرائش محفل جس میں حیدر بخش حیدری نے حاتم طائی کی مہمات کا ذکر کیا ہے۔ یہ ۱۸۰۱ء میں لکھی گئی باغ و بہار میر امن کے ہاتھوں ۱۸۰۲ء میں وجود میں آئی۔ اسی سال انشاء اللہ خان نے رانی کیتکی کی کہانی لکھی۔ ۱۸۲۴ء کے قریب رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب کو مکمل کیا۔''۱۷

ناول

برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد یورپی علوم اور انگریزی زبان و ادب کے زیر اثر اردو ادب میں جن اصناف نے اہمیت حاصل کی ان میں ناول اور افسانہ خاص طور پر اہم ہیں ناول ایک قصے کا نام ہے جس کا موضوع زندگی ہے ناول نگار کہانی میں زندگی کے حقائق کو مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں کچھ اس طرح سمیٹتا ہے کہ فن پارہ ادب اور زندگی کا حسین امتزاج بن کر قاری کے سامنے آتا ہے ناول کے فنی پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ایسا کوئی قصہ جو حقیقت نگاری کا حامل ہوتے ہوئے واقعی حالات انسانی کا بیان ہو، عام گفتگو میں اور ادبی تنقید میں عام طور پر ناول کہلانے کا مستحق ہے۔ ایسا کوئی قصہ جو زندگی کو غلط یا غیر معمولی طریقے سے پیش کرے یعنی جہاں عجیب وغریب ماحول، ناممکن الواقوع حالات پیش آجائیں یعنی جہاں فطرت انسانی کی خیر وشر کو مثالی رنگ میں ابھارا گیا ہو۔ رومانس کہلاتا ہے.... یوں کہئے کہ یہاں افسانہ اور حقیقت آنکھ مچولی کھیلتے نظر آتے ہیں۔ واقعات کی صحت اور ترتیب پر نظر رکھیں تو تاریخ کا اندازہ کھلنے لگتا ہے اور دلچسپ انداز بیان یا تخیل کی رنگ آمیزی نکھر آئے تو یہی حقیقت افسانہ بن جاتی ہے۔ افسانوی ادب کے ارتقا کی تاریخ بھی اس انداز کی نشاندہی کرتی ہے۔''۱۸

ناول کی اجزائے ترکیبی

فنی اور تکنیکی لحاظ سے ہیئت، ساخت اور بناوٹ میں جن اجزائے ترکیبی کو اہمیت حاصل ہے ان میں پلاٹ، کہانی، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، تکنیک، منظر نگاری، اسلوب، زبان و بیان اور فلسفہ حیات شامل ہیں ناول کے اسلوب اور اجزائے ترکیبی میں جن اجزا کو اہمیت حاصل ہے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کشاف تنقیدی اصطلاحات میں لکھا ہے کہ:

> ''ناول سے مراد سادہ زبان میں ایسی کہانی ہے جس میں انسانی زندگی کے معمولی واقعات اور روزانہ پیش آنے والے معاملات کو اس انداز میں بیان کیا جائے کہ پڑھنے والے کو اس میں

دلچسپی پیدا ہو۔ یہ دلچسپی پلاٹ، منظر نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری سے پیدا کی جاتی ہے اور یہی ناول کے بنیادی عناصر ہیں ۔ ان میں پلاٹ اور کردار نگاری خاص طور پر اہم ہیں۔''[۱۹]

ناول میں قصہ کہانی اور پلاٹ کی اہمیت مسلمہ ہے لیکن ہم کہانی اور پلاٹ میں فرق پیدا کرتے ہیں۔ پلاٹ ایک ایسی شعوری کوشش ہے جس میں تمام واقعات ایک خاص نقطہ آغاز سے بتدریج اختتام تک کا مربوط سفر طے کرتے ہیں۔ پلاٹ ایک شعر کی مانند فنی اعتبار سے اس طرح مربوط ہوتا ہے۔ کسی کمی بیشی کا متحمل نہیں ہوسکتا یعنی ایک ایسا خاکہ جو ناول کے واقعات کو تمام تر نشیب و فراز کے باوجود خاص ترتیب سے اختتام تک پہنچاتا ہے۔ پلاٹ مختلف مدارج سے تشکیل پاتا ہے۔ یہ مدراج آغاز، پیچیدگی، آویزش، کلائمکس، سلجھاؤ اور اختتام کی مختلف سطحوں سے تکمیل پاتے ہیں لیکن ہم بہت سے صاحبان علم وادب پلاٹ کی اہمیت کو ثانوی درجہ پر رکھتے ہیں اور ان کے نزدیک اصل اہمیت مواد، قصہ اور نثر کی کیفیت جمالی سے ہے لیکن ہم پلاٹ اور پلاٹ کی اہمیت کے حوالے سے سید عابد علی عابد کی رائے دیکھئے:

''مربوط پلاٹ کا وہ سلسلہ جو کسی داستان یا ناول میں پیدا ہوتا ہے۔ پلاٹ ہے...... کہانی اور پلاٹ میں بہت فرق ہے۔ کہانی دراصل قصے کے ان اجزا کا نام ہے جو بنیادی ہیں اور جن سے پلاٹ تعمیر کیا گیا ہے۔ کہانی خاکہ ہے، پلاٹ رنگین نقش ہے...... ناول نگار اپنی کہانی کے تمام بنیادی عنصر کو لے کر ان کا ایک منطقی سلسلہ قائم کرتا ہے۔ واقعات باہم اس طرح مربوط ہو جاتے ہیں کہ ایک واقعہ دوسرے واقعے سے ابھرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کہیں علت اور معلول کی صورت پیدا ہوتی ہے، کہیں کسی اور لزوم کی۔ لیکن بہر حال کہانی کے واقعات مربوط ہو کر افکار کے ایک سلسلے کا روپ دھارتے ہیں...... جس طرح پلاٹ (انگریزی میں) سازش کو بھی کہتے ہے اسی طرح کہانی کے واقعات کو یوں ترتیب دینا کہ وہ ایک سوچی سمجھی ہوئی سازش کا نتیجہ معلوم ہوں۔ اصطلاحی معنوں میں پلاٹ کہتے ہیں۔''[۲۰]

ناول اور کردار لازم و ملزوم ہیں ناول کی کہانی کرداروں کی مدد سے آگے بڑھتی، وسعت پذیر اور منطقی اختتام تک پہنچتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ناول میں بعض کردار اہم اور بعض کم اہم ہوتے ہیں۔ یوں مرکزی اور معاون کرداروں کے ذریعہ کہانی کے پھیلاؤ اور حالات و واقعات کی کشمکش تشکیل پاتی ہے۔ کردار کے لیے لازم ہے کہ وہ

ہمارے ار□ دگی ن□ گی سے لیے گئے ہوں اور مانوس ہوں۔ ان کے رویے، □ ن، بول چال، لہجے، الفاظ کا تعلق، ان کے مقام مرتبے اور د□ حوالوں سے مطابقت کے اصول کے مطابق ہوں۔ کردار نگاری کے لیے انتہائی فن کارانہ صلا □ اور اہلیت کا □ ضروری ہے۔ اس لیے □ ول نگار کو کردار کی ا□ ادی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اجتماعی، □ طنی اور خارجی رویوں کی عکاسی کر□ ضروری ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ کرادار کے طرزِ عمل میں کسی □ ی تبد□ کو فطری □ از میں □ چاہئے ورنہ کہانی فنی جھول اور گہری مقصد □ کا شکار ہوسکتی ہے۔ کہانی اور کردار میں تبد□، فطری ارتقا کے اصول کے مطابق □ □ ول کی خوبی کہلاتی ہے۔ اس طرح □ ول نگار کو اپنے سماج کے مروجہ اصولوں اور تہذ□ رویوں کو سامنے ر □ ہوئے ن□ گی کے تلخ حقائق کو کہانی و کردار کی صورت میں پیش کر□ □ ہے۔ اس کے لیے □ ول نگار میں فن کارانہ مہارات کا □ ضروری ہے۔ کردار نگاری اور اس سے □ ے حقائق کی وضا □ کرتے ہوئے ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> ''اعلیٰ درجے کی کردار نگاری کا ا□ تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر کردار عام ا□ نی سر □ میں شامل ہوتے ہوئے بھی ان صفات اور خصوصیات کا امتیازی □ ا□ ٹھپہ لے ہوئے ہو۔ جنہیں □ ول نگار اس کے ذریعے سے پیش کر□ چاہتا ہے □ ول میں جہاں کہیں آپ کی اس سے □ قات ہو آپ اسے فوراً پہچان لیں۔ اس کا ہر فعل، ہر مکالمہ اس کی ا□ اد □ اور شخصیت کا اعلان کرے۔ □ ت صرف خاص قسم کے طرزِ گفتگو □ تکیہ کلام سے حاصل نہیں ہوتی۔ ا□ چہ ظاہری تعارف میں ان چیزوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔ اصل چیز ذہنی اور نفسیاتی کیفیات ہیں جو ا□ کردار کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں۔ کرداروں کے انتخاب میں بھی وہی اصول کارفرما ہے □ ول کے لئے کہانی □ واقعات کے پیش□ □ ہے۔ یعنی عام معمولی واقعات جس طرح □ ول کا پلاٹ تیار کرنے کے لیے کافی ہیں اسی طرح معمولی کردا□ ول نگاری کے تمام اصولوں کو □ وئے کار لانے کے لیے □ لکل کافی ہیں، غیر معمولی کرداروں کی تلاش □ معمولی کرداروں کو مثالی ر□ میں پیش کرنے کی کوشش ہمیش□ کا □ .□ ہوگی۔ ا□ ن نہ صرف شیطان ہے، نہ صرف فرشتہ، وہ تو صرف ا□ ا□ ن ہے جس میں خامیوں اور لغزشوں کا بھی خطرہ ہے اور استقلال او□ .□ قدمی کی بھی توقع ہے۔ جو□ ہ بھی کر□ ہے اور جس سے

نیکیاں بھی سرزد ہوتی ہیں۔''۲۱

ان ان حیوان طق ہے۔ پ کہ وِل کا تعلق ن گی اور ان ن سے ہے وِل میں موجود کردار اپنی موجودگی کا احساس اپنے مکالموں اور گفتگو کے ذریعے دلاتی ہیں۔ قاری مکالموں کے ذریعے کردار، اس کی رویے، اس کی سوچ، اس کے عمل، اس کے ردِعمل، اس کے ت، اس کی عمر، اس کے مقام و مرتبے، اس کے علم و شعور سے آگاہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکالمہ نگاری کو وِل میں بہت اہم قرار دی جاتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وِل نگار مکالموں کی اہمیت کے پیش موقع محل کی منا سے کرداروں کی گفتگو کو پیش کرے لیکن یہ عمل انتہائی فطری چاہیے نہ تصنع اور بناوٹ کا پہلو وِل کی فنی حیثیت کو متاثر کرے گا۔ اسی طرح مکالموں کی طوا اور کرداروں کی تقا کو بھی غیر منا ہے اس لیے مکالموں کا مختصر اور موقع محل کے مطابق جستہ فنی خوبی کے دائرے میں داخل سمجھا جا ہے۔ ہر طبقے اور علاقے کی گفتگو کا مخصوص از ہے اور یہ رنگ کردار کے مکالموں میں آ چاہیے۔ اردو وِل میں مکالمہ نگاری کی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے فاصل مصنف کی رائے کچھ اس طرح ہے:

''اس کے لئے تین شرطیں ہیں۔ ضروری ہوں، مختصر ہوں اور فطری ہوں۔ ظاہر ہے کہ غیر ضروری مکالموں کے سوائے وِل کے طویل ہوجانے کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا اور پڑھنے والے اکتا جا گے۔ اس کے عکس اگر مکالمے مختصر ہوں گے تو پڑھنے والے پر ڈرامائی ا پیدا ہو سکے گا۔ مقصدی وِلوں میں مکالموں کے طویل ہوجانے کا خطرہ دہ ہو جا ہے۔ کسی کردار کے منہ سے پ کوئی ت ایسی نکل جاتی ہے جو اہ را لواسطہ اس کے مقصد کی جمانی کرتی ہے تو وہ بے قابو ہو جا ہے اور جو کچھ اپنے مخالفین کی میں کہنا چاہتا تھا وہ پ کچھ کہہ ڈالتا ہے۔ کبھی کبھی تو مکالمہ خاصا وعظ لیکچر کی صورت اختیار کر ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ مختلف جنسوں کے لوگ اپنے اپنے محاروے ر ہیں جو مکالمہ نگار اس فرق سے واقف نہیں ہوتے۔ ان کے مکالمے محض کتابی ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان میں وہ زگی زور نہیں جو چلتے پھرتے ان نوں کی تقر میں ہے روزمرہ گفتگو کی ن سادہ بے تکلف او جستہ ہوتی ہے اس میں تصنع آورد م نہیں وِل کے اچھے مکالموں میں بھی یہی از چاہیے۔''۲۲

منظراو ظر کے گہرے تعلق کی ی پ ول نگار اپنے قصے اور کہانی میں ماحول اور منظر کی در عکاسی کے ذریعے جان ڈال دیتا ہے۔ منظر اور پس منظر کا واقعات کی فضا سازی سے گہرا تعلق ہے۔ فضا کی در تص یکشی قاری کے تص یچشم کو اس ماحول کا حصہ بنے میں معاون و مددگار ہوتی ہے، جو مصنف کا مطمع ہ ہے۔ قدرتی مناظر سے لے کرا نی ن گی کے خوبصورت او صورت تمام منظر اور پس منظر نگاری، منظر نگاری کے زمرے میں آتے ہیں۔ حقیقی منظر نگاری، حقیقی ن گی سے ڑی ہوتی ہے ہم تخیل اس کو بعض صورتوں میں وہ رَ ک ہے جو عام ن گی میں قاری کی سے اوجھل ہ ہے۔ خاص طو پ گہرے نفسیاتی معا ت او ر ول نگار کے ماضی سے ڑے واقعات میں تخیل بعض حوالوں سے معاون ہ ہے۔ میدان . َ ہ یکسی کردار کے طن میں موجود کشمکش، اس طرح کی منظر نگاری اعلیٰ فنی صلاحیتوں کا تقاضا کرتی ہے۔ منظر نگاری کے مختلف پہلوؤں کی وضا کرتے ہوئے ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> ''مناظر کا مقصد اصل کہانی کے واقعات، افراد، قصہ، ان کے حالات وحوادث، ان کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات کے لیے پس پ دہ منظر کا کام دیتا ہے......اس کے بغیر ا ی ول ایسا ہی ہوگا جسے ا ی خوبصورت تص یبغیر پس منظر کے ہوتی ہے۔ پس منظر کا مقصد دراصل اس ث کو ڈھ ہ ہے ج ول میں کسی خاص واقع یکردار سے پیدا ہ ہے۔ اس لئے پس منظر اور قصہ میں ہم آہنگی نہا ی ضروری ہے یہ کوئی دشوار کام نہیں ول نگار کی قوت مشاہدہ تیز او . ی یفتہ ہو تو جس طرح اسے اپنے ماحول میں کہانی کے لئے اور کرداروں کی تلاش میں کہیں دور نہیں جا پ اس طرح پس منظر کے لیے اسے اپنے َ دو پیش کا جا ئ ہ کافی ہے۔ لیکن اس پس منظر کو منتخب کر کے جوں کا توں پیش کر دینا ہی اس کا کام نہیں یہ تو ا ی فوٹو َ افر بھی کر سکتا ہے اسے اس پس منظر میں جان پیدا ک ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے . ب اس نے فطرت کے وسیع ذخیرے کو آ کھول کر دیکھا ہو۔ اَ وہ اپنی سیر میں ہر چیز پ ا ی سرسری ڈالتا َ ہے تو وہ شا ی پس منظر کی روح ت کبھی نہ پہنچ سکے گا۔ اعلیٰ درجہ کا پس منظر غیر معمولی چیزوں کو تلاش کر کے لانے سے تیار نہیں ہ بلکہ روزمرہ ن گی کے معمولی مناظروں میں سے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو ابھارنے اور اجا کرنے سے یہ مقصد حاصل ہ

ہے۔''۲۳

اردو ناول کا ارتقا

اردو ناول کے ارتقا پر بات کرنے سے قبل ناول اور معاشرتی کشمکش کے باہمی تعلق کے حوالے سے ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رائے جان لیں کہ کیوں کر اردو کے ابتدائی ناول نگاروں ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار اور پریم چند کو اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ناول کی انتہائی ترقی کا زمانہ ہر ملک میں وہی ہے جس میں سماجی کشمکش کے اثرات نمایاں تھے۔ فرانس میں ناول نے سب سے زیادہ ترقی انقلاب سے قبل یا انقلاب کے فوراً بعد کی۔ بالزک فلابیئر ٹ، وکٹر ہیوگو، اناطول فرانس اور زولا وغیرہ کے کارنامے اس بیان پر تصدق کی مہر لگاتے ہیں۔ روس میں ٹالسٹائی، گوگل، چیخوف اور گورکی وغیرہ نے جو ناول لکھے۔ وہ سماجی کشمکش ہی کے زمانے میں لکھے۔ ہندوستان میں شرت چندر چڑ جی نذیر احمد، سرشار اور پریم چند وغیرہ کے ناول اس اعتبار سے بہت بلند ہیں۔''۲۴

ڈپٹی نذیر احمد کے قصوں کو اردو ادب کے اولین ناول کا نمونہ کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اردو کا پہلا ناول نگار کہا جاتا ہے۔ ان کا پہلا ناول ''مراۃ العروس'' ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ نذیر احمد کے ناول زیادہ تر خاص مقصد اور تعلیمی اخلاقی نقطۂ نظر سے لکھے گئے۔ ان کے کردار اسم بامسمّٰی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے زیادہ تر ناول اصلاحی ادب کے ذیل میں شمار کیے جاتے ہیں تاہم اردو کے وہ پہلے کہانی کار اور ناول نگار ہیں جن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ کہانی کو آسمان کی تخیلی فضا سے نکال کر زمین کے حقیقی ماحول میں لے آئے۔

تقریباً اسی عہد میں رتن ناتھ سرشار کا نام ان کے ناول ''فسانۂ آزاد'' کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ جس نے جہاں ایک طرف لکھنوی طرزِ معاشرت کو کہانی کے پردے میں زندہ رکھا تو دوسری جانب سرشار کا نام بھی۔ اور اسی طرح کے ناول میں پیش کردہ اخلاقی کا نمونہ ''خوجی'' کا کردار بھی لازوال ہوا۔

تاریخی ناول نگاری علمی تاریخی، فکری اور ادبی لحاظ سے انتہائی مشکل فن ہے۔ اردو ادب میں کسی حد تک پہلے تاریخی ناول نگار عبدالحلیم شرر قرار پائے۔ اگرچہ ان کے ہاں مقصدیت موجود ہے لیکن اگر ان کے ہاں تاریخ سے گہری واقفیت پائی جاتی تو اردو کو زیادہ بہتر تاریخی ناول میسر آتے تاہم ''فردوسِ بریں'' بہت سے حوالوں سے معیاری ناول

ہے۔ ''امراؤ جان ادا'' اردو ناول نگاری میں اہم سنگ میل ہے۔ مرزا ہادی رسوا نے اگرچہ اور ناول بھی لکھے لیکن جو اہمیت اور فنی محاسن ان کے اس ناول میں موجود ہیں۔ اس کے سبب ان کا نام اردو ناول نگاری کی تاریخ (قدیم و جدید) میں زندہ و جاوید ہو گیا ہے۔

راشد الخیری عورتوں کے سرسید کہلائے۔ ان کے ہاں عورتوں کے مصائب کا دردناک تذکرہ بڑی خوبی ہے۔ ''صبح زندگی'' اور ''شام زندگی'' اس کی عمدہ مثال ہیں۔ جب کہ منشی سجاد حسین نے اپنے مخصوص شگفتہ نثری اسلوب میں قصہ نگاری کی اور ''حاجی بغلول'' جیسا مزاحیہ کردار پیش کیا۔ لیکن اس دور میں جس ناول نگار کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی اس کا نام ہے پریم چند۔ انہوں نے بازار حسن، چوگان ہستی، گوشہ عافیت، پردہ مجاز، غبن، میدان عمل اور گئودان جیسے اہم ناول لکھے۔ پریم چند کا میدان اگرچہ بہت وسیع ہے، ہم ان کے ہاں شہری معاشرت کے ساتھ ساتھ دیہی زندگی کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ یوں ان کے ہاں گہری مقامیت کا رنگ نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے ناول میں اپنے عہد کو کچھ اس طرح سمویا ہے کہ روح عصر زندہ ہو گئی ہے۔

کرشن چندر نے اپنی کہانی میں حقیقت اور رومان کا حسین متزاج پیش کیا ہے۔ ''شکست'' اس کی خوبصورت مثال ہے۔ قرۃ العین حیدر بیسویں صدی کی سب سے اہم اور بڑی ناول نگار ہیں۔ انہوں نے اردو ناول کو معیار اور اعتبار بخشا ہے۔ ان کا ناول ''آگ کا دریا'' تاریخ ادب اردو میں ایک منفرد تجربے اور تکنیک کی روشن مثال ہے۔ جس میں ''شعور کی رو'' کی تکنیک انتہائی مہارت سے استعمال کیا گیا ہے۔ جہاں فن اور فلسفہ، زندگی کی قربت میں سانس لیتے ہیں۔ جب کی عصمت چغتائی تیکھی حقیقت نگاری میں چھپی رومانیت کو روزمرہ کی انتہائی معیاری زبان میں فنی خوبیوں کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ تو ردعمل خود بخود تحریک پاتا ہے۔ عزیز احمد کئی زبانوں پر عبور رکھنے والے ناول نگار ہیں۔ ان کے ہاں ناول میں تجربات کا عنصر نمایاں ہیں۔ اجتماعی زندگی کو ناول کی فنی خوبیوں کے ساتھ پیش کرنے کا حقیقی ملکہ انہیں حاصل تھا۔ شوکت صدیقی کا ناول ''خدا کی بستی'' اردو ناول میں ایک اہم اضافہ تھا۔ جہاں سماجی حقیقت نگاری کو انسانی کمزوریوں کے ہمراہ پیش کیا گیا۔ ان کے ہاں ہجرت کے بعد کے معاشرے کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ ہجرت کے حوالے سے ایک اور اہم ناول ''آنگن'' ہے، جسے خدیجہ مستور نے لکھا۔ اس کو اردو ناول کی ارتقائی تاریخ میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔ جس میں اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، خاندانی، اور دیگر مسائل کی ترجمانی کے علاوہ انسانی

نفسیات کے چھپے پہلوؤں کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔

اس دور میں تاریخی ناول نگاری کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ نسیم حجازی کے بیشتر ناولوں میں سے ''محمد بن قاسم'' اور ''خاک وخون'' کو قدرے زیادہ اہمیت ہے۔ اس نوع کے ناول نگاری کے مصنفین میں رئیس احمد جعفری اور ایم اسلم بھی شامل ہیں۔

سجاد ظہیر کے مختصر ناول ''لندن کی ایک رات''، مرزا ادیب کے ناول ''لمحوں کی راکھ'' اور عبداللہ حسین کے ناول ''اُداس نسلیں'' میں ترقی پسند رجحانات ملتے ہیں۔ جب کہ محمد خالد اختر کا ''چا کیواڑہ میں وصال'' الطاف فاطمہ کا ناول ''دستک نہ دو''، ممتاز مفتی کا ''علی پور کا ایلی'' اور ''الکھ نگری''، بانو قدسیہ کا ''راجہ گدھ''، انتظار حسین کا ''بستی'' اور مستنصر حسین تارڑ کا 'راکھ' اردو ناول کے ارتقائی سفر کی چند اہم منزلیں ہیں۔

افسانہ

اردو ادب میں ناول کی طرح افسانہ بھی اسی دور میں مغرب کے توسط سے آیا اور اہمیت اختیار کر گیا۔ افسانہ، مختصر افسانہ یا شارٹ سٹوری کیا ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے 'کشاف تنقیدی اصطلاحات' میں لکھا ہے کہ:

> ''اصطلاحی اعتبار سے مختصر افسانہ انگریزی کی اصطلاح شارت سٹوری کا اردو ترجمہ ہے۔ افسانہ کا لفظ بھی بالعموم مختصر افسانے ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ سہیل بخاری نے مختصر افسانے کے لیے افسانچے کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس (افسانے) سے مراد نثر میں ایک مختصر سادہ قصہ ہے جس میں زندگی کے کسی ایک پہلو کو بے نقاب کیا گیا ہو۔ مغرب میں ایڈگر ایلن پو کو مختصر افسانے کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ مختصر افسانے کی کوئی جامع و مانع تعریف ممکن نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مختصر افسانہ وہ کہانی ہے جسے ایک نشست میں پڑھا جا سکے یا جس کے مطالعے میں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے صرف ہوں۔ اس قسم کی سرسری باتیں مختصر افسانے کے حدود و شرائط کا تصور دلانے سے قاصر ہیں تاہم چند باتیں ایسی ہیں جو مختصر افسانے کو عام کہانی سے ممیّز کر کے اس کے خد وخال کو نمایاں کر سکتی ہیں۔
>
> (الف) موضوع
>
> (ب) وحدت تاثر ''[25]

اردو افسانے کے اجزائے ترکیبی:

تمام اصناف کی طرح افسانے کے بھی مخصوص اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں۔ کسی ایک افسانے میں عمومی طور پر درج ذیل اجزا کا ہونا مناسب سمجھا جاتا ہے تاہم جدید افسانے میں روایتی افسانے کی طرح ان تمام اجزا کو استعمال میں لانا لازم نہیں آتا ہے۔

۔پلاٹ

۔کردار

۔مکالمہ

۔منظر کشی

۔اسلوب بیان

۔وحدت تاثر، وحدت زماں، وحدت مکاں

۔موضوع

۔مقصدیت

افسانے میں پیش کی گئی کہانی کے تدریجی ارتقا کے لیے ایک مربوط پلاٹ کا ہونا ضروری ہے۔ حالات و واقعات کی مربوطیت ہی ایک اچھے پلاٹ کا خاصہ ہے۔ ناول کی طرح افسانے میں بھی حالات، واقعات اور کردار کے درمیان کشمکش کا ہونا ضرور موجود ہوتا ہے لیکن اختصار کی صورت میں۔ کیوں کہ افسانے میں ناول کی طرح پھیلاؤ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ افسانے میں وحدت تاثر، وحدت زماں اور وحدت مکاں کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس لیے افسانے میں کسی ایک موضوع، کسی ایک کردار یا کردار کی زندگی کے کسی ایک پہلو کو پیش کیا جاتا ہے۔ تاہم افسانے کے زندگی سے گہرے تعلق کے سبب افسانے کے واقعات اور کرداروں کا تعلق ہمارے ارد گرد کے روزمرہ زندگی سے ہوتا ہے۔ ان واقعات میں حقیقت نگاری یا رومانیت یا ان کے حسین امتزاج کا انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ جس کے لیے اسلوب بیان اور طرز اظہار کے مختلف پیرائے کو اختیار کیا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ اسلوب موضوع اور کردار کے مطابق ہوتا ہے۔ تاہم اسلوب کا گہرا تعلق مصنف کی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ لہٰذا مصنف فن پارے میں اسلوب، روح عصر اور مقصدیت کو سمو کر کہانی کے

خوبصورت رنگوں سمیت تمام فنی رینائی کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ افسانے کے ایک ایک تکنیکی کے تعلق سے ڈاکٹر فوزیہ اسلم کا کہنا ہے کہ:

''پلاٹ کی کئی قسمیں ہیں۔ سادہ، پیچیدہ مبہم اور ضمنی پلاٹ۔ اہم پلاٹ کے عناصر تکنیکی میں اظہار، تصادم، الجھاؤ، مستقبل کی اشارے، تحیر زائی، معکوس، سلجھاؤ، بصیرت شمار ہوتے ہیں۔ یہ سارے پلاٹ کے لوازم ہیں۔ کہیں شدت کے ساتھ اور کہیں دھیمے سروں میں پلاٹ کا حصہ بنتے ہیں۔ لیکن یہ بات درست کی ہے کہ ضروری نہیں کہ تمام عناصر ایک ساتھ کسی افسانے میں لازمی ایک سی شدت کے ساتھ وارد ہوں ...... کردار نگاری افسانے کا لازمی جزو ہے۔ کہانی کی بنت کاری میں پلاٹ، فضا اور کردار کو بنیادی عناصر کا درجہ حاصل ہے۔ کہانی کی تشکیل میں ان ہی تین اجزا میں سے کسی ایک کو مرکزی نقطہ بنا کر کہانی کار کہانی کی تکمیل کرتا ہے۔ کہانی کبھی پلاٹ کے ذریعے یعنی واقعیت کی بنیاد پر بنی جاتی ہے تو کبھی کردار کہانی کا انکشاف کرتا ہے اور کبھی کبھی فضا کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے اور اس کے ذریعے کہانی بیان ہوتی ہے۔''[۲۶]

افسانہ نگاری کے فن کے ذیل میں تکنیک اور اسلوب کی اہمیت بہت زیادہ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی □ ہے کہ افسانوی ادب کی تکنیک اور اسلوب کے باب میں تنوع اور تجربات کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ یہ تجربات افسانے کی ارتقائی تاریخ کا اہم حصہ ہیں۔ آغاز سے موجودہ دور تک افسانے کی تکنیک کے بے شمار رنگ ابھرے۔ یوں بدلی ہوئی فضا میں افسانے کا بنیادی ڈھانچہ بھی متاثر ہوا اور اس کے اثرات تکنیک اور اسلوب میں بھی ظاہر ہوئے۔ اگر جدید دور میں ان اثرات کے محرکات کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں جدید علوم اور خاص طور پر علم نفسیات اہم محرک کے طور پر □ آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یورپ میں ابھرنے والی مختلف سیاسی، سماجی اور ادبی تحریکیں بھی اس کا سبب □ آتی ہے۔ ڈاکٹر شفیق انجم ان محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فرائیڈ اور یونگ کے نظریات نے جو فکر پیدا کی اس نے دنیا بھر کے علم و ادب کو متاثر کیا۔ مغرب میں بطور خاص اس کا اثر ہوا اور جلد ہی ایسی تحریکیں اور رجحانات کو پذیرائی ملنے لگی جن کی بنیاد فرد کے داخل اور لاشعوری رویوں پر تھی۔ فرائیڈ نے نفسیات نے سماجی زندگی کے بہت

سی عروج ☐ یوں بھی کاری ضرب لگائی۔ فری ، اخلاقیات، جمالیات، تہذی وثقافت غرض ز گی کا ہر پہلو اس زد میں آ ...... فرائیڈین نفسیات کے ادب میں دو طرح کے رجحا ت سامنے آئے ۔ اول فکری نوعیت کے رجحا ت اور دوم تکنیکی نوعیت کے رجحا ت ۔ فکری حوالے سے جنس اور وجود کے ابہام رجحا ت نے فروغ اور تکنیکی حوالے سے آزاد تلازمہ خیال، شعور کی رو، داخلی خود کلامی، علامت نگاری اور تجر یں ہوئے۔''[۲۷]

افسانے کے دی اور روایتی ڈھانچے دور میں جو ات ے ان کی نوعیت کس طرح کی تھی اور کس قدر تھی اس کی وضا کرتے ہوئے فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ:

''افسانے نے کہانی کے مروجہ فارمولے کو توڑ کر اسے ای نئی شکل ☐ کی۔ اس عمل کو اینٹی سٹوری کا م بھی ۔ افسانہ نگاروں نے روایتی اور انضباط سے بھی ☐اف کیا اور کہانی کی اٹھان کے اس م ی نقطے سے بھی جو ٹھوس مظاہر کا مر تھا۔ اب وقوعہ کی بجائے اس کے کو اہم سمجھا اور واقعاتی تسلسل کی بجائے خیال و احساس کے تسلسل کو اہمیت دی گئی۔ ظاہر ہے خیال و احساس کی حیثیت طنی ہے او طن کی و تنظیم اور آہنگ خارج سے ای لکل مختلف چیز ہے۔ کہانی کے حوالے سے اس تجدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر و بیشتر افانے میں واقعاتی عناصر مادوم ہو کر رہ گئے اور پلاٹ کا داخلی آہنگ خارج سے ہم آ نہ ہو سکا۔ لیکن جہاں تمام احتیاط و توازن کو قرار رکھا وہاں عمدہ صورتحال سامنے آئی اور کہانی پن کے نئے ذائقے کا احساس ابھرا۔''[۲۸]

ڈراما:

ڈراما، سٹیج اور کہانی کے ضمن میں ''کشاف تنقیدی اصطلاحات'' کے مر ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کا تبصرہ کچھ اس طرح ہے:

''کلیٹن ہملٹن (CLATON HAMILTON) نے ڈراما کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے...... ڈراما ای کہانی ہے جو اداکاروں کے ذریعے ناظرین کے سامنے سٹیج پیش کی جاتی

> ہے……سٹیج پر پیش کیا جا سکے۔ ایک ایسی خصوصیت ہے جو ڈراما کو دوسری اصناف سے ممیّز کرتی ہے اور اسی ایک تقاضے کی وجہ سے ڈرامے کا فن ادبیات کی دوسری اصناف سے یکسر مختلف ہے۔ ڈراما نویس کو کرداروں کی تخلیق کرتے ہوئے واقعات اور ان کی جزئیات کی وضع اور ترتیب کے وقت، مکالمات لکھتے ہوئے، الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے، غرض کہ ڈراما لکھنے کے دوران ہر ہر قدم پر اس امر کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ وہ قارئین کے لیے نہیں بلکہ ناظرین کے لئے لکھ رہا ہے۔ کہانی پڑھی نہیں جائی گی بلکہ اسے ایک خاص قسم کے سٹیج پر تماشائیوں کے لئے کھیلا جائے گا اور ڈراما اسی وقت کامیاب سمجھا جائے گا۔ جب وہ سٹیج پر عمدگی سے کھیلا جا سکے۔''۲۹

کہانی اور تمثیلی انسان کے قدیم شوق رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادبیات میں ڈراما کی اہمیت اور قدامت مسلمہ ہے۔ ہر عہد اور ہر خطے میں ایک اس کے نام میں کچھ فرق رہا ہے لیکن ہم اس کی کوئی نہ کوئی صورت موجود رہی۔ یونان سے شیکسپیئر تک اور پھر ہمارے ہاں موجودہ دور تک ڈراما تاریخ کے ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے۔ ڈرامے کے لوازمات میں اسٹیج، ایکٹر، مکالمہ، ماحول، تہذیب و معاشرت، زبان و بیان اور کسی حد تک موسیقی کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ مرکزی قصہ، پلاٹ، کشمکش، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری ڈرامے کی بنیاد ہوتے ہیں۔ جب کہ ڈرامے کا ہر ایک حصہ اہم کہلاتا ہے اور اب بھی قدر تبدیلی کے ساتھ یہ طریقہ مروج ہے۔ اگر ڈرامے کے ابتدائی تکنیک پر نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں نظر آئے گا کہ ڈراما اور دوسری افسانوی اصناف کے پلاٹ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ دوسری افسانوی اصناف صرف پڑھنے کے لیے۔ جب کہ ڈرامے کا تعلق پڑھنے، پیش کر کے دکھانے اور دیکھنے سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ڈرامے کے پلاٹ میں صرف اہم واقعات کو بیان کیا جاتا ہے جس کے لیے اختصار سے مدد لی جاتی ہے اور باقی عمل اداکاروں کے ذریعے پورا کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً ڈرامے میں رقص کے منظر کی تفصیل سے زیادہ رقاصہ کی رقص کی پیش کش سے مصنف تفصیل کی زحمت سے بچ جاتا ہے۔ پلاٹ کو بہتر انداز میں سمجھنے اور جاننے کے لیے مختلف حصوں میں تقسیم کر لیا جاتا ہے مثلاً ابتدا، محرکاتی قوت، تصادم، ارتقائی عمل، کشمکش، اختتامی عمل اور انجام۔ تاہم لازم نہیں کہ پلاٹ کی یہ تقسیم اسی ترتیب سے ہر ڈرامے میں موجود رہے۔ بہت سے ڈراما نویس اپنی فنی صلاحیت، افتادِ طبع اور موضوع کی مناسبت سے مناسب تبدیلی کرتے ہیں اور ان پابندیوں سے خود کو آزاد کرتے ہیں لیکن ہم پلاٹ میں بیان کردہ ترتیب کا فائدہ یہ ہے کہ ڈرامے میں دوسری خصوصیات مثلاً متوازیت اور تضاد وغیرہ کو پیش کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

کردار نگاری کی ڈرامے میں اہمیت کے پیش نظر ہی کہا گیا ہے کہ ''ڈراما کی کہانی، واقعات اور ماحول میں اگر کردار نگاری کی آمیزش نہیں ہے تو وہ طفلانہ تخلیق ہے''۔ اس حوالے سے مختلف زبانوں کے نامور ڈراما نگاروں کی تخلیقات میں پیش کردہ کرداروں کو بطور مثال کے پیش کیا جاسکتا ہے۔

مکالمہ، ڈرامے میں پیش کردہ کرداروں، حالات وواقعات اور ان کی سوچ کو جاننے کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے ڈرامہ اپنے فطری ارتقا اور اختتام کی جانب بڑھتا ہے۔ جہاں ڈرامے میں مختلف کرداروں کے افعال و حرکات ڈرامے کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں، وہیں ان کرداروں کے مکالمے ان کرداروں کے افعال، سوچ، نفسیات اور ڈرامے کے واقعات کو سمجھنے میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ مکالمے کی خوبصورتی، کراد کے مقام اور مرتبے اور کہانی کے موقع محل کی مناسبت سے ہوتی ہے تاہم اختصار کی اہمیت سے انکار نہیں۔ مکالمے کی ایک نوعیت خودکلامی بھی ہے۔ ڈراما نگاری میں کسی کردار کی داخلی سوچ اور باطنی کیفیت کو تنہائی میں بیان کرنے کے اس انداز اور گفتگو کو خودکلامی کہا جاتا ہے۔ اس انداز اور تکنیک کو ہر دور اور ہر زبان کے ڈرامانویسوں نے ضرورت کے مطابق استعمال کیا ہے۔

ڈرامے کے آغاز تا اختتام اہم حصوں میں تمہید، واقعہ، الجھاؤ، نقطہ عروج، سلجھاؤ اور اختتام کو سمجھا جاتا ہے۔ ڈرامے کی بعض روایات کہ جنہیں ڈرامائی وحدتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان میں وحدت عمل، وحدت زماں و مکاں اور وحدت تاثر شامل ہیں۔ بطور صنف ادب ڈرامے کے تقاضوں کی وضاحت کرتے ہوئے فاضل مرتب کی رائے یہ ہے کہ:

> ''ایک صنف ادب کی حیثیت میں بھی ڈرامے کے اپنے بعض تقاضے ہیں۔ ہر کہانی ڈرامانہیں بن سکتی۔ ڈراما کی بنیاد کشمکش اور تصادم پر ہے۔ یہ تصادم کبھی خیر و شر کی پیکار کی صورت میں، کبھی تقدیر اور تدبیر کے تصادم کی صورت میں، کبھی فرد اور جماعت کے تصادم کی صورت میں، کبھی فرض اور جذبے کے تصادم کی صورت میں، کبھی فرد اور معاشرہ کے تصادم کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ تصادم کی بے شمار صورتیں ہیں لیکن ان سب کو دو زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (الف) خارجی تصادم، (ب) داخلی تصادم۔''[۳۲]

ڈراما کی اقسام کا اگر جائزہ لیا جائے تو اہم ترین اقسام کی صورت یوں سامنے آتی ہے۔ ان میں المیہ (ٹریجڈی)، طربیہ (کامیڈی)، المناک طربیہ (ٹریجڈی کامیڈی) رومانی، سوانحی، معجزاتی و اخلاقی، ڈریم اور میلوڈراما شامل

ہیں۔ڈرامے کی اقسام سے قطع نظر،ڈرامے کا گہرا تعلق زندگی سے ہے بلکہ بعض حوالوں سے ڈرامے کو زندگی کی تنقید بھی کہا گیا ہے۔ڈراما اور زندگی کے اس گہرے تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے ایک فاضل ادیب لکھتے ہیں:

''ڈراما نگار بھی زندگی کے متعلق ایک فلسفہ پیش کرتا ہے۔اکثر ڈراما نویس صرف زندگی کا مشاہدہ کرنے والے ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ زندگی کے متعلق سوچنے والے بھی ہوتے ہیں۔ ان کا زندگی کے متعلق ایک مخصوص زاویہ نگاہ ہوتا ہے اور اسی زاویہ نگاہ سے اپنے کرداروں کو پیش کرتے ہیں۔ ہر ڈراما ایک خاص زمانے اور ایک خاص ماحول کی پیداوار ہوتا ہے ایک ڈراما نویس کبھی اس ماحول اور زندگی کی عکاسی نہیں کرتا جس کا اس نے مطالعہ نہیں کیا ہو۔وہ زندگی کی حقائق سے بحث کرتا ہے۔ وہ صرف ان سچائیوں کو پیش کرتا ہے جن کا انکار نہیں......ڈراما نویس کو اپنی کہانی اپنے ارد گرد کے چلتے پھرتے انسانوں میں ڈھونڈنی پڑتی ہے۔وہ اپنے ارد گرد کے افراد کا گہرا مطالعہ کرتا ہے اور پھر انہی کی زندگی کے مطالعے میں کوئی نہ کوئی ایسا گوشہ مل جاتا ہے۔جس سے کوئی معمولی اور غیر اہم کہانی پیدا ہو جاتی ہے۔یہ کہانی بظاہر معمولی نظر آتی ہے۔ڈراما نویس کا ذہن معمولی واقعات سے بہت سے اہم اجزاء تلاش کرتا ہے۔ان واقعات میں اور واقعات سے زیادہ سچائی ہوتی ہے کیونکہ تاریخ میں عام طور پر تعصب کارنگ غالب ہوتا ہے۔''[31]

ب: غیر افسانوی ادب کی تعریف و تفہیم

ساری د□ میں لفظی اظہار و بیان کے ہمیشہ دو طر□ رہے ہیں۔(□)اور(□)۔اس طرح ادب دو حصوں میں منقسم ہو□ ہے۔ یہاں یہ□ت واضح کر□ ضروری ہے کہ ''□'' اور ''□'' اگر چہ ادب کی دو شاخیں ضرور ہیں لیکن ہر منظوم تحر□ ادب میں شامل نہیں ہو سکتی۔ کیو□ قدیم زمانے میں علمی ادبی، فنی طبی، نجوم کی کتابیں بھی□ میں لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح ہر□ی تحر□ بھی ادب میں شامل نہیں ہو سکتی۔ موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے□ و□ کی مختلف اصناف ہیں۔□ی اصناف کو دو حصوں میں تقسیم کیا□ ہے۔''افسانوی □'' اور ''غیر افسانوی □'' اسی کو ''افسانوی ادب'' اور ''غیر افسانوی ادب'' سے تعبیر کیا جا□ ہے۔ افسانوی ادب کی تعریف و تفہیم مندرجہ□ب میں ہو چکی ہے۔ اس□ب میں غیر افسانوی ادب کی تعریف و فہیم بیان کی جا رہی ہے۔

غیر افسانوی ادب میں جن اصناف کو شامل کر□ ہیں وہ یہ ہیں: ا□ئیہ، سفر□مہ، خودنو□، سوانح نگاری، آپ □، خاکہ نگاری اور رپو□ژ نگاری۔

ا□ئیہ:

ا□ئیہ ا□ ایسا ہلکا پھلکا مضمون ہے جس میں بے ساختگی اور بے تکلفی کے ساتھ نہا□ دلچسپ اور شگفتہ اسلوب میں کسی موضوع□ اظہار خیال کیا جائے ا□ئیہ کہلا□ ہے۔ ایسے مضمون کو انگر□ی میں Light Essay کہا جا□ ہے۔ Essay فرانسیسی لفظ Essai سے مشتق ہے۔ بعض ماہرین لسا□ت اور علمائے ادب کا خیال ہے کہ Essai عربی□ن کے لفظ ''السعی'' سے ماخو□ اس کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ فرانسیسی□ن میں اس کے معنی ''کچھ کہنے کی کوشش'' کے ہیں۔ یہ معنی ''السعی'' کے معنی سے بہت قر□ ہیں۔ عربی میں ''سعی'' کے معنی بھی کوشش کے ہی ہیں ۔انگر□ی ادب کے معروف اد□ بیکن نے Light Essay کو ایسی ہلکی پھلکی اور مختصر تحر□ کہا ہے جس میں بغیر کسی کھوج اور تجسس کے حقیقت کا اظہار ہو۔ اردو میں اس قسم کے مضامین کے لیے ''ا□ئیہ'' کا لفظ وضع کر لیا□ ۔

ا□ئیہ مضمون ہی کی ا□ قسم ہے۔ ا□ئیہ نگار سنجیدہ و عالمانہ□ از اختیار کرنے کے بجائے شگفتہ اور ہلکے پھلکے □ از میں اپنے شخصی□ ات و احساسات کو پیش کر□ ہے۔ ا□ئیہ میں اشار□ ، ایمائیت، اختصار اور تہہ داری ہوتی ہے۔ مسرت و شادمانی پہنچا□ ا□ئیہ کا اہم کام ہے اور عدم تکمیل ا□ئیہ کا اہم خاصہ ہے۔ ا□ئیہ کا کوئی خاص موضوع

نہیں ہوتی بلکہ انشائیہ نگار ہلکے پھلکے انداز میں بڑی گہری اور فکری انگیز باتیں کہہ جاتا ہے۔ بقول احتشام حسین:

''انشائیہ ایک فلسفانہ شگفتگی کا حامل ہوتا چاہیے جو پڑھنے والوں کے ذہن میں استدلال کے ذریعہ نہیں بلکہ محض خوشگوار استعجاب اور بے تکلف انداز کے ذریعہ بات قائم کرے۔''

انشائیہ میں چند اوصاف ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر یہ صنف اپنی شناخت اور فن کی تکمیل کرتے ہیں ۔ یہ اوصاف کچھ یوں ہیں : غیر رسمی طریق کار، اسلوب کی تازہ کاری ، شے یا مظہر کے مخفی مفہوم تک قاری کی رسائی میں معاونت ،کسی شے یا مظہر میں ایک (نئے) زاویہ دیکھنے کا سلیقہ پیدا کرے۔

اردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز انگریزی کے زیر اثر ہوا۔ ابتدا میں مضمون اور انشائیہ میں فرق نہیں سمجھا گیا اور دونوں کو ''ایسے'' کے نام سے موسوم کیا گیا ۔ بعد میں دونوں کے حدود، فنی محاسن اور انداز نگارش کی روشنی میں انہیں دو الگ الگ اصناف قرار دیا گیا ۔ آج مضمون اور انشائیہ دو بیگانہ سی اصناف کی حیثیت سے اردو کے غیر افسانوی ادب میں معروف اور مقبول ہیں ۔ سنجیدگی ، متانت ، تسلسل اور جامعیت مضمون کی جان اور حُسن ہے ۔ جبکہ انشائیہ میں بے ساختگی اور بے تکلف گفتگو کا انداز پایا جاتا ہے اور یہ بے ساختگی ہی اس کا حُسن ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کو نہایت دلچسپ ، ہلکے پھلکے اور بے حد شگفتہ اسلوب میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ قاری اس سے ذہنی تلذذ اور لطف و انبساط حاصل کرتا ہے ۔ ماہرین ادب کے نزدیک انشائیہ کا بنیادی مقصد مسرت بہم پہنچانا ہے ۔ علمائے ادب نے یہ بھی کہا ہے کہ انشائیہ گہری علمیت ،قوانین وضوابط اور سنجیدگی کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ ایک طرف قاری کو دعوت غور وفکر دیتا ہے تو دوسری طرف انبساط وفرحت اور کیف وسرور بھی عطا کرتا ہے ۔ کہا گیا ہے کہ انشائیہ کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کی کوئی شرط نہیں ۔ جو کہو اس طرح کہو کہ پڑھ کر جی خوش ہو جائے اور پڑھنے والے کے ذہن میں گدگدی سی ہونے لگے ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انشائیہ میں حکمت وحماقت ،مقصدیت اور بے مقصدیت اس طرح آپس میں گتھ جاتے ہیں کہ ان کا الگ کرنا ناممکن ہے ۔ انشائیہ کیا ہے؟ ۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''انشائیہ کے خالق کے پیش نظر کوئی ایسا مقصد نہیں ہوتا جس کی تکمیل کے لیے وہ دلائل و براہین سے کام لے اور ناظرین کے ذہن ودل قبول کو میلانات کو تحریک دینے کی سعی کرے، اس کا کام محض یہ ہے کہ چند لمحوں کے لیے زندگی کی سنجیدگی اور گھما گھمی سے قطع نظر کر کے ایک

غیر رسمی طریق کا اختیار کرے اور اپنے شخصی ردعمل کے اظہار سے ناظرین کو اپنے حلقہ احباب میں شامل کر لے۔۔۔۔انشائیہ کا خالق اس شخص کی طرح ہے جو دفتر سے چھٹی کے بعد اپنے گھر پہنچتا ہے، چست و تنگ سا لباس اتار کر ڈھیلے ڈھالے پہن لیتا ہے اور ایک آرام دہ مونڈھے پر دراز ہو کر حقے کی نے ہاتھ میں لیے انتہائی بشاشت و مسرت سے اپنے احباب سے محو گفتگو ہو جاتا ہے۔انشائیہ کی صنف اسی شگفتہ موڈ کی پیداوار ہے۔بنیادی طور پر انشائیے کے خالق کا کام ناظر کو مسرت بہم پہنچانا ہے۔"[۳۲]

مولانا محمد حسین آزاد، مولانا عبدالحلیم شرر، خواجہ حسن نظامی، مرزا فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین وغیرہ نے اردو میں انشائیہ کے فن کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

سفرنامہ:

سفرنامہ، غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے۔نقل مکانی اور مختلف دیار و امصار کا سفر کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔یہ نقل مکانی اور سفر کبھی تجارت کے غرض سے ہوتا ہے تو کبھی حصول علم کے لیے ہوتا ہے۔کبھی تفریح کے لیے تو کبھی سیاسی غرض سے ہوتا ہے۔ایک کہاوت ہے "سفر وسیلہ ظفر" یعنی سفر کامیابی کا وسیلہ ہے۔اللہ تعالیٰ نے بھی "سیروا فی الارض" کہہ کر سیر و سیاحت کے ذریعے اللہ کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا ہے۔

کبھی کبھی زندگی کی یکسانیت سے اکتا کر محض سیر و تفریح کی خاطر انسان سفر پر نکل جاتا ہے۔بعض لوگ مہم جو واقع ہوتے ہیں۔ایسے لوگ نئے مقامات کی کھوج، نئی دنیاؤں کی تلاش، نئی نئی چیزوں کی دریافت کی غرض سے دریاؤں، سمندروں، پہاڑوں اور جنگلات کے خطرناک سفر پر نکل پڑتے ہیں۔نئے مقامات کی سیر و تفریح اور نئے نئے خوشنما مناظر کو دیکھنے سے انسان کے جمالیاتی ذوق کو تسکین ہوتی ہے۔

سفر تقریباً ہر انسان کرتا ہے لیکن جو قلم کار ہوتے ہیں۔ان میں سے بعض حضرات اپنے سفر کی روداد پُر لطف اور دلچسپ انداز میں قلمبند کرتے ہیں۔کسی سفر کی روداد نہایت دلچسپ اور دلکش اسلوب میں تحریر کی جاتی ہے تو وہ سفرنامہ

کہلاتا ہے۔انور سدید لکھتے ہیں:

> ''فنی طور پر سفر نامہ وہ بیانیہ ہے جو ایک سیاح دوران سفر یا اختتام سفر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر اوقات قلبی روداد کو مرتب کرتا ہے۔اس صنف ادب کا تمام تر مواد منظر کے دو پیش کی صورت میں خارج میں بکھرا ہوتا ہے۔لیکن سفر نامہ نگار صرف خارج کا ہی مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ اپنے بیانیہ کو ہمہ جہت با معنی اور مدلل اور دستاویزی بنانے کے لیے بہت سی دوسری جزئیات کو بھی سمیٹتا چلا جاتا ہے۔چنانچہ سفر نامہ نگار کی جتنی نظر دور بین ہوگی جزئیات اتنی ہی تفصیل سے اس کے مشاہدے میں آئیں گی۔''٣٣

سفر نامہ ایسی غیر افسانوی صنف ادب ہے جس کے مطالعے سے ہمیں مختلف مقامات ،ملکوں ،شہروں، قوموں اور قبیلوں کی تہذیب و ثقافت، سیاسی وسماجی صورت حال، مذاہب وعقائد ،ادبی وعلمی زندگی، معاشی و تعلیمی ترقی یا پس ماندگی کا علم ہوتا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ ان مقامات کے جغرافیائی حالات موسم اور آب و ہوا کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہے۔ان گوناگوں فوائد کے پیش نظر سفر ناموں کی اہمیت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔یہی وجہ ہے کہ سفر نامہ مختلف زبانوں کے ادب میں خاص مقام کا حامل ہے۔

دوسری قوموں کی تہذیب و تاریخ ،ثقافت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا رجحان انسان کی سرشت میں شامل ہے ۔اس رجحان کے بارے میں انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے تجسس کو سفر نامے کے آغاز کا محرک کہا جاسکتا ہے ۔ مکانی یعنی ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے کے عمل کو سفر کہا جاتا ہے۔اس عمل کے دوران وہ جن تجربات اور مشاہدات سے دوچار ہوتا ہے ۔ جو مناظر اس کے سامنے آتے ہیں اس کی روداد دوسروں سے بیان کرنے کو سفر نامے کا آغاز سمجھنا چاہیے۔سفر نامے کے لیے کوئی خاص تکنیک استعمال نہیں ہوتی بلکہ سفر نامہ نگار واحد متکلم میں اپنی روداد سفر بیان کرتا ہے۔سفر نامے میں غیر ضروری رنگین بیانی ،مبالغہ آرائی اور پر اسرار یت کو فنی نقطہ نظر سے بہتر نہیں سمجھا جاتا ۔سفر نامے میں سادگی اور تازگی کو مستحسن قرار دیا گیا ہے۔زبان و بیان ایسا ہو جو خیالات و واقعات سے مناسبت رکھتا ہو۔ادب میں ایسے سفر نامے کو کامیاب سمجھا جاتا ہے جس میں ادبی حسن پایا جاتا ہو۔

دنیا میں سفر نامہ نگاری کی شروعات کس نے کی؟ یہ بتانا مشکل ہے ۔ ماہرین کا ماننا ہے کہ یونانی سیاح ہیروڈوٹس دنیا کا پہلا سفر نامہ نگار ہے۔اردو کا پہلا سفر نامہ ''عجائبات فرنگ المعروف بہ تاریخ یوسفی'' ہے۔جس کے مصنف

یوسف خان کمبل پوش ہیں۔

سوانح نگاری:

'سوانح' سانحہ کی جمع ہے۔ سانحہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں۔ پیش ہونے والا یا ظاہر ہونے والا واقعہ، لہٰذا، کسی فرد کی زندگی کے تمام حالات، کوائف، واقعات اور نشیب و فراز کو زمانی ترتیب کے ساتھ قلمبند کرنے کو سوانح نگاری کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے Biography کہا جاتا ہے۔ Bio کے معنی ہیں حیات اور Graphy کے معنی ہیں لکھنا۔ اس طرح اس کے معنی ہوئے حیات نگاری یا [illegible]۔ دی النظر میں سوانح نگاری کا سیدھا تعلق اس مخصوص فرد سے ہوتا ہے جس کی سوانح لکھی جا رہی ہوتی ہے۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو کسی فرد کی سوانح اس دور کی تاریخ بھی ہوتی ہے۔ جس دور میں وہ فرد مصروف کار رہتا ہے۔ اس طرح سوانح نگاری کے ڈانڈے تاریخ نگاری سے بھی ملتے ہیں۔ بقول پروفیسر گیان چند جین 'سوانح عمری میں کسی شخص کے حالات زندگی اور شخصیت کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔ یہ ایک مختصر سا مضمون بھی ہو سکتا ہے اور پوری کتاب بھی۔'

کسی بھی نامور شخصیت کی زندگی کے حالات تفصیل کے ساتھ ایک کتاب میں پیش کرنے کا فن سوانح کہلاتا ہے۔ سوانح میں کسی مشہور شخص کی زندگی کے محاسن و معائب دونوں بیان کیے جاتے ہیں۔ سوانح میں مستند اور جامع مواد کی پیش کش ضروری ہوتی ہے بلکہ اس کے ساتھ اس حقیقت پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے کہ جس شخص پر سوانح لکھی جا رہی ہے اس کی زندگی کے تمام کارناموں کو سلسلہ وار بیان کر دیا جائے۔ اگر صرف محاسن و کمالات بیان کیے جائیں تو ایسی سوانح ادبی معیارات کی تکمیل نہ کر سکے گی۔

سوانح میں کسی مشہور و معروف شخصیت کی زندگی کے تمام حالات و واقعات، کارنامے اور خدمات کو نہایت ترتیب کے ساتھ تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے۔ ایسی سوانح اچھی سمجھی جاتی ہے جس میں صاحب سوانح کی شخصیت کے تمام پہلو بہ حسن خوبی اجاگر کیے گئے ہوں اور جس میں اس شخص کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہو۔ اچھی سوانح کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ صاحب سوانح کے کارناموں کو نہ صرف تفصیل سے پیش کیا جائے بلکہ مناسب اور احسن طریقے سے ان پر تنقید و تبصرہ کیا جائے۔ غیر مستند یا فرضی واقعات کی شمولیت اور مبالغہ آرائی کو سوانح

نگاری کا سب سے بڑا عیب سمجھا جاتا ہے۔

سوانح نگاری کی اہمیت وافادیت مسلم ہے۔مشہور ومعتبر سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی اور علمی شخصیات کی سوانح قلمبند کرنے سے قوم ان کے عظیم الشان کارناموں سے واقف ہوتی ہے۔یہی نہیں بلکہ ان کی خدماتِ جلیلہ اور عظیم الشان کارنامے قوم کے نوجوانوں میں غیر معمولی جوش وجذبہ پیدا کرتے ہیں اور انہیں اس طرح کی خدمات انجام دینے کی ترغیب دیتے ہیں۔نئی نسل کو علمی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے منجملہ اور چیزوں کے اپنے اکابرین کی سوانح نگاری کا مطالعہ بے حد سودمند ثابت ہوتا ہے۔

اردو میں سوانح نگاری کی بنیاد حالی نے رکھی۔"یادگار غالب"، "حیات جاوید"، "حیات سعدی" ان کی مشہور سوانحی تصانیف ہیں۔حالی کے بعد شبلی نے اس روایت کو آگے بڑھایا اور "سیرت النبوی"، "المامون"، "الغزالی"، "الفاروق"، "سوانح مولانا روم"، شبلی کی اہم سوانحی کتابیں ہیں۔دیگر ادیبوں نے اس روایت کو مزید آگے بڑھایا۔

خودنوشت:

خودنوشت سوانح کسی فرد کی وہ داستانِ حیات ہے جسے خود اس نے پورے ہوش وحواس کے ساتھ اور حقائق کی روشنی میں تحریر کیا ہو۔آسان لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے حالات زندگی خود قلمبند کرے تو اسے خود نوشت سوانح کہا جاتا ہے۔انگریزی میں اسے Autobiography کہتے ہیں۔خودنوشت سوانح عمری کا مرکز ومحور خود مصنف کی ذات ہوتی ہے۔دیگر افراد کا ذکر ضمنی طور پر درمیان میں آتا ہے۔خودنوشت سوانح کے لیے بھی ضروری ہے کہ جو بھی واقعات قلمبند کیے جا رہے ہوں وہ حقائق پر مبنی ہوں۔جھوٹ اور غلط بیانی قاری کو گمراہ کر دیتی ہے۔ خودنوشت میں مصنف اپنی زندگی کے واقعات، حادثات، تجربات اور مشاہدات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کی تمام جذباتی اور نفسیاتی کیفیت قاری پر اجاگر ہوتی ہے۔خودنوشت سوانح میں صاحب تصنیف کی افکار ونظریات، عقائد، کسی مخصوص چیز کے متعلق اس کے رائے، اس کی ترجیحات اور خواہشات پسند ناپسند غرض تمام جزئیات آشکار ہو جاتی ہیں۔

خودنوشت سوانح نگاری کا ارتقا صدیوں پر محیط ہے۔خودنوشت نگار اپنی ذات کے آئینے میں اپنا عکس دیکھنا چاہتا ہے۔اس میں ساری زندگی کو دوہرایا نہیں جا سکتا بلکہ وہ خاص خاص ادوار اور واقعات ہی شامل کیے جاتے ہیں جن

کی مصنف کے نزدیک اہمیت ہوں اور جن سے مصنف کی شخصیت کی اصلی خد وخال نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔
بقول رائے پسکال:

> ''خودنوشت سوانح میں زندگی کے کسی حصے کو ان حقیقی حالات کے تحت دوہرایا جاتا ہے جن میں ان واقعات نے جنم لیا۔۔۔۔۔خودنوشت نگار کی ذات ہی اس کا محور ہے حالانکہ خارجی دنیا بھی اس کی زد میں آتی ہے اس میں روزمرہ کے کاروبار اور اس کے ماحول کی وہ جھلک آتی ہے جس میں مصنف کی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے۔'' (رائے پسکال آٹوبایوگرافی)

اب تک کی تحقیق کے مطابق محمد جعفر تھانیسری کی ''تواریخ عجیب المعروف کالا پانی'' اردو کی پہلی خودنوشت سوانح سمجھی جاتی ہے۔ سر رضا کی ''اعمال نامہ'' یوسف حسین خان کی ''یادوں کی دنیا'' جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات'' قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' مشتاق احمد یوسفی کی ''زرگزشت'' وغیرہ اردو کی چند اہم اور مشہور خودنوشت سوانح عمریاں ہیں۔

آپ بیتی:

خود پر بیتے ہوئے حالات کی تحریری بیان کو ادب کی اصطلاح میں ''آپ بیتی'' کہا جاتا ہے۔ یہ غیر افسانوی ادب کی نسبتاً کم معروف صنف ہے۔ ''خودنوشت'' اور ''آپ بیتی'' کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ دونوں میں بہت مماثلت ہونے کے باوجود یہ دونوں الگ الگ اصناف ہے۔ آپ بیتی اور خودنوشت میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ آپ بیتی میں کسی خاص واقعے یا مخصوص حالات کو پیش کیا جاتا ہے۔ عام طور پر آپ بیتی میں صدمات وسانحات، آلام و مصائب، زندگی کی مشکلات اور پریشانیوں کا تذکرہ نہایت پُر درد، غم انگیز اور موثر اسلوب میں ہوتا ہے۔ جذبات کی شدت اور جذبات کی فراوانی سے کام لے کر مصنف قارئین کو اپنا ہمہ درد اور غم گسار بناتا ہے۔ بعض آپ بیتیاں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ مطالعے کے دوران قارئین اپنے آنسوؤں کو روک نہیں پاتے اور بے ساختہ رو دیتے ہیں۔ گویا زندگی کے پُر درد حالات اور غم انگیز واقعات آپ بیتی کی لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

خاکہ:

''خاکہ'' کے معنی ہے کسی عمارت کا کچا نقشہ، کسی چیز کے خد وخال کی وہ جو اصل کے مشابہ ہو، کسی صورتحال یا کسی حقیقت کی مختصر کیفیت کا نقشہ۔ خاکہ کی اصطلاح مصوری میں بھی مروج ہے۔ جب کوئی مصور کسی فرد کی مکمل تصویر بناتا ہے تو اسے پورٹریٹ کہا جاتا ہے اور اگر وہ آڑھی ترچھی لکیروں کی مدد سے کسی شخص کے خد وخال نمایاں کرتا ہے تو اسے ''سکیچ'' کہتے ہیں۔ ادب کی اصطلاح میں خاکہ اس نثری صنف کو کہا جاتا ہے جس میں کسی فرد کے نقشہ، خد وخال، عادات واطوار اور سیرت وکردار کی لفظوں کے ذریعے تصویر کشی کی جاتی ہے۔ خاکہ کے لیے اردو میں قلمی تصویر، مرقع، شخصی مرقع اور چہرہ بشرہ جیسی اصطلاحات بھی استعمال کی جاتی ہے۔ آج کل ''خاکہ'' کا لفظ پوری طرح سے رائج ہو گیا ہے۔

خاکہ ایک طرح سے سوانحی مضمون ہوتا ہے لیکن اس میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہاں کسی شخص کی زندگی، عادات واطوار، سیرت وکردار کی صرف جھلکیاں دکھائی جاتی ہے۔ کیونکہ ان دونوں اصناف میں بھی تفصیل اور وضاحت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ خاکے میں کسی شخص کے چند اہم پہلو اور نمایاں خصائص اس طرح پیش کیے جاتے ہیں کہ اس کی جیتی جاگتی تصویر ہماری نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اگرچہ خاکہ سوانحی مضمون ضرور ہے لیکن یہ سوانح سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ سوانح واقعات کی تفصیل ہوتی ہے جبکہ خاکے میں تاثرات غالب رہتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق سوانح میں تو خاکہ کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن خاکہ میں سوانح کی شمولیت غیر واجبی اور نامناسب ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ خاکے میں مزاح، ظرافت، لطف زبان اور شگفتہ اسلوب غالب رہتا ہے۔ خاکے کے بارے میں ڈاکٹر صابرہ سعید کا کہنا ہے:

> ''خاکے کی کوئی ایسی جامع تعریف ممکن نہیں ہے، جو اس کے تمام فنی اور ادبی پہلوؤں پر حاوی ہو۔ البتہ اس کے بنیادی اصول اور اہم خد وخال کی یوں نشاندہی کی جا سکتی ہے کہ خاکہ ایک صنف ادب ہے۔ اس کا سانچہ بیانیہ کا ہوتا ہے اور اس میں کسی شخصیت (حقیقی یا خیالی) کی سیرت وصورت اور کارناموں کی کچھ جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں اور وہ شخصیت کے ایسے مطالعے کو پیش کرتا ہے جس سے پڑھنے والے کو جمالیاتی حظ حاصل ہو۔''[۴۴]

خاکہ نگاری ای□ ایسی صنف ہے جس میں کسی شخص کے حقیقی□ وخال قار□ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ خاکہ نگار ای□ جیتی جاگتی شخصیت کی دلکش اور دلچسپ پیرائے میں تص□ کشی کر□ ہے۔ خاکہ نگار واقعات ومشاہدات کے ساتھ ساتھ اپ□□ ات وقیاسات کو بھی شامل کر□ ہے۔ ای□ کامیاب خاکہ نگار کی نگاہ اس مقام ک□ پہنچ لیتی ہے جس مقام ت□ عام لوگوں کی نگاہ نہیں پہنچتی۔ اس صنف میں بہت سی صورتیں ہیں۔ ان میں سے ای□ شخصی خاکہ ہے۔ یہ دراصل مضمون نگاری کی ای□ قسم ہے۔ جس میں کسی شخصیت کے ان□ ش کو اجا□ کیا جائے جن کے امتزاج سے کسی کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔

اردو میں خاکہ نگاری کی ابتدائی . □ ں شعرائے اردو کے ت□ کروں میں □ آتی ہیں۔ لیکن خاکہ نگاری کا □ ضابطہ آغاز مرزا فر□ اللہ بیگ سے ہو□ ہے۔ □ انہوں نے ''مولوی □ □ احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری □ نی'' لکھی۔ مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، شو□ تھانوی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، □ اغ حسن حسرت، مجتبیٰ حسین وغیرہ اردو کے اہم اور مشہور خاکہ نگار ہیں۔

رپو□ ژ:

رپو□ ژ ''انگر□ ی لفظ'' Reportage' کا فرانسیسی تلفظ ہے۔ انگر□ ی اور فرانسیسی میں یہ لفظ اطالوی □ ن کے ذریعے داخل ہوا۔ □ پو□ ژ کے معنی ہیں، کسی جلسے، کا□ نس□ واقعے کی ایسی تفصیلی رپورٹ جس میں مصنف خود شر□ ہو رہا ہو۔ یعنی اس میں کسی آنکھوں دیکھے حال کی تفصیلات بیان ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر طلعت گل نے رپو□ ژ کے □ رے میں انگر□ ی مصنف جان کیری کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''عینی شاہد کے ذریعے ضبط تحر□ میں لائے گئے ایسے ٹھوس حقائق میں جو ٹھوس□ واقعے کے وقوع□ □ ہونے کے بعد قلمبند کیے گئے ہوں۔ وقت اور □ ریخ کا تعین خود مصنف کا عینی شاہد ہو□ رپو□ ژ کو □ دہ معتبر بنا دیتا ہے۔''۳۵

رپو□ ژ ای□ طرح کی رپورٹ ہوتی ہے لیکن اخباری رپورٹ سے یہ رپورٹ یکسر مختلف ہوتی ہے۔ رپو□ ژ طویل ہوتی ہے اور اس کا لکھنے والا جلسوں، کا□□ ں اور مشاعروں کی رپورٹ تمام □ ئی تفصیلات کے ساتھ ادبی

پیرائے میں اس طرح بیان کر□ ہے کہ قاری کے سامنے وہ سارا منظر آ جا□ ہے۔ رپو□ ثر□ڑھنے کے دوران قاری خود کو اس جلسے میں شر□ی□ سمجھتا ہے۔□پروفیسر احتشام حسین نے اسے کسی واقعے کی ادبی اور محاکاتی رپورٹ کہا ہے۔ رپو□ ژ کا تعلق بیک وقت صحافت اور ادب دونوں سے ہے۔ صحافتی رپورٹ□ بلکل روکھی پھیکی اور سادہ ہوتی ہے۔ اس کے □ خلاف رپو□ ژ میں ادب کی چاشنی ہوتی ہے اور اس کا اسلوب افسانوی ہو□ ہے۔ اس میں مصنف کے□□ثرات اور □□بات بھی شامل ہوتے ہیں۔ رپو□ ژ میں اسلوب افسانوی ہو□ ہے لیکن تمام واقعات اور کردار حقیقی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علی سردار جعفری نے رپو□ ژ کو صحافت اور ادب کی درمیانی□ڑی کہا ہے۔

اردو میں رپو□ ژ نگاری کا آغا□ ترقی پسند تحر□ی□ کے زمانے میں اور خو□ ترقی پسند مصنفین کے ذریعے ہوا۔□ ترقی پسند مصنفین کے ادبی جلسوں کی روداد حمید اختر نے ادبی ر□ میں لکھ کر رپو□ ژ نگاری کی □ی در کھی □ی دیں (سجاد ظہیر) پودے (کرشن چندر) دہلی کی □ی (شاہد احمد دہلوی) چھٹا د□ی (فکر تو□ی) پو ٹھنے (□ یحیٰ مستور) کشمیر اداس ہے (محمود ہاشمی) اردو کے چند اہم اور مشہور رپو□ ژ ہیں۔

ج: افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب میں افتراقات

افسانوی اور غیر افسانوی ادب میں بعض عمومی افتراقات:

افسانوی ادب	غیرافسانوی ادب
ا۔وہ تحر□یں جوافسانو□ت کی حامل ہوں۔	ا۔ وہ تحر□یں جو حقیقت کی حامل ہوں۔
۲۔افسانوی ادب کا مر□ ومحوراوراس کی اصلی روح 'کہانی' ہے۔	۲۔غیر افسانوی ادب حقیقی واقعہ پر□ ہوتی ہے۔اوراس کی اصلی روح حقیقت کی معلومات فراہم کر□ ہے۔
۳۔ افسانوی ادب خارجی تصدیق سے بے □ز ہوتی ہے۔	۳۔غیرافسانوی ادب خارجی تصدیق کی محتاج ہوتی ہے۔
۴۔افسانوی ادب تخیل میں تخلیق کی جاتی ہے۔	۴۔ غیر افسانوی ادب میں تخیل کا کوئی دخل نہیں ۔ بلکہ مشاہدات پر□ صداقت ہوتی ہے۔
۵۔اس میں طے شدہ ہئیت وسا□ اور د□ عناصر کے □ی□ ہی تحر□یں وجود میں لائی جاتی ہیں۔ جیسے پلاٹ، تکنیک، اسلوب، کرداروغیرہ۔	۵۔اس میں کسی طے شدہ ہئیت ،تکنیک□ عناصر کی□ بندی مشروط نہیں ہے بلکہ حقیقی حالات وواقعات کومنظر عام□ □ مقصود□ ہے۔
۶۔**تخلیقی آزادی:** وہ تحر□یں جوتخلیقیت کی حامل ہوں جن میں تخلیقی آزادی□ ئی جاتی ہے۔	۶۔ان تحر□وں میں تخلیقی آزادی محدوداورمشروط ہوا کرتی ہے۔یعنی واقعیت کی صحت□ □ دہ زور□ □ ہے۔
۷۔**راوی کے□ ب میں تخلیقی آزادی:** ان تحر□وں میں مختلف قسم کے راوی ممکن ہیں۔ واحد متکلم، جمع متکلم، واحد غا□ اورجمع غا□ وغیرہ۔	۷۔راوی اتنے اقسام کے نہیں□ ئے جاتے۔ غیرافسانوی □ کی صنف□ بھی راوی منحصر□ ہے۔ مثلاً سف□ موں، رپو□ ژ، مکتوب نگاری، خودنو□ □ وغیرہ میں راوی □ □ واحد متکلم ہوا کرتے ہیں جبکہ سوانح، خاکے وغیرہ اصناف میں صیغہ غا□ راوی□ □ ہے۔

۸۔ **کردار کے باب میں تخلیقی آزادی**: افسانوی ادب کے کرداروں میں تخلیقی آزادی ہوتی ہے۔

۸۔ غیر افسانوی ادب کے کرداروں میں تخلیقی آزادی محدود ہوا کرتی ہے۔

تنوع: کرداروں میں تنوع پائے جاتے ہیں۔ کردار حقیقی، غیر حقیقی، مرئی، غیر مرئی، جاندار، غیر جاندار غرض ہر قسم کے کردار ممکن ہے۔

تنوع: کردار زیادہ متنوع نہیں ہوا کرتے۔ عموماً کردار حقیقی اور انسانی ہی ہوا کرتے ہیں۔

تعداد: کرداروں کے تعداد محدود نہیں ہوتی۔ ایک ایک سے زیادہ کردار بھی ہو سکتے ہیں۔

تعداد: کرداروں کی تعداد محدود ہوا کرتی ہیں۔ جو مصنف یا راوی کے منشا اور صنف کی نوعیت پر منحصر ہوتی ہے۔ مثلاً خودنوشت، مکتوب اور سفرنامہ میں مرکزیت واحد متکلم کو حاصل رہتی ہے۔ جبکہ سوانح، خاکے وغیرہ میں راوی صیغہ غائب کے ہوتے ہیں۔

پیش کش: کرداروں کی پیشکش کے معاملے میں مصنف کو مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ وہ حقیقی کو غیر حقیقی، غیر حقیقی کو حقیقی بنا سکتا ہے۔ وہ ہیرو کو ولن اور ولن کو ہیرو بنا سکتا ہے۔ تخلیق کار کی اس آزادی پر قاری کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ قبول کرتا ہے۔

کردار تخلیق کار کے تخیل، اس کے مدعا و منشا اور قصے کے پابند ہوا کرتے ہیں۔

پیش کش: کرداروں کی پیش کش کے معاملے میں مصنف کو مشروط آزادی حاصل ہے۔ غیر افسانوی ادب میں مصنف ہیرو کو ولن نہیں بنا سکتا اور نہ ہی غیر حقیقی کو حقیقی بنا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں قاری اسے قبول نہیں کرتا بلکہ معترض ہو جاتا ہے۔

مصنف کرداروں کا پابند ہوا کرتا ہے۔ اور وہ حقیقت حال کو جوں کا توں پیش کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

۹۔ **اظہارِ ذات کے طریق کار**: افسانوی ادب کی تحریروں میں اظہارِ ذات دبیز پردوں میں ہوتی ہے۔

۹۔ غیر افسانوی ادب کی تحریروں میں اظہارِ ذات کا کھلا بیان ہوتا ہے۔

۱۰۔ افسانوی ادب کی بنیاد تخیل، فکر و فلسفہ اور فنون و ادب پر قائم ہے۔

۱۰۔ غیر افسانوی ادب کی بنیاد عموماً علوم پر قائم ہے جیسے تاریخ، علوم تہذیب، سیاسیات، سماجیات وغیرہ۔

۱۱۔ واقعات کے بیان میں تخلیقی آزادی: واقعات کے انتخاب اور بیان میں مصنف کو مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ واقعات کی صحت□ عدم صحت کا تقاضہ غیر مستحسن تصور کیا جا□ ہے۔ واقعہ کا انتخاب کہانی کے مدعا و منشا□ قصہ کا □ بند کر□ ہے۔ یعنی فنکار اپنے قصہ اپنے تصور کے مطابق واقعہ خلق کر□ ہے□ انتخاب کر□ ہے جو□ تو کردار کی تشکیل میں□ کہانی کو آگے□ ھانے میں مددگا□ . □ ہوتے ہیں۔

۱۱۔ واقعات کے بیان میں مشروط تخلیقی آزادی□ عدم آزادی: واقعات کے انتخاب میں مصنف کو مشروط آزادی حاصل ہے لیکن ان کے بیان کے معاملے میں تخلیقی آزادی اور بھی محدود ہو جاتی ہے۔ غیر افسانوی □ میں واقعات کی صحت□ □ دہ زور□ جا□ ہے۔ اور واقعات کے غیر صحت مند ہونے کو احسن نہیں سمجھا جا□ ۔ واقع کا انتخاب ممدوح کی شخصیت کی□ بع ہوا کر□ ہے۔ انہی واقعات کا انتخاب کر□ ہو□ ہے جو ممدوح کی ز□ گی میں واقع ہوئے ہوں۔ اور ممدوح کی شخصیت کے تعین میں معاون ہوں۔

۱۲۔ افسانوی ادب میں ای□ طے شدہ خیال□ □ یے کے مطابق صورت حال (کہانی) تخلیق کی جاتی ہے۔

۱۲۔ غیر افسانوی ادب میں صورت واقع□ صورت حال کے مطابق □ یہ قائم کیا جا□ ہے۔

افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب میں اشتراکات:

اگر□ چہ افسانوی اور غیر افسانوی ادب کے حدود متعین ہیں اور ان میں واضح فرق□ پ ئے جاتے ہیں۔ اس کے□ . وجود یہ طے شدہ نہیں ہے کہ □ افسانوی ادب میں غیر افسانوی ادبی□ ازا آ جائے اور □ غیر افسانوی تحر□ وں میں افسانوی □ ازا ابھر آئے۔ کیو□ دونوں کا تعلق ادب سے ہے۔ دونوں اصناف کے مابین بعض مشترک نکات:

۱۔ دونوں اصناف کا تعلق ادب سے ہے۔

۲۔ دونوں میں افسانوی □ ان□ پ ئے جاتے ہیں۔

۳۔ دونوں اصناف میں□ اہ را □□ . لواسطہ سماجی حقائق اور مشاہدات کا اظہار ہو□ ہے۔

۴۔ دونوں کا بیا□ علامتی اور استعاراتی ہو□ ہے۔

۵۔ دونوں سماج و معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔

۶۔ ہردواصناف میں مصنف اپنی فکر وفلسفہ اور□یت کوتحر□ی صورت میں پیش کر□ ہے۔

۷۔دونوں اصناف کی □ دیں فکر وفلسفہ اور علوم وفنون □ قائم ہوتی ہیں۔

۸۔دونوں کا عمومی موضوع ا□ن اور اس کا اطراف ہے۔

حوالہ جات

(۱) شاعری اور فکشن کی ٹوٹتی حد بن ◻ یں، بلراج کومل، مضمون مشمولہ، اردو افسانہ روای ◻ اور مسائل، مرتبہ ◻ وفیسر گوپی چن ◻ ر ◻، سنگ میل ◻ ◻ لاہور، ۱۹۸۶ء، ص: ۷۰۸۔۷۰۹

(۲) ایضاً، ص: ۷۰۹

(۳) افسانہ اور افسانہ کی تنقید، ڈاکٹر عبادت ◻ ◻ ی، ادارہ ادب و تنقید لاہور، ۱۹۸۶ء، ص: ۳۰۱۔۳۰۲

(۴) اردو افسانہ روای ◻ اور مسائل، بلراج کومل، بحوالہ سابقہ، ص: ۷۱۰

(۵) کشاف تنقیدی اصطلاحات، ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، مقتدرہ قومی ◻ ن اسلام آ ◻ د، ۱۹۸۵ء، ص: ۱۰

(۶) اسلوبیاتی مطالعے ◻ وفیسر منظر عباس ◻ ی، ایجوکیشنل ◻ ہاؤس، علی گ ◻ ڑھ، ۱۹۸۹ء، ص: ۹

(۷) ایضاً، ص: ۱۵ (۸) ایضاً، ص: ۱۵

(۹) نئی تنقید ڈاکٹر جمیل جالبی، (مر ◻ خاور جمیل) رائل ◻ کمپنی، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص: ۲۷۴

(۱۰) اردو افسانہ روای ◻ اور مسائل، بلراج کومل، بحوالہ سابقہ، ص: ۷۱۰۔۷۱۱

(۱۱) کشاف تنقید اصطلاحات، بحوالہ سابقہ، ص: ۷۷۔۷۸

(۱۲) اردو فکشن کی مختص ◻ ریخ، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر بیکن بکس، ملتان، ص: ۱۷۔۱۸

(۱۳) ایضاً، ص: ۱۹ (۱۴) ایضاً، ص: ۲۰

(۱۵) ایضاً، ص: ۲۲ (۱۶) ایضاً، ص: ۲۴۔۲۵

(۱۷) ایضاً، ص: ۲۳

(۱۸) اردو ◻ کا فنی ارتقا، ابواللیث صدیقی، مضمون مشمولہ اردو ◻ کا فنی ارتقا، مر ◻ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، الاوقار ◻ ◻، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۷۵۔۷۶

(۱۹) کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص: ۱۹۲

(۲۰) ایضاً، ص: ۲۳

(۲۱) اردو ◻ کا فنی ارتقا، بحوالہ سابقہ، ص: ۸۹۔۹۰

(۲۲) ایضاً،ص:۹۱۔۹۲ (۲۳) ایضاً،ص:۹۲۔۹۳

(۲۴) ایضاً،ص:۱۹۲ (۲۵) ایضاً،ص:۱۲۸

(۲۵) اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجہ□ ت ،فوزیہ اسلم ، ڈاکٹر ، پورب اکادمی ، اسلام آ□ د ، ۲۰۰۷ء ، ص:۲۰

(۲۶) اردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحر□ں اور ر□ت کے تناظر میں)،شفیق انجم ، ڈاکٹر ، پورب اکادمی،اسلام آ□ د،۲۰۰۸ء،ص:۱۲۷

(۲۷) ایضاً،ص:۸۲

(۲۸) کشاف تنقیدی اصطلاحات،بحوالہ سابقہ،ص:۱۸

(۲۹) ایضاً،ص:۸۲

(۳۰) اردو□کا فنی ارتقا،مضمون فن ڈراما نویسی،(□ اہیم یوسف)،بحوالہ سابقہ،ص:۱۹۰

(۳۱) ایضاً

(۳۲) و□ آغا،بحوالہ سابقہ

(۳۳) انور سد□ ،بحوالہ سابقہ

(۳۴) صل□ ہ سید،بحوالہ سابقہ

(۳۵) طلعت گل،ڈاکٹر،بحوالہ سابقہ

□ب دوم: □ی □ جموں وکشمیر کی صورت حال

الف: جغرافیائی□ ر□ وسیاسی

ب: تہذ□ وثقافتی

ج: ادبی و لسانی

الف: جغرافیائی ر □ وسیاسی

ی جموں وکشمیر جسے عموماً محض ''کشمیر'' بھی کہا جا ہے اعظم ایشیا کے عین وسط میں او صغیر کے انتہائی شمال میں واقع ہے۔اس اعتبار سے اسے ایشیا کا دل او صغیر کا ج بھی کہا جا ہے۔جغرافیائی اعتبار سے جموں وکشمیر نہای ہی اہم خطہ ہے۔اس کی سرحدیں ( ) چین، افغا ن پ کستان اور رون ملک صوبہ ہماچل اور پنجاب سے ملتی ہیں۔ پہاڑوں کے □ ں قراقرم، ہمالیہ، ہندوکش میں گھرے ہوئے اس خطے کے شمال میں وسط ایشیا کی ی جکستان اور چین کا علاقہ سنکیا ہے۔اس کے شمال مشرق میں تبّت، شمال مغرب میں افغا ن، مغرب میں پ کستان اور جنوب میں ہماچل اور پنجاب کے صوبے واقع ہیں۔اس ی کی سرحدیں ۷۵۰میل چین کے ساتھ ۷۰۰ میل پ کستان کے ساتھ اور ۱۵۰ میل افغا ن کے ساتھ ملتی ہیں۔ افغا ن میں واقع خطہ واخان (Wakhan corridor) کی ا تنگ پٹی ی جموں وکشمیر کو وسط ایشیا کی ی جکستان سے ا کرتی ہے۔آب ہوا اور جغرافیائی لحاظ سے جموں وکشمیر کی ی کو چار ڈ ن میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔جموں ۲۔کشمیر ۳۔لداخ ۴۔گلگت بلتستان

(نوٹ: یہاں ضمناً ا ت کی وضا ضروری ہے کہ ی جموں وکشمیر سے مراد ۱۹۴۷ء سے قبل کی غیر متنازعہ اور متحدہ جموں وکشمیر لیا ہے)

جموں وکشمیر ا زرعی ی ہے۔ یہاں کے اسی فیصد آ دی زرا سے تعلق ر ہیں۔ یہ ی معدنی دو سے مالا مال ہے۔جس میں سے بیش ا حال تہہ دار چٹانوں تلے دبے ہوئے ہیں۔ جنگلات اس ی کا عظیم سرمایہ ہیں اور قومی آمدنی کا ا احصہ، جنگلات کی مختلف نوع کی پیداوار سے حاصل ہے۔ مز اں پھل دار درختوں میں ی شپاتی، آڑو، آلوچہ، آلو بخارا ر، آ وٹ دام، شہتوت، چیری اور خ نی کثرت سے ئے جاتے ہیں۔اس وقت ی کی مجموعی آ دی کا ازہ ا کروڑ پچاس لاکھ لگا یا ہے۔ یہاں مسلمان، ہندو، سکھ، بودھ اور عیسائی تمام مذاہب کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔مسلمان اکثری میں ہیں جن کا تنا ۸۴ فیصد ہے۔

جموں وکشمیر جسے ارضی بھی کہا جا ہے۔تقریباً ۸۴،۴۷۱ مربع میل پھیلی ہوئی رسیا ہے۔اس

ریاست کی رقبہ کے لحاظ سے صوبہ دار تقسیم ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو حسب ذیل تھی:

صوبہ جموں	۱۲،۳۷۸ مربع میل
صوبہ کشمیر	۸۵۳۹ مربع میل
سرحدی صوبہ لداخ و گلگت بلتستان	۶۳،۵۵۴ مربع میل
کل رقبہ	۸۴،۴۷۱ مربع میل

یکم جنوری ۱۹۴۹ء کی جنگ بندی کے بعد رقبہ کی صورت حال حسب ذیل ہے۔ ہندوستان کے زیر انتظام علاقہ:

صوبہ لداخ	۳۳،۷۴۰ مربع میل
صوبہ کشمیر	۶،۸۹۳ مربع میل
صوبہ جموں	۹،۸۸۰ مربع میل
کل رقبہ	۵۰،۵۱۳ مربع میل

پاکستان کے زیر قبضہ علاقہ:

مقبوضہ کشمیر	۴،۱۴۴ مربع میل
گلگت بلتستان	۲۹،۸۱۴ مربع میل
کل رقبہ	۳۳،۹۸۵ میل مربع

۵، اگست ۲۰۱۹ء میں حکومت ہند کے ایک فیصلہ کے تحت ریاست جموں و کشمیر کو دو مرکزی زیر انتظام علاقوں میں تقسیم کر کے صوبہ لداخ کو ریاست سے الگ کیا گیا۔ اس طرح دو یونین ٹیریٹریز جموں و کشمیر اور لداخ کا قیام عمل میں آیا۔

اس خطے کی تاریخ اور نام کے حوالے سے مختلف روایات تواریخ کشمیر میں درج ہیں۔ ایک روایت کے مطابق یہ خطہ پانچ ہزار سال قبل مسیح سے تاریخ کی روشنی میں ہے۔ اس وادی کا قدیم نام ''سرستی'' تھا۔ طوفان نوح کے بعد یہ خطہ

پیالہ نما جھیل بن گئی۔ اسی زمانے میں ملتان کا ہندو راجہ ہر کشب موسمِ گرما میں سیر و تفریح کے لیے اس وادی میں آیا تو اس
نے دیکھا کہ بارہ مولہ کے مقام پر ایک بڑی چٹان نے پانی روک کے رکھا ہے۔ راجہ نے چٹان کے ٹکڑے کرا دیے تو پانی کا
دھارا بہہ نکلا۔ ''سرستی'' پانی کا خشک ہوگیا تو قابل کاشت زمین نکل آئی۔ راجہ نے یہاں لوگوں کو آباد کیا اور یہ خطہ راجہ
ہر کشب کے نام کے نسبت ''کشب میر'' کہلانے لگا اور بعد میں کشمیر کے نام سے مشہور ہوگیا۔ ایک قدیم روایت کے
مطابق بھگوان برہما کے پوتے کشب نے ایک راکشش دیو کو شکست دینے کے لیے ''سرستی'' کے روکے ہوئے پانی کو بہا
دیا۔ جس سے ایک خوش نما وادی ظاہر ہوئی، جسے کشب کے نام سے منسوب کر کے کشمیر یا ''کشمیر میر'' کہا جانے لگا۔ محمود
آزاد نے ''تاریخ کشمیر'' میں کشمیر کے نام کے حوالے سے تفصیلی بحث کی ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے:

''لفظ کشمیر کی ترکیب کے لیے اب تک جس قدر تاویلیں کی گئی ہیں ان سے صحیح نتیجہ اخذ
کرنا مشکل ہے۔ لفظ کشمیر اور اس کی ترکیب اور پھر اس کا پس منظر ایک ایسا لسانی مسئلہ ہے
جس پر ماہرین لسانیات بھی کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس لے دے کے
ایک لفظ ''مر'' ہے۔ اگر یہ کسی ایسے مقام کے لیے سنسکرت میں بولا جاتا ہے جس سے آبادی
کے معنی برآمد ہوتے ہیں تو اس کے پیش نظر ''کھش مر'' یعنی کھشوں کا ملک یا ''کاش مر'' کاش
لوگوں کا ملک یا آبادی ہو سکتا ہے۔''[1]

محمود آزاد کے مطابق یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ کشمیر کے نواحی پہاڑوں میں کھش قوم اور ان کے بعد دردی لوگ
آباد تھے۔ یہ واقعہ کم از کم آریاؤں کے زمانے کا ہے اور اس طرح اس ملک کا نام پہلے ''کھش مر'' ہوگیا جو وقت کے
ساتھ ساتھ پہلے ''کش مر'' بنا اور بعد میں ''کشمیر'' کی صورت اختیار کر گیا۔

جموں: جموں کی وجہ تسمیہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں دریائے توی کے اس پار کا علاقہ جہاں اب جموں
شہر آباد ہے۔ گھنا جنگل تھا اور جنگلی جانوروں کا مسکن تھا۔ ایک بار ریاست باہو کا راجہ 'جامبولوچن' شکار کے لیے اس
علاقے میں آیا۔ شکار کی گھات میں ایک جگہ بیٹھا تھا کہ اس کی نظر ایک تالاب پر جا پڑی جہاں ایک طرف شیر اور ساتھ
ہی چند قدم پر ایک بکری پانی پی رہی تھی۔ دونوں پانی پی کر اپنی راہ ہو لیے۔ یہ منظر دیکھ کر راجہ جامبولوچن شکار کا خیال

بھول گیا۔ وہ لا بہ پتا اور اپنے ہمراہیوں سے کہا ''یہ بہت امن وامان کی جگہ ہے جہاں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ میں یہاں ایک محل بناؤں گا اور نگر آباد کروں گا۔'' چنانچہ اسی جمبولوچن نے ''جمبونگر'' کے نام سے ایک شہر بسایا جو کثرت استعمال اور تغیر زبان کے ساتھ 'جمبو' پھر 'جموں' ہو گیا۔

جموں شہر تاریخی شہادتوں کے مطابق تقریباً تین ہزار سال قبل آباد ہوا تھا۔ ابتدا میں یہ صرف شہر کا نام تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ اس نام کی ایک ریاست وجود میں آ گئی۔ اور آج کل یہ ریاست جموں و کشمیر کا ایک اہم صوبہ بن گیا ہے۔

گلگت و بلتستان: زمانہ ما قبل تاریخ میں یہ خطہ دردستان کے نام سے موسوم رہا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے اس خطہ اور یہاں کے رہنے والوں کو ''دردی'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ جموں و کشمیر کی قدیم تاریخی کتاب 'راج ترنگنی' کے مصنف پنڈت کلہن اس علاقے کو ''درددیش'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی میں یہاں ایک نئی سلطنت قائم ہوئی جس کا نام ''بلور'' تھا۔ مشرقی حصہ یعنی موجودہ بلتستان کو ''بلور کلاں'' اور مغربی حصہ یعنی گلگت کو ''بلور خورد'' کا نام دیا گیا۔ چودھویں صدی میں مورخ مرزا حیدر اپنی کتاب 'تاریخ رشیدی' میں اس علاقے کا ذکر ''بلورستان'' کے نام سے کیا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ ۳۲۶ ق م میں ایک چینی سیاح ''فاہین'' نے سنکیانگ سے 'اسکردو' کا سفر کیا تو اس علاقے کا نام ''پلول'' تھا۔ اب بھی گلگتی لوگ بلتیوں کو ''پلوئی'' کہتے ہیں۔ قیاس قرین ہے کہ اسلامی دور میں بلتی زبان کی مناسبت سے اس علاقے کو ''بلتستان'' کا نام دیا گیا ہو۔

گلگت کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس کا قدیم نام ''گری گت'' تھا۔ یعنی پہاڑوں میں گھرا ہوا اور ایک روایت یہ ہے کہ اس کا اصلی نام ''گل گد'' تھا۔ جو ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''آبادی'' کے ہیں۔ یعنی ایک ایسا پڑاؤ جہاں اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ یہی نام بدل کر ''گلگت'' ہو گیا۔ شینا زبان کے ماہر ڈاکٹر موس کے خیال کے مطابق اس کا اصلی نام ''گلیت'' ہے۔ شینا ادب میں گلگت کے لیے گلیت نام کا ہی استعمال ہوتا ہے۔

لداخ: لداخ کا قدیم نام ''ماریول'' تھا۔ یعنی ''سرخ دھرتی''۔ یہ نام اس خطے کے سرخ پہاڑی [illegible] کی وجہ سے پڑا۔ مشہور چینی مورخ ہیون سانگ نے اس کو اسی نام سے اپنے تاریخی سفرنامے میں موسوم کیا ہے۔ 'لداخ' نام اس کے کافی عرصے بعد پڑا۔ محققین کے مطابق یہ ''لادقس'' کی بگڑی شکل ہے۔ جس کے معنی ہے ''پہاڑی دروں والا''۔ ابتدائی

ر کتابوں میں ''ماریول لدقس'' کے نام سے موسوم ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ محض ''لداخ'' کہلایا جانے لگا۔

کشمیر میں مسلمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ آٹھویں صدی عیسوی میں محمد بن قاسم کے حملے ہی سے شروع ہو گیا تھا لیکن کشمیر میں اسلامی حکومت کا آغاز چودھویں صدی کے آغا میں اس وقت ہوا . بدھ مت کے پیروکار حکمران رنچن شاہ (۱۳۲۰ء۔۱۳۲۶ء) نے صوفی رگ ت شرف الدین المعروف بہ بلبل شاہ کے د مبارک پر اسلام قبول کیا۔ رنچن کا اسلامی نام صدرالدین رکھا گیا ۔ کشمیر میں قاعدہ اسلامی حکومت ر والے والا شخص ''شاہ میر'' تھا جو سلطان شمس الدین (۱۳۳۹ء۔۱۳۴۲ء) کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ شاہ میری حکمران نے صدیوں کشمیر میں حکومت کی اور کشمیر کو خالصتاً اسلامی تشخص کیا۔ اس خاندان کے ایک اور بہادر حکمران شہاب الدین (۱۳۵۴ء۔۱۳۷۳ء) نے وسیع علاقے کو فتح کر کے سلطنت کشمیر کا حصہ بنایا۔ اس کے فتوحات کا سلسلہ کابل، غزنی، قندھار اور لداخ وغیرہ سے ہندوستان میں سرہند تک پھیلا ہوا تھا۔ شاہ میری خاندان کے ایک اور حکمران سلطان زین العابدین (۱۴۴۰ء۔۱۴۷۰ء) نے کشمیر میں نصف صدی حکومت کی۔ اس کے دور حکومت میں کشمیر نے علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی شعبہ جات میں اس قدر ترقی کی کہ یہ خطہ ''ایران صغیر'' کہلانے لگا۔ ہندوستان، وسط ایشیا اور مشرق وسطی کے ممالک سے علم کے متلاشی حصول علم کے لیے کشمیر آنے لگے اس طرح کشمیر اسلامی علوم وفنون کا بہت اہم مرکز بن گیا۔

زین العابدین کے بعد شاہ میری خاندان زوال پذیر ہوا اور ۱۵۵۵ء میں ایک اور مسلمان خاندان ''چک'' کی حکمرانی قائم ہوئی لیکن یہ خاندان اپنی مذہبی فرقہ روایت کو قابو نہ رکھ سکا اور صرف اس کے بعد ہی ۱۵۸۶ء میں مغل شہنشاہ اکبر نے کشمیر کو سلطنت مغلیہ کا حصہ بنا لیا۔ مغلیہ حکمرانوں میں اکبر کے بعد جہانگیر (۱۶۰۵۔ ۱۶۲۷) شاہجہاں (۱۶۲۷ء۔۱۶۵۸ء) اور اورنگ زیب عالم گیر (۱۶۵۸ء۔۱۷۰۷ء) نے کشمیر کی سیاست کی اور وہاں کے معاملات میں دلچسپی لی، نیز یہاں کئی پر شکوہ عمارتیں اور باغات بنوائے۔ مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہوئی تو احمد شاہ ابدالی کے پنجاب پر حملوں کے دوران ۱۷۵۲ء کشمیر پر افغانوں کا قبضہ ہو گیا جو ۱۸۱۹ء تک قائم رہا۔ ۶۷ برس پر محیط اس عہد کے بعد کشمیر پر رنجیت سنگھ (۱۷۹۹ء۔۱۸۳۹ء) کی فوجیوں نے ۱۸۱۹ء میں حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور یوں کشمیر پر سکھوں کا تسلط قائم ہو گیا (۷)۔ سکھوں کا دور اقتدار ۲۷ برس پر محیط رہا۔ یہ دور کشمیر کی تاریخ میں ظلم و ستم کا سیاہ دور ہے۔ سکھ کشمیریوں سے ت

کرتے تھے اور ان کے ساتھ مویشیوں سے بھی بدتر سلوک روا رکھتے تھے۔ اگر کوئی کشمیری مسلمان کسی سکھ کے ہاتھوں قتل ہوجاتا تو قاتل کو صرف بیس روپے جرمانہ کیا جاتا اور مقتول کے ورثاء کو ۲ روپے ادا کرکے بقیہ رقم سرکاری خزانے میں جمع کرادی جاتی۔

۱۸۴۶ء میں جب سکھوں کو انگریزوں کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ تو مارچ ۱۸۴۶ء کو فریقین میں ''معاہدہ لاہور'' طے پایا۔ اس معاہدہ کے تحت کشمیر اور اس کے گرد و نواح کا پہاڑی علاقہ انگریزوں کے حوالے کردیا گیا، جنہوں نے چند روز میں ہی اپنے ایک وفادار گلاب سنگھ ڈوگرہ کو ۷۵ لاکھ نانک شاہی سکوں کے عوض فروخت کردیا۔ اس سلسلے میں ایک معاہدہ انگریزوں اور گلاب سنگھ کے مابین ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو طے پایا۔ اس بدنام زمانہ معاہدے کے تحت پوری ریاست کشمیر اور اس کے ارد گرد کے علاقے آبادی اور مال اسباب سمیت ڈوگرہ سلطنت کے بانی گلاب سنگھ کے حوالے کردیے گئے۔ اس معاہدہ کو ''معاہدہ امرتسر'' کہا جاتا ہے۔

اس معاہدے کے رو سے ایک کشمیری کو صرف سات نانک شاہی سکوں کے عوض ڈوگروں کے ہاتھوں فروخت کردیا گیا۔ مزید براں اس ریاست کے وسائل کو بھی ڈوگروں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا۔ پھر اس معاہدے میں کشمیریوں کی حیثیت اور حقوق کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا تھا جس کی وجہ سے ڈوگروں نے کشمیریوں پر ظلم و ستم کا بازار گرم کیے رکھا۔ ڈوگرہ راج میں مسلمانوں کو تعلیمی، سماجی، اقتصادی الغرض ہر شعبۂ زندگی میں پس ماندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی یہاں تک کی مسلمانوں کو مذہبی آزادی تک حاصل نہیں تھی۔ مسجدوں کو اصطبل اور بارود خانوں میں تبدیل کردیا گیا۔ اذان دینے اور خطبہ پڑھنے پر پابندی عائد کردی گئی۔ مسلمانان کشمیر سے بیگار لینا ریاست کا معمول تھا اور اگر کوئی بیگار کی صعوبتیں برداشت نہ کرتے مرجاتے تو ڈوگرہ فوج اس کے گھرانے کے کسی دوسرے فرد کو پکڑ لاتے تاکہ ادھورا کام مکمل کیا جائے۔ اس بے بس ولاچار کشمیریوں پر ٹیکسوں کا اس قدر بوجھ ڈالا گیا تھا کہ تمام پیداوار اور آمدنی حکومت کو ٹیکس کی صورت میں ادا کردینے کے باوجود یہ مظلوم مکمل ٹیکس ادا نہیں کرپاتے تھے۔ ٹیکس کی رقم مکمل طور پر ادا نہ کرنے کی صورت میں ڈوگرہ سپاہی انہیں ظلم و تشدد کا نشانہ بناتے اور قید کر دیتے تاوقتیکہ ان کا واجب الادا ٹیکس ادا نہ ہوجاتا۔ اس مجبوری کے پیش نظر کشمیری مسلمانوں نے ترک وطن کی راہ اختیار کی اور جو ایسا نہ کرپائے وہ پنجاب کے مختلف علاقوں میں آکر مزدوری کرتے اور واپس جا کر ڈوگروں کو ٹیکس ادا کرتے۔

لیکن ڈوگرہ حکمران کے خلاف بھی ایک دور میں صدائے احتجاج بلند کرنے والے لوگ پیدا ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب پورے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف آواز اٹھائی جا رہی تھی۔ جموں کشمیر میں بھی اب سیاسی اجلاس منعقد ہونے لگے۔ اب عوام بھی بڑے جوش وخروش سے ان اجلاس میں شرکت کرتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مہاراجہ کے ظلم و ستم کے خلاف پوری قوم اٹھ کھڑی ہوئی۔ جموں میں سردار گوہر خان نے مسلم ینگ مینز ایسوسی ایشن کو متحرک کیا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۱۳ء کو ڈوگرہ فوج نے نہتے کشمیری مسلمانوں پر بلا اشتعال گولی چلائی۔ تو پوری ریاست میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور صدیوں کی غلامی کے بعد کشمیریوں نے انگڑائی لی۔

مختصر یہ کہ ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو شملہ کے مقام پر آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ بعد ازاں شیخ محمد عبداللہ اور چودھری غلام عباس نے آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۳۳ء میں کشمیری مسلمانوں کی سول نافرمانی کی تحریک جب ڈوگرہ حکمران کی جانب سے سختی سے کچلی گئی تو پنجاب میں مقیم کشمیری مسلمانوں نے ڈوگروں کے ظلم و ستم پر شدید ردعمل کا اظہار کیا اور برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالا کہ اس ظلم و ستم کو بند کرایا جائے۔ برطانوی حکومت نے کشمیری مسلمانوں کی شکایات کو دور کرنے کے لیے گلینسی کمیشن کا تقرر کیا۔ لیکن کچھ بیرونی سازشیں اور اندرونی نا اتفاقی کی وجہ سے مسلم کانفرنس زیادہ کامیابی سے نہ چل سکی۔ شیخ محمد عبداللہ نے اسی پارٹی سے 'نیشنل کانفرنس' کے نام سے ایک نئی شاخ کے قیام کا اعلان کیا۔ برسوں ملکی اور ریاستی سطح پر انگریزوں کے خلاف بغاوت چلتی رہی۔ اس دوران جموں وکشمیر کے سرزمین پر کچھ ایسی سازشیں ہوئیں کہ جس کا خمیازہ آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت نہرو نے شیخ محمد عبداللہ اور مہاراجہ ہری سنگھ کو یقین دہانی کی کہ اگر جموں کشمیر ہندوستان کے ساتھ الحاق کرتے ہیں تو وہ اسے اس کی مکمل حمایت اور حفاظت کی جائے گی۔ مہاراجہ قائل ہو گئے اور ہندوستان سے الحاق کیا۔ ہندوستان میں یہ واحد ریاست تھی جس کا اپنا الگ مقام، حیثیت آئین پرچم اور حقوق تھی۔ اس طرح ریاست جموں وکشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ ہو گیا اور کشمیر عظیم بھارت کا ایک حصہ بن گیا۔

ب: تہذیب وثقافت

کسی بھی خطۂ ارض میں تخلیق ہونے والا ادب اس علاقے کی مخصوص تہذیب وثقافتی اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ جموں وکشمیر کے جغرافیائی محل وقوع اور سیاسی رخ کے ساتھ ساتھ اس کے مخصوص تہذیبی وثقافتی پس منظر کا جائزہ بھی ضروری ہے کہ اس کثیر السانی اور کثیر التہذیبی خطے کی تفہیم میں آسانی ہو۔ تہذیب وثقافت ایک ہمہ گیر موضوع ہے جو زندگی گزارنے کے عام اصولوں اور روزمرہ کے معاملات سے لے کر مخصوص فلسفہ حیات کا احاطہ کرتا ہے اور ان کے اظہار کا وسیلہ اور ذریعہ بھی بنتا ہے۔ گویا یہ کسی قوم کی فکری، روحانی اور باطنی زندگی کے افکار واعمال کا نام ہے۔ ایک صحت مند معاشرہ مثبت تہذیبی اقدار کو جنم دیتا اور پروان چڑھاتا ہے۔ جب کہ زوال پذیر اور اخلاقی طور پر خستہ معاشرہ تہذیبی سرمائے کے زوال کا باعث بنتا ہے۔

ثقافت کے لغوی معنی ہیں ،عقل مند،علوم وفنون میں دسترس حاصل کرنا ،کسی چیز کو تیزی سے سمجھنا اور اس میں مہارت حاصل کرنا ہے۔ مجازی معنوں میں یہ لفظ شائستگی اور خوش اخلاقی کے لیے بھی مستعمل ہے۔ اہل تصوف کے نزدیک تہذیب کے معنی پاک کرنا ،آلائشیں دور کرنا اور روحانی اور اخلاقی صفات سے مزّین کرنا ہے۔ تہذیب وثقافت کی اصطلاحات کو یکجا کرتے ہوئے جو لفظ ان کا بھرپور احاطہ کرتا ہے وہ کلچر ہے۔ فیض احمد فیض لکھتے ہیں:

> ''بعض اوقات ہم کلچر سے روزمرہ رہن سہن اور طریق زندگی مراد لیتے ہیں۔ بعض اوقات عقائد اور دین و مذہب اور بعض اوقات فن اور ادب۔ لیکن یہ بات بہر طور مسلم ہے کہ قومی تہذیب کے تعیّن میں ان تمام اجزا کا باہمی رشتہ ان کی اہمیت اور غیر اہمیت، ان کے تقدیم وتاخیر کچھ بھی قائم کر لیجئے انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور قومی تہذیب کو صحیح طور سے سمجھنے کے لیے ان کی مجموعی شکل وصورت ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اس مجموعے کی بنیادی اجزا کیا ہیں۔ اول وہ تمام عقیدے، قدریں، افکار، تجربے، امنگیں (ideals) یا آدرش جنہیں کوئی انسانی گروہ عزیز رکھتا ہے۔ دوم وہ آداب، عادات ورسوم و اطوار جو اس گروہ میں رائج و قبول ہوتے ہیں۔ سوم وہ فن مثلاً ادب، موسیقی، مصوری، عمارت گری، اور دستکاریاں جن میں باطنی تجربے، قدریں، عقائد وافکار اور ظاہری طور واطوار

بہت ہی مربوط اور تراشی ہوئی صورت میں اظہار پاتے ہیں۔''۲

اگر ہم اپنے علاقائی ثقافتوں کا مطالعہ کریں تو ہمیں ان کی روح سارے علاقوں میں یکساں و مشترک نظر آئے گی اور ان میں جو فرق نظر آئے گا وہ روح کا نہیں بلکہ جغرافیائی ماحول اور موسمی تقاضوں کا ہوگا جن سے زندگی بسر کرنے کا رواج اور طریقے پیدا ہوتے ہیں اور جنہیں ہم اصطلاح میں کلچر یا ثقافت نہیں بلکہ فوک ویز (Folk Ways) کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''فوک ویز جغرافیائی تقاضوں سے از خود وجود میں آتے چلے جاتے ہیں۔ یہ خودرو ہوتے ہیں لیکن ثقافت یا کلچر زراعت کی طرح ہوتا ہے جس کے لیے پہلے زمین تیار کی جاتی ہے۔ کھاد ڈالی جاتی ہے۔ پہچان کر مطلوبہ فصل کا بیج ڈالا جاتا ہے۔ سینچا جاتا ہے، گوڑی کی جاتی ہے۔ گھاس پھوس کو صاف کیا جاتا ہے اور ہر وہ ممکن طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکے گویا کلچر ایک شعوری کاوش و عمل سے پیدا ہوتا ہے۔''۳

تہذیب و ثقافت کے اس اجمالی جائزے کے بعد ہم جموں و کشمیر کے تہذیبی و ثقافتی پس منظر کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطہ طویل تر پس منظر کا حامل ہے۔ قبل از مسیح سے اس علاقے میں انسانی معاشرے کی تشکیل شروع ہوتی ہے۔ پھر آریہ بھی اس علاقے میں آئے۔ بدھ مت کے پیروکاروں اور ہندرشیوں اور منی سیوں نے بھی اس علاقے کو اپنا مسکن بنایا۔ متعدل موسمی حالات اور سازگار فضا کے باعث لوگ کشمیر کی طرف متوجہ ہوتے رہے۔ ان لوگوں نے ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے کاشتکاری اور زراعت پر دھیان دیا۔ اس طرح انسانی معاشرہ نئے سرے سے تشکیل پذیر ہوا۔ بعد ازاں اسلام کی تعلیمات اور فلسفہ حیات نے اس علاقے کو مسخر کر لیا۔ بالآخر ۱۳۲۴ء میں بدھ مت پیروکار رنچن شاہ کی کشمیر پر حکمرانی کا آغاز ہوا جس نے ایک مسلمان صوفی بزرگ شرف الدین بلبل شاہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور سلطان صدرالدین رنچن شاہ کہلایا۔ اس کے عہد میں اسلامی تہذیب و ثقافت کو پھیلنے اور پھولنے کا موقع ملا۔ بعد ازاں مسلم سلاطین کشمیر کے عہد میں یہاں اسلامی تہذیب و ثقافت نے خوب فروغ پایا۔ سلطان زین العابدین مسلمان اور ہندو دونوں میں یکساں مقبول تھا۔ ہندو اُسے پیار سے بڈ شاہ (ہندوؤں کے بادشاہ) اور مسلمان بڈھ شاہ (بڑا بادشاہ) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس عہد کا کشمیر معاشی اور معاشرتی ترقی کے حوالے سے سنہری دور کہلاتا ہے۔ اس کے دور حکمرانی میں آبپاشی، معاشیات اور تعلیم سمیت ہر شعبہ زندگی میں بھرپور ترقی ہوئی۔ اس

عہد میں سنگتراشی، منبت کاری، ریشم سازی، شال□ بافی اور قالین□ قی جیسی صنعتوں کی خوبصورتی اور□ □ کے□ □
فن کی د□ میں کشمیر کو چار چا□ لگ گئے۔ اس کے دور حکومت میں ہندوؤں کو بھی مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ مسلمان
سلاطین کے عہد میں کشمیرا□ نئے تمدن سے آشنا ہوا اور پھر مغلوں نے بھی کشمیر کے تہذ□ وتمدن□ گہرے□ ات
مرت□ کیے۔ مختلف مغل حکمرانوں نے کشمیر میں تعمیرات کرا □ او□ غات لگوائے جو اپنے حسن اور جاذ□ کے□ □
کشمیر کی خوبصورتی کو مز□ □ ھانے کا مو□ بنے اور یہاں کے ثقافتی ورثے میں اضافہ کی وجہ بھی۔ افغانوں کا دور ظلم و
جبر کا تھا اور سکھوں نے ظلم وستم کی انتہا کر دی۔ □ حالات اتنے □ گوں ہوں تو ا□ نی ذہن وجسم کے تخلیقی سوتے خشک
ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اس دور کو ثقافتی اور تہذ□ حوالے سے□ نجھ قرار□ جا سکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر کی تقسیم
نے تمدنی عمل کو نئے □ از سے مت□ کیا۔ پچھلے کچھ عرصے سے کشمیر کی آزادی اور وحدت کی حفاظت کے ساتھ ساتھ قدیم
اعلیٰ اقتدار کی بحالی اور ثقافتی ورثہ کے تحفظ کا شعور بیدار ہوا ہے۔ آج جہاں کشمیر کے کونے کونے اپنے حقوق کی بحالی کے
لیے صدا □ بلند کی جا رہی ہے وہاں اہل کشمیر اپنے ماضی کی طرف مراجعت کرتے بھی □ آ رہے ہیں۔

الغرض کشمیر کا ا□ طویل□ ر□ پس منظر ہے ابتدا میں یہاں ہم رنگی و یکسا □ کے فقدان کے□ □ تہذ□
عمل□ د□ وان نہ □ ھ سکا۔ لیکن □ ھ دور او□ لخصوص مسلم سلاطین وحکمران کے عہد اور سید علی ہمدانی جیسے اکا□ ین
دین کی آمد اور□ وجہد سے جہاں معاشرے کی صنعت وحرفت کو عروج حاصل ہوا وہاں لوگوں کو فنون لطیفہ کا ذوق بھی □
اور معاشرتی سطح□ □ نگت اور مساوات کا □ بہ پیدا ہوا۔

تعلیم:

اہل کشمیر ابتدا سے ہی علم کے رسیا تھے اور□ ب د □ □ دماغ جیسی صفات سے میزّ ین تھے۔ مسلمانوں کے
عہد میں تعلیم کی□ وتج□ قی کا عمل پوری تیزی سے جاری رہا۔ اس دور میں فارسی□ ن وادب کی□ قی ملی اور کشمیری□ ن
کے لیے فارسی رسم الخط اختیار کیا □ ۔ اس زمانے میں بلا مذہب وقوم□ □ کے□ شندوں نے مختلف علوم وفنون میں
اپنا□ م پیدا کیا۔

مذہبی رواداری:

جموں و کشمیر کی تہذیب وثقافت میں ایک اور چیز مذہبی رواداری کا عنصر ہے۔ یہ کشمیری تہذیب کا لازمی اور کشمیر کی تاریخ کی سب سے اہم خصوصیات ہے۔ زین العابدین نے ایسے ماحول میں حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی تھی کہ ۔ جب حکومت کی کاسہ لیسی کی سیج پر سونے کے مترادف تھا۔ اس نے مذہبی رواداری کی روایت کے ٹوٹے ہوئے دھاگے کو اس ہوشیاری اور دانشمندی کے ساتھ پھر سے جوڑا کہ کشمیر میں نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس امن و آشتی، علم و فن، محبت و عزت کی پرانی بنیادوں کو پھر سے اتنا مستحکم کیا کہ آج سینکڑوں برس بعد بھی یہاں کے عوام کی سمجھ میں دوئی کا فلسفہ نہیں آیا۔ ہندو عارفوں، مسلمان صوفیا اور بودھ مت کے بھکشوں کی باتوں میں لوگوں نے کبھی کوئی فرق نہیں سمجھا۔ گویا مذہبی رواداری یہاں جموں و کشمیر کے عوام کیا فطرت کا لاینفک ہے۔

فن تعمیر:

کشمیر میں ابتدائی تعمیر ہونے والی عمارتیں جو زیادہ تر مذہبی مقامات ہیں ہیں۔ مندروں سے ملتی جلتی ہیں بلکہ بعض جیسے مارتنڈ کا مندر یونان کے ہیکلون سے مطابقت رکھتا ہے۔ طوفان نوح کے بعد ہندو راجگان کے عہد میں ہندو طرز تعمیر رائج ہوا۔ اشوک کے عہد میں بودھ مت کو عروج حاصل ہوا تو گندھارا آرٹ نے یہاں عروج پایا اور اہل کشمیر سنگ تراشی کے فن سے روشناس ہوئے۔ جب کشمیر میں اسلام کا نور پھیلا تو دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح فن تعمیر بھی یہاں سرگرم ہوا۔ اس عہد میں جو خانقاہیں، مساجد اور دوسری عمارتیں تعمیر ہوئیں وہ غرناطہ اور قرطبہ کی عمارتوں سے مشابہ تھیں۔ دوسری طرف مبلغین اسلام کی آمد کے ساتھ ہی ایرانی فن تعمیر نے بھی یہاں کے تعمیراتی عمل پر اثر ڈالا۔ چوبی فن تعمیر، جو ہندو دور میں رائج تھا کے ساتھ ساتھ بودھ اور مسلمان حکمرانوں کے دور میں لکڑی کی تعمیر کے فن میں کشمیری ہنرمندوں نے کمال حاصل کیا۔ ان کاریگروں نے لکڑی کے کام کے اتنے نفیس نمونے پیش کیے جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ مغل حکمرانوں نے یہاں محل، بارہ دریں، قلعے، سرائے سمیت دیگر عمارتیں تعمیر کیں جو مغلیہ فن تعمیر کے بہترین نمونہ ہیں۔ اسی طرح مغل بادشاہوں نے کشمیر میں بے شمار باغات لگوائے جو اپنے حسن میں لاجواب

ہیں۔ کشمیری تعمیرات میں پل بھی بہت اہم ہیں۔ انہیں مقامی زبان میں ''کدل'' کہا جاتا ہے۔

صنعتیں/ دستکاریاں:

ہر معاشرے میں صنعتیں اور دستکاریاں اس کے کلچر کا حصہ ہوتی ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ادب اور فن کا استعاراتی حصہ بھی بن جاتی ہیں۔ کشمیری دستکاریاں اپنی خوبصورتی کے حوالے سے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ ان دستکاریوں میں شال بافی، قالین سازی، لکڑی اور خاص طور پر اخروٹ کی لکڑی کا کام، پیپر ماشی، کاغذی سازی، سازن کاری، ریشمی کپڑے کی صنعت، نمدہ سازی اور ظروف سازی وغیرہ شامل ہیں۔

مصوری اور خطاطی:

کشمیری مصوروں اور خطاطوں نے پچی کاری، نقش نگاری، تذہیب کاری اور خوش نویسی میں کمال حاصل کیا۔ بڈھ شاہ کے عہد میں محمد جمیل اس حوالے سے بہت مشہور ہوئے۔ ان کے علاوہ میر حسن کشمیری، حسین کشمیری، محمد حسین زری قلم، محمد محسن، محمد علی کشمیری، باقر کشمیری، اور امام بخش یوی وغیرہ اہم ہیں۔ کشمیر میں عوامی اور مغل آرٹ کے میلاپ سے بسوہلی انداز سے خوب فروغ پایا۔ یہ جموں و کشمیر کے لوگ چونکہ ذہین اور تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں اس لیے انہوں نے اس میدان میں بھی بلند مقام حاصل کیا۔ کشمیری خطاطوں کی تحریروں اور مصوری کی تصویروں کے نمونے آج بھی ہند کی، ایران اور یورپ کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں محفوظ ہیں۔ وکٹوریہ البرٹ میوزیم لندن کے ہندوستانی شعبے میں چوبیس بڑی تصویروں کا ایک نہایت ہی نادر سیٹ موجود ہے جو کپڑے پر بنایا ہوا ہے۔ یہ نادر تصویریں کشمیر میں بنائی گئی ہیں۔ الغرض دیگر ثقافتی حوالوں کے ساتھ ساتھ فن مصوری کے حوالے سے بھی کشمیر ایک بے بہا قیمتی اور رنگارنگ ورثہ کا حامل خطہ ہے۔

موسیقی:

کشمیری موسیقی کا خمیر ہندی اور ایرانی تہذیبوں کی آمیزش سے تیار ہوا ہے۔ امیر خسرو نے ہندوستانی موسیقی

اور ایرانی موسیقی کے میلاپ سے ۔ یہ نئی طرز کی موسیقی کو رواج دی تو یہ از کشمیر میں بھی مقبول ہوا۔ شاہ ہمدان اور دوسرے ایرانی مبلغین نے جہاں کشمیر کی طرز معاشرت کو ہر رخ سے متاثر کیا۔ وہاں موسیقی بھی ایرانی اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ کشمیری مو رول نے ایرانی ساز سیکھے اور نہایت فن کاری سے ان کا استعمال کیا۔

لوک ادب:

جموں وکشمیر چو ا کثیر الثانی خطہ ہے۔ اس لیے یہاں مختلف علاقوں کا الگ لوگ ادب ہے۔ کشمیر میں کشمیری، جموں میں ڈوگری، پیر پنچال میں گوجری اور پہاڑی، وادی چناب میں کشتواڑی، پوگلی اور بھلیسی . کہ لداخ وگلگت بلتستان میں، لداخی، بلتی، پورگی اور شینا زبانوں کے اپنا لوگ ادب ہے۔ ان علاقائی زبانوں میں تخلیق ہونے والے لوک ادب کا بنیادی حصہ شاعری پر مشتمل ہے اور ان میں داستا اور لوک ادب کی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بجھارتیں، پہلیاں، اقوال، آخان، بچوں کے گیت اور لوریاں بھی یہاں کے لوک ادب کا حصہ ہے۔

رقص ناچ:

کشمیری میں کلاسکی ناچ کا پس منظر مذہبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری لوک ناچ چاہے وہ ا ادی ہو یا اجتماعی اپنی اساس میں بلند اور ارفع خیال کے لیے ہوتا ہے۔ پہاڑی علاقوں بشمول جموں میں بنگڑے اور لڈی کا رواج ہے۔ پونچھ کے علاقے میں گتگا بھی ایک طرح کا ناچ ہے جو خوشی کے موقع پر کھیلا جاتا ہے۔ کشمیر میں رووف ناچ کا رواج ہے۔ جبکہ لداخ وگلگت بلتستان میں تبتی سا کے ناچ گانوں کا رواج ہے۔ لداخ میں تو شادی وغمی غرض ہر موقع کی منا سے ناچ کا اہتمام ہوتا ہے۔

کشمیری دستر خوان اور عوامی تقریبات:

کشمیری دستر خوان اور عوامی تقریبات بھی ثقافت کا اہم حصہ ہے۔ کشمیر میں اہم معاشرتی اور اجتماعی تقریبات میں میلے، عیدیں یتھ اور دوسرے مذہبی تہوار شامل ہیں۔ کھی کا میلہ، دسہرہ و دیوالی، محرم کی تقریبات، نوروز اور

لوسر کی تقریبات مشہور ہیں۔ ہر علاقے کا اپنا الگ الگ تہوار ہوتے ہیں جن میں اپنے تہذیب و رواج کی مطابق دعوتوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ جموں وکشمیر کے لوگ اچھے کھانے کے شوقین ہیں اور مہمان نوازی بھی ان کی فطرت کا لازمی جزو ہے۔ اس لیے ان کا دسترخوان سجا اور بھرا رہتا ہے۔

ج : ادبی ولسانی

□ی □ جموں وکشمیر تین مختلف خطوں □پ مشتمل ہے۔ جموں، کشمیر اور لداخ وگلگت و بلتستان۔ یہ تینوں خطے جغرافیائی لحاظ سے ای□ دوسرے سے□ لکل مختلف اور منفرد ہیں۔ جس کی وجہ سے تینوں خطوں کی تہذ ی□ ،ثقافت،□ ن و بیان اور سماجی صورتحال ای□ دوسرے سے□ لکل الگ ہیں۔ کشمیر کی وادی کی تہذ ی□ وتمدن اسلامی تہذ ی□ سے متا□ث ہے تو جموں صوبے کی تہذ ی□ □پ پنجابی ثقافت کے□ ات□ ی ں ہیں۔ جبکہ لداخ اور گلگت وبلتستان کی تہذ ی□ تبّتی تہذ ی□ کی مماثل ہے۔ کشمیر اور اس کے نواح میں کشمیری اور اس قبیل کی □ □ بولی جاتی ہیں۔ . □ کہ جموں میں پنجابی□ ن کے قبیل کی□ □ جیسے ڈ□َ ی، پہاڑی وغیرہ بولی جاتی ہیں۔ لداخ میں لداخی اور گلگت و بلتستان میں شینا، بلتی او□ وہشسکی □ □ بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ جو تبّتی □ ن کے قبیل کی □ □ ہیں۔ اس طرح □ی □ جموں وکشمیر ای□ کثیر لسانی اور تہذ□ □ی □ ہے۔ مز□ آں ان خطوں کے□ ربھی مختلف لسانی اکائیاں ہیں جیسے□ میں شینا رائج ہے، جبکہ وادی چناب اور اس نواح کے علاقوں میں بھدرواہی، پوگلی، بھلیسی، کشتواڑی□پ ڈری، سرازی جیسی بولیاں عام ہیں۔ اسی طرح پیر پنجال اور اس کے نواح میں گو□ ی، بکروالی، پہاڑی جیس□ □ بولی جاتی ہے۔ لداخ میں لداخی کے علاوہ بلتی، شینا، دردی، تبّتی، اور پ□ سکت جیسی □ □ بولی جاتی ہیں۔ اس طرح ان علاقوں کے عوام ای□ دوسرے کی □ ن سے عمو□ً آشنا ہوتے ہیں اور ای□ دوسرے کو سمجھنے اور تعلقات بنانے کے لیے ہمیشہ سے کسی رابطے کی □ ن کے محتاج رہے ہیں۔ اَ□ چہ ابتدا میں فارسی کے رواج سے کسی حد□ یہ کام آسان ہوَ□ تھا۔□ فارسی، علماء وخواص کی ہی □ ن تھی اور عام عوام کی رسائی اس علمی □ ن □ نہیں تھی۔ اسی دوران ہندوستان اور پنجاب سے کشمیر آنے والے لوگ اپنے ساتھ اردو □ ن بھی لے آئے۔ اردو جو اس وقت □ ریختہ ہی کہلائی جاتی تھی۔ جو عوام کی □ ن □ جا رہی تھی۔ دھیرے دھیرے □ی □ کے عام عوام میں بھی مقبول ہو رہی تھی اور عوام کے□ میل □پ اور مواصلات کی سبیل نکل آئی۔ اب اسی □ ن کی توسط سے □ی □ کی مختلف اور متعدد لسانی اکائیوں کے درمیان تہذ□ ، سماجی اور سیاسی رشتے استوار ہو گئے۔

□ی □ جموں وکشمیر کو□ صغیر سے□ لعموم اور صوبہ جموں کو پنجاب سے□ لخصوص علاقائی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی

اور لسانی روابط نے کچھ اس مضبوطی سے بہم جوڑ دیا ہے کہ دونوں خطوں میں موجود تہذیبی و تمدنی روایات، رسوم و رواج اور زندگی سے متعلق عمومی رویوں کا ایک دوسرے پر اثر لازمی و فطری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار عوامل اور لسانی ضرورتوں کے باعث نئی زبان اردو نے پنجاب میں جنم لیا تو اس کا دائرہ اثر جموں تک پھیل گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ جموں اور اس کے نواحی علاقے عموماً عہد ماضی میں فوجی کارروائیوں کا مرکز رہے ہیں اور یہاں کے مخصوص حالات کے سبب اس علاقے میں علمی و ادبی تحریکوں کو پنپنے کے مواقع کم ملتے رہے ہیں۔

سکھ شاہی خاتمے کے بعد رسوائے زمانہ معاہدہ امرتسر (۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء) کے ذریعے مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر انگریزوں سے حاصل کر کے ڈوگرہ راج قائم کیا تو یہاں نئی ریاست تشکیل پذیر ہوئی۔ جس کے نتیجے میں باوجود ڈوگرہ ظلم و تعدی کے، جموں و کشمیر کے سیاسی و سماجی حالات کسی حد تک تبدیل ہونے لگے۔ دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح یہاں علم و ادب کی کچھ روایات بھی قائم ہونے لگیں۔ اس طرح ان اثرات کو جو برصغیر میں اردو زبان کے ارتقا کی روشنی میں ڈوگرہ راج سے قبل ہی جموں و کشمیر میں پڑے تھے انہیں پھیلنے پھولنے کا موقع ملا۔ ڈوگرہ اقتدار کے آغاز کے وقت سرکاری اور دفتری زبان تھی۔ فارسی زبان طویل عرصہ تک یہاں کی علمی و ادبی زبان رہی۔ اہلیان کشمیر نے جہاں اسے دفتری زبان کے طور پر اپنایا وہاں اس زبان میں شعر و ادب بھی تخلیق ہوا۔ تاہم ڈوگرہ عہد میں اس اردو کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوگئی۔ جموں و کشمیر اردو زبان کی ابتدائی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''قدیم ترین تحریری آثار جو ہم کو کشمیر میں دستیاب ہوئے ہیں۔ وہ سترھویں صدی کے آغاز سے تعلق رکھتے ہیں اور عموماً ریختہ کا انداز رکھتے ہیں۔ اس زمانے تک مغل فوجیوں کا ربط کشمیر سے قائم ہو چکا تھا۔ سلطان یوسف شاہ چک فارسی کا خوش گو شاعر تھا لیکن اس کے بارے میں مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ ہندی میں بھی شعر کہتا تھا۔''[۲]

خواجہ غلام احمد پنڈت لکھتے ہیں:

''کشمیر میں کشمیری، سنسکرت اور فارسی زبانیں عام طور پر مقبول ہیں اور ان کی طویل تاریخ ہے۔ لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے کہ جتنی ترقی اردو نے ہندوستان کے باقی صوبوں، ریاستوں اور علاقوں میں کی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اور مسلمہ طور پر جموں و کشمیر میں

کی ہے۔حتیٰ کہ ڈوگرہ عہد میں اردو نے دفتری زبان کی حیثیت سے فارسی کی جگہ لی اور عدالتی ودرسی زبان کا درجہ بھی پایا۔‘‘[۵]

کشمیر میں ڈوگرہ راج کا آغاز ایسے وقت میں ہوا جب اردو برصغیر میں ابتدائی تشکیلی مراحل تیزی سے طے کرتے ہوئے ایک واضح اور مستحکم زبان کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ سکھوں کے عہد میں دربار لاہور سے وابستگی کے باعث پنجاب سے اردو ادب وصحافت کی نئی اٹھنے والی تحریکوں نے جموں کی راہ بھی دیکھ لی تھی۔اس کے علاوہ ہندوستان سے اردو شعرو ادب کی روایت بھی مختلف ذریعوں سے جموں وکشمیر میں روشناس ہونے لگی تھیں۔ جموں میں ڈوگری، گوجری اور پنجابی کا رواج تھا۔ پنجاب سے ملحق ہونے کے باعث پنجابی زبان کا اس علاقے میں عمل دخل زیادہ تھا۔ڈوگری اور گوجری بولنے والے بھی پنجابی بخوبی سمجھ لیتے تھے۔ جبکہ پنجابی زبان اردو کے عناصر ترکیبی میں شامل ہے۔اس طرح سے جموں میں معمولی محنت سے اردو کو اپنا لیا گیا۔ اہلیان کشمیر اور پنجاب کا کئی حوالوں سے ہمیشہ تعلق رہا ہے۔لوگ محنت مزدوری کے لیے پنجاب کا رخ کیا کرتے تھے۔سلیم خان گمی لکھتے ہیں:

’’کشمیر نے جب اہل کشمیر کے لیے سکھوں اور ڈوگرہ کے عہد میں ایک عقوبت خانہ کا روپ دھارا تو ہزاروں کشمیری کنبے کشمیر چھوڑ کر سیالکوٹ، لاہور، امرتسر، گوجرانوالہ، راولپنڈی اور دوسرے شہروں میں آباد ہو گئے۔ظاہر ہے ان کی دلچسپیاں کشمیر سے ہی وابستہ تھیں۔دوسرا یہ کہ وہ لوگ جو کشمیر نہ چھوڑ سکے، وہ بھی سردیوں کے موسم میں پنجاب کی طرف نکل جاتے تھے اور محنت مزدوری کر کے پیٹ پال لیتے تھے۔ وہ لوگ موسم گرما کے آغاز میں واپس کشمیر کا رخ کرتے تھے۔تیسری بات یہ کہ کشمیر اور پنجاب رنجیت سنگھ کے سے ’’یک جان دو قالب‘‘ چلے آتے تھے اور دونوں خطوں کی سیاست ایک دوسرے کو متاثر کرتی چلی آ رہی تھی۔جغرافیائی اعتبار سے بھی پنجاب اور کشمیر ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں اور اگر ان کی جغرافیہ کا مطالعہ کیا جائے تو دونوں خطوں کے کیف وکم میں زیادہ بعد نہیں۔ چوتھے یہ کہ نسلی اعتبار سے بھی پنجاب کے کئی قبیلے کشمیر میں اور کشمیر کے کئی قبیلے پنجاب میں پھیلے ہوئے ہیں جب کہ پانچویں بات یہ کہ دونوں خطوں کے تہذیبی اور ثقافتی تعلقات بھی صدیوں سے باہم مربوط چلے آ رہے ہیں۔چھٹی بات یہ کہ مذہب اسلام کا رشتہ بھی دونوں خطوں میں مسلمانوں میں پائیدار اور مستحکم

ہے۔''۶؎

اس طویل اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اہل کشمیر بالخصوص جموں و کشمیر اور مغربی پنجاب کے مسلمانوں کے درمیان گہرے مذہبی اور ثقافتی رابطہ تھے۔ علاقائی اور سماجی وتجارتی تعلقات کے باعث جموں کے لوگ نئی زبان اردو سے کسی حد تک آشنا ہوگئے تھے۔ کیونکہ زبانوں کے نفوذ کا عمل غیر شعوری سطح پر جاری رہتا ہے۔ اس لیے اردو کے کئی الفاظ اُن کی زبان (ڈوگری) کا حصہ بن چکے تھے۔ لیکن اردو کو ابھی وہ ضروری استحکام حاصل نہیں ہوسکا تھا، جس سے وہ فارسی کی جگہ لے کر سرکاری زبان بن سکے۔ البتہ یہ زبان تیزی سے ان منزلوں کی جانب سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی جہاں پر پہنچنے کے بعد اسے فارسی کا نعیم البدل بننا تھا اور ریاست کی سرکاری، دفتری اور علمی و ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرنی تھی۔

جموں و کشمیر میں ترویج اُردو کے عوامل

جموں اور پنجاب کے قریبی تعلقات، تہذیبی و ثقافتی ربط کے علاوہ ریاست میں اردو کی ابتدا، ترویج و ترقی کا عمل جن عوامل کے باعث تیزی سے ممکن ہوا۔ ان میں چند عوامل جو زیادہ قابل ذکر ہیں۔ درج ذیل ہیں۔

ذرائع مواصلات میں اضافہ اور اہل علم کی آمد و رفت

ریاست کے صوبہ جموں کی اکثریت ڈوگری زبان بولتی تھی۔ جس سے اہل وادی نا آشنا تھے۔ جبکہ وادی کشمیر میں بولی جانے والی کشمیری زبان سے جموں و نواح کے رہنے والے ناواقف تھے۔ اسی طرح لداخ و بلتستان کے لوگ ان دونوں زبانوں سے قطعی نابلد۔ لداخی و بلتی جیسی زبانیں اہلیانِ کشمیر و جموں کے لیے ادق تھیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی ایسی زبان استعمال کی جائے جسے ریاست کے ہر خطے اور علاقوں کے رہنے والے بھی سمجھ سکیں۔ نیز دنیا میں ہونے والی صنعتی ترقی کے اثرات جب سات سمندر پار سے ہندوستان میں پہنچے تو ریاست جموں و کشمیر پر بھی اس کا اثر پڑا۔ اس صنعتی ترقی کے باعث جب ذرائع مواصلات میں اضافہ ہوا تو میل جول بڑھا۔ اہل کشمیر کا آپس میں رابطہ اور ہندوستان کے تمام علاقوں تک رسائی کا عمل آسان ہوا تو اردو زبان کے نفوذ کا عمل تیزی سے بڑھا۔

علاوہ ازیں ساری دنیا کی طرح کشمیر میں بھی تیزی سے بدلتے حالات کے باعث تعلیم یافتہ اور ہنر مند لوگوں

کی□ یستی امور□ نے اور دفتری امور□ نے اور دفتری کا□ ر سنبھالنے کے لیے ضرورت□ پڑی۔□ یہ □ میں□ پڑھے لکھے لوگوں کی کمی تھی۔ جس کا □ □ یہ □ □ قابض حکمرانوں کی عوام کو اَن□ پڑھ ر□ کی شعوری کوشش تھی۔ اس صورت حال کا ادراک کرتے ہوئے□ صغیر کے□ پڑھے لکھے لوگ□ لعموم اور پنجاب سے□ لخصوص کشمیر کا رخ کرنے لگے۔ حکومت کو بھی□ یستی مشینری کو□ نے کے لیے ای□ ایسے افراد کی اشد ضرورت تھی۔ حبیب کیفوی لکھتے ہیں:

> ''□ یہ □ کو□ پڑھے لکھے لوگوں اور ہنرمندوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو ہندوستان اور پنجاب سے لوگ کشمیر آنے لگے۔ حکومت نے اپنے مفاد کے لیے ان لوگوں کو□ زمینیں دیں اور اچھے اچھے عہدوں□ پر فا□ کیا۔ یہ لوگ اپنی□ ن اردو بھی ساتھ لائے اور مقامی لوگوں کے میل میلاپ سے کشمیر میں اردو کی□ ویج کی سبیل نکل آئی۔''ے

۱۸۵۷ء کی □ آزادی

۱۸۵۷ء کی □ آزادی کی ہمہ گیر□ ات سے جہاں آنے والے دنوں میں□ صغیر میں □ گی کا ہر شعبہ متا□ ہوا۔ وہاں یہ □ کشمیر میں اردو کی□ ویج کے لیے مو□ □ ہوئی۔ مہاراجہ کشمیر گلاب سنگھ نے معاہدہ امرتسر کی رو سے تحر□ آزادی کو کچلنے کے لیے ڈ□ ہ فوج دہلی بھیجی۔ جو □ آزادی کے خاتمے کے□ وجود کافی دنوں□ وہاں مقیم رہی۔ دہلی میں قیام کے دوران اہل دہلی سے میل جول کے□ □ یہ فوجی ان کی□ ن اردو سے بے شمار الفاظ سیکھ چکے تھے۔ لہٰذا □ وہ واپس لوٹے تو اپنے ساتھ کئی الفاظ لائے۔ جو□ یہ □ میں اردو کی ابتدا□ ویج کا□ □ بنے۔ حبیب کیفوی اس□ رے میں لکھتے ہیں:

> ۱۸۵۷ء کی □ آزادی بھی کشمیر میں اردو کی ای□ مو□ □ بنی وہ اس طرح کہ انگر□ وں نے تحر□ آزادی کو کچلنے کے لیے گلاب سنگھ سے فوجی امداد طلب کی۔ گلاب سنگھ اگر□ چہ ۱۸۵۷ء میں حکومتی امور سے اپنے □ رنبیر سنگھ کے حق میں د□ دار ہو چکا تھا□ ہم گلاب سنگھ نے انگر□ وں کا حق نمک ادا کرنے کے لیے ڈ□ ہ فوجیوں کو انگر□ وں کی امداد کے لیے دہلی بھیجا۔ جنہوں نے آزاد پسندیوں کو کچلنے میں اپنی پوری سفا کی اور د□ گی کا ثبوت□ یا۔ □ آزادی ختم ہونے کے□ وجود ڈ□ ہ فوجیں کچھ عرصہ دہلی میں مقیم رہیں اور □ □ یہ □

میں واپس آ□ تو اپنے ساتھ اردو کے بے شمار الفاظ لا□ جس سے کشمیر میں اردو کے رائج
ہونے میں مدد ملی۔''[8]

پنجاب کے میدانی علاقوں سے قر□ کے□ اہل جموں و پنجاب میں قر□ روابط کے□ ان
علاقوں کے□ سیوں کا ہر سطحی□ متا□ فطری امر تھا۔لیکن سر بفلک□ ف پوش کوہساروں سے گھری وادی سے اہل
ہندوستان کا رابطہ کچھ آسان نہ تھا۔البتہ □ ذرائع آمد و رفت میں اضافہ ہوا تو سفری سہولیتیں میسر ہونے کے□
پنجاب اور ہندوستان کے ہر شعبہ□ گی کے لوگ کشمیر کا رخ کرنے لگے۔کشمیر کے دلفری□ □روں، خوبصورت
وادیوں، د□ؤں، سبزہ زاروں اور طلسمی حسن کی جاذ□ نے اہل فکر و□ کی□ ی تعداد کو متوجہ کیا۔وہ اکثر وہاں کے مسحور
کن ماحول سے لطف□ وز ہونے کے لیے سفر کرنے لگے۔ان لوگوں کی آمد و رفت وادی کشمیر میں اردو کی ابتدا□ و تیج
کا اہم وسیل□ □ ہوئی۔

موسیقی و شاعری

□ □ جموں و کشمیر میں اردو کی ابتدا، اشا□ و مقبولیت کے حوالے سے موسیقی کا کردار بھی بہت اہم ہے۔
پہاڑی سارنگی نواز□ اردو گیتوں اور غزلوں سے آشنا ہوئے تو انہوں نے بستی بستی گھوم کر لوگوں کو اس نئی□ ن کے
گیت سنائے جو اپنی□ آفرینی کے□ لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتے اور ان کو ان□ ہو جاتے۔یوں ساز و آواز کا
یہ سنگھم بھی اردو کی□ و تیج میں اہم□ □ ہوا۔

کشمیری حکمرانوں کے د□ ر

□ کشمیر میں ڈ□ ہ راج کو استحکام نصیب ہوا تو اہل اقتدار کے دلوں میں د□ ر کی شان و شو□ □ ھانے کی
سوچ ابھری۔ان کے سامنے مغل حکمرانوں کے د□ ر کی شان و شو□ اور ٹھاٹھ باٹھ بطور نمونہ تھی۔لہٰذا انہوں نے
مغلیہ□ از حکمرانی اختیار کرنے کے لیے علاوہ دوسرو□ توں کے ہندوستان سے نقیب بھی منگوائے جو مہاراجہ کی د□ ر
میں آمد کے موقع□ مغلیہ د□ ر کے□ از میں اس کا اعلان کرتے۔ان لوگوں کے ساتھ ان کے عز□ و اقارب بھی کشمیر
چلے آئے۔ان □ کی□ ن اردو تھی۔یہ مقامی لوگوں سے اردو □ ن میں□ ت □ کرتے۔یوں ان لوگوں کی کشمیر
میں آمد ہی اردو کے فروغ میں خاصی معاون□ □ ہوئی۔اس طرح مہاراجہ رنبیر سنگھ کا خاص محافظ دستہ رام کے روہیلوں

□ مشتمل تھا جو اردو □ ن بولتے تھے۔ کشمیر کے حسن و دلنوازی کے □ حسن □ □ مغل حکمران اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں سمیت اہل اقتدار و اختیار □ اس خطے کا رخ کرتے تو شعراء و علماء اور اہل کسب و کمال کا ا □ قافلہ ان کے ساتھ چلتا □ صغیر سے کشمیر آنے والے ان لوگوں کی □ ری اور عوامی سطح □ □ ائی اور مقبولیت بھی یہاں اردو کی □ وتیج کا □ □ ہوئی۔

تنظیموں اور اداروں کا کردار

اردو کی مقبولیت میں بعض فوجی تنظیموں اور اداروں کا بھی □ ا اہم کردار ہے۔ جنہوں نے اپنی علاقائی شاخیں قائم کر کے اور اپنی تنظیموں کے □ اہتمام تقریبات منعقد کروا کر □ □ میں اردو کو فروغ □۔

ہندوستان کے د□ فنون لطیفہ کی طرح ڈرامہ کا فن بھی □ قی کر □ □۔ تفریحی پہلو اور ہلکے پھلکے □ از کے □ □ یہ صنف لوگوں میں بہت مقبول ہوئی۔ لہٰذا ہندوستان کی ڈرامہ کمپنیاں اکثر □ □ کشمیر کا رخ کرتیں اور اپنے کھیل اسٹیج کرتی تھیں۔ □ □ کے عوام ان تفریحی کھیلوں کو □ ی رغبت سے دیکھتے۔ عوامی ذوق کو دیکھتے ہوئے جموں میں بھی □ □ کمپنی تشکیل دی گئی۔ ان تفریحی □ ں کی □ ن اردو ہوتی تھی۔ یوں ان تھیٹر □ کمپنیوں نے عوام کو تفریح مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ □ □ میں اردو کی □ وتیج میں □ ں کردار ادا کیا۔

مذہبی تحر□ ں اور مجلسوں کا کردار

□ □ میں اردو کے □ نو کی آبیاری اور اسے مضبوط بنانے میں مذہبی تحر□ ں کا کرار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ عیسائی مشنری بھی اپنا لیٹر□ اردو میں شائع کر کے تقسیم کرتے تھے۔ مذہبی اداروں اور شخصیات نے بھی □ □ میں اردو □ ن کے فروغ میں □ اکلیدی کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں □ □ میں رہنے والے اہل تشیع محرم کی مجلس □ ے اہتمام سے منعقد کرتے تھے۔ ان مجالس کا زور □ ھانے کے لیے لکھنؤ سے شیعہ ذاکر خاص دعوتوں □ وہاں تشریف لاتے جو اردو میں سلام و مرثیہ سناتے تھے۔ واقعہ کربلا کے ضمن میں سلام و مرثیہ کے روح کو □ ما دینے والے اشعار جہاں ایمان کی □ زگی کا □ □ ہوتے وہاں یہ اردو کے فروغ میں بھی معاون □ □ ہوتے۔

دارالترجمہ کا قیام اور اردو کا پہلا چھا □ خانہ

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے بے شمار اقدامات غیر محسوس □ از میں اردو کا ذوق پیدا کرنے اور اس کی □ قی میں مدد و

معاون ثابت ہوئے۔ لیکن مہاراجہ کا سب سے بڑا دیدہ شناس کارنامہ، دارالترجمہ اور محکمۂ تالیف و ترجمہ کا قیام تھا۔ جس کا بنیادی مقصد مغربی علوم کو ریاست کی زبانوں بالخصوص اردو میں منتقل کرنا تھا۔ اس کی وساطت سے اگرچہ بعض ترجمے دو تین زبانوں میں ہوئے لیکن زیادہ تر ترجمے اردو میں ہوئے۔ اس طرح اس ادارے نے اردو کے فروغ میں اہم کردار کیا۔

اسی طرح ''احمدی پریس'' اردو کا وہ پہلا چھاپہ خانہ تھا جو ۱۸۵۸ء میں جموں میں قائم ہوا۔ اس چھاپہ خانے کے قیام سے ریاست میں اردو کی ترقی کا ایک اور زینہ طے ہوا۔ اس کے بعد 'وکرم بلاس'، 'پبلک پرنٹنگ پریس'، 'دیوان پریس'، 'اونکار پریس'، 'مارتنڈ پریس' اور 'ہمدرد پریس' جیسی پرنٹنگ پریس کے قیام سے اشاعتی مراحل تیزی سے ترقی کرنے لگے۔ اور اس طرح کتابوں کے علاوہ متعدد اردو کے اخبارات بھی منظر عام پر آنے لگے۔

متذکرہ بالا عوامل کے تحت ریاست میں اردو کا رنگ چڑھنے لگا۔ دھیرے دھیرے ادبی اور غیر ادبی تحریریں بھی منظر عام پر آنے لگیں۔ رنبیر سنگھ کے دور حکومت تک اردو نے اپنی مستحکم جگہ بنالی تھی۔ ہر زبان کی طرح ریاست میں اردو کی تحریری روایت کا آغاز نظم سے ہوا۔ اس کی شروعات میرپور (پاکستان کے زیر قبضہ کشمیر میں واقع ہے) کے غلام محی الدین میرپوری کی مثنوی ''گلزار فقیر'' سے ہوئی جو ۱۱۳۱ھ (مطابق 1702-03ء) میں تحریر کی گئی۔ نثری تحریر کا آغاز اس کے کافی عرصہ بعد کیا گیا۔ جو غیر ادبی نثر کی صورت میں سرکاری اشتہارات، اعلان ناموں اور فرامین پر مشتمل ہیں۔ محققین نے ریاست کی ابتدائی نثری تحریر مہتہ شیر سنگھ کے ''سفرنامہ بخارا'' کو مانا ہے جو 1864-65ء میں تحریر کردہ سرکاری وفد کے سفری روداد اور کوائف پر مشتمل رپورٹ ہے۔ حبیب کیفوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> کشمیر اور ہندوستان سے تجارت کے لیے سمرقند و بخارا اور چین کے تاجروں کی سرینگر میں آمد و رفت رہتی تھی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ۶۵-۱۸۶۴ء میں رام پور راجوری کے ایک شخص چودھری مہتہ شیر سنگھ کو تجارتی و سیاسی تعلقات کے امکانات کا جائزہ لینے کے لیے بخارا بھیجا۔ چودھری مہتہ شیر سنگھ نے واپس آکر اردو میں ۱۵۰ صفحات پر مشتمل اپنے سفر کے کوائف اور جائزہ کے نتائج مرتب کر کے پیش کیے۔ یہ رپورٹ ریاست کے سرکاری رکارٹ میں اردو کی پہلی تحریر ہے۔---------------

----

مہتہ شیر سنگھ کی پہلی اردو تحریر کے علاوہ میر پور میں جو جہلم سے ۳۵ میل کے فاصلہ پر ہے اور
ریاست جموں وکشمیر کا ایک حصہ ہے، میاں غلام محی الدین میر پوری نے ۱۳۱۱ھ میں یعنی اب
سے دو سو سٹھ برس قبل 'گلزار فقیر' کے نام سے اردو میں ایک مثنوی لکھی تھی۔''۹

گلزار دہلوی کا ماننا ہے کہ یہ مثنوی شمالی ہند میں اردو کی اولین تحریروں میں سے ہیں۔ پنڈت ہرگوپال کول خستہ کے ''جغرافیہ کشمیر'' (1975) اور 'گلدستہ کشمیر'' (1977) کو اولین مربوط نثری تحریر مانا گیا ہے۔ جب ضابطہ اردو میں تحریک کہ ڈوگرہ سرکار نے اسے سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ ''ودیا بلاس سبھا'' کے قیام کے ساتھ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمے کیے گئے۔ اور ''ودیا بلاس'' اور ''رنبیر'' جیسے سرکار کی پشت پناہی میں شائع ہونے والے اخباروں نے اس کو مزید فروغ دیا۔ پریس پر پابندی کے باوجود مختلف تالیفات منظر عام پر آنے لگیں۔ جس سے اس زبان کی اہمیت اور واضح ہوتی گئی۔ اس کی اسی مقبولیت کے پیش نظر مہاراجہ پرتاب سنگھ نے بیسویں صدی کے اوائل میں اردو کو ریاست جموں کو کشمیر کی سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔ یوں اردو زبان دفتری کام میں استعمال ہونے کے علاوہ تعلیمی نصاب کا ذریعہ بن گئی۔ نیز اردو زبان ریاست میں سیاسی بیداری کا سبب بھی بنی۔ لاہور کے اخبار کوہ نور، زمیندار، اخبار عام، پیسہ اخبار اور الہلال وغیرہ نے کشمیر میں اردو نوازی کے ہی نہیں بلکہ حریت پسندی کے تخم بھی بوئے۔ اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر کا ''انقلاب'' اخبار کشمیر کی تحریک آزادی کا ترجمان بنا۔ ان اخبارات کی پیروی کرتے ہوئے جموں سے بھی اخبارات چھپنا شروع ہو گئے۔ جن میں تحریک آزادی کا موضوع اہم رول رہا اور مقامی اہل قلم نے ملی مذہبی اور سیاسی بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈوگرہ دورِ استبداد میں ریاستی آزادی کا جذبہ حکمرانوں کے طرز عمل سے اور بھی مستحکم ہوا۔ کئی ایک خاندان حکمرانوں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر ہجرت کر گئے۔ ترک وطن کے بعد یہ لوگ ہندوستان میں اِدھر اُدھر بس گئے۔ یہ لوگ اصلاً اور نسلاً کشمیری تھے۔ جنہوں نے تحریک آزادی میں اپنی آواز کو شامل کیا اور اپنا قومی اور مذہبی فرض خیال کیا۔ ان میں وہ کشمیری الاصل زیادہ ایسے تھے جو اپنی شاخِ آشیاں سے زیادہ دور نہ تھے۔ ان لوگوں نے تحریک آزادی میں قلمی جہاد کیا۔ اس سے جہاں تحریک آزادی کشمیر کو بیرون کشمیر تقویت ملی وہاں کشمیر میں اردو ادب کو بھی فروغ ملا۔ کشمیر میں اردو زبان نے تیزی کے ساتھ اپنا اثر ورسوخ قائم کیا۔ کشمیر کی سیاسی جماعتیں بھی اردو کی افادیت سے آگاہ تھیں۔ ان دو بڑی سیاسی جماعتوں مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس سمیت ساری جماعتوں کا لٹریچر اردو میں ہی چھپتا رہا۔ نیشنل کانفرنس کے صدر شیخ محمد عبداللہ نے ایک

موقع پر اردو کے بارے میں کہا تھا:

> ’’نیشنل کانفرنس اس بات پر یقین رکھتی ہے اور واقعات چمکتے ہوئے سورج کی طرح اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس پر ریاست کے تمام لوگ سالہاسال سے تعلیمی اور دوسری ضروریات کے لئے اتفاق کر چکے ہیں۔ آئندہ بھی یہی زبان اُن کی ترقی کا وسیلہ بننے کی اہلیت رکھتی ہے۔‘‘۱۰

کشمیر میں اردو نے جس تیزی کے ساتھ [illegible]ز کیا اس کا اندازہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے دہلی دربار میں ’’کل ہند اردو کانفرنس‘‘ سے کیے گئے خطاب سے ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ’’شاید ہندوستان کے کسی صوبے میں اردو اس قدر مقبول اور رائج نہیں جس قدر کشمیر میں ہے۔ مدارس میں اردو پڑھائی جاتی ہے اور ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ دفاتر کی زبان بھی اردو ہے۔ اور بہت اچھے اردو کے شاعر اور ادیب موجود ہیں۔ وہاں (کشمیر) اسمبلی کے اجلاس کو بھی جا کر دیکھا ہے۔ یہ ممبر اردو میں بلاتکلف تقریر کرتے تھے۔ اور سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ پنجاب اسمبلی میں ایسی اچھی تقریریں نہیں ہوتیں۔‘‘۱۱

ان عوامل کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچنا آسان ہو جاتا ہے کہ تقسیم ہند اور تحریک آزادی کشمیر کے عروج کے وقت (۱۹۴۷ء) اردو جموں و کشمیر میں رابطے کی زبان تھی۔ اس کا اپنا ادب تھا اور حلقہ اثر بھی، اور یہ کہ نصف صدی بعد عوامی سطح پر ریاست میں اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

ریاست کا وجود دو حصوں میں تقسیم ہو جانے بھی اس پر اثر انداز نہ ہو سکا۔ تقسیم ہند اور آزاد ریاست جموں و کشمیر کے قیام کے بعد اس خطہ میں حکومت نے اردو زبان کو ترجیح دی۔ اردو زبان کو آزاد حکومت کی دفتری اور سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ ذریعہ تعلیم بھی اردو ہی رہا۔ نتیجتاً یہاں اردو میں شاعری، افسانوی اور غیر افسانوی تمام اصناف میں بہترین شاہکار منظر عام پر آئے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱) □ ریخ کشمیر،محمود آزاد،ادارہ معروف، کشمیر،ص:۴۰

(۲) میزان،فیض احمد فیض،کراچی، ۱۹۸۷ء،ص:۱۵۴

(۳) نئی تنقید،جمیل جالبی،ڈاکٹر، رائل □ کمپنی، کراچی، ۱۹۸۵ء،ص:۳۱۵

(۴) کشمیر میں اردو، حصہ دوم،عبدالقادر سروری □ وفیسر، کلچرا کیڈمی،ص:۳۳۔۳۴

(۵) کشمیر آزادی کی دہلیز□ ،خواجہ غلام احمد پنڈت،ص:۹۷

(۶) اقبال اور کشمیر،سلیم خان گمی، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۷۷،ص:۲۷

(۷) کشمیر میں اردو، حصہ اول،حبیب کیفوی، میزان □ شرز،ص:۴۸

(۸) ایضاً،ص:۴۸

(۹) ایضاً،ص:۲۴

(۱۰) آتش چنار، شیخ محمد عبداللہ،محمد علی اینڈ □ ،سرینگر،۱۹۸۶ص:۱۱۵۱

(۱۱) خطبات،مولوی عبدالحق،ص:۱۱

□ب سوم: □ی □ جموں وکشمیر میں سوانح نگاری

الف : خودنوشت □ وآپ بیتی □

ب: سوانح نگاری

ج: سفرنامہ □

الف : خودنوشت وآپ بیتی

اللہ کریم نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ اُسے اس کائنات کے تمام جانداروں سے بالاتر اور متعدد صلاحیتوں سے نوازا، عقل وفہم اور شعور سے نوازا کم وبیش ہر انسان کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے، ذاتی تجربات و احساسات ہوتے ہیں۔ شعور لوگ اپنے ان مشاہدات تجربات اور یادوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کی ان یادوں، لمحوں، سرگزشتوں، مسلسل جدوجہد زندگی کے نشیب وفراز کو قلمبند کرتے ہیں تاکہ آنے والے لوگوں کے لیے مشعل راہ بنے۔ ہر فرد میں آگے بڑھنے ترقی کرنے اور زمانے کے لحاظ سے چلنے اور چھاجانے کا مادّہ پیدائشی ہوتا ہے۔ اسی مطابقت سے وہ اپنی عقل وشعور اور لیاقت وصلاحیت کی زور آزمائی کرتا رہتا ہے اور یہ صلاحیت بسا اوقات مواقع کے فقدان کے سبب محدود ہو جاتی ہے۔ بسا اوقات اسی ہنر اور صلاحیت کے سبب انسان اپنے گردوپیش کے حالات اور حادثات پر قابو پا کر اپنے ہمعصروں اور آنے والی نسلوں میں ایک نمایاں مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

نمود اور خودنمائی کا احساس اور انکشاف ذات کا جذبہ ہی انسان کو اپنی ذات اور شخصیت کا اظہار کرنے کے لیے خودنوشت سوانح تحریر کرنے کی تحریک دیتا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسان اپنی خودنمائی کے لیے اور اس جذبے کی تسکین کے لیے ہی اپنی ذات اور شخصیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی خودنوشت سوانح حیات تحریر کرتا ہے۔ بے شک اس کے پیچھے جو مقصد کار فرما ہوتا ہے وہ آئندہ نسلوں کی رہنمائی بھی ہوتی ہے۔

خودنوشت سوانح میں کوئی شخص اپنی زندگی کے متعلق خود لکھتا ہے، واقعات، حالات اور واردات کو خود بیان کرتا ہے، اس میں مصوّر اپنی تصویر خود بناتا ہے، اپنی ماضی کی یادوں اور لمحوں کو تازہ کرتے ہوئے اسے قلمبند کرتا ہے۔ بشری فطرت کے تقاضے کے تحت اس کا غیر ارادی مطمح نظر یہی ہوتا ہے کہ لوگ اسے اس کے کارناموں کی وجہ سے پہچانیں۔ خودنوشت سوانح میں عجز وانکساری کے خواہ کتنے ہی پردے ڈال دئے جائیں لیکن تعلقات اور تسلسل پہ در پہ حلقے کھینچ دئے جاتے ہیں۔ خودنوشت میں مصنف خود ہیرو ہوتا ہے۔ تمام واقعات اور واردات اس کے گردوپیش گھومتے ہیں۔

خودنوشت میں مصنف کی ذہنی اور نفسیاتی کوائف، نشیب وفراز، سرگرمیاں، احساسات، جذبات، مشاہدات

، تجربات زندگی، صداقت وحقیقت اور ادیب وشخصیت خود اپنی زبانی عیاں ہوجاتی ہے۔ اب یہ خودنوشت نگار کی صداقت پسندی، بےباکی اور صاف گوئی پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک حقیقت بیان کرتا ہے۔

جہاں تک جموں کشمیر میں خودنوشت سوانح عمری کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو یہاں بھی خودنوشت سوانح عمری کا میدان زرخیز رہا ہے۔ یہاں کافی تعداد میں ادیبوں نے اپنی سوانح عمریوں کو اس طرح صفحہ قرطاس پر لائے ہیں۔ جو فنی اور تکنیکی اعتبار سے خودنوشت سوانح عمری کے معیار پر کھری اُترتی ہیں۔ اب تک جہاں تک جموں کشمیر میں جو خودنوشت وجود میں آئی ہیں۔ ان میں منشی محمد الدین فوق کی خودنوشت 'سرگذشتِ فوق'، شیخ محمد عبداللہ کی 'آتش چنار'، بیگم ظفر علی کی 'میرے شب وروز'، قدرت اللہ شہاب کی 'شہاب نامہ'، چودھری غلام عباس کی 'کشمکش'، سعید علی شاہ گیلانی کی 'رودِ قفس' اور 'ولر کے کنارے'، پروفیسر شہاب عنایت ملک کی 'یادوں کے لمس'، پروفیسر حامدی کاشمیری کی 'رہگزر در رہگزر'، ڈی ڈی ٹھاکر کی 'یادوں کے باغ'، عبدالرشید بانجوارہ کی 'چنار کے سایے میں' کاچو سکندر خان سکندر کی 'افکار پریشاں یادوں کی دوش میں' اور ابوالاشرف قاری سیف الدین کی 'مہماتِ حیات' وغیرہ خودنوشت سوانح حیات قابل ذکر ہیں۔

سرگذشتِ فوق

''سرگذشتِ فوق'' جہاں تک جموں وکشمیر میں اردو خودنوشت نگاری کی تاریخ کے حوالے سے بحث کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ منشی محمد الدین فوق کی تصنیف ''سرگذشتِ فوق'' کو یہاں کی پہلی خودنوشت سوانح ہونے کا درجہ حاصل ہے اگرچہ یہ خودنوشت زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔ اس بات کی تصدیق علیم الدین سالک کرتے ہیں جو اس مسودے کی عینی شاہد ہیں۔ کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''میرے دوست منشی محمد دین فوق اپنے زمانے کے ایک قابل قدر انسان تھے۔ گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر اور شہرت کو لات مار کر اتنا کام کیا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ وہ ایک کامیاب صحافی، نغز گو شاعر، تاریخ کے جیّد عالم اور اصلاح معاشرے کے بہت بڑے داعی تھے۔ انہوں نے کشمیریوں کو بیدار کرنے کے لیے پچاس برس کام کیا اور یہ ان کی خوش نصیبی

تھی کہ ان کی زندگی ہی میں کشمیری نشئہ حریت سے سرشار ہوکر اپنے دی انسانی حقوق طلب کرنے کے لیے میدانِ گل میں کود پڑے۔ ''سرگذشتِ فوق'' ابھی تک طبا عت کے زیور سے آراستہ نہیں ہوئی۔ وہ مسودے کی صورت میں میرے ایک دوست مولوی عبداللہ قریشی کے پاس موجود ہے۔ اس کے سرسری مطالعہ سے چند ایسی باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں جو کسی اور سرگذشت میں نہیں ملتیں۔ منشی صاحب بہت بڑے سیاح تھے انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں پنجاب، وسط ہند اور راجپوتانہ کی ریاستوں کی سیاحت کی۔ بنگال تک پہنچے اور اپنے مشاہدات سرگذشت میں درج کیے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاستی دنیا برطانوی ہندوستان سے بالکل مختلف تھی۔ راجے مہاراجے ایسی ہستیاں تھیں جن کے بارے میں شیخ سعدی نے فرمایا تھا:

''گاہے بہ سلامے برنجند گاہ ہے بہ دشنامے خلعت می بخشند۔'' [1]

یہ خودنوشت کب لکھی گئی اس کا ذکر تو نہیں ملتا البتہ فوق کی وفات 1947ء سے قبل ہوئی۔ اس سے قبل دوسری کسی خودنوشت کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے۔ فوق نے ایک سیاح کی حیثیت سے پنجاب، کلکتہ، راجپوتانہ ریاستوں، بنگال، کشمیر سمیت دور دور تک سفر کیے تھے۔ جس کہ وجہ سے ان ریاستوں کے راجاؤں، اور رعایا کی سماجی و سیاسی صورتِ حال اس میں ملتی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاستی دنیا برطانوی ہندوستان سے بالکل مختلف تھی۔ راجے مہاراجے ایسی ہستیاں تھیں جو اپنے رعایا کو بھیڑ بکریوں سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے تھے بلکہ انہیں اپنا زر خرید غلام سمجھتے تھے۔ پڑھنا پڑھانا ان کے نقطۂ نظر سے ایک فضول چیز تھی۔ انسانوں سے بیگار لی جاتی اور قسم قسم کے ٹیکس وصول کیے جاتے تھے۔ ڈاکٹر علیم الدین سالک 'سرگذشت فوق' کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''اس آپ بیتی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فوق صاحب خود اس کا مرکزی کردار ہیں۔ وہ ایک منٹ کے لئے بھی اس بات کو فراموش نہیں کرتے کہ وہ اپنی سرگذشت لکھ رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جو شخص بھی ان سے ملا ہے اس کا بیان کرہ انہوں نے اس انداز سے کیا ہے کہ اس کی خوبیاں نمایاں ہوجاتی ہیں اور وہ زندہ جاوید ہوجاتا ہے۔ ان کے بیان میں متانت اور سنجیدگی ہے۔ وہ مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیتے حقیقت کو اس انداز میں بیان

کرتے ہیں کہ اس میں افسانے کا مزہ آتا ہے۔ان کی زندگی میں حیرت انگیز انقلابات
ہندوستان میں کئی تحریکیں اُبھریں، جماعتیں بنیں اور بگڑیں پرانی قدریں مٹیں اور نئی بستیاں
آباد ہوئیں۔ان سب کا ذکر اور آپ کی زندگی کی ہر منزل میں آتا ہے۔''۲؎

منشی محمد الدین فوق 1877ء میں کوٹلی ضلع میر پور کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور مڈل تک کی مزید تعلیم لاہور سے حاصل کی۔فوق اپنی ابتدائی تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ابتدائی تعلیم گھر،تل، جاگے اور لاہور میں ہوئی ،اسی کو ابتدائی سمجھتا ہوں کیونکہ میں مڈل سے آگے نہ جا سکا،لیکن اس زمانے میں مڈل کا امتحان بھی یونیورسٹی کا امتحان تھا اور ہر طلبہ یہی سمجھتا تھا۔''۳؎

فوق ایک تعلیم یافتہ ،متحرک ،فعال ،وسیع مطالعہ،تنہا پسند،سنجیدہ با شعور شخصیت کے مالک تھے۔انہوں نے تاریخ،شاعری،ناول،افسانوی ادب وغیرافسانوی ادب الغرض ہر شعبہ ادب میں طبع آزمائی کی اور کئی معرکتہ الآراء تصانیف اپنی یادگار چھوڑے جن میں تاریخ کشمیر،مختصر تاریخ کشمیر، ناول رنگیلی،وغیرہ اہم ہیں،متعدد رسائل و جرائد اور اخبارات نکالے۔تمام عمر اپنے قلم سے صدیوں سے سوئے ہوئے کشمیری قوم کو خواب بیداری سے جگانے اور اصلاح کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

یوں تو فوق اقبالیات کے سلسلہ میں ابتدائی حوالہ نگاروں میں سے ہیں۔اقبال کے ساتھ ان کا گہرا وابسطہ تھا۔خط و کتابت کے ذریعے مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔اس حوالے سے ان کی تحریروں کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔فوق جس زمانے میں جی رہے تھے۔اس زمانے میں جموں وکشمیر انتشار کا شکار تھی۔اس کے باوجود فوق کی شخصیت میں حصول علم،تحقیق وتنقید،اور اپنے ہم وطنوں کی بیداری اور انہیں ترقی کی راہ پر گامزان کرنے کا جذبہ اور ولولہ اس قدر تھا کہ انہوں نے اس ضمن میں اپنے عہد کی عظیم شخصیتوں و دانشوروں سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کی اور کئی شخصیات سے ملاقات اور خط و کتابت بھی کرتے رہے۔ڈاکٹر اجمل نیازی'سرگذشت فوق' کے حوالے سے یوں لکھتے ہیں:

''سرگذشت فوق آپ بیتی اور جگ بیتی کا ایک دلچسپ امتزاج ہے۔اس میں علامہ اقبال کے علاوہ عبدالحلیم شرر،ابوالکلام آزاد،حالی ،داغ،آزاد،اکبرآلہ آبادی،ظفر علی خان ،آغا حشر

کاندھی، اور کئی اہل علم اور اہل قلم حضرات کے ساتھ فوق کی ملاقاتیں اور خط و کتابت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح ان کے زمانے کے فکری رجحانات اور ذاتی خیالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔'' [۴۲]

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فوق نے اپنی خودنوشت میں ذاتی اور زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے دور کے تمام مسائل سیاسی، سماجی اور معاشرتی غرض ہر شعبۂ ہائے زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ 'سرگزشت فوق' کے مطالعے سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ ایک انقلابی ذہن کے مالک تھے اور دوراندیش بھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو بیدار کرنے کی تحریک چلائی تھی۔ مرتے دم تک اپنے اس مہم اور مشن پر گامزن رہے۔ سیاست میں خاصی دلچسپی رکھتے تھے اور دوقومی نظریے کے حامی تھے۔

اس خودنوشت کی زبان سلیس اور شگفتہ ہے۔ اگرچہ فنی اور تکنیکی اعتبار سے یہ خودنوشت کے معیار پر پوری نہیں اترتی اور اسلوب میں خامیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کمزوریوں کے باوجود یہ ایک اہم خودنوشت ہے کیونکہ جموں و کشمیر میں اس خودنوشت کو سنگ بنیاد کا درجہ حاصل ہے۔ اس سے یہاں کے ادیبوں کو لکھنے کی تحریک ملی۔

کشمکش (۱۹۵۰ء)

''کشمکش'' چودھری غلام عباس کی خودنوشت سوانح ہے۔ جو 1950ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ آپ جموں کی ایک راجپوت گھرانے میں 4 فروری 1904ء کو چودھری نواب خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی ان کے لاولد ماموں نے انہیں گود لیا اس کے بعد انہیں دونوں گھروں سے لاڈ پیار ملنے لگا اس وجہ سے ان کی فطرت میں شرارت اور ضد کی آ گئی۔ اپنی انہی شرارتوں کی وجہ سے بچپن میں کئی اسکولوں سے نکال دیے گئے اور انہوں نے اپنے حقوق کے لیے صدائے احتجاج بلند کیا اور یہ خصلت عملی زندگی کا شیوہ اور شناخت بن گئی۔ ابتدائی تعلیم مشن اسکول جموں سے حاصل کی، 1921ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ پرنس آف ویلز کالج جموں (موجودہ گاندھی میموریل کالج) میں داخلہ لیا۔ 1925ء میں پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن اور 1929ء میں لاء کالج لاہور سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ ڈوگرہ حکومت میں جموں میں سب جج کے عہدے پر فائز ہوگئے لیکن انہیں شخصی راج کے زیر کام کرنا

منظور نہیں تھا۔ زمانہ طالب علمی میں ہی مسلمانان جموں کی تعلیمی و سماجی خدمت کے لیے ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کو دوبارہ قائم کیا۔

اکتوبر 1932ء میں شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مل کر "آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس" کی بنیاد ڈالی۔ شیخ محمد عبداللہ صدر اور غلام عباس جنرل سیکٹری منتخب ہوئے۔ 1934ء میں گرفتار ہوگئے۔ 1942ء میں مسلم کانفرنس کے □ر□ اجلاس کے موقع پر آپ نے خطبہ صدارت میں تحریکِ پاکستان کی بھرپور حمایت اور تعاون کا اعلان کیا۔ فروری 1948ء میں شیخ محمد عبداللہ کے دورِ حکومت میں انہیں اپنے وطن سے نکال دیا گیا۔ ان تمام واقعات اور مشاہدات کا تذکرہ "کشمکش" میں مفصلاً ملتا ہے۔ یہ جموں و کشمیر میں مسلمانوں کی اولین سیاسی پارٹی جموں و کشمیر مسلم کانفرنس وجود میں آئی۔ ریاستی مسلمانوں کی شیرازہ بندی، سیاسی، سماجی اور ملی مسائل کو حل کرنے اور جدوجہدِ آزادی کے لیے زندگی کی آخری لمحوں تک مسلسل سرگرم رہے۔ چودھری غلام عباس نے اپنی ہنگامہ خیز عہد کی داستان کی وضاحت اپنی خودنوشت سوانح حیات "کشمکش" میں کی ہے۔ انہوں نے یہ خودنوشت جموں سنٹرل جیل امپھلا میں اسیری کے ایام میں تحریر کی۔ جسے انہوں نے 1950ء میں مکمل کیا اور زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔

یہ ان کے حسن اخلاق، خلوص، وفاداری، نیکی، عظمت، سادہ لوحی اور سادگی کا نتیجہ ہے کہ آج پچاس سال گزرنے کے بعد بھی پاکستان اور مسلمانانِ جموں و کشمیر کے دلوں میں چودھری غلام عباس کے لیے بے لوث محبت وعقیدت اور احترام ہے اور انہیں قائدِ ملت اور رئیس الاحرار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کی وفات 18 دسمبر 1966ء کو ہوئی۔ آپ کی برسی پر جماعت رئیس الاحرار اور مسلم لیگ ہر سال 18 دسمبر کو رئیس الاحرار کے صدر آفس جمع ہوتے ہیں جن میں انجمن کے کارکن، یونیورسٹی کے اساتذہ و طلباء کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

14 اور 15 اگست 1947ء کو برصغیر کا نقشہ ہی بدل گیا۔ چودھری غلام عباس ان ایام میں سنٹرل جیل امپھلا جموں میں زیرِ عتاب تھے۔ انہوں نے یقیناً جیل کی چاردیواری میں شہر جموں میں شہید ہونے والے فرزندانِ توحید کے آخری کلمات، بے بس مسلم عورتوں کی آہ و پکار اور ان فلک شگاف فریادی چیخیں ایک بے بس قیدی کی طرح کلیجہ تھام کر سُنی ہونگیں۔ ان حالات اور قہر و جبر سے متاثر ہونے والے جموں کے مسلمانوں میں چودھری غلام عباس کا خاندان بھی

شامل تھا۔ چودھری غلام عباس کی صا□ ادی کو بھی اغوا کرلیاگیا تھا۔لیکن اس وقت ایک سردار□ ھ سنگھ نے وحشیوں کے چنگل سے بچالیا تھا۔شیخ محمد عبداللہ ''آتش چنار'' میں اس کام کو اپنے آپ سے منسوب کرتے ہیں۔ جناب امیر احمد شمسی جنہوں نے چودھری غلام عباس کی اس بیٹی سے□ قات کی اور ان کی□ نی دردانگیز داستان و واقعات کو سنا۔ ایک مضمون میں امیر احمد شمسی کی□ نی واقعہ کو اس طرح□ کرتے ہیں:

''1983ء میں میر پور کے منگلا کینٹ میں اس خاتون سے□ قات ہوئی، اُس نے بتایا کہ جموں میں اس کیمپ میں لڑکیوں کی حالات□ قابل بیان تھے۔البتہ میں نے . □ شیخ صا □ کو کیمپ میں دیکھا تو میری کچھ آس بندھی کہ شاید وہ میری مدد کے لیے آئے ہیں□ افسوس جو آس میں نے ان سے بندھی تھی وہ سردار□ ھ سنگھ کے ذریعے پوری ہوئی۔ حالا□ میرے ابّا اور شیخ محمد عبداللہ تحر□ کے ابتدائی ساتھی تھے۔اور دونوں نے پورے آٹھ سال□ ڈ□ ہ سرکار کے خلاف تحر□ کو منظم کیا تھا□ افسوس!!! اللہ رکھا ساغر، کے۔ایچ خورشید اور چودھری غلام عباس تینوں□ □ کے قدآور لیڈر تھے،جن کے سامنے شیخ محمد عبداللہ کی□ نوی حیثیت تھی۔'' ۵

شیخ محمد عبداللہ نے قیام□ کستان کے بعد ان تینوں لیڈروں کو جموں جیل سے نکال کر سچیت□ ھ کے راستے جبرًا□ کستان بھجوا□ ۔وہ جا□ تھے کہ ان لیڈروں کے□ □ کے اس حصے میں موجودگی ان کی لیڈر□ کے لیے خطرہ ہے چو□ چودھری غلام عباس اور ساغر نے ہی جموں میں شیخ عبداللہ کو جموں کی انجمن کی طرف□ سری نگر میں ینگ مینز مسلم ایسوسی ا□ کی شاخ قائم کرنے کی□ غیب دے کر مکتب سیا □ سے متعارف کرا□ تھا۔ چودھری غلام عباس یوں لکھتے ہیں:

''پونچھ اور میر پور میں مسلم ایسوسی ا□ کا□ ا ہوگیا اور سری نگر سے شیخ عبداللہ جموں آئے۔ وہ ان دنوں گورنمنٹ ہائی اسکول میں سائنس کے استاد تھے۔انہوں نے مجھ سے □ قات کرنے کے بعد سری نگر میں ایسوسی ا□ کی□ انچ قائم کرنے کی درخوا □ کی۔ جسے ہم نے□ قاعدہ طور□ منظور کرلیا۔ یہ ہم نے اس لئے کیا کہ حکومت سری نگر میں ایسوسی ا□ کے کام میں قانونی لحاظ سے روڑے نہ اٹکائے۔'' ٦

اس خودنوشت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک زندہ قسم کے راسخ العقیدہ نظریاتی مسلمان، اور نظریاتی سیاست دان تھے۔ وہ ساری زندگی چٹان کی طرح اپنے سیاسی و مذہبی اور نظریاتی اصولوں پر ڈٹے رہے آتے ہیں۔ انہوں نے ریاست میں تحریک آزادی کی بنیاد رکھی اور ملّت اسلامیہ جموں وکشمیر کا فریضہ کمالِ دیانت داری اور خلوص کے ساتھ ادا کیا۔ ''کشمکش'' چودھری مرحوم کی سوانح حیات ہی نہیں بلکہ تحریک آزادی جموں کشمیر کی ابتدائی پچاس سالوں کی مستند تاریخ، اس راہ میں پیش آنے والے حالات و واقعات اور واردات پر اپنے رفیقوں اور رقیبوں کی وفاداریوں اور دغابازیوں کا تذکرہ ہے۔ انہوں نے زندگی کے تلخ و شیریں تجربات، نشیب و فراز، اپنوں اور غیروں کی نیکی و بدی، ضمیر فروشوں اور بے قدروں کے حوالے سے جو کچھ رقم کیا ہے اس کا ہر لفظ لفظ تاریخ کا آئینہ ہے۔ قوم اور ملّت کے حقوق کے لیے احتجاج کرنے کی پاداش میں عمر کا بیشتر حصّہ انہوں نے اسیری میں گذارا۔ جیل خانوں میں چار دیواری کے اندر انہیں وقت گذاری کے لیے کوئی دوسرا وسیلہ میّسر نہ تھا۔ اس لیے عبادت سے فراغت کے بعد وہ وقت مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ یہاں انہوں نے سیاست اور قانونی کے کتب کے علاوہ مذہبی کتابیں، قرآن پاک کی تفسیریں، لٹریچر، اقبالیات، فلسفہ اور ہندوؤں کی مقدس کتاب بھگوت گیتا کا غور سے مطالعہ کیا جس سے ان کی سوچ، شعور اور افکار میں مزید وسعت، سنجیدگی اور پختگی کے ساتھ ساتھ سیکولر ذہن کی تشکیل ہوئی۔ اس بات کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہو جاتا ہے:

> ''اسلامی کتب کے مطالعے کے دوران مجھے اتفاقاً تلک کی مترجمہ بھگوت گیتا کا ایک نسخہ مل گیا۔ گیتا گہرے مطالعہ کی محتاج ہے۔ اس کتاب کی ابتداہی ظلم کے خلاف سے ہوتی ہے۔ بقول قرآن حکیم خدا تعالیٰ نے ہر قریہ اور ہر بستی میں انسانی اصلاح کیلئے اپنے مرسل مبعوث کیے ہیں۔ ہندوستان بھی اس نعمت خداوندی سے محروم نہیں رہ سکتا تھا۔ ممکن ہے اصل گیتا کا مصنف ایسی ہی کوئی مقدس ہستی ہو۔''[7]

1932ء سے 1936ء تک ینگ مینز ایسوسی ایشن نے تحریک آزادی کی مہم چلائی۔ اس دور میں ذرائع ابلاغ ونشر و اشاعت کے وسائل محدود تھے۔ اس لیے ان کارکنوں کو دور دراز کے دیہی علاقوں کی مسافت طے کر کے اور پیدل چل کے ان دور دراز علاقوں میں عوام کے مسائل دیکھنے اور ان تک پیغام پہنچانے کے لیے جانا پڑتا تھا اور عوام کے دلوں میں حکومت کے ظلم و تشدد کے خلاف اور انسانی حقوق کے لیے صدائے احتجاج بلند کرنے کی تحریک چلائی ان سالوں میں

مسلم کانفرنس نے میر پور، پونچھ، جموں اور سری نگر میں بڑے بڑے اجلاس منعقد کیے۔ جس کی صدارت چودھری غلام عباس اور شیخ محمد عبداللہ نے کی۔ ان جلسوں وجلوسوں میں لاکھوں کی تعداد میں عوام شریک ہوتے تھے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم افراد بھی تندہی سے شمولیت کرتے تھے۔

چودھری مرحوم بنیادی طور پر تجربہ کار سیاستدان تھے تخلیق کار نہیں لیکن حالات اور وقت نے ان کے اندر تخلیقی صلاحیت کو نکھارا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ''کشمکش'' میں بعض جگہوں پر تشبیہات اور استعارات پیدا کرنے کے لیے علمِ بلاغت اور صنعتوں کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔ تجاہل عارفانہ کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

> ''کس قدر شرم کی بات ہے کہ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود بھی ہمارے چند مسلمان جواہر لال نہرو اور گاندھی کو اپنا دوست اور قائد اعظم کو اپنا دشمن سمجھتے رہے۔ دراصل تمام تر طور کا دارومدار نیّت اور ضمیر پر ہے۔ جسکی نیت خراب ہوگی اور جو اپنا ضمیر کھو چکا اس کے لئے اچھے اور برے اور دوست و دشمن کی تمیز ہی کیا ہے۔''۸

قیام پاکستان کے بعد چودھری غلام عباس نے 1954ء سے سیاست سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ایک متحرک اور فعال سیاستدان سیاسی ہنگامیوں سے کیسے دور رہ سکتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے زیر قبضہ کشمیر میں دوبارہ مسلم کانفرنس کی شیرازہ بندی کرائی اور وہ اس خطہ کے صدر منتخب ہوگئے۔ لیکن بہت جلد انہیں یہاں بھی اپنے ساتھیوں کی دغا بازیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت پاکستانی سیاستدانوں اور اس خطے کے حکمرانوں میں ایک سیاسی رسہ کشی چل رہی تھی اور ایک طرح کی ناراض گی کی کیفیت تھی۔ بقول امیر احمد شمسی:

> ''اس خطہ پاک سردار محمد ابراہیم خان کی قیادت میں ''آزاد حکومت'' قائم ہوئی تھی جس کا نگرانِ اعلیٰ چودھری غلام عباس کو بنایا گیا۔ پاکستان اور آزاد کشمیر کے تمام سیاستدان اس وقت کے آپس میں دستِ گریبان تھے۔ اور ایک قسم کی طوائف الملوکی کی کیفیت طاری تھی۔''۹

آزاد کشمیر پاکستانی حکمرانوں اور بیوروکریسی کے اس رویّے نے طرز عمل کے باعث چودھری مرحوم بد دل ہو کے آزاد حکومت کی سربراہی سے مستعفی ہوئے اور اپنے بھائی آر۔ زبیر چیف انجینئر کے پاس سرگودھا میں جا کے وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

مِن جملہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ 'کشمکش' میں چودھری غلام عباس نے اپنی ذاتی زندگی سے متعلق اختصار سے کام

لیا ہے اور اپنے دور کے تمام سیاسی وسماجی پہلوؤں اور مسائل پر نہایت عمدہ طر□ سے روشنی ڈالی ہے۔اس کتاب سے اس عہد کی □ر□ ،سماجی ،سیاسی ،اقتصادی اور تہذ□ زندگی کے تمام کوائف وحالات پر روشنی پڑتی ہے۔خودنو□ □ نگار نے اپنے مشاہدات ،تجربات ،واردات ،واقعات ،اور □داشت ،زندگی کے تلخ وشیریں حقائق کو صفحۂ قرطاس پر اپنے منفرد □ از واسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے۔البتہ اس کتاب میں کچھ فنی خامیاں بھی موجود ہیں ۔□اس کے □ وجود بھی اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

میرے □ شتہ روزو□ □ ۔(۱۹۶۵ء)

''میرے □ شتہ روزو□ □'' پروفیسر جگن □ تھ آزاد کی خودنو□ □ سوانح حیات ہے ۔58 صفحات پر مشتمل یہ مختصرسی کتاب 1965ء میں جامعہ مکتبہ دہلی سے شائع ہوکر منظر عام پر آئی ۔ان کی دوسری خودنو□ □ بعنوان ''بہ سلسلہ روزو□ □'' غیر مطبوعہ ہے۔''میرے □ شتہ روزو□ □'' کا انتساب لاہوراوراس کی □ دوں کے □ م اقبال کی اس غزل سے کیا ہے:

سخن اگر ہمہ شور □ ہ گفتہ ام چہ عجب
کہ ہر کہ گفت زگیسوئے او □ یشاں گفت

پروفیسر جگن □ تھ آزاد 5 دسمبر 1918ء میں عیسیٰ خیل ،تحصیل میاں والی پنجاب (پاکستان) میں اردو کے ا□ مشہور شاعر تلوک چند محروم کے گھر پیدا ہوئے ۔ان کے والد اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے ۔ □ وہ چار □ س کے تھے ۔تو والد کا تبادلہ کلورکوٹ کے اسکول میں ہوا ۔جہاں سے انہوں نے آٹھویں جما □ □ کی پڑھائی کی ۔مز□ تعلیم کے لیے لاہور آئے ۔یہاں D.A.V کالج سے بی اے اور فارسی میں ایم اے کیا ۔اسی دوران وہ حافظ کلام اقبال ہو گئے ۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد فکر معاش دامن گیر ہوئی ۔1941ء میں قائم مقام □ یٹر ماہنامہ ''ادبی د□'' لاہور ،1946ء میں اسسٹنٹ □ یٹر ''جے ہند'' لاہور ،1947ء ہجرت کر کے دہلی آنے کے بعد اسسٹنٹ □ یٹر 'میلاپ'' دہلی 1955ء میں ''ایمپلا □ نیوز'' کے □ یٹر اور 1965ء میں ا□ رمیشن آفیسر مقرر ہوئے ۔پھر □ □ جموں کشمیر کا رخ کیا جہاں مختلف عہدوں پر فا□ رہے ۔□ □ میں انہوں نے اپنے ذمہ داریوں کو بہترین □ از میں ا□ م دے کر کلیدی

رول ادا کیا۔ان کی خدمات کے عوض حکومت جموں وکشمیر نے انہیں ریاست میں مستقل سکونت Permanent Resident ship) فراہم کی۔اس طرح وہ ہمیشہ کے لیے جموں وکشمیر سے جڑ گئے۔امین بنجارا اپنی کتاب ''نذرِ آزاد'' میں لکھتے ہیں:

> ''جگن ناتھ آزاد 1968ء میں مرکزی سرکار کے ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر (پی آئی بی) کی حیثیت سے ریاست میں تشریف لائے تھے۔1977ء میں ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز کے عہدے سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد شعبہ اردو جموں یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے۔1984ء میں جموں یونیورسٹی نے حیات ایمریٹس فیلوشپ کے اعزازِ عظمیٰ سے نواز کر آزاد صاحب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ریاست جموں وکشمیر کا مکین ومقیم بنایا۔ان کی مستقل قیام گاہ گاندھی نگر جموں میں واقع ہے،لیکن حقیقت یہ ہے کہ ریاست کی لاکھوں عوام نے انھیں اپنے دلوں میں بسا رکھا ہے۔ریاست میں اپنے طویل قیام کے دوران ان میں جس قدر علمی،ادبی،تحقیقی،تنقیدی اور تخلیقی کام آزاد صاحب نے کیا ہے اس قدر کام وہ لاہور یا دہلی میں نہیں کر پائے۔حالات نے لاہور ان سے چھینا۔ان کا شعور بالیدگی کی راہوں پر گامزن تھا اور دہلی میں رہتے ہوئے بھی ان کا دل جموں وکشمیر میں دھڑکتا رہا۔شاید اس لیے کہ ریاست ہذا ان کے محبوب شاعر اقبال کے آباواجداد کی سرزمین رہی تھی۔''۱۰

''میرے گذشتہ روز و شب'' میں آزاد کے بچپن کے ایام کے واقعات کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے۔کہ انہیں کس طرح کی[ی] ماحول میں تربیت ملی تھی اور کس طرح شاعری اور ادبی ماحول میں پرورش پائی۔ان کے والد نے انہیں ابجد سکھاتے ہوئے دیوان غالب پکڑایا اور کلام اقبال کو بھی یاد کرایا اس طرح وہ آٹھویں جماعت میں حافظ کلام اقبال ہوگئے۔انہیں خالص ادبی،علمی اور شاعرانہ تہذیب اور ماحول نصیب ہوئی۔والد اپنے ہمراہ مشاعروں میں لے جاتے تھے۔شعرائے کرام سے ملواتے تھے اور اس طرح متعدد شعرا کی صحبت میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔اس طرح ابتدائی عمر سے شعر وشاعری میں دلچسپی اور ذوق وشوق پیدا ہوا۔زمانہ طالب علمی سے کالج کے ادبی پروگراموں اور محفلوں کے منتظم اور روح رواں بنتے تھے اور ساتھ ہی شہر کے مختلف مشاعروں میں حصہ لیتے تھے۔'حلقہ اربابِ ذوق'،اور'حلقہ اربابِ علم' جیسی ادبی تنظیموں سے منسلک رہے۔لاہور انہیں بہت راس آیا تھا ایک طرف یہاں کی خوش

گوارفضا، دوسری طرف یہاں کا علمی وادبی ماحول۔ یہ وہی شہر ہے جہاں انہیں بے شمار ادیبوں، شاعروں اور حلقہ احباب کی صحبت نصیب ہوئی جن کی□ دیں اور محبت آزاد کو عمر بھر بے قرار کرتے رہے۔ اسے اُستا□ جور نجیب آ□ □ اور منشی مصطفٰے جیسے راہنما ملے جن کی شا□ دگی حاصل ہونے کو وہ اپنے لیے□ □ فخر و امتیاز سمجھتے تھے۔ دوستوں میں قتیل شفا□ئی، اختر شیرا□نی، کہ□ ل سنگھ بید□، فضل الرحمٰن اشک□ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس خودنو□ □ میں ان اصحاب کے خاک □ ی ہنر مندی سے کھنچتے ہیں۔ لاہور سے انہیں بے انتہا محبت تھی، اس شہر سے بچھڑنے کا غم انہیں مرتے دم □ ستا□ رہا۔ اس کتاب میں لاہور شہر سے اپنی محبت اور اُنسیت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی□ د آتی ہے راہی کو
کھٹک سی ہے جو □ میں غم نہ بن جائے

مز□ لکھتے ہیں:

''حالات کے تحت میں خود تو دہلی آ□ لیکن میرا دل لاہور میں رہا۔ مدتوں □ ایسا رہا کہ □ پ ریلمنٹ اسٹری□ کے بجائے مال روڑ کا□ م □ ن□ پ آ□ ۔ چا□ نی چوک کا لفظ□ ی مشکل سے□ ن□ پ□ ھا، بلا ارادہ □ م□ ن□ پ آ□ وہ '' □ رکلی'' تھا۔''[۱۱]

□ پ وفیسر جگن□ تھ آزاد نے جس شہر میں اپنا بچپن گذارا وہاں کی آب و ہوا، پہاڑ، وادی، کھیت کھلیان اور مناظر قدرت کی بہترین تصو□ کشی کی ہے اور جس سے ا□ □ دوں کے لمس اور □ وطن کا بخوبی ا□ ازہ ہو جا□ ہے۔ اپنے مقام پیدائش اور وطن کو□ د کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عیسیٰ خیل ا□ چہ اس زمانے میں تحصیل کا صدر مقام تھا، لیکن تھا ا□ بہت چھو□ سا شہر۔ آ□ ی□ ر میں نے اس شہر کو 1934ء میں دیکھا۔ اس وقت □ اس کی طُول وعرض میں کوئی خاص فرق نہیں تھا اب□ کستان □ کے بعد ممکن ہے کہ اس کا شمار بھی□ ے شہروں میں ہونے لگا ہو۔ لیکن یہ شہر چھو□ ہو□ امیرا وطن مالوف ہے، اور میری □ میں اس کی اہمیت کسی بھی□ ے شہر سے کم نہیں۔ یورپ کے اکثر مما لک اور□ ے□ ے شہر دیکھنے کے بعد بھی ا□ کسی جگہ کو دیکھنے کی حسرت اس وقت دل میں ہے تو وہ یہی چھو□ سا شہر عیسیٰ خیل ہے۔''[۱۲]

اس خودنو□ □ میں مصنف نے اپنی پیدائش، جائے پیدائش، خا□ انی پس منظر، بچپن، لڑ□ □ تعلیمی

زندگی، شاعری، دوست واحباب، تقسیم اور ہجرت کی داستان کو نہایت مختصر طور پر پیش کیا ہے۔ خود نوشت نگار نے اپنی ذاتی زندگی، شادی، بیوی بچے، خاندانی پس منظر، گھریلو زندگی کی طرف قلم اٹھانے سے کافی احتیاط برتی ہے۔ اپنے کاموں، مضامین اور شاعری کے بارے میں ایک دو موقعوں پر صرف سرسری سا ذکر کیا ہے۔ اپنے دوست احباب، شاعروں اور ادیبوں سے متعلق دلچسپ باتیں اور یادیں قلم بند کی ہیں۔ لاہور جیسے ادبی زرخیز شہر کو چھوڑ کر دہلی آئے تو ابتدا میں پریشانی ہوئی، غمِ وطن، غمِ یار، اور غمِ روزگار نے گھیر لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ غمِ روزگار کا حل نکل آیا، غمِ یار اور غمِ وطن کو دل میں دفنائے ہوئے اس جہان فانی سے رحلت کر گئے۔

آزاد کو علامہ اقبال سے والہانہ محبت اور حد درجہ عشق تھا۔ بچپن میں ہی اقبال کا سارا کلام حفظ کر چکے تھے پھر اقبال پر شاہکار مقالے لکھنے لگے۔ ماہر اقبالیات کے طور پر جانے جاتے ہیں اور اقبال اور ان پر دو درجن سے زائد کتابیں لکھی ہیں۔ اس قدر محبت اور احترام کے باوجود اسی شہر راولپنڈی میں مقیم رہتے ہوئے بھی انہیں کبھی حضرت علامہ اقبال کا دیدار نصیب نہ ہوا شاید یہ ہجر اور لذت عشق کی انتہا تھی۔ ایک جگہ وہ رقم طراز ہیں:

> ''ایک بار میں نے سالک صاحب سے عرض کیا کہ کسی روز میں آپ کے ساتھ علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ سالک صاحب نے کہا جب تم چاہو میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ لیکن خدا جانے معاملہ کیا تھا، میکلور روڈ سے میں گزر رہا تھا اور ان کی کوٹھی کی جانب قدم بڑھانے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ اصل میں گمان ہی نہ کر سکتا تھا کہ ''شکوہ''، ''جواب شکوہ''، ''شمع اور شاعر''، ''خضر راہ''، ''فریادِ اُمت''، ''طلوع اسلام'' ایسی نظموں کا خالق کوئی عام انسان ہو سکتا ہے۔ میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوں گا تو میرے منہ سے بات کیسے نکلے گی۔ کیا وہ میری آپ کی طرح کرسی پر بیٹھے ہوں گے، پلنگ پر لیٹے ہوں گے؟ کیسے ممکن ہے کہ بانگ درا کے مصنف ہماری آپ کی طرح بات کر رہا ہو۔۔۔ یا آمدے میں چل پھر رہا ہو۔۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔ علاّمہ اقبال سے ملاقات کیسے ممکن ہے؟۔''[۱۳]

جگن ناتھ آزاد علاّمہ اقبال کو اپنا مرشد مانتے تھے محبت اور عقیدت میں اتنی گرم جوشی تھی کہ دل میں عقیدت عشق و محبت کی آگ دہک رہی تھی کبھی ملاقات کرنے کا حوصلہ نہیں جٹا پائے۔ انہیں ہجر میں وہ لذت ملتی تھی کہ کبھی

وصال کی تمنا نہیں کی۔

''میرے گزشتہ روز و شب'' میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنی حیات، واقعات و واردات، ادوار، زندگی کے نشیب و فراز، تجربات و مشاہدات، افکار و شعور، جہد و جہد زندگی کی داستان کو سلیس اسلوب میں تلخیص کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس سے ان کی تخلیقی صلاحیت، حقیقت پسندی، انکشاف ذات اور ادبی صلاحیت و لیاقت عیاں ہو جاتی ہے۔ آزاد نے اپنی خودنوشت سوانح میں مبالغہ کی آمیزش نہیں کی ہے۔ اس کتاب کے موضوع اور فن سے متعلق محمد منظور عالم یوں رقم طراز ہیں:

> ''میرے گزشتہ روز و شب'' آزاد کی یہ سوانح عمری ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت ان کے دوست احباب بہت سے دنیا میں موجود ہے اور اب بھی موجود ہیں [illegible] کسی نے بھی ان کے بیانوں پر اعتراض نہیں کیا نہ ان کی ذہانت پر اور نہ ہی ان کی علمی استعداد، لیاقت، قابلیت، شاعری یا شاعروں کے ذکر میں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آزاد نے حقیقت پسندی سے کام لیا ہے۔''[۱۴]

میرے شب و روز: (۱۹۷۳ء)

''میرے شب و روز'' ریاست جموں و کشمیر کی ایک فعال، متحرک، تعلیم یافتہ خاتون بیگم ظفر علی کی تصنیف ہے۔ یہ خودنوشت 12 مارچ 1973ء کو دہلی سے شائع ہوئی۔ اس میں بیگم ظفر علی کی زندگی کا مکمل احاطہ کیا ہے۔ بیگم ظفر علی کو اردو ادب میں اس لیے بھی اہم مقام حاصل ہے کیونکہ وہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو غیر افسانوی ادب میں طبع آزمائی کرنے والی پہلی خاتون ہیں۔ بیگم ظفر علی کی اس خودنوشت میں ان کی ذاتی اور [illegible] زندگی کے واقعات کے ساتھ ساتھ ریاست جموں و کشمیر کی صورتحال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب مصنفہ کی ذاتی زندگی سے زیادہ ریاست کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور اقتصادی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔

اس آپ بیتی میں عورتوں کو ان کے حقوق دلانے کی پُرزور وکالت کی گئی ہے۔ وہ عورتوں کے مسائل اور ان کے حل کے لیے بالخصوص ریاست کی عورتوں کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں۔ ان کی ان کوششوں و کاوشوں کے پیش [illegible] اس

وقت کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے ریاست جموں وکشمیر میں عورتوں کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری انجمنیں اور اسکول کھولنے کا اہتمام کیا۔اس کے علاوہ بیگم ظفر نے عورتوں کی زندگی ،سیاسی ،سماجی ،خانگی حالات اور مسائل کے حل اور ان کے درمیاں آپسی اور باہمی میل جول بڑھانے کے لیے (Ladies club) کی بھی داغ بیل ڈالی۔اس طرح عورتوں کی طرزِ زندگی کافی بہتر ہوئی۔

اس خودنوشت سے مصنّفہ کے کارنامے اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔جن میں وہ مختلف عہدوں پر فائز رہیں ان میں خاص طور پر ڈپٹی ڈائریکٹر تعلیم نسواں جموں وکشمیر،ممبر قانون ساز اسمبلی جموں کشمیر،ممبر سوشل ویلفیئر بورڈ وایئزری بورڈ اور سیکریٹری آل انڈیا ویمن کانفرنس شامل ہیں۔مصنّفہ نے اپنی خودنوشت میں جن قدآور سیاسی شخصیات کا تذکرہ کیا ہے ان میں شیخ محمد عبداللہ، بیگم شیخ محمد عبداللہ، قائد اعظم محمد علی جناح، مسٹر کاک، بخشی غلام محمد، مس فاطمہ جناح، مسز نہرو وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ان شخصیات کی زندگی کا خاکہ مصنفہ نے عمدگی سے اس طرح کھینچا ہے کہ ہمیں ان کی تمام خوبیاں اور خامیاں صاف نظر آتی ہیں۔

تقسیم ہند کے وقت ہندو مسلم کے درمیان پیدا ہونے والے فرقہ ورانہ فسادات اور انسانی رشتوں کو شرمسار کرنے والے واقعات کا تذکرہ بھی مصنّفہ نے اس خودنوشت میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ان حالات سے جہاں تہذیبی ومعاشرتی زندگی پر گہرا اثر پڑا وہیں ان کی زندگی بھی انتشار کا شکار ہوگئی۔سرحدی خونی لکیر کھینچ کر ملک کا بٹوارہ کیا گیا اور انسانی رشتوں میں بھی دراڑ پڑ گئی۔اس درد سے بیگم ظفر علی کو خود بھی دوچار ہونا پڑا کیونکہ ان کا لخت جگر آغا ناصر علی British India میں سول سروس کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھا جو تقسیم کے بعد وہیں کے ہو کر رہ گئے۔تقسیم وطن اور بٹوارہ کے واقعات کے بیان سے مصنفہ کے دکھ اور درد کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

مصنفہ نے خودنوشت میں قبائلی حملے کا بھی ذکر کیا ہے۔جن قبائلیوں نے اکتوبر 1947ء میں بارہمولہ پر اپنا قبضہ جمالیا تھا۔اور اس دوران ریاست جموں وکشمیر میں ہونے والی خون ریزی کا المناک سانحہ بھی پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ جموں میں R.S.S. کی وحشت ناک حملوں کا بھی بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔1947ء میں جموں میں ہندو اکثریت نے ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیے اور ہزاروں عورتوں اور جوان لڑکیوں کی بے عزتی کرکے [illegible] دیں۔مصنّفہ ایک جگہ ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''وہ لوگ ایک طوفان کی طرح فتح کرتے ہوئے لوگوں کو ہراتے ہوئے بارہمولہ پہنچ گئے
تھے۔ دونوں صوبوں میں ایک جیسی کہانیاں دہرائی جارہی تھیں۔ ایک قبائل سکھوں کو مارتے
ہوئے آئے تو جموں میں مسلمانوں کو R.S.S. نے تہ تیغ کیا، سوائے چند گھرانوں کے
جو استاد محلے میں کرنل پیر محمد کی ہمسائیگی میں اپنی جان بچا سکے۔''۱۵

اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ کس طرح خودنوشت نگار نے سماج میں عورتوں کی سماجی، معاشرتی، تعلیمی، اقتصادی اور تہذیبی زندگی کو خوشگوار بنایا اور اپنی آسائشوں کو قربان کیا۔ انہوں نے دور دراز کے پسماندہ علاقوں میں جا کر خواتین کے مسائل کو حل کیا۔ مصنّفہ اپنی حسیت اور حیثیت کے تحریک سے متاثر تھیں۔ ان کو سماجی وسیاسی مسائل میں عورتوں کی شرکت اور ان کے تعاون کا شدّت سے احساس تھا۔ وہ خود قوم کی ترقی کے لیے اپنے ہمعصر مرد حلقوں کے شانہ بشانہ چلتی رہیں اور اپنی قوم کی عورتوں سے بھی یہی توقع رکھتی تھیں، ان میں عورتوں کے فلاح و بہبودی کا اور ان کو خود کفیل بنانے کا جذبہ شدت سے تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بھی اپنے اہل خانہ کی ترقی۔ اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں بحیثیت ماں اور روشن خیال بیوی کا رول بخوبی سے نبھایا۔ بیگم ظفر علی کی شخصیت، کردار اور سیرت قوم کی عورتوں کے لیے ایک مثال ہے۔

بیگم ظفر نے اس خودنوشت میں اُس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ جب 1953ء میں شیخ محمد عبداللہ نے ان کے لیے واگہ بارڈر پنجاب میں ان کے بڑے آغا شوکت علی سے ملنے کا انتظام کیا۔ انہوں نے آغا کو واپس ہندوستان بلانے کے لیے اصرار کیا لیکن آغا شوکت علی نے آنے سے انکار کیا۔ بیگم کے دونوں بڑے مسلم کانفرنس کے رکن تھے۔ اس سلسلے میں انہیں قید و بند کے سزا بھی کاٹنی پڑی۔ جیل میں ان کے ساتھ کیے گئے سلوک کو بیگم ظفر نے اپنے آنکھوں سے دیکھا تھا اور اپنی اولاد کی تکلیف ان سے برداشت نہیں ہوئی تو شیخ محمد عبداللہ سے ان کی رہائی کی درخواست کی جسے متذکرہ الذکر نے قبول نہیں کی۔ ان تمام واقعات کو انہوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہاں مصنفہ کی ممتا کے احساسات وجذبات اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔

مصنّفہ نے خودنوشت کے آخری حصہ میں ''اسمبلی میں میری پہلی تقریر'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے قانون ساز اسمبلی میں عوامی مسائل کو پیش کیا ہے۔ ریاست کو صنعتی ترقی کی طرف رغبت دلائی ہے۔ اسکولوں میں تعلیمی نظام کی خستہ حالی کو بھی حکومت کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ اس دور کے ایسے مسائل

تھے جس سے □ستی عوام دو چار تھی اور آج بھی یہاں کے تعلیمی نظام خاص طور سے سرکاری اسکولوں کی صورت حال میں بہتری دیکھنے کو نہیں ملتی۔

''میرے شب و روز'' ادبی لحاظ سے بھی ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس میں مصنفہ نے جس اسلوب اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی اور معاشرتی مسائل، اس کے علاوہ خواتین کے مسائل پر توجہ دی ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک اہم خود نوشت ہے۔

آتش چنار۔(۱۹۸۶ء)

''آتش چنار'' ریاست جموں و کشمیر کے پہلے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کی سوانح حیات ہے۔ جسے مصنف نے نظر بندی کے دوران تحریر کیا۔ لیکن بخشی دورِ حکومت میں ان کے رہائش گاہ پر پولیس کی تلاشی کے دوران بہت سے قیمتی دستاویزوں کے ساتھ ان کے لکھے ہوئے مسوّدات کے کچھ حصے بھی تلف ہو گئے۔ جو کچھ محفوظ تھا اسے انہوں نے ریاست کے ایک نامور محقق محمد یوسف ٹینگ کی مدد سے از سرِ نو مرتب کیا۔ بقول ٹینگ: شیخ محمد عبداللہ اپنے واقعات کو سناتے جاتے اور وہ ان واقعات کو قلمبند کر لیا کرتے۔ زبان و بیان کی نوک پلک آل احمد سرور نے درست کی۔ شیخ محمد عبداللہ کی وفات کے بعد ان کی بیگم اکبر جہاں نے پیش لفظ لکھا، مقدمہ محمد یوسف ٹینگ نے تحریر کیا اور یہ کتاب پہلی بار ۱۹۸۶ء میں علی محمد اینڈ سنز، سرینگر سے شائع ہوئی۔ کمال احمد صدیقی اپنی کتاب 'کشمیر: ایک منظر نامہ' میں 'آتش چنار' کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''محمد یوسف ٹینگ کو اس بات پر اصرار ہے کہ شیخ محمد عبداللہ 'آتش چنار' کے ایک ایک لفظ کے مصنف ہیں، کیونکہ وہ بولتے تھے، اور ٹینگ لکھ لیتے تھے۔ مسوّدہ صاف کر کے شیخ صاحب کے سامنے رکھا جاتا تھا۔ اگر وہ اس میں کمی بیشی پاتے، تو انہیں ناگوار ہوتا، اور کبھی کبھی تو مشتعل بھی ہو جاتے۔ مسوّدے کی تصحیح کرتے، اور اس طرح کتاب تیار ہوئی۔ کتاب کی زبان پر ایک نظر آل احمد سرور نے بھی ڈالی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ انہوں نے اسلوب میں کوئی اصلاح نہیں کی۔ اور یہ اچھا ہی کیا۔ اس طرح کشمیر کی اردو کا جو علاقائی رنگ ہے وہ اس کتاب میں سلامت ہے۔'' [۱۶]

کتاب کی ابتدا پنڈت کلہن کے قول اور□ ریشی کے علاوہ علامہ اقبال کے اس شعر سے شروع ہوتی ہے اور اسی طرح اس کتاب کا□ م ہے۔

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتش چنار

ممکن نہیں کہ سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

ا□ ب ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے شہدائے کشمیر کے□ م کیا ہے۔ جنہوں نے اپنے لہو سے چمن لالہ زار کو سینچ کر تحر□ کے اولاؤ کو روشن کر گئے۔

شیخ محمد عبداللہ کی ولادت سری نگر میں صورہ کے مقام□ ہوئی۔ والد کا انتقال ولادت سے چند روز قبل ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کی والدہ نے ان کی□ ورش کی۔ ابتدائی تعلیم کے لیے محلے کے ا□ مکتب میں ان کا داخلہ کر□ ۔ اس مکتب سے وہ قرآن□ ک کی□ آواز بلند اور خوش الحانی سے□ ڑھنے کے لائق ہوئے۔ مکتب سے فارغ ہونے کے بعد ا□ □ ائمری اسکول میں داخلہ لیا۔ وہ اسکول انجمن □ ت الاسلام کے انتظام سے چلتا تھا اور نوشہرہ بستی میں واقع تھا۔ یہاں کی تعلیم اور□ م سے غیر مطمئن ہوکر□ ی□ گ کے ا□ مدرسے میں منتقلی چاہتے تھے۔ لیکن ہیڈ ماسٹر نے انہیں سرٹیفکٹ دینے سے انکار کیا۔ سرٹیفکٹ نہ ملنے□ انہوں نے احتجاج شروع کیا اور یہ احتجاج□ گی کا □ سے پہلا احتجاج تھا۔

□ ک کے بعد ایس پی کالج میں ایف۔اے میں داخلہ لیا۔ ان کا خواب میڈ □ تعلیم حاصل کر کے ا□ قابل ڈاکٹر□ تھا۔ لیکن ان دنوں ڈ□ ہ حکومت کے دور میں مسلمانوں کو□ جیح نہیں دی جاتی تھی بلکہ ان کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی۔ صرف خاشامدیوں کی ہی رسائی تھی۔ کسی بھی اعلیٰ منصب□ مسلمان □ زم نہیں تھا۔ ا□ کوئی □ بھی وہ بھی اپنے آقاؤں کا خوشامدی لوگ □ تھا۔ اس لیے حکومت نے انہیں کسی بھی طرح□ مزد نہیں کیا۔ اور انہیں مجبور ہوکر علی □ ھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ ایس۔ سی کمسٹری کی ڈ□ ی حاصل کرنی□ ڑی۔ شیخ محمد عبداللہ کی شخصیت میں بچپن سے ا□ قسم کی□ □ موجود تھی اور وہ ہمیشہ□ م جوشی سے مسائل کو سلجھا□ جا□ تھے۔□ وقت کا تقاضا یہ نہیں تھا بلکہ صا□ اقتدار ان سے عا□ ی، چاپلوسی اور انکساری چاہتے تھے۔ جو ان کے مزاج کے□ لکل□ عکس تھا۔ کسی کے آگے اپنی□ دن جھکا کر اپنے مسئلہ کو حل کرانے سے انہیں□ ت تھی۔ جو سراسر□ تمیزی اور سرکشی سمجھی جاتی تھی اور اکثر انہیں اس کا خمیازہ

بھی بھگتنا پڑتا تھا۔ ایک خوددار سپاہی کی طرح اپنے دن کو اوپر رکھ کر زندگی گزارنے پر انہیں کافی پریشانی اُٹھانی پڑی۔

ان کی سیاسی زندگی ہنگامہ خیز تھی اور انھوں نے تحریک کشمیر کے لیے اپنی پوری زندگی لگادی۔ وہ ایک متحرک اور فعال سیاست داں تھے۔ اپنی سیاسی زندگی کو اہمیت دے کر اس کا حق ادا کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ازدواجی زندگی کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور عزیزوں نے زبردستی انہیں شادی کے لیے آمادہ کیا۔ اس ضمن میں خودنوشت نگار رقم طراز ہیں:

> ''میں اگرچہ پہلے پہل اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے شادی کے بندھن میں قید نہ ہونا چاہتا تھا لیکن دوستوں احباب نے میری صحت کی طرف میری توجہ دلائی اور کہا کہ شادی اور گھر کا سکھ میری جسمانی راحت اور ذہنی سکون کا باعث بنے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور بڑی وجہ تھی جس نے مجھے شادی کرنے پر مائل کیا۔ میری مقبولیت اور شہرت اب عروج پر تھی۔ میری رہائش گاہ پر میرے مدّاحوں اور عقیدت مندوں کا رات دن تانتا بندھا رہتا تھا۔ مرد تو خیر بڑی تعداد میں آتے لیکن صنفِ نازک کی تعداد بھی کچھ کم نہ ہوتی تھی۔ ان میں جوان رعنا دوشیزائیں اور حسین و جمیل عورتیں شامل ہوتی تھیں۔ میں اس وقت شباب کی نازک منزل میں تھا جبکہ ہر ہر قدم پر لغزش کے امکانات ہوتے ہیں۔ یہ عمر کا وہ والہانہ دور ہوتا ہے . جب کسی جھنکار اور کسی کھنک سے آدمی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔''[12]

1947ء میں مہاراجہ ہری سنگھ اور نیشنل کانفرنس کے صدر شیخ محمد عبداللہ نے جموں وکشمیر کا ہندوستان کے ساتھ عارضی اِلحاق کے لیے حامی بھر لی۔ اس منصوبہ کے بارے میں مختلف دلائل اور وضاحت ملتی ہیں۔ مورخین نے اپنے اپنے نظریے پیش کر کے مختلف نتائج نکالے ہیں۔ لیکن اس عہد کے تمام مسائل، نشیب وفراز، حقیقت، حالات و تناظر اور واقعات سے واقف رہنے والے شیخ محمد عبداللہ اپنے تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر دلائل وشواہد کے ساتھ اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

> '' 1947ء میں . جب دوقومی نظریے کا سیلاب فاتحانہ طور پر آگے بڑھ کر ہر دیوار کو زمین بوس اور ہر فیصل کو ڈھاتا چلا جا رہا تھا۔ تو ہم اس کے آگے سینہ سپر ہو گئے، ہم نے اپنے ہم مذہبوں کے بہائے آگ اور آہن کے سمندر پار کیے اور ہندوستانی کنبے کے ساتھ ہاتھ

> ہیں۔اس لیے کہ ہم مذہب کو سیاست کی بنیاد تسلیم نہیں کرتے تھے۔اس لیے کہ ہم یہ بات جانتے تھے کہ ہندوستان گاندھی اور جواہر لال نہرو جیسے آدرش وادیوں کا ملک ہے اور اس لیے کہ ہم مانتے تھے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ان سے پہلے آنے والے آریاؤں یا دوسرے لوگوں کا جن کے مذہب، رنگ، نسل وغیرہ جدا جدا ہیں۔‘‘ ۱۸

شیخ محمد عبداللہ ایک بہترین مقرر اور ہر دلعزیز رلیڈر تھے۔ان کی تقاریر مُردوں میں بھی نئی زندگی کی تاثیر پیدا کر دیتی تھیں۔خوش الحان قاری تو وہ تھے ہی اس کے علاوہ علامہ اقبال سمیت مختلف شعراء کے کلام سے اپنی تقاریر اور بیان کو پُراثر بنانے کا ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔اس طرح درد انگیز شاعری اور قرآن پاک کی تلاوت سے سامعین اور عوام کے دل پر گہرا اثر ڈالتے تھے اور وہ سن کر خلوص و محبت سے آنسو بہاتے تھے۔اس طرح کشمیری عوام کے دلوں کی دھڑکنوں میں شیخ محمد عبداللہ کے لیے گہری ہمدردی اور بے لوث محبت پیدا ہوئی اور یہ سلسلہ آخری دم تک برقرار رہا۔

شیخ محمد عبداللہ اپنے ابتدائی دنوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے بچپن میں ہی اپنے وطن کے لیے قربانی دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔جس حوصلے، جانفشانی اور دلیری سے کام کرتے اور اجتماع سے خطاب اور صلاح و مشورہ اور حکومت الوقت کی مخالفت کر کے کشمیری عوام کے حقوق کی بات کرتے تھے اس سے ان کی حوصلہ مندی اور بے باکی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔جاگیردرانہ نظام حکومت اور زمینداروں کے ہاتھوں ہو رہے ظلم و استحصال کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔غریب عوام کی حمایت اور زندگی کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا اور اسی کام کو اپنا نصب العین سمجھتے تھے۔اس لیے بہت جلد اپنی ملازمت سے مستعفٰی ہوئے۔ان کی بہادری اور صلاحیت سے متاثر ہو کر میر واعظ یوسف شاہ نے انہیں ’’شیرِ کشمیر‘‘ کا لقب دیا اور یہی نام عرف خاص و عام ہو گیا۔شیخ محمد عبداللہ ایک دوراندیش انسان تھے انہوں نے ابتدا سے ہی عوام کا اعتماد حاصل کر لیا۔

تحریک آزادی کشمیر کے بانی شیخ محمد عبداللہ ہی ہیں اور ان کے ساتھیوں میں اُس عہد کی کشمیر کی نامور لوگ شامل تھے۔عوام کا بھی قدم قدم پر تعاون حاصل رہا۔یہ تحریک شیخ محمد عبداللہ اور چند انقلاب پسند شخصیات کی شمولیت سے ایک تنظیم کے طور پر ابھری اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ کاروان آگے بڑھتا گیا بقول شاعر: لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔

1933ء میں یہ تحریک شروع ہوئی اور 1938ء میں مسلم کانفرنس سے علیحدہ ہو کر نیشنل کانفرنس وجود میں آئی

اور اس کے دروازے بلا امتیاز مذہب وملت، ریاست کے تمام، صوبوں، طبقوں اور فرقوں کے لوگوں کے لیے کھل گئے۔ اس تحریک نے سیکولرازم، سوشل ازم اور جمہوریت کے اصول اپنائے۔ یہی حیثیت اس تحریک کے بنیادی ستون قرار پائے۔ اس تحریک کا منشا ومقصد عوام کو صدیوں کی غلامی اور شخصی راج سے نجات دلانا تھا۔ یہاں کے غریب عوام کو ان کی حقوق دلوانے اور انہیں ایک معیاری طرزِ زندگی دینے کے لیے اس تحریک سے وابستہ نہ جانے کتنی جانیں تلف ہوگئیں۔ شیخ محمد عبداللہ نے اس عظیم تحریک کے قائد کے حیثیت سے بہت سی اذیتیں برداشت کیں۔ ان کی جماعت کے کارکن بھی اس تحریک کو عملی جامہ پہنانے میں قدم قدم پر ان کے ساتھ تھے۔ ابتدا میں گوناگوں ترقی ملی اور انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ ہی عرصے میں اپنی منزل پالیں گے وقت اور حالات ہمیشہ ایک سے نہیں ہوتے۔ کیوں کہ وقت اور حالات بھی کروٹ بدلتے رہتے ہیں۔ ٹھیک یہی صورتحال نیشنل کانفرنس کی جماعت کے ساتھ پیش آئی۔ جماعت کے کچھ اراکین جن میں بخشی غلام محمد، مرزا افضل بیگ، محمد صادق اور مولانا سعید مسعودی شامل تھے اور ان لوگوں نے خوشامدی، لالچ، اور حرص کے اوچھے ہتھکنڈوں سے انتشار پھیلا کر اس تحریک کو درہم برہم کر دیا۔ شیخ محمد عبداللہ کافی دلبرداشتہ ہوئے۔ جس کا اظہار وہ اس شعر کے ذریعہ کرتے ہیں۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

''آتش چنار'' کے مطالعے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ جہاں ایک کہنہ مشق سیاستدان تھے تو وہیں ایک ادیب اور ادب شناس انسان بھی۔ یہ ان کی ادب سے وابستگی، دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ وہ تمام عمر اپنی سیاسی رجحان، شعور اور شعور کی تشکیل وتعمیر کے لیے ہر موقع پر اردو کے نامور شاعروں اور ان کے کلام سے سبق لیتے رہے۔ ان کے کلام سے صدیوں سے تاریکی میں پھنسی کشمیری عوام کو بھی اپنے حقوق اور ترقی سے آشنا کرواتے رہے۔ چاہے وہ علامہ اقبال کی وجودِ حیات وزندگی ہو یا غالب کا مطالعہ کائنات، فیض کی انقلابی شاعری یا ساحرلدھیانوی کی سحر انگیز شاعری۔ اکثر شعراء اور ادیبوں سے مصنف کے گہرے دوستانہ تعلق اور مراسم تھے۔ فیض احمد فیض سے اپنے مراسم کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''فیض ایک اچھے سخنور شاعر تو ہیں ہی لیکن ایک بڑے دانشور بھی ہیں۔ لیکن ان کا جھکاؤ اشتراکیت کی طرف تھا۔ وہ تحریکِ کشمیر کے ہمدردوں میں سے تھے۔ ان کی شخصیت

میں چاندنی کی طرح ایک ملائم روشن خاصیت موجود ہے۔ان کی شادی محمد دین فوق شیر
صاحب کی سالی ایلس جارج سے سرینگر میں ہوئی۔اور میں نے ہی ان کا نکاح پڑھایا۔''[۲۰]

چند اہم شعراء کے علاوہ درجنوں شعراء واُدباء کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ایک بات جو ''تیں ہمالیہ'' کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے کہ تحریک حریت نیشنل کانفرنس اور سرزمین کشمیر کو اس کے ہر دور سے نکال کر راہِ عمل اور نیشنل کانفرنس کو ہر نشیب وفراز میں ساتھ دینے میں ان شعراء نے اپنے کلام، شعور، فلسفہ اور دوراندیشانہ مشوروں کا انمول خزانہ پیش کیا۔اس سے زیادہ ادبی وابستگی کی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب کی ابواب بندی مشہور اشعار کی بنیاد پر کی ہے۔

(Accession of Kashmir) کے تحت پورے ریاست جموں وکشمیر کا ہندوستان کے ساتھ اِلحاق کرنا ایک وقتی ضرورت تھی جو حالات کے پیشِ نظر وجود میں آئی۔تقسیم ملک کا طوفان زوروں پر تھا محمد علی جناح نے نیشنل کانفرنس کے کارکنوں کو بہت سمجھایا اور اپنی تحریک کے ساتھ جڑنے کی تلقین کی۔لیکن کارکنوں اور رہنماؤں نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے تاریخ کے آئینہ میں دیکھتے ہوئے عوام کے مسائل کو مدِنظر رکھ کر ان کے اس مشورے کو رد کردیا اور ہندوستان کے ساتھ بھی حامی نہیں بھری۔اس اِلحاق سے متعلق شیخ محمد عبداللہ کا بیان یہ دیکھئے:

> ''ہمیں پاکستان سے کوئی عناد نہیں ہے۔لیکن ہمارا موقف ہمیشہ یہی رہا ہے کہ کشمیر کے مستقبل
> کا فیصلہ کرنے کا حق صرف کشمیر کے لوگوں کو ہے۔اسی لیے ہندوستان سے الحاق کی نوعیت
> عارضی ہے اور یہ تابع رائے شماری ہے اور ہم بھی رائے شماری کے ذریعے اس کا فیصلہ کرنا
> چاہتے ہیں۔''[۲۱]

پنڈت جواہر لال نہرو ریاست جموں کشمیر کو مٹھی میں ٹھیک اسی طرح لینا چاہتے تھے جس طرح 1947ء میں بے شمار راجاؤں کو Privacy parse کی موٹی رقم دے کر لینے میں کامیاب ہوئے تھے۔لیکن شیخ محمد عبداللہ کا ماننا تھا ایسا کرنا مناسب نہیں کیونکہ یہاں کے عوام کو صدیوں کی غلامی سے نجات ملی ہیں اور وہ کسی بھی طرح کی زور زبردستی کے قائل نہیں۔شیخ محمد عبداللہ چند لمحے کے لیے پریشان ہوگئے اس کے باوجود پنڈت نہرو کی خلوص ومحبت اور ان کو رہنمائے کشمیر مانتے ہوئے ان کے بین الاقوامی شہرت اور کشمیر النسل ہونے کی وجہ سے ان کے عقیدے میں اقبال کا یہ شعر پیش کر کے گفتگو کو ختم کرتے ہیں۔

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز

دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری ۲۲

اس شعر کے مفہوم سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ پنڈت نہرو کے شخصیت اور ان کی لیاقت و حکمت عملی سے متاثر تھے۔

دفعہ 370 (Article 370)

آئین ہند میں ایک ایسی دفعہ شامل ہے جو ریاست جموں و کشمیر کو Special status خصوصی درجہ عطا کرتی ہے۔ اس خصوصی دفعہ کی حقیقت کیا ہے، تشکیل کیسے ہوئی اور اس سے ریاستی عوام کو کیا مفاد اور سہولیت میّسر ہو سکتی ہیں۔ اس کی پوری تفصیل (آتش چنار) میں واضح طور پر دی گئی ہے۔ شیخ محمد عبداللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''یہ سارا معاملہ اقوامِ متحدہ کے فارم میں نہ صرف بحث و مباحثے اور سفارتی سرگرمیوں کا مرکز اور محور بن کر رہ گیا تھا۔ جہاں بار بار ہندوستانی نمائندے بلند آواز سے یقین دلاتے رہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو کشمیر کی سرزمین پر قابض ہونے کی نہ کبھی خواہش تھی اور نہ اب ہے۔ وہ صرف یہی چاہتا ہے کہ ریاست میں اقوامِ متحدہ کی نگرانی رائے شماری کرائی جائے اور یہاں کے لوگوں کو حق دیا جائے کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ آیا وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں یا وہ اپنی ریاست کو آزاد اور خود مختار رکھنے کے حق میں ہیں؟ ان حالات میں ریاست کا ہندویونین میں مکمل انضمام خارج از بحث تھا۔ اس لئے ان تمام باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے آئین ہند کی دفعہ 370 کی تشکیل دی گئی۔'' ۲۳

مسئلہ کشمیر 1947ء کے بعد سے اقوامِ متحدہ میں ایک پیچیدہ مذاکراتی مسئلہ Disscussion Issue اور داستان بن کر رہ گیا۔ اقوامِ متحدہ کی عدالت میں پہلی مرتبہ دونوں ممالک کے نمائندے موجود تھے۔ جس میں کشمیر کی طرف سے شیخ محمد عبداللہ نمائندگی کر رہے تھے۔ اس وقت امریکہ، چین اور روس نے پاکستان کی حمایت کی۔ طویل بحث و مباحثے کے بعد کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے آزادی کے بعد اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود بھی مسئلہ کشمیر اقوامِ متحدہ کے طاق نسیاں پر سجا کر رکھا ہوا ہے۔ ہر بار کمیشن بٹھائے جاتے ہیں۔ گفتگو بحث و مباحثہ کی حد سے کبھی آگے نہیں بڑھتی۔

مصنف نے گاہ بگاہ اپنے خیالات، احساسات اور جذبات کے اظہار کے لیے شاعری کا سہارا لیا ہے۔ خواہ وہ کلام شاعر مشرق علامہ اقبال کے ہوں یا غالب و میر اور دیگر شعراء کے۔ وہ اپنی کسی بات کو واضح کرنا چاہتے ہیں تو خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں اور حالات و کوائف کے مطابق موقع و محل کی مناسبت سے شاعری میں ڈھال دیتے ہیں۔ جن میں ان کی اپنی شاعری بھی شامل ہے۔ جس سے موصوف کی شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ ہوجاتا ہے، جہاں وہ عصری حالات کی ترجمانی کرتے ہیں وہیں روحانیت اور تصوف کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ کے دور میں کشمیر میں فارسی کا چلن عام تھا۔ اس کا ثبوت ''آتش چنار'' میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ متعدد فارسی جملے اور اشعار بھی استعمال ہوئے ہیں۔

بنیادی طور پر شیخ محمد عبداللہ ایک مدبر اور ایک منجھے ہوئے سیاستداں تھے لیکن ان کے اندر کئی اداد صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ وہ بیک وقت ایک دوراندیش اسکالر، مقرر، قاری اور تخلیق کار اور ادیب تھے۔ ''آتش چنار'' میں فارسی، انگریزی اور عربی زبان کے محاورے و مقولے وغیرہ بکثرت مستعمل ہیں۔ موقعہ محل پر موزوں استعارات، تلمیحات کا استعمال کرنا آیات قرآنی، پیش کرنا اور محاورات کا برمحل استعمال ان کی تخلیقی صلاحیت کا پتہ دیتی ہیں۔ مثال کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''آج صبح میں آپ کو پیغام عید دینے کے لئے کسی نکتہ کی تلاش میں تھا کہ قرآن مجید کو کھولوں اور جو سب سے پہلی سورۃ نکلے اسی سے اپنا پیغام اخذ کروں۔ چنانچہ وہاں میری نظر سب سے پہلے القصص کی سورۃ پر پڑی۔ اس سورۃ میں بنی اسرائیل کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ سلام اور فرعون کے ساتھ ان کی کشمکش اور پھر ان کی فتح کا مفصل بیان کیا گیا ہے۔'' [۲۴]

یہ کلمات انہوں نے 1957ء میں جیل سے رہائی کے بعد عید الفطر کی اجتماع میں عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے۔ اس مختصر سے اقتباس میں ایک اہم اسلامی تاریخ پوشیدہ ہے کہ کس طرح منکرِ خدا فرعون نے مفلس اور مجبور بنی اسرائیلوں پر ظلم و جبر اور استحصال کیا اور حضرت موسیٰ علیہ سلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کو بچانے کے لیے پیدا کیا۔ اس بیان میں بخشی غلام محمد کے دورِ حکومت پر طنزیہ انداز میں اشارہ کیا ہے۔

شیخ محمد عبداللہ کو کم وبیش بیس سال تک قید و بند اور جلاوطنی کے سزا کاٹنے کے بعد کسی اہم سیاسی Policy اور مقصد کے لیے واپس دہلی جانے کی اجازت دی گئی۔ مرکزی حکومت میں ان دنوں اندرا گاندھی وزیراعظم تھیں۔ ...

میں سعید میر قاسم ون□ یا اعلیٰ تھے اور ڈاکٹر کرن سنگھ□ی □ میں کانگریس کے سر□ اہ۔ کانگریس کے ارکان نے شیخ محمد عبداللہ کو اپنا قائ□ چن لیا۔ اس□ لتے ہوئے صورتحال کو دیکھ کر میر تقی میر کا یہ شعر مصنف کے نوکِ قلم□ آ جا□ ہے۔

آ□ لیب صلح کر .□ ہو چکی

لے اے□ ن دراز تو □ کچھ سوائے گل ۲۵

اس شعر اور ان واقعات میں گہری وابستگی لگتی ہے کیو□. □ سال بغیر کسی□ م و□ ہ کے قید و بند کی سزا دینا، □ی □ □ رک□ ،اقتدار سے غیر قانونی طو□ ہٹا دینا اور پھر اسی□ رٹی کے ممبران کا انہیں واپس بلا کر استقبال کر کے نئ ذمے دا□ ں سو□ ، سیاس□ ریخ کے اہم واقعات ہیں۔ یہ کوئی سازش تھی□ کوئی دور□ یشانہ منصوبہ۔ یہاں وہ نئے کابینہ کے سر□ اہ کی حیثیت سے چنے گئے جس میں شیخ محمد عبداللہ کے علاوہ مرزا افضل بیگ، صونم□ بو، اور ڈی ڈی ٹھاکر تھے۔ مرزا بیگ کے علاو□ قی دو حضرات کا نہ سیا □ سے تعلق تھا اور نہ شیخ محمد عبداللہ سے، وہ انہیں جا □ □ نہیں تھے۔ پہلی دفعہ□ی □ کے بکھرے ہوئے شیرازے کو سمیٹ کر بغیر کسی چھوت چھات کے تینوں خطوں سے عوام کے□ ئندے چنے گئے۔

خودنو□ □ نگار کی شخصیت میں □ بہ □ الوطنی، ایثار، ا□ ن دوستی، خلوص، اصول□ ستی، منکسر المزاجی اور دردمندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ شا□ یہی وجہ ہے کہ□ □ سال سزائے قید و بند،□ بندی اور□ی □ □ رکی تکلیف دہ، آزمائش اور اذیتیں سہہ کر بھی کبھی اپنے اصولوں اور آدرشوں اور□ یت سے سمجھوتہ نہیں کیا□ دم حیات اُسی□ قائم رہے۔ مشکل□ ین حالات اور حا□ ت کے□ وجود نہ کبھی پشیماں ہوئے نہ ذرّ□ □ اپنے اصولوں سے منحرف ہوئے۔ ''آتش چنار'' میں خودنو□ □ نگار نے حقیقت کو بیان کرنے میں کہیں بھی ک□ ہی نہیں□ تی۔ انہوں نے اپنی ن□ گی اور اطراف میں رو□ ہونے والے طوفان کے□ وجود منزل مقصود کی جا□ رختِ سف□ □ ھا۔ ان کے قدم کبھی ڈگمگائے نہیں۔ ان تمام حقائق کو انہوں نے □ کی سے پیش کیا ہے۔

موضوعاتی اعتبار سے ''آتش چنار'' کو چار حصوں میں تقسیم کر □ ہیں۔ سیا □ ، کشمیر، شاعری اور اسلام۔ جن موضوعات□ انہوں نے قلم اٹھا□ ی ہے۔ ان کے ساتھ انہوں نے ا□ ف□ تنے کی بھرپور کوشش کی۔ ''آتش چنار'' کے موضوعات کے متعلق ڈاکٹر ایس۔ مظفر الدین یوں رقم طراز ہیں:

''سوائے ان چند اوراق کے جن میں ان کی پیدائش، بچپن، تعلیم، والدین کا ذکر، شادی کی روداد ہے، شروع سے آ□ □ کشمیر ہی کشمیر پھیلا ہوا ہے، کشمیر کی وا□ ں، کشمیر کے گاؤں، کشمیر کے لوگ، کشمیر کی غر□، کشمیر کے سیاسی مسائل، کشمیریوں □ ڈھائے جانے والے مظالم، سیاسی استبداد، طبقاتی عصبیت، کشمیر کی سرکاریں، مہاراجا، ان کے حواری، ان کے شوق، ان کی چالیں، ان کے□ ے پھر آزادی کے پس منظر میں کشمیر کی پوز □، دو ملکوں کے درمیان اس زمین کی چھینا □، یہ شیخ عبداللہ کی سوانح بقلم خود کم ہے اور کشمیر کی سوانح بقلم شیخ عبداللہ□ دہ اس خود نو□ □ کے□ ے حصے□ قابض ہے اور آ□ میں جو بچا اسے ہندوستانی سیا □ لے اڑی ہے، آزادی سے پہلے کشمیر ہندوستان کا دل رہا ہے، اور آزادی کے بعد اس کی آ□ و، کشمیر ا□ ایسا انمول ہیرا ہے جسے دونوں ملک اپنے □ سے□ ا□ نہیں چاہتے، اور خود کشمیری کیا چاہتے ہیں وہ اس کتاب میں پوری وضا □ کے ساتھ بیان ہوا ہے۔''[۲۶]

''آتش چنار'' میں مصنف کے بچپن اور ابتدائی تعلیم کے حالات اور کوائف شامل ہیں۔لیکن بہت جلد شیخ محمد عبداللہ کا وجود اپنی مادرِ وطن کے وجود سے مل کر کشمیر کا وجود بن جا□ ہے، اس کے□ وجود ساری داستان میں اپنی شنا□ □ نہیں کھونے دیتے۔ کشمیریوں کے بھوکے چہرے، حقوق سے محروم عوام، مظلوم مسلمان، مقروض کسان او□ مال ا□ □ یہی شیخ محمد عبداللہ کا سیاسی وسماجی چہرہ ہے۔

''آتش چنار'' کی ا□ اور خوبی یہ ہے کہ اس میں کشمیر کی پوری□ ریخ سمٹ آئی ہے۔ سیاسی□ ریخ، سماجی □ ریخ، ادبی□ ریخ، طبقاتی□ ریخ، کشمیری پنڈتوں کا ماضی وحال، ان کی صلاحیتیں، ان کے کا□ مے، ان کی اہمیت، کشمیر کے لوگوں کی فطرت، ر□ ورواج سبھی اپنی اپنی جگہ اپنا اپنا کردار ادا کرتے □ آتے ہیں۔ اسی □ □ مسلمہ طو□ اسے دستا□ کی حیثیت دی گئی ہے۔ کمال احمد صدیقی 'آتشِ چنار' □ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'''' آتشِ چنار' وادیٔ کشمیر میں بولی جانے والی اظہارِ خیال اور بیان کی عام□ ن کے مستند اور معتبر نمونے کی حیثیت سے بھی ا□ اہم لسا□ تی او□ ر□ دستا□ ہے۔''[۲۷]

شیخ محمد عبداللہ نے کچھ اہم واقعات □ قلم نہیں اٹھا□ ہے۔ ایسے واقعات جو ان کی □ گی میں رو□ ہوئے تھے۔ جیسے ان کے□ ینہ ساتھی مرزا افضل بیگ سے خفگی، ان کے□ رٹی کے ساتھ لاتعلقی، ان کی عمر کے آ□ ی دنوں میں

نیشنل کا□نس کا د□ ہوں میں۔□ جا□ ۔’فاروق□ وپ‘ ان کے فر□ ڈاکٹر فاروق عبداللہ اور’خالد□ وپ‘ ان کی بیٹی خالدہ شاہ اور داماد غلام محمد شاہ کے□ کچھ اختلافات کی وجہ سے شیخ محمد عبداللہ کے عمر بھر کے سرمایہ یعنی’نیشنل کا□نس‘ کا شیرازہ بکھر جا□ ۔ یہ واقعات ان کے لیے کافی تکلیف دہ رہے ہونگے لیکن وہ مجبور اور بے بس تھے۔لیکن اس کتاب میں ان واقعات کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

’آتش چنار‘ شیخ محمد عبداللہ کی آپ □ کے ساتھ ساتھ اس دور کی□ سی،قومی اور بین الاقوامی □ گی کے تمام پہلوؤں،سیاسی،سماجی،اقتصادی،تہذ□ اور تعلیمی □ گی□ روشنی□ تی ہے۔□ ن و بیان اور اسلوب کی □ اردو کے شہرہ افاق اور بلند□ یہ خودنوشتوں میں اس کا شمار□ ہے۔

شہاب□ مہ۔(۱۹۸۷ء)

’’شہاب□ مہ‘‘ قدرت اللہ شہاب کی خودنو□ سوانح حیات ہے۔فلیش بیک کی تکنیک□ لکھی گئی یہ ضخیم خودنو□ 59ابواب اور 1247 صفحات□ مشتمل ہے۔اس خودنو□ کی وجہ تصنیف کے متعلق مصنف کے مطابق یہ 9جون 1938ء سے□ قاعدہ ڈا□ ی لکھنے لگے تھے۔جس میں روزمرہ کی □ گی کے اہم واقعات اور احوال کو قلمبند کر لیا کرتے تھے۔اسلام آ□ د میں مشہور شاعرہ محترم□ اجعفری نے ادبی تنظیم’’سلسلہ‘‘ قائم کی تو انہوں نے اس تنظیم کی ادبی اجلاس میں قدرت اللہ شہاب سے ا□ □ ب □ کی خواہش ظاہر کی تو شہاب نے یہاں اپنی ڈا□ ی میں تحر□ یا□ واقعہ س□ جسے لوگوں نے بے حد پسند کیا اور یہ سلسلہ جاری رہا۔پھر ابن صفی،اشفاق احمد□ نو قدسیہ،اور ممتاز شیریں جیسے منفرد تحقیق نگاروں نے اپنے مشوروں سے نواز کرا□ حوصلہ افزائی کی اور اس طرح 1978ء میں یہ شہرہ آفاق خودنو□ منظر عام□ آئی۔

قدرت اللہ شہاب نے نہا□ خوش اسلوبی اور سلیقے سے □ گی کے ابتدائی دنوں کی داستان تحر□ کی ہے اسے □ ھ کر اُس دور کی عوام کے □ گی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ان کے عہدِ طفولیت (Adolcence Period) کے نفسیاتی پہلو بھی اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔بچپن کی آزادانہ □ گی،مصا□ سے بے□ ز،دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے اور ساتھ ہی انہیں□ ھنے کا ذوق شوق اور لگن بھی □ آ□ ہے اور کچھ □ کی معصوم خواہش بھی دل میں ابھرتی

ہے۔اس بات کا اندازہ اس اقتباس سے ہوجاتا ہے:

''میرے ذہن سے ہری سنگھ کیز جموں کی گیٹ کیپر اور رائل سے یا ین کا گارڈ بننے کے خیالات کافور کی طرح اُڑ گئے۔اور چودھری مہتاب الدین کے نقش قدم پر چلنے کی آرزو نے مجھے مچھ کی طرح غڑاپ سے نگل لیا۔''۲۸

اس اقتباس میں ایک بچے کی خواہش اور آرزو کا اندازہ ہوجاتا ہے جس میں وہ اپنے آنے والے مستقبل کی تصویر دیکھتا ہے۔وہ عملی زندگی میں کسی مقام پر پہنچنے کی چاہت رکھتا ہے چاہے وہ گیٹ کیپر ہو یا جہاد میں جامِ شہادت پینے والا چودھری مہتاب الدین ہو۔وہ ان پیشوں کی حقیقت سے ناواقف تھا ہے اور ہر پل لمحے کے ساتھ اس کی خواہشات اور خواب بدلتے رہتے ہیں۔لیکن ایسا کیا ہوا کہ یہی معصوم قدرت اللہ شہاب جو گاؤں نگر جموں کے ایک سرکاری اسکول اکبر اسلامیہ ہائی اسکول سے پڑھ کر ہندوستان کا سب سے مشکل ترین مسابقاتی امتحان .I.C.S جسے آج I.A.S کہا جاتا ہے میں کامیاب ہوکر پہلا مسلمان ICS Officer بن گیا۔اپنی کامیابی کے بارے میں سوچ کر جو دلی کیفیات اور مسرت کا احساس ہوتا ہے وہ اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

''آنکہ پدر نتواند پسر تمام کند''

ترجمہ''جو کام باپ مکمل نہیں کرسکتا بیٹا کرے گا۔''۲۹

اُس وقت ان کے دل میں اپنے باپ کا خیال آتا ہے کہ کس طرح دادی اماں نے انہیں سات سمندر پار اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے جانے سے منع کیا تھا اور عمر بھر ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی۔ان کے والد عبداللہ صاحب کو سرسید نے اس بات پہ خفا ہو کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بے دخل کردیا تھا اور قسم دے رکھی تھی کہ عمر بھر وہ انہیں شکل نہ دکھائیں۔دل میں I.C.S آفیسر بننے کی تمنا لیے وہ علی گڑھ سے دور گلگت کے وزارت میں کمیشنر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔اور ان کے ہونہار بیٹے نے ان کا یہ خواب مکمل کردکھایا۔

قدرت اللہ شہاب پیشے کے اعتبار سے Bureaucrate تھے اور مختلف شعبوں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہنے اور جنرل ایوب خان، یحییٰ خان کے ذاتی مشیر (Personal secerertry) رہنے کی وجہ سے انہیں بڑے بڑے سیاستدانوں، Policy Makers، بیروکریٹ کے ساتھ رہنے، اُٹھنے بیٹھنے، تبادلہ خیال کرنے کا موقعہ ملا۔وہ صاف گو، خوددار، ایماندار، انصاف پسند، دیانتدار اور اصول پسند طبیعت کے مالک تھے اس لیے انہیں عوام کے ساتھ

ہورہی ناانصافی ،ظلم اور جبر کا سخت احساس تھا جوان سے برداشت نہیں ہوتی تھی ۔اس لیے وہ ہر گھڑی عوام کے حق اور حمایت میں کھڑے رہتے تھے ۔انہوں نے ملک میں انگریزوں، ہندوستان کے امیروں، ساہوکاروں، زمینداروں اور راجاؤں کے ہاتھوں غریب عوام کو پٹتے ،مار کھاتے دیکھا۔ یہ لوگ اپنی دولت اور طاقت کے ذریعے غریب اور مجبور عوام میں نفرت اور فرقہ وارانہ فساد کے بیج بوتے تھے ۔''شہاب نامہ'' میں کئی ابواب اسی طرح کے واقعات کی تفصیلات پر ہیں جیسے ''بہار میں ہندو مسلم فسادات'' ۔ان ابواب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح سے امراء اپنے مفاد کے لیے غریب عوام کو استعمال کرتے ہیں ۔

قحط بنگال ہندوستان کی تاریخ میں ایک دردناک اور عبرتناک سانحہ اور واقعہ ہے ۔قدرت کی طرف سے ہندوستانیوں پر ٹوٹ پڑنے والی آفت سے سرزمین بنگال کے بہت سے مقامات پر بھوک افلاس، پیاس وتشنگی کا عالم چھا گیا اور قحطِ بنگال میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ بھوک اور پیاس سے مر گئے ۔سائیکلون نے بھی بے شمار انسانوں پیڑ پودوں اور جانوروں کو بہا کر سمندر کی تہہ میں لے گیا ۔اس خودنوشت میں اس واقعہ کو مصنف نے بڑے دلسوز انداز میں پیش کیا ہے اور ایسی تصویرکشی کی ہے کہ قاری کو ایسا لگتا ہے کہ وہ منظر، خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے ۔شہاب نے ذاتی دلچسپی سے رضا کارانہ طور پر بنگال میں تبادلہ کرا کر کے امدادی محکمہ Relief and Rehibiltiation میں جانے کا فیصلہ کیا۔ وہاں پہنچ کر وہ سارا منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ہندوستانی سیاستدانوں نے انگریزوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور جنگی سپاہیوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ذخیرہ اندوزی پر زور دینے لگے اور عوام کی ضروریات کو یکسر نظرانداز کیا گیا تھا اور جب جاپان کے حملہ آور آسام سے ہوتے ہوئے سرزمین بنگال میں وارد ہو چکے تھے اور انگریزوں کو اس بات کا علم تھا کہ خوراک، چاول اور اناج کی قلت پڑنے والی ہے اس لیے اپنے غذائی اجناس کی فقدان کو پورا کرنے کے لیے پہلے سے ہی گوداموں میں ذخیرہ اندوزی کی گئی تھی ۔جس کا شکار لاکھوں غریب ،مجبور اور لاچار عوام ہوگئی ۔قدرت اللہ شہاب نے ان گوداموں کے تالے توڑا کر اناج کو بھوکوں پیاسوں میں تقسیم کردیے ۔اس ضمن میں اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''ایک روز گودام کے آس پاس تین بچوں اور دو عورتوں کی لاشیں پائی گئیں ۔اب مزید انتظار فضول ہی نہیں بلکہ مجرمانہ غفلت کے مترادف تھا۔ چنانچہ میں نے کانگریس ،مسلم لیگ اور فارورڈ بلاک کے ایک ایک نمائندہ چن کر پولیس کی موجودگی میں گودام کا تالا تڑوایا ،اور

آدھا دھان ان کے حوالے کیا۔ اس کمیٹی نے بڑی محنت اور ایمانداری سے یہ غلّہ سیلاب زدہ دیہات کے مستحق لوگوں میں تقسیم کیا۔''۳۰

خود نوشت نگار اس قوم کو دیکھ کر بھوک اور پیاس کی اہمیت کا اندازہ اچھی طرح ہونے لگتا تھا۔ ان کے مشاہدات کے مطابق بھوک کی موت سب سے زیادہ کربناک اور اذیت دہ ہوتی ہے۔ بھوک اور پیاس کی تکلیف کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اس میں طائرِ روح ایک دم میں قفسِ عنصری سے پرواز نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی کا ہر جوہر رگ رگ اور نس نس سے کشید ہو کر بدن کے پور پور، مسام مسام، رواں رواں سے قطرہ قطرہ دنوں اور ہفتوں ٹپکتا رہتا ہے۔ آگ پر رکھے ہوئے ہوئے ابال کی طرح جسم تشنج کے حلقوں میں جلتا ہے۔''۳۱

''شہاب نامہ'' میں تقسیم ہند کے دردناک اور المناک واقعہ کا تذکرہ نہایت سچائی اور صاف گوئی اور ہنر مندی سے کیا ہے۔ 1947ء کا سال ہندوپاک کی سرزمین کے لیے ایک اذیت ناک اور تکلیف دہ حادثہ تھا۔ اس سال کے پس منظر اور اسباب کے حوالے سے تاریخ کی کتابوں، اخبارات اور رسائل میں جو دلائل، وضاحتیں، معلومات اور بیانات ملتے ہیں۔ 'شہاب نامہ' میں اس کے برعکس حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ مصنف کے اپنے ذاتی تجربات، مشاہدات، نظریات اور اصول ہیں۔ وہ حالات کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ مختلف حالات کو سمجھنے کا انکا الگ زاویہ نگاہ ہے، شہاب کا اپنا الگ سے یہ اور prespective ہے۔ وہ اپنے بیانات کے لیے اور اسے مدلّل بنانے اور شواہد کے ساتھ سمجھانے کے لیے اپنے قاری کو دو کتابوں لطیف گل کی (Passive voice) اور چودھری محمد علی کی (Emergence of Pakistan) کے مطالعہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ 'شہاب نامہ' میں بے شمار سیاستدانوں، کانگریس کے لیڈروں خاص کر گاندھی جی، جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، آر۔ ایس۔ ایس کے لیڈراں، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، وغیرہ کے اصلی چہروں اور منصوبوں کی بے باکی اور صاف گوئی سے کی گئی ہے۔ انہیں ایک Administrator ہونے کی وجہ سے سیاستدانوں کے Master plan کو نزدیک سے دیکھنے، سمجھنے اور جاننے کا موقعہ ملا اور انہوں نے ایک سچے اور ایماندار آفیسر کا کردار نبھایا۔ کانگریس اور ہندو اکثریت دیش بھر میں مسلمان اقلیت پر ظلم و استحصال کرتے رہے۔ ملک کو تقسیم کر کے بھارت کو Common wealth country بنانے اور Lord

Mounbettan کو ہندوستان کا گورنر بنانے کے لیے کروڑوں غریب مسلمانوں کو بے گھر کرنے اور موت کے گھاٹ اُتارنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔لیکن اس سے ہندوعوام کو بھی تکلیف اُٹھانی پڑی۔اس ضمن میں وہ رقمطراز ہیں:

''مہاتما گاندھی کی نام نہاد بے تعصبی کی لنگوٹی بدِمخالف کے جھونکوں میں اُڑ کر دور جا پڑی،اور وہ اپنے اصل رنگ وروغن میں بالکل برہنہ ہوگئے۔اہنسا پرم دھرم کے اس جھوٹے پجاری کے اشاروں پر ناچنے والی انڈین نیشنل کانگرس کے عزائم مسلمانوں کے خلاف اتنے ہی خطرناک اور سنگین نکلے جتنے کہ ہندومہا سبھا یا راشٹریہ سیوک سنگ کے سمجھے جاتے تھے۔''۳۲

قدرت اللہ شہاب کا تعلق ریاست جموں وکشمیر کے صوبہ جموں سے تھا۔یہاں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔یہ خطہ تین مختلف جغرافیائی،مذہبی،تہذیبی اور ثقافتی عوام پر مشتمل ایک ریاست ہے۔جس کے وجود کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔لیکن پنڈت کلہن نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''راج ترنگنی'' میں 4000 سالہ پرانی تاریخ اور تہذیب سے جڑنے کا دعویٰ کیا ہے۔یہاں پر مختلف راجاؤں،سلاطین اور بادشاہوں کی حکومت صدیوں سے رہی۔اس سرزمین کے قدرتی مناظر،فردوس بریں کو دیکھ کر ہمیشہ سے غیرملکی بادشاہوں کی خواہش رہی کہ اس ریاست کو اپنے زیر تسلّط لایا جائے،اور ہوا بھی کچھ ایسا ہی رہا ہے۔مقامی عوام پر ظلم وستم کی بارش برساتے رہے۔یہ سلسلہ ڈوگرہ دورِ حکومت تک مسلسل چلتا رہا۔16 مارچ 1846ء کو معاہدہ امرتسر کے تحت انگریزوں نے اس خطہ خُلدِ بریں کو محض ملبغ 75 لاکھ روپیہ سکہ رائج الوقت کے عوض مہاراجہ گلاب سنگھ کو فروخت کیا۔''شہاب نامہ''میں اس حقیقت اور واقعہ کی پوری تفصیل سے پیش کیا ہے۔یہاں ایک طرف انہوں نے اپنی وطن کی تاریخ اور ماضی پر روشنی ڈالی ہے وہیں دوسری طرف فرزندِ کشمیر ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے اپنی تکلیف اور بغاوت کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''ریاست کا رقبہ 84471 مربع میل تھا۔اس نرخ پر یہ سرزمین رشکِ فردوس بریں تقریباً 155 روپے فی مربع میل بکی۔ موجودہ زمانے کے ایک پیسہ میں تقریباً 270 مربع گز پڑی۔اس وقت کی آبادی کی حساب سے انسانوں کی قیمت تقریباً سات روپے سوا سات روپے فی کس پڑی۔''۳۳

قدرت اللہ شہاب نے اپنے دور کے کئی مشاہیر عالم کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔جو اپنے دور کی اہم ہستیاں تھیں۔ان میں مہاراجہ پرتاب سنگھ،مہاراجہ ہری سنگھ،قائد اعظم محمد علی جناح،پنڈت جواہر لال نہرو،گاندھی جی

،شر□ ئ راگائ ھی،صدر ایوب،شیخ محمد عبداللہ، چودھری غلام عباس کے علاوہ درجنوں شخصیات جن سے ان کا وابستہ رہا ،ان کا خاکہ پیش کیا ہے۔ جہاں ان خاکوں کے تواسط سے شہاب نے ان شخصیات کی ذاتی ئ گی، عادات واطوار، ذہنی ونفسیاتی کوائف پ روشنی ڈالی ہے وہیں ان کی خارجی ئ گی کے ب رے میں بھی تفصیلات دی گئی ہے۔

قدرت اللہ شہاب ئ دی طور پ فکشن نگار تھے شا ی یہی وجہ ہے کہ ان کی خودنو ش پ افسانوی اسلوب،اس ء پ دازی اور مافوق الفطری عناصر کے ث ات غا ب ہیں۔ کچھ محیر العقول واقعات جنہیں عقل تسلیم نہیں کرسکتی لیکن مصنف نے انہیں حقیقی واقعہ قرار د ی ہے ان واقعات کی ت □کی ہے۔ چند ابواب افسانے کی شکل میں لکھی گئی آپ ب ی ہے۔ کچھ واقعات ایسے ملتے ہیں جنہیں مطالعہ کرتے وقت ایسا لگتا ہے کہ کوئی خوبصورت سا افسانہ پ ڑھ رہے ہوں۔ انہوں ں نے اپنے خیالات، احساسات، ب ت، مشاہدات تج ب ت کا اظہار قصہ گوئی ی حکا ی بیانی کے ئ از میں کیا ہے اور قصہ اس ظر□ نہ ئ از سے پیش کیا ہے کہ قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شا ی یہی وجہ ہے کہ ضخامت کے ب وجود بور ی محسوس نہیں ہوتی۔ عقل وفہم سے ب لا ت کئی ایسے تخیلی قصے اور واقعات سناتے ہیں۔ جو حقیقت سے کوسوں دور لگتے ہیں۔ ا ی مثال □ حظہ فرما □ :

''ا ی رات میرے کمرے میں اینٹوں اور پتھروں کی جگہ مُردار ہڈ ی ں ب سنے لگیں۔ ہڈیوں میں چند ا ن ی کھ پ ڑ ی ں بھی تھیں۔ جابجا بکھرا ہوا ہڈیوں اور کھ پ ڑیوں کا یہ ا □ راتنا کر □ المنظر تھا، کہ صبح کا انتظار کئے بغیر میں نے انہیں اکٹھا کر کے ا ی چادر میں ب ن ھا اور انہیں ت لاب میں پھینکنے کے لئے ب ہر لان میں نکل آ ی ا۔ لان میں پہنچتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے زنجیروں کے گُچھے سے میرے دونوں ٹخنوں پ پے در پے زور کی ضربیں لگ رہی ہیں ت لاب سے اس قسم کی آوا ز آمد ہوئی جیسے کوئی غوطہ خو ر پ نی سے ب ہر ابھر ت ا ہے۔ ساتھ ہی ت لاب کے کنارے سبز کائی میں ل ت ہوا ا ی کالا سیاہ سایہ نمودار ہوا، اور خوں خوں کر ت ا ہوا گوریلے کی طرح میری طرف ب ڑھنے لگا۔'' ۳۴

اس اقتباس سے خودنو ش ت کم قصہ ئ ی دہ محسوس ہ ت ا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے شہاب کسی ی ا ن جنگل اور نخلستان کی دی و پ یوں کی داستان اور کالے جادو کا قصّہ سنا رہے ہوں۔ بقول مصنف وہ اس راز سے پ دہ اٹھا ن ا چاہتے تھے۔ آخ ر مصنف کی کوشش رنگ لائی اور وہ اس نتیجے پ پہنچتے ہیں کہ ا ی انگری ز آفیسر اپنی ہندوستانی نوکرانی کو اپنے ہوس کا شکار

بیٹا رہا اور . اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا ہے تو اس وحشی انگریز آفیسر نے کوٹھری کے کسی کمرے میں ماں اور نوزائیدہ بچی دونوں کو مار کے دفنا دیا۔ آس پاس کے لوگ جانتے تھے لیکن مجال ہے کوئی غلام ہندوستانی اپنی بہن بیٹی کا انصاف اپنے انگریز آقا سے مانگنے کی جرأت کرے۔ اس لیے وہ روح سالوں سے اس کوٹھی میں بھٹک رہی تھی۔ شہاب کو . معلوم ہوتا ہے تو وہ ہڈیاں نکال ان کا آخری رسومات ادا کراتا ہے۔ اور اس طرح سے بھٹکتی آتما کو شانتی ملتی ہوتی ہے۔ اور حویلی سے بھوت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ یہاں انگریزوں کی بے رحمی اور ہندوستانیوں کی مظلومیت اور مجبوری کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔

یوں تو اس خودنوشت کو پڑھ کر قدرت اللہ شہاب کا کمال فن، زبان دانی، اظہار بیان کا کمال، صنائع، استعارات و تلمیحات، فصاحت و بلاغت، ظرافت اور جادوئی قلم کا اندازہ ہوتا ہے اور قاری کے ذہن پر اسے گہرے اثرات چھوڑ جاتا ہے کہ اس کی شعور اور دماغ کی نہاں خانوں میں گھر کر جاتے ہیں۔ صنعت تلمیح کی ایک خوبصورت مثال دیکھئے:

> ''اپنے جگر کے گوشوں کو اس افتادہ سے محفوظ رکھنے کے لئے عبداللہ نے اپنے دل میں ایک پختہ منصوبہ تیار کر لیا۔ نہا دھو کر مسجد میں کچھ نفل پڑھے۔ قصاب کی دکان سے ایک تیز دھار چھری مانگ لایا اور گھر آ کر تینوں بیٹیوں کو عصمت کی حفاظت اور سُنتِ ابراہیمی کے فضائل پر بڑا موقر وعظ دیا۔ زہرہ اور عطیہ کم عمر تھیں اور گڑیاں کھیلنے کی حد سے آگے نہ بڑھی تھیں۔ وہ دونوں اچھے کپڑے پہن کر توں میں آ گئیں۔ دلہنوں کی طرح سج دھج کر انہوں نے دو دو نفل پڑھے اور پھر ہنسی خوشی دروازے کی دہلیز پر سر ٹکا کر لیٹ گئیں۔ عبداللہ نے آنکھیں بند کئے بغیر اپنی چھری اٹھائی اور باری باری دونوں کا سر تن سے جدا کر دیا۔ عجیب اتفاق تھا کہ اس روز آسمان کے فرشتے بھی اس قربانی کے لئے دودنبے لانے سے چُوک گئے۔''۳۵

اس اقتباس میں اُس واقعہ کا تذکرہ ہے کہ . 1947ء میں ملک بھر میں دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ جموں میں مہارانی تارا دیوی اور .R.S.S کے ایجنٹ کے دشمنوں نے یہاں اقلیتی مسلمانوں کی خون کی ندیاں بہائیں اور ہزاروں پاک دامن عورتوں اور معصوم لڑکیوں کو آغوا کر کے تقسیم کی گئیں۔ عبداللہ نامی ایک جوشیلے اور بے بس شخص نے اپنی بیٹیوں کو ان کی عصمت اور عفت کی حفاظت کی خاطر سنت ابراہیمی کے تحت ان کو قربان کر

ہیں۔ یہاں اس دور کی سیاسی وسماجی حالات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے شہاب کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ان کے احساسات، جذبات، خیالات، شعور وافکار، تجربات ومشاہدات، سیرت وصورت، بصیرت وبصارت اور داخلی وخارجی مسائل غرض ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔شہاب ایک فرمانبردار فرزند، خود شناس انسان، ایماندار افسر، محنتی، فرض شناس اور ایک صاف گو اور مخلص شخصیت کے مالک تھے۔ایک ایماندار اور فرض شناس بیورکریٹ کا کردار انہوں نے شروع سے آخر تک بحسن وخوبی نبھایا۔سیاستدان، رؤسا، امراء اور ان سے اونچے عہدیداران کی بھی ان سے خوف کھاتے تھے۔انہوں نے ذاتی اور پیشہ ورانہ زندگی میں بھی وہی کام انجام دئے جس کے لیے مذہب اجازت دیتا ہے اور ضمیر گوارا کرتا ہے۔کسی کی حق تلفی نہیں کرتے۔حق الناس کا ایک لقمہ بھی حلق سے اتارنے سے گریز کرتے تھے۔ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''میں نے نہایت لجاجت سے گذارش کی کہ میں اس انعام کا مستحق نہیں ہوں۔یہ سن کر صدر ایوب حیرانی سے بولے،''تمہیں زرعی اراضی حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں؟''''جی نہیں سر''۔میں نے التجا کی۔''آخیر میں فقط دوگز زمین ہی کام آتی ہے۔وہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح مل ہی جاتی ہے۔''۳۶

انہوں نے دفاتر میں مروج رشوت، نذرانہ، بخشش، اور تحفے کا تصوّر ہی ختم کردیا۔وہ اپنے کام کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔رزقِ حلال اور حفظِ ایمان کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتے۔اس لیے صدر ایوب نے جن کے ساتھ انہوں آٹھ سال تک بحیثیت سیکریٹری کے کام کیا تھا ان کی قابلیت اور محنت سے متاثر ہوکر انہیں ایک تحفے کی پیشکش کی جسے انہوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا۔وہ سالہا سال تک اپنی کرسی پر بیٹھ کر حق اور ایمان سے کام انجام دیتے رہے۔

''شہاب نامہ'' میں جذبات نگاری بھی عروج پر آتی ہے۔مصنف کو جن چیزوں اور رشتوں سے جذباتی طور پر گہری وابستگی تھی ان کے ساتھ وقت گزارنے کے مواقع بہت کم ملے۔وہ ان رشتوں کو محبوب اور عزیز رکھتے تھے۔ لیکن کوئی گل چیں اس چمن کو اُجاڑ کر چلا جاتا تھا۔ان کی والدہ بھی جوان عمری ہی میں وفات پا گئیں۔جن کی یاد شہاب کو آخری سانس تک ستاتی رہی۔انہوں نے زندگی میں جن خواتین سے محبت کی وہ انہیں داغ مفارقت دے کر موت کی آغوش میں سو گئیں۔چاہے وہ تیسری جماعت میں زیر تعلیم کے دوران محبت کرنے والی مولوی صاحب کی بیوی، امین

دوالی بملا کماری جن سے عنفوانِ شباب میں محبت کی تھی۔ اپنی بیوی عفت شہاب جو شادی کے اٹھارہ سال بعد شہاب کو ا قب دے کر کر فقط 41 سال کی عمر میں وطن سے دور کینٹ بیری کی قبرستان میں ی نیند سو گئیں۔ان کے چلے جانے قدرت اللہ شہاب اپنے ت،احساسات ،دکھ درد س اُمیدی ،محبت اور دلی کیفیات کو آ کے ساتھ بہانے کے بجائے قلم کے ذریعے محفوظ کرتے رہے اور عمد دا اور خاکے وجود میں آئے۔مثال کے طور ''ماں جی''،''جموں میں پیلک''،''بملا کماری کی بے چین روح''اور''عفت''۔

مجموعی طور کہہ ہیں کہ''شہاب مہ''میں قدرت اللہ شہاب نے اپنے ابتدائی ن گی کے م سے لے کر عہد ضعیفی کی مکمل داستانِ حیات پیش کی۔اس ضخیم خودنو کو موضوعاتی اعتبار سے چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔کشمیر کستان،اسلام اور خود قدرت اللہ شہاب کی شخصیت۔مصنف نے تمام واقعات کو تسلسل سے دلائل اور شواہد کے ساتھ ہے۔ہند ک کے تمام مسائل اور پہلوؤں یعنی سیاسی،سماجی،معاشرتی،تہذ ،ثقافتی اقتصادی ن گی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اس دور کی اہم شخصیات اور سیاسی ر صورتحال کو ڑھنے اور سمجھنے کے لیے یہ کتاب ا اہم دستا کی حیثیت ر ہے۔یہ نہ صرف قدرت اللہ شہاب کی سوانح عمری ہے بلکہ اس عہد کا ا اہم سیاسی ر مرقع ہے۔'شہاب مہ' کا شمار اردو ادب کے اہم خودنوشتوں میں ہے۔

مُہمّاتِ حیات۔(۲۰۰۱ء)

'' مُہمّاتِ حیات''ابواشرف قاضی سیف الدین کی خودنو سوانح حیات ہے۔ان ب والدین کو اس شعر سے کیا ہے۔

روح رم شاد کہ فرمود بہ اُستاد
فرزندِ مرا عشق بیاموز د ہیچ

یہ کتاب سال 2001ء میں جے کے آ دہلی سے شائع ہو کر منظر عام آئی۔200 صفحات مشتمل اس کتاب میں مصنف نے تمام ابواب اختصار سے لکھے ہیں۔اپنی ت کو اختصار سے خودنو کی ہئیت میں ڈھالتے وقت واقعات او داشتوں کو صحت مندطر سے صفحہ قرطاس را ہے۔انہوں نے اس قدر اختصار سے کام لیا ہے کہ

کہیں کہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔اس کتاب میں مصنف نے موقع محل پر اپنے کشمیری، فارسی اور اردو کے اشعار کے علاوہ مشہور شاعروں کے اشعار بھی درج کیے ہیں۔جس سے تحریر کے خوبصورتی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔میر کا مشہور شعر دیکھئے۔

ناحق ہم مجبوریوں پہ یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہے سو آپ کرے، ہم کو عبث بدنام کرے

مصنف کا تعلق سرینگر کے ایک مذہبی اور علمی خاندان سے تھا۔ان کے والد نصیرالدین اور چچا مذہب، دین اور علم کے شیدائی تھے۔اکثر گھر پر علمی و مذہبی محفلیں منعقد کرتے رہتے تھے قرآن خوانی، اجتماعی ذکر واذکار، دعائے فاتحہ ،مسجد میں نماز پنجگانہ کے بعد مذہبی و دینی باتیں، تبلیغ و اشاعت کے تعلق گفت و شنید ہوتی رہتی تھی اور مصنف ابتداء سے ہی ان سے مستفید ہوتے رہے۔جب سے ہوش سنبھالا مسجد میں بلا معاوضہ امامت کرتے رہے۔مسجد کے دیگر انتظامی امور بھی خود ہی دیکھتے تھے۔

فنون و ادب کے میدان میں قاری سیف الدین وسیع تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔وہ بیک وقت ایک قلمکار، شاعر، مزاح گو اور بہترین افسانہ نگار بھی رہے ہیں۔اس خودنوشت میں جا بجا عربی اور فارسی تلمیح و استعارات کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے جو ان کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ اور ثبوت ہے۔انہوں نے ابتدا میں مرزائیت کے لٹریچر کا مطالعہ کیا۔کچھ عرصہ کے لیے مرزائیت کی طرف مائل ہوئے۔لیکن ان کے والد کی بر وقت نصیحت پر پھر سے صحیح راستے پر آ گئے۔اس سے متعلق خودنوشت نگار یوں رقمطراز ہیں:

> ''ایک روز والد مرحوم نے ایسی ہی ایک کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھ سے کتاب کے بارے میں استفسار فرمایا۔فخر کے ساتھ کتاب کا نام لیا اور اس کے مضامین کے بارے میں تھوڑی سی جانکاری دی۔یہ سب کچھ سن کر والد مرحوم نے مسکراتے ہوئے پڑھنے کی اجازت دے تو دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ''دیکھو میں نے اس شہرستان کی خوب دشت نوردی کی ہے اور کوچہ گردی بھی لیکن بیٹا۔تم بھی اپنی بصیرت سے کام لو اور حق و باطل میں تمیز کرنا سیکھ لو۔'' ۳۷

چنانچہ انہوں نے مختلف مذاہب کے کتب کا بغور مطالعہ کیا اور اسلامی کتابوں سے ان کا تقابل کرتے رہتے

تھے۔جس سے ان کی ذہنیت،شعور وافکار اور زاویہ نگاہ میں وسعت آ گئی۔

مصنف نے کشمیر کے اس ا ماحول سے متا ہو کر اس تُند ہوا کے رخ کے ساتھ میدانِ سیا میں قدم رکھا اور نیشنل کا نس کے ساتھ ہاتھ ۔لیکن وقت کے ساتھ انہیں اس ت کا احساس ہوا کہ نیشنل کا نس کی لیسی کشمیری عوام کے حق وحما میں نہیں اور اس رٹی کے لیڈر اپنی سوچ وافکار سے نہیں بلکہ کانگریس کی لیسی کے مطابق چلتے ہیں جو کشمیر کے لیے آئندہ زمانے کے لیے خوشگوا ہو ہیں۔بقول مصنف ''م کشمیر کی سیاسی ،اقتصادی اور سماجی گی کے رے میں کوئی تجربہ نہیں ر ۔ان کا فیصلہ اور منصوبہ کشمیر میں لاکر کشمیر میں لاگو کیا جائے تو نتیجہ بے سود نکلے گا''۔اسی دوزخی سیا سے مایوس ہو کر MLA کے بعد انہوں نے سیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔لہٰذا خودنو نگار کا ماننا یہ ہے کہ ا ،ملّت ،دین اسلام ،مذہب اور قوم کے لیے مقدور بھر مات ا م دینا چاہتا ہے تو آپ سیا کے ذریعہ نہیں بلکہ اسلامی شرعی راہ اختیار کریں ا اللہ منزل مقصو آسانی سے پہنچ سکے اور اللہ تعالیٰ قبول بھی فرمائے گا۔

سیا ک کرنے کے بعد وہ جما اسلامی کے ساتھ ڑ گئے ،پھر مختلف درسگاہوں ،مکتبوں ،تعلیمی اداروں میں درس و ریس کام ا م دیتے رہے اور ہزاروں طلبہ وطالبات کو دین و د سے روشناس کرواتے رہے۔عملی گی کے لیے بھی دیتے تھے۔درسگاہوں کو نے کے لیے انہیں مالی ستی کا سامنا کر تھا۔لوگوں سے چندہ وصول کرنے کے لیے انہیں خود دور دراز علاقوں کا سفر کر تھا او ڑھانے کے لیے بھی اکثر و بیشتر دیہی علاقوں میں قیام کرتے۔لیکن وہ خوشی خوشی اس کام کو قبول کرتے تھے۔انجمن سے وابستگی کے م میں انہیں کئی مرتبہ غیر قانونی طور جیل بھی جا ڑا۔پھر یہ ا معمول ہی بن گیا کہ یہاں کے سیاسی لیڈر انہیں قید کرا اور عوام ان کی حما میں آواز اٹھا کر رہا کراتے۔''مہمات حیات''میں ان توں کا کرہ ملتا ہے۔

مجموعی طور یہ کہہ ہیں کہ''مُہمّاتِ حیات''میں خودنو نگار نے اختصار کے ساتھ اپنے حالات گی ،روادات،س دا ،کشمیر کی سیاسی ومعاشرتی گی ،اپنی خارجی وداخلی گی کے تمام پہلوؤں روشنی ڈالی ہے۔اپنی ذات کے ساتھ ساتھ کشمیر اور اسلامی فرائض کو موضوع یا ہے۔صاف وسلیس ن میں تمام واقعات کو وضا کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

افکارِ پریشان (پردوں کے دوش پر)۔(۲۰۰۱ء)

'افکارِ پریشاں (پردوں کی دوش پر)' ضلع کرگل خطۂ لداخ کے ایک ممتاز ادیب اور اسکالر کاچو سکندر خان سکندر کی خودنوشت سرگذشت ہے۔ جو 2001ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آئی۔ 256 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اوّل صفحہ 196 تک مشتمل ہے جو ان کی سوانح حیات پر ہے۔ حصہ دوم میں مصنف کی طبع زاد اشعار اور نعتیہ کلام شامل ہیں۔ خودنوشت میں اپنی شاعری کو شامل کرنے کے بارے میں وجہ بتاتے ۔۔۔۔کہ ''شاعری کو بھی اس سوانح کے ساتھ چھپوا رہا ہوں کیونکہ یہ بھی میرا ہی کلام ہے جسے میں نے عنفوانِ شباب سے حال تک لکھا ہے''۔ انتساب ان کی رفیقہ حیات رقیہ بانو کے نام کیا ہے۔

کتاب کی ابتدا میں انہوں نے بدلتے ہوئے زمانے کا جائزہ لیا ہے آج کی تیز رفتار زندگی جہاں سائنس کی نت نئے ایجادات، حیرت انگیز اور محیّر العقول ٹکنالوجی نے انسانی طرزِ زندگی میں آسانیاں اور آسائشیں فراہم کی ہیں وہیں مصنف کو اس بات کی تکلیف ہے کہ زمانہ اپنی قدروں کو کھو رہا ہے تہذیب وتمدن، رسم ورواج اور انسانی رشتوں کا شیرازہ بکھرتا جا رہا ہے۔ انہوں نے اپنی 70 سالہ زندگی کے تجربات ومشاہدات کو بیان کرتے ہوئے اپنی تہذیب کی اہمیت کی پُر زور وکالت کی ہے۔ یہ کتاب قدیم وجدید تہذیب اور پرانے اور نئے زمانے کی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ کاچو سکندر خان اس دور کی پیداوار ہیں۔ جب لوگ بڑے سیدھے سادے اور ملنسار ہوا کرتے تھے۔

کاچو سکندر خان سکندر کا تعلق پُورگ (کرگل) کے دَرد شاہی خاندان سے ہے۔ اس خاندان کی بنیاد نویں صدی عیسوی میں درد Dard شہزادہ ٹھاٹھا خان نے گلگت سے آکر یہاں ڈالی تھی۔ کاچو خاندان علاقہ شکر چکتن، سوت اور اقصائے سورو کرچے میں نویں صدی عیسوی سے ڈوگرہ حکومت کے فتحِ لداخ یعنی انیسویں صدی تک سریرِ حکومت رہے۔ ان کے والد راجا اسفندیار خان زیلدار مذکورہ خاندان کی بتیس پُشت پر موضع یقما کھربو، علاقہ شکر چکتن میں رہائش پذیر تھے۔ ان پر اچانک فالج کا حملہ ہوا اور وہ 1932 میں عالمِ جوانی میں ہی فوت ہوئے۔ والدہ کلثوم خاتون دختر راجا حیدر خان ساکن ٹمبس جن کا شاہ بہما گوں سے قریبی رشتہ تھا۔ سکندر خان کی پیدائش ٹمبس گاؤں میں اپنی ننہال میں ہوئی جہاں والدہ اپنے والدین کے پاس مختصر قیام کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ بچپن کرگل کے ایک خوبصورت گاؤں یوقما

کھر بو میں□ ارا۔ا پنے□ ریخ پیدائش سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

''میرے ماں□ پ کہا کرتے تھے کہ میں نے انیسویں صدی عیسوی کی ابتدائی دہائیوں میں آ□ کھولی جبکہ اس خطۂ ارضی یعنی لداخ میں ی□ لدوس' (شاہانِ سلف کا دورِ حکومت) کے □ش ابھی کم وبیش□ زہ تھے اور یہ ابھی ان ہی□ ش□ گا مزان تھا'' ۳۸؎

ابتدائی تعلیم خانگی طرز□ قرآن□ ک سے ہوئی۔ والدین مروجہ د□وی تعلیم دلوانے کی خواہش ر □ تھے۔ لیکن گاؤں میں کوئی سکول نہیں تھا اس لیے گھر سے دور کرگل کے ای□ سرکاری اسکول میں داخلہ دل□ ی□۔ حصول تعلیم کی غرض سے وہ فقط چا□ س کی عمر میں اپنے□ ئی گاؤں سے میلوں دور کا مسافات□ ئے پیدل سفر طے کر کے کرگل پہنچے۔ ان کے چچا□ زمت کے سلسلے میں کرگل میں مقیم تھے ان کے ساتھ رہنے لگے۔ وہ □□ تعلیم حاصل کرنے میں دلچسپی ر □ تھے اس لیے اسکول کے ماحول کے ساتھ جلد ہی کھل گئے۔ اپنی محنت، لیاقت اور سریع العقل کے□ □ ہر جما □ میں اوّل آتے تھے۔ ہر سال وہ کلاس مانیٹر منتخب کئے جاتے تھے۔ درجہ نہم کے بعد کرگل میں lower high secondery school کی□ ڑھائی نہیں ہوتی تھی۔ آگے□ ڑھنے کے لیے سری نگر جا□□ تھا۔ اس زمانے میں آمد ورفت کے لیے شاہراہ نہیں بنی تھی۔ کرگل سے سری نگر□ پہنچنے کے لیے درّہ زوجیلہ عبور کرتے ہوئے ہفتہ بھر کا جوکھم بھر□ پیادہ پیدل سفر طے کر□□ تھا۔ لداخ سے گنتی کے چند ہی لوگ سودا سلف کی□ وفرو□ □ کی غرض سے سرینگر جاتے تھے۔ کاچو سکندر بھی مقامی□ □ وں کے قافلے کے ساتھ سری نگر روانہ ہوگئے۔ یہاں ان کے چچا کے کوئی واقف کار دو □ رہتے تھے چچا نے ان کو تعارف□ مہ بھیج کر ان کے قیام وطعام اور د□ ضرو□ یت کے معقول انتظام کے لیے لکھا۔ شہر سری نگر میں وارد ہوتے ہی انہیں مسرت بھی ہوئی او□ یشانی بھی، خوشی اس لیے کہ ان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش پوری ہونے جا رہی تھی، منزل آنکھوں کے سامنے تھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یتیمی اور غری□ الوطنی کی فکر بھی دامن گیر تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے سرینگر میں اس رحم دل اور مہ□ ن کنبے کے افراد نے انہیں یہ احساس ہونے نہیں□ جن کے ہاں ان کا قیام رہا۔ سرینگر میں اپنے ابتدائی دنوں کے□ رے میں وہ لکھتے ہیں:

''خا□ ر میں میرے بہت اچھے دن□ رے۔ خواجہ صا □ اور ان کا اہلخانہ میرا بہت خیال ر □ تھے۔ میں یوں محسوس کر□ کہ اپنے گھر میں ہوں، میں اپنے اہلخانہ کے ساتھ ہوں □ دیسی نہیں ہوں۔ میرے لئے الگ کمرہ مخصوص تھا۔ نوکر م□ صدقہ اور کمسن خادمہ

''راتی'' میرے لئے کھا نا، کانگڑی لاتے اور دیگر ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔اور دوسرے اہل خانہ بھی ہمیشہ مہربان اور متوجہ تھے۔پانی بجلی اور دیگر لوازمات کا اچھا انتظام تھا۔غرض ہر طرح کا آرام میسر تھا۔''۳۹

اس اقتباس سے کشمیریوں کی مہمان نوازی اور خلوص وملنساری کا اندازہ ہوتا ہے۔یوں بھی یہ قوم اپنی انہی خوبیوں کے لیے عالم میں مشہور رہے۔

پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کر کے سری نگر میں شری پرتاپ سنگھ کالج میں ایف اے آرٹس مضامین میں داخلہ لیا۔پھر بی۔اے۔امر سنگھ ڈگری کالج سے حاصل کی۔دوران تعلیم ملازمت اختیار کی۔اس زمانے میں سرکاری نوکری حاصل کرنا آسان تھا۔لیہہ میں سرکاری اسکول میں بطور ٹیچر مقرر ہوئے۔دو سال تک ریسی کام انجام دینے کے بعد کرگل میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے، چار سال بعد ترقی کر کے اسسٹنٹ ڈی۔سی کے عہدے پر فائز ہوگئے۔1975 میں تحصیلدار کے عہدے دو سال بارہمولہ میں تعینات رہے پانچ سال کے بعد K.A.S بن کر D.C کی حیثیت سے کام کرتے رہے 1980 میں ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔تیس سال کی ملازمت سے فراغت پا کر اب اپنے آبائی گاؤں سنجک میں رہائش پذیر ہیں۔انہیں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔اس سفرنامہ میں انہوں اسلام، اور دین اسلام میں امت کے جو فرائض، ذمہ داری، اعمال، اختیارات، اور اختیارات پر روشنی ڈالی ہے۔دین اسلام کے بارے میں اپنی علمی مشاہدات اور افکار کے ذریعہ دین کی حقیقت، ماہیت، کو واضح کرنے کی سعی کی ہے۔

کاچو سکندر خان شاعری بھی کرتے ہیں۔اپنی شاعری کے ابتدائی ایام کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ مہاراجہ ہری سنگھ ریاست کی ترقی وتعمیر میں ذاتی دلچسپی رکھتے تھے وہ اپنی ریاست اور رعایا کو ہر حال میں آسودہ دیکھنا چاہتے تھے۔چونکہ ریاست کی اقتصادی ومعاشی ترقی وترویج اسی صورت میں ہی ممکن تھی کہ ریاست میں ہریالی ہوں، اس لیے جنگلات کی تحفظ وفروغ کے لیے قوانین نافذ کئے۔''اشجار فروغ درختان'' کی مہم زور وشور سے چل رہی تھی۔لیہہ میں ''اشجار فروغ درختان'' کا دن منایا گیا۔اس جلسے میں انہوں نے اپنی ایک نظم پڑھی۔انہوں نے اس کے کچھ مصرعے درج کئے ہیں۔مصنف لکھتے ہیں کہ پوری نظم ان کی یاداشت سے محو ہوگئی ہیں۔البتہ بعض مصرعے درج کئے ہیں۔

تمنا ہری کی ہم ، بجا □ چین کی بنسی
پھلے پھولے چمن پر سو گوشے گوشے میں خیاباں ہوں
جہاں خارِ مغیلاں وہاں گلزار و بستاں ہوں
خوشا اب رڑے کو آج تحصیلدار آئے ہیں
سکندر کی دعا ہے وہ وطن کی حق میں نیساں یوں [۴۹]

مذکورہ بالا □ میں نہ صرف مہاراجہ ہری سنگھ کی اس کوشش کو دادِ تحسین پیش کیا ہے بلکہ دلی خواہشات کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالا ہے۔

واقعات اور یادشتوں کو صحت مند طر □ سے تفصیلاً بیان کیا ہے۔ اپنے تجربات، مشاہدات، زندگی کے نشیب و فراز، رنج وغم، تکالیف اور مسرتوں کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ کتاب کی وجہ تصنیف کے بارے میں یوں فرماتے ہیں:

> ''یہ تھی میری ملازمت اور ایام ملازمت کی مجملی داستان میں نہیں چاہتا تھا کہ میری سرگذشت کا یہ باب میری سروس ہسٹری شیٹ بن جائے۔ لیکن یہ باتیں چونکہ کہنے کی تھیں۔ ''گزارش احوال واقعی'' ضروری تھی۔''[۵۰]

اس اقتباس سے ان کی ذات، شخصیت، فن، قابلیت، اہلیت، بصارت و بصیرت اور شرافت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مصنف اپنی قابلیت، روادات، واقعات، کارناموں اور حاصل زندگی کو انکشاف نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ اس سے خودنمائی اور خودستائی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ان کے اخلاص اور شرافت کا مسلمہ ثبوت ہے۔

اس خودنوشت میں مصنف نے اپنی یادوں یادداشتوں اور روداد کو داستانوی انداز میں بیان کیا ہے۔ شاید اس لیے کہ لداخی تہذیب میں حکایتوں اور روایتی قصوں کا شغف زیادہ رہا ہے۔ اور مصنف نے ہی تبّت لداخ کی مشہور داستان ''گیالم کیسر'' کا ترجمہ کر کے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ کاچو سکندر خان سکندر نے اپنی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس خودنوشت میں مصنف نے اپنے بچپن کی یادوں، اس زمانے کے لوگوں کے بارے میں اپنی یادداشتوں، زمانہ طالب علمی، ملازمت اور زندگی غرض تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ خودنوشت کو قلمبند کرتے ہوئے خاندانی پس منظر، اپنے اطراف کی زندگی اور ماحول کی دلکش انداز میں منظر کشی کی ہے۔ اختصار کے ساتھ تمام واقعات، حالات اور روداد کو

خودنوشت □ کی رو سے قلمبند کیا ہے۔ اسلوب میں روانی، عام فہم□ ن، وسیع زماں ومکاں، پس منظر،□ ت نگاری، قصہ خوانی اور بہترین لفظیات کا انتخاب کیا ہے۔ ان کی □ اداد صلا □ ، اور ادب سے دلچسپی کا □ ازہ اس□ ت سے □ ہے کہ اردو ان کی مادری □ ن نہیں ہے۔ خطۂ لداخ میں اردو کی تہذ□ کم اور محدود ہے اس کے□ وجود بھی انہوں نے اپنے ذاتی ذوق وشوق، محنت اور دلچسپی کے□ □ اپنی خودنوشت □ کو اردو□ ن میں ہی قلم بند کیا ہے۔ یہ کتاب اس لیے بھی خاص اہمیت کی حامل ہے کہ یہ خطۂ لداخ میں اردو کی پہلی مکمل خودنوشت □ سوانح حیات ہے۔

□ دوں کے□ اغ۔(۲۰۰۶ء)

"□ دوں کے□ اغ" ڈی ڈی ٹھاکر کی خودنوشت □ سوانح حیات ہے۔ یہ کتاب مصنف کی وفات سے ا□ سال قبل 2006ء میں ایجوکیشنل □ ہاوس دہلی سے شائع ہوکر منظر عام□ آئی۔ ڈی ڈی ٹھاکر پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے۔ انہوں نے سپریم کورٹ میں بطور جج کے کام کیا۔ نیشنل کا□نس کے رکن کی حیثیت سے قانون ساز اسمبلی کے ممبر رہے۔ شیخ محمد عبداللہ نے ان کی ایم□ اری اور اصول□ ستی سے متا□ ہوکر سیا □ سے وابستہ نہ ہونے کے□ وجود بھی انکا انتخاب کیا۔ حکومتِ ہند نے انھیں ا□ چل□ دیش کا گو□ کے منتخب کیا۔

ڈی ڈی ٹھاکر کا تعلق□ □ کے اس خطے سے تھا جسے قدرت نے اپنی خوبصورت تخلیق کی تص□ بنائی ہے۔ کوہ ہمالیہ اور پیر پنجال کے پہاڑی سلسلہ کی وادیوں میں جہاں صن□ ، چیل، اور دیودار کے اونچے اور تناور درختوں کا □ حدنگاہ ا□ لامتناہی سلسلہ ہے۔ ان سفید□ ف پوش چوٹیوں کی آغوش میں آ□ روں او□ □ لوں کے□ سرسبز وادی "پوگل□ ستان" میں وہ پیدا ہوئے اور یہیں لڑ□ گذارا۔ شا□ یہی وجہ ہے کہ ڈی ڈی ٹھاکر نے اپنی کتاب میں جس فنکارانہ□ از سے قدرتی مناظر اور فطرت کی تص□ کشی کی ہے۔ ان مناظر کو اپنی□ دوں کی ڈا□ ی سے انہوں نے صفحۂ قرطاس□ □ رکر یہ خودنوشت □ سوانح تخلیق کی۔ انہیں ان حسین مناظر قدرت کے□ میں لڑ□ □ ارنے کا موقع □ شا□ اس لیے اس کی تص□ کشی بھی دلکش مناظر کے ساتھ کی ہے۔ مثال کے طور□ :

> "بٹرو میں ا□ □ ی گاؤں سے تقریباً چند س□ نیچے بہتی ہے۔ اس□ ی کا□ م مدھومتی ہے۔ یہ
> پوگل او□ ستان کے□ م دو پہاڑوں سے □ ہے۔ اور ان دونوں□ یوں کا اکھڑال کے مقام

پ سنگم ہوجاتا ہے ۔ ی کے ۔ کنارے اور گاؤں کے بالکل سامنے ایک جنگل
ہے۔جو درختوں اور سدا بہار جھاڑیوں سے گھرا ہوا ہے ۔ ف نے پ یہ
جھاڑیاں سے اوجھل ہوجاتی ہیں۔دھان اور مکی کے کھیت ی کے دا کنارے پر
دکھائی دیتے ہیں۔جو اس علاقہ کے باقی حصوں سے زیادہ ہیں ہیں۔خاص کر اُسی علاقہ
میں جو مدھومتی کی دوسری طرف کی ڈھلانوں پر واقع ہیں۔پچھلی طرف کا پہاڑ مال مویشی کے
لئے مفید اگاہ کا کام دیتا ہے۔ہمارے گھر سے مشرق میں ایک قدیم چشمہ ہے۔اور ساتھ
ہی آ وٹ کے درختوں کا ایک جھنڈ بھی ہے۔جو یہاں کی فضا اور ماحول کو دلآویز بنا دیتا
ہے۔گاؤں کے مشرق کی طرف تو تقریباً تین سو کے فاصلے پر ایک مقام تھا جو سادہ لوح
دیہاتی اور روحانی لوگوں کا مرکز بن چکا تھا۔''۴۲

ڈی ڈی ٹھاکر نے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ان کے والدین پڑھے لکھے تو نہیں تھے لیکن روشن خیال ضرور تھے۔انہوں نے ایک مخلوط گھرانے میں بچپن گزارا اس لیے انہیں مل جل کر رہنے اور مشترکہ تہذیب و تمدن میں رہنے کی تربیت ملی اسی وجہ سے ان کے ہاں Compoesd culture کا تصور بدرجہ اتم دیکھنے کو ملتا ہے۔اس علاقہ میں جہاں ہندو مسلمان دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے خوشی و غم کے موقعوں پر ایک دوسرے کے ہاں شرکت کرتے تھے۔اس لیے ان کی شخصیت مذہبی تعصب سے پاک تھی، وہ ایک غیر جانبدار، انسان دوست ،خلوص و محبت ،اور رواداری کا پیکر آتے ہیں۔ مذہبی فرقہ وارانہ تعصب کی آگ دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتے ہیں ۔ دوں کے داغ'' سے مصنف کی شخصیت کی آئینہ داری ہوجاتی ہے۔فرقہ ورانہ فسادات کے واقعات اور صورتحال کا واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ہم ہندو اکثریت میں معصوم مسلمانوں کا اور مسلم اکثریت میں بے ہ ہندوؤں کے قتل عام
کی خبریں تے تھے۔میرے ایک دو نصیر احمد اور ان کے کنبے کے افراد فرقہ وارانہ فساد
کے شکار ہوئے ۔ یہ قتل دونوں فرقوں کے متعصب لوگ انتقام کے جذبہ کے تحت کیا کرتے
تھے ۔میرے والدین کی پاکیزگی اور میرے بچپن سے مسلمانوں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے نے
مجھے سکھایا تھا، کہ تمام انسان ایک ہیں۔''۴۳

ان کی□ . □ جس ماحول میں ہوئی وہاں ا□ □ ،روحا □ ،صداقت ،□ نتداری،حقوقِ ا□ نی اور ایشور کے فیصلوں □ اعتماد کو اہمیت حاصل تھی۔ والدین کی شخصیت میں بھی یہ خوبیاں □ رجہ اتم موجود تھیں۔ اس لیے وہ اپنی عملی □ گی میں بھی تمام عمر اسی کے پیروکار رہے چاہے وہ سیا □ میں ہو□ عدا □ میں۔ عدا □ میں موکلوں اور فریقین کے ساتھ ا□ ف کرنے کے لیے وہ ہمیشہ سچائی اور □ نتداری سے کام □ رہے۔ □ نتداری اور غیر جانبداری کو وہ ا□ منصف کا □ دی اصول ما □ ہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میرا مقصد ہے کہ ا□ ف د□ میں ا□ □ ک فریضہ ہے۔ جج کا درجہ ذاتیات سے بلند ہے۔ اسے اس □ ت کا موازنہ کر□ ہے کہ فریقین میں سے صداقت کس کے حق میں جاتی ہے۔ اور یہ سارا عمل ضابطہ قانون کے تحت کر□ ہے۔ ا□ جج کو من مانے طر□ سے شہریوں کے حقوق کو کچلنا نہیں چاہیئے۔ □ طرفہ جھکاؤ اور تنگ دلی رکھنا ا□ ف کے مقدس اصولوں کے خلاف ہے۔ جہاں فریقین آپس میں لڑتے ہوں اُسے فریقین میں □ رٹی نہیں □ چاہیئے۔ ا□ وہ ایسا کر□ ہے تو وہ ا□ ف کی □ دکو ڈھا□ ہے۔''۴۴

بے شک عدا □□ عدلیہ ا□ ف کی ا□ امید ہے۔ جہاں لوگ اپنے حقوق کو □ نے کے لیے آتے ہیں۔ عدا □ میں نہ صرف جا□ اد، حقوق، اور سامان سے متعلق بلکہ ا□ نی □ گی اور رشتوں کے تنازعات کو بھی حل کر کے حق وا□ ف □ جا□ ہے اب یہ ان منصفوں، وکلاء اور ارکان کے طر□ عدل و ایمان □ منحصر ہے کہ کیسے ا□ ف □ □ اور حق گو ہیں۔ یہ اخلاقی فریضہ تمام قانونی پیشہ وروں میں ہو□ چاہیئے کہ عدل وا□ ف کے دھارے کو حقیقت اور سچائی کے اصولوں کے مطابق لے کر چلیں□ کہ اسے د□ وی اور دینوی دونوں طر□ □ گی میں ا□ سچے ،ایما□ ار اور عادل قانون دان کی حیثیت حاصل ہو۔ ڈی ڈی ٹھاکر تمام عمر حق، عدل وا□ ف اور سچائی کے □ ذ کے لیے کوشاں رہے۔ پوگل □ یستان کے ا□ پسما□ ہ گاؤں کے ا□ غر□ گھرانے کے لڑکے کا □ □ آسام وا□ چل □ دیش کے گو□ اور □ ستی کا □ کے کو□ کا ممبر□ اپنے آپ میں ا□ اہم□ ت ہے۔

چھٹی جما □ میں حصول تعلیم کے سلسلے میں اپنے □ ئی گاؤں سے نکلے اور اپنے والدین، گھر احباب اور دوستوں سے بچھڑ کر□ نہال میں مڈل جما □ □ تین سال مقیم رہے، اُدھم پور اور جموں سے ہائی اسکول □ کی □ ھائی کی پھر سری نگر سے□ یجو□ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وطن سے دور لکھنؤ یونیورسٹی سے قانون کی ڈ□ ی حاصل

کی۔غریب الوطنی نے اپنے عزیزوں سے دور خاص طور پر والدین سے دور رکھا، وہ سارے احساسات، بکھرت دیں، حالات کی تنگ دستی جن سے کا ر زندگی کی فکر سے دامن گیر ہوکر حالات سے لڑنا سیکھا۔ وہ تمام چیزیں ''یادوں کے باغ''میں بہترین انداز میں پیش کی گئی ہے۔

اس کتاب میں خودنوشت نگار نے ایک اہم بات بتائی ہے کہ زیادہ تر عالم وفاضل، سیاسدان، مقرر کو جب کبھی کسی محفل، اجتماع یا کانفرنس میں اپنی خواہشات اور داخلی کیفیات کے اظہار بیان کا موقع ملتا ہے تو وہ پہلے تقریر تیار کرتا ہے۔ تحریری تقریر تخلیق کر کے لاتا ہے۔ اس سے سامعین اور ناظرین پر اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا موقع محل پر کی گئی تقریر کرتی ہے۔ اس لیے ان کا ماننا یہ ہے کہ تقریر وہی کامیاب ہوتی ہے جو موقع محل پر کہی بات ہو۔ موصوف خود ایک بہترین اور کامیاب مقرر تھے۔ جس کے ہر کوئی قائل رہے ہیں۔ اس ضمن میں ایک واقعہ□ کیا ہے۔ وزیر اعظم ہندمراری جی ڈیسائی نے ا□ تقریر کے انداز سے متاثر ہوکرا□ تقریر کو مثالی قرار دیا۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

> ''وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی نے اپنے اختتامی خطبہ میں کہا۔ وزراء اعلیٰ کی پڑھی ہوئی تقریریں سن رہا ہوں۔ جنہوں نے میرے لئے لوری کا کام کیا، ہمیں پڑھنے کے بجائے تقریریں کرنی چاہئیں۔ کشمیر کے وزیر مالیات مسٹر ٹھاکر نے لکھی ہوئی تقریر نہیں پڑھی۔ اس نے صرف تقریر کی اور میرے دل پر دوسروں سے زیادہ اثر پیدا ہوئی۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم انگریزی سے چمٹے رہیں۔ کوئی بھی اپنی مقامی زبان میں بول سکتا ہے ہمارے ہاں لفظی تا جمہ کا انتظام ہے، میری خواہش ہے کہ ہمیں ان نیند لانے والی تقریروں کو ترک کرنا چاہئے'' یہ ہمارے لئے حوصلہ افزائی تھی جس کو میں نے ہمیشہ اطمنان بخش سمجھا ہے۔''؂۴۵

''یادوں کے باغ''کے مطالعہ سے ڈی ڈی ٹھاکر کی شخصیت کے مختلف پہلو وَں، سیرت و صورت، ادراک، زاویہ نگاہ، زندگی پر روشنی پڑتی ہے وہ بیک وقت ایک عدل پسند قانون دان، سیاستدان، صحافی و ادیب ہیں۔ ڈی ڈی ٹھاکر کی شخصیت ہمارے لیے ایک مثالی کردار کا رول ادا کرتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے تمام نشیب وفراز سے جد وجہد کرتے ہوئے اپنی روح وافکار اور شعور کو روشن رکھا۔

خودنوشت نگار نے انسانی زندگی، روح، پیدائش، دین ود□، جنت وجہنم، ضمیر، خودی، خدا، □ م قدرت، رموز واسرار کائنات، فلسفۂ حیات ومہمات، فلسفۂ حیاتِ نو REBIRTH، مذہب، مذہبی رسومات، رسم ورواج اور سماجی و

معاشتی □م کے قانون یعنی قدرت کے قانون کے□ رے میں مفصل طر□ سے وضا □ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔انہوں نے □م کائنات اور □گی کے تمام پہلوؤں اور مقام کو قانون کی □ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ان کا مطالعہ وسیع تھا اس لیے ان کے □ یہ بھی وسعت اور گہرائی ہے اگر چہ ا□ روا□□ □ اور مذہبی ہندو گھرانے میں آ□ کھولنے کی وجہ سے ان کی شخصیت میں بھی مذہبی عقا□ اور رسوم □ستی کا □ دیکھنے کو ملتا ہے اور □ یہ حیات نو REBIRTH اور جوتشیوں □ مکمل یقین ر □ ہیں۔لیکن عملی □گی میں مذہبی عقا□ اور توہم □ستی کے □ وجود وہ فعال اور متحرک رہے۔

اس کتاب میں □ □ کے تینوں خطوں، جموں، کشمیر اور لداخ کے سیاسی ،سماجی ،معاشرتی ،معاشی اور اقتصادی □گی کے تمام پہلوں □ روشنی ڈالی ہے۔انہیں □ □ کے تینوں خطوں کے عوام کے □ رہنے،غر□ عوام کے مسائل کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع □۔تینوں خطوں کے عوام کو مختلف مسائل کا سامنا □ □ ہے۔ان کی وجوہات مختلف ہیں۔انہوں نے عوام کے مسائل کو قر□ سے دیکھا،سمجھا اور حل نکالنے کی بھر پور کوشش کی۔آسام اور ا□ چل □ دیش میں قیام کے دوران شمالی مشرقی □ستوں کے عوام کو سامنے دیکھنے اور ان کے مسائل کو سمجھنے کا موقع □۔س کتاب میں شمالی مشرقی ہندوستان کی □ستوں اور وہاں کے اقتصادی اور سماجی وسیاسی □گی اور قومی سطح کی سیا □ کا اس طرح جا□ہ لیا ہے کہ شا□ □ستی سطح □ اس قسم کی سیاسی معلومات کسی وسری کتاب میں شا□ ہی مل سکتی ہے۔

''□دوں کے □اغ''میں ڈی ڈی ٹھاکر نے اپنی □گی کے □ واقعات ،حالات ،گھر□ ماحول ،خا□انی پس منظر ،بچپن ،عہد بلوغیت ،پیشہ ورانہ □گی اہل خانہ اور عملی و پیشہ وارانہ □گی کی صورتحال □ روشنی ڈالتے ہوئے اپنے احساسات و □ت ،دکھ تکلیف ،ایثار وقر□نی اور تج□ت ومشاہدات کو سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس خودنو□ □ کوا□ اہم سیاسی □ر□ دستا□ کہہ □ ہیں۔اس میں مصنف نے اپنے تج□ت کی روشنی میں آئندہ نسلوں کے لیے پیغام کا نچوڑ پیش کیا ہے □ن و بیان سادہ اور عام فہم ہے۔دلچسپ اسلوب میں تح□ کردہ یہ خودنو□ □ ا□ اہم تخلیق کی حیثیت ر□ ہے۔

''□دوں کے □اغ''میں واقعات کا تسلسل اور روانی ،بہترین اور صحت مند طر□ سے ملتا ہے۔واقعات کو انہوں نے ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اگر چہ کتاب کو ضبطِ تح□ میں لاتے وقت مصنف بستر علا □□ دراز تھے۔ضعیفی سے

ان کی یادداشت بھی متاثر تھی۔ ضعیفی میں یادوں کو پھر سے تازہ کرنا اور ماضی کے اوراق پلٹ کر واقعات کو صحت مند طریقے سے صفحہ قرطاس پر لانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مصنف کا کمال ہے کہ انہوں نے ضعیف العمری میں بستر علالت پر ہوتے ہوئے بھی اپنے ماضی کے حالات و واقعات، تجربات و مشاہدات، نشیب و فراز، احساسات و جذبات اور حقائق و کوائف کو ضبط تحریر میں لایا اور یوں جموں و کشمیر کے خودنوشت سوانح کے دامن کو وسعت بخشی۔ جو مصنف کی ذوق وشوق، ادب شناسی، ادب پروری اور تخلیقیت کا کھلا ثبوت ہے۔

یادوں کے لمس۔(۲۰۱۲ء)

"یادوں کے لمس"، پروفیسر شہاب عنایت ملک کی خودنوشت سوانح ہے۔ یہ کتاب 2012ء میں میزان پبلشرز سرینگر سے شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔ پیش کلام محمد یوسف ٹینگ نے تحریر کی ہے جس میں قارئین کے لیے کتاب اور صاحب کتاب سے متعلق اہم باتیں ہیں جس سے ان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک وادی چناب کے خوبصورت قصبہ بھدرواہ، کے ایک چھوٹے سے گاؤں گاٹھہ میں 10 مارچ 1965ء کو عنایت اللہ ملک اور رشیدہ بیگم کے ہاں پیدا ہوئے۔ شہاب عنایت ملک نے ابتدائی تعلیم گاٹھہ میں حاصل کی۔ جموں یونیورسٹی سے ایم اے کر کے 1993ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس طرح، بقول ان کے، ڈاکٹر بننے کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔ پھر اڈہاک لکچرر (Adhoc Lecturer) کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1995ء میں شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی میں بحیثیت اردو لیکچر منتخب ہوئے۔ انہیں اردو ادب کے نوجوان پروفیسر ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ 2009ء میں صدر شعبۂ اردو کی صدارت سنبھالی اور آج بھی اس عہدہ پر فائز ہیں۔ جموں یونیورسٹی کے بھدرواہ کیمپس کے ڈائریکٹر بھی رہ چکے ہیں۔ یونیورسٹیوں کے علاوہ مختلف اداروں جیسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL)، جموں و کشمیر کلچرل اکاڈمی اور جموں سے شائع ہونے والا اردو روزنامہ "اڑان" کے ساتھ وابستہ ہیں۔

بچپن میں ان کے گھر دادا کا رعب اور دبدبہ تھا۔ وہ شہاب کو نہایت عزیز رکھتے تھے۔ وہ بارعب اور خوش لباس اور پُر مذاق شخصیت کے مالک تھے۔ پیشے سے وہ محکمہ جنگلات میں معمولی سپاہی تھے لیکن شاہانہ زندگی گزارنے کے شوقین تھے۔ وہ اپنے دادا کے متعلق لکھتے ہیں:

’’ملازمت کے دوران اپنی بارہ بور کی بندوق لے کر گھوڑے پر سوار ہوکر اور کتے کو ساتھ لیکر جب وہ بھدرواہ کے جنگلات میں شکار کرنے کیلئے جاتے تھے،تو لگتا تھا کہ واقعی کوئی نواب جارہا ہو۔‘‘۴۶

یہاں ان کے گھر کی صورتحال اور مسائل کے ساتھ ان کے فن سیرت نگاری کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں اپنی ذاتی زندگی ،خاندانی پس منظر،والدین کی زندگی ،دوست احباب ،قلمی دوست ،ادبی دوست ،اپنے colleague،اور رشتہ داروں،بچپن اور عہد بلوغیت میں جن لڑکیوں سے جذباتی تعلق رہے ان کے بارے میں بھی مفصل انداز میں بتایا ہے لیکن اپنی ازدواجی زندگی اور اولاد کے بارے میں کچھ خاص بیان نہیں کیا ہے۔ان کی زندگی میں کئی شخصیات ایسے آئے جنہوں نے ہر قدم پر ان کا ساتھ دیا ضرورت پڑنے پر مالی مدد کی ،ان کے خوشی وغمی کے لمحوں میں میں ان کے قدم دوش رہے۔ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ہمت بندھتے رہے۔ان میں یوں تو سینکڑوں ہیں لیکن دواشخاص ایسے ہیں ۔جنہیں وہ اپنا مسیحا سمجھتے ہیں ،ڈاکٹر جان مائیکل وَس اور پروفیسر اینتا بھٹو پروفیسر اینتا بھٹو کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

’’بھٹو انتہائی ذہین انسان ہیں۔اپنے چھ سالہ دور میں انہوں نے جموں یونیورسٹی میں بلا لحاظ مذہب وملت ہر کسی کی مدد کی۔‘‘۴۷

خودنوشت نگار ایک نڈر، بے باک اور صاف گو فطرت کے مالک ہیں ۔’’یادوں کے لمس‘‘ میں بھی انہوں نے جو واقعات اور واردات پیش کئے ہیں بالکل کھل کے اور سچ کیے ہیں۔اپنے دوستوں کے بارے میں جہاں ان کی خوبیاں بیان کی ہیں وہاں ان کی کمزوریاں اور خامیاں بھی بتائی ہیں۔کہیں کہیں اپنوں اور غیروں کی بے رخی،موقع پرستی اور مطلبی رویے سے دلبرداشتہ دکھائی دیتے ہیں۔اس کتاب کے مطالعہ سے ان کی شخصیت،سیرت وصورت ،مزاج اور عادات واطوار کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔انہوں نے جہاں کہیں کسی محسن کا تذکرہ کیا ہے جو ایک طرح سے اظہارِ تشکر کا طریقہ ہے وہیں ان لوگوں کے بارے میں بھی بے جھجک لکھا ہے جو ان سے خار کھاتے ان کی کامیابی سے حسد کرتے تھے۔اس معاملے میں اپنے اساتذہ کو بھی نہیں بخشا ہے۔

مصنف نے اس خودنوشت میں جابجا دلچسپ واقعات بھی قلم بند کئے ہیں۔جن میں پاکستان میں کانفرنس میں شرکت کے لیے جانا ،مائیکل وَس سے ممبئی میں اپنے قلمی دوست عارف کی وفات پر ان کے گھر والوں کے پاس جانا

شوپیان میں فرضی NCPUL کے سینٹرز کو ضبط کرنے کے واقعات کو مصنف نے بڑے فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ مصنف نے اپنے عہد کے تمام مسائل، سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی وتمدنی اور تعلیمی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور معاشرے میں اُبھرنے والی خرابیوں کو بھی ضبطِ تحریر میں لایا ہے۔ جموں وکشمیر کی موجودہ صورت حال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ آج کل ہمارے معاشرے میں سر اُٹھانے والی اذیت ناک حقائق کا بھی ذکر کیا ہے:۔ اقتباس:

> ''آج کل یہ چلن عام ہوگیا ہے کہ بچوں کی شادی کے بعد والدین کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی ہے۔ بیٹی اپنے گھر چلی جاتی ہے اور بیٹے اپنی بیویوں کے ساتھ یا تو بیوی کی خدمت گذاری میں مصروف ہوجاتے ہیں یا پھر اُس کے والدین کی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے والدین بچوں کے اس بے راہ وری سے تنگ آ کر آشرم کی راہ اختیار کرتے ہیں۔''۴۸

یادوں کے لمس میں خودنوشت نگار کی شخصیت کے تمام پہلو خوبیاں، خامیاں، شکست و ریخت، نشیب و فراز، ذوق وشوق، ذہنی ونفسیاتی افکار وغیرہ کا بیان کیا گیا ہے۔ جس سے ان کی ذات کا ہر پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ اپنی ذاتی و نجی زندگی اور فطرت کے ان گوشوں کا بھی انکشاف کیا ہے جس سے ان کی شخصیت عیاں ہوجاتی ہے۔ جیسے سگریٹ نوشی، جوانی کی رعنائیاں اور دوست پرستی وغیرہ۔ اس سے نہ صرف مصنف کی شخصیت ظاہر ہوجاتی ہے بلکہ ان کی بے باکی، صاف گوئی اور صداقت پسندی کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے۔ انہوں نے اپنے احساسات، جذبات، دلی کیفیات، تجربات و مشاہدات، واقعات وروودات قلبی کو نہایت عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔ ان کی فطرت میں سچائی، صاف گوئی اور حق گوئی واضح ہے۔ مصنف نے صاف گوئی کا دامن کہیں نہیں چھوڑا ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں اپنی ذاتی زندگی، اپنی ذات، فطرت، اخلاق، مزاج، ذوق وشوق، مشاغل تمام چیزوں کو آشکار کیا ہے۔ جس سے ان کے افکار، ذہنی ونفسیاتی کیفیات، عادات واطوار یعنی ان کی کل شخصیت کی تصویر سامنے آجاتی ہیں۔

مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ خودنوشت سوانح نگار نے ''*یادوں کے لمس*'' میں اور اپنے دور کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ سادہ سلیس زبان میں اختصار کے ساتھ واقعات وروداد، تجربات ومشاہدات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود یہ خودنوشت فنّی خامیوں سے مبرّا نہیں ہے۔ واقعات کو تسلسل سے پیش کیا گیا ہے۔ اسلوب وتکنیک مقرر دیے۔ جس سے اس کی ادبی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اور اس کو مکمل خودنوشت نہیں کہہ سکتے کیونکہ ابھی خودنوشت نگار خوداد بی و

تدریسی کاموں میں سرگرم ہیں۔

رہگزر در رہگزر۔(۲۰۱۳ء)

”رہگزر در رہگزر“ پروفیسر حامدی کاشمیری کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔اس خودنوشت کو ان کی رفیقہ حیات محترمہ مصرہ مریم نے ترتیب دیا ہے، کمپیوٹ سٹی سرینگر سے ان کے فرزند مسعود عالم کی نگرانی میں سال 2013ء میں زیورطبع ہوکرمنظر عام پر آئی۔ انتساب اپنی شریک حیات مصرہ مریم کے نام کیا ہے۔

حامدی کاشمیری کے آباواجداد کا تعلق کشمیر کے ایک پرانے بھٹ خاندان سے تھا۔ان کا اصلی نام حبیب اللہ تھا۔یہ نام ان کے والد کے روحانی مرشد صاحب نے تجویز کیا تھا۔وہ اپنے والدین کی دعاؤں اور آرزؤں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔اس بارے میں لکھتے ہیں:

”معاً صاحب نے مراقبے سے سر اٹھا کر انہیں بشارت دی کہ خدائے کریم آپ کو فرزند عطا کرے گا۔اس کا نام حبیب اللہ رکھنا،اس کی خوشبو سارے عالم میں پھیل جائے گی۔“۹۲

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یہی حبیب اللہ اپنے بزرگوں کی دعاؤں،اپنی محنت،لگن،جانفشانی اور لیاقت کی بدولت ایک معروف ادیب، نقاد ومحقق اور مشہور استاد کی حیثیت سے عالم ادب کے آسمان پر جلوہ گر ہو گئے۔ابتدائی تعلیم کا آغاز بہوری کدل کی جمعہ مسجد کے ایک مدرسے سے قرآن پاک کی تعلیم سے ہوا۔گھر والے مروجہ تعلیم دلانے کے خواہاں تھے لیکن وہ اس کے حق میں نہیں تھے۔1938ء میں ان کے چچا نے بہوری کدل کے ایک سرکاری اسکول میں ان کا داخلہ کر دیا۔اس وقت ان کی عمر 5 سال تھی لیکن اسکول میں داخلہ کرانے کے لیے چچا اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے ان کی تاریخ پیدائش 29 جنوری 1930 درج کرائی۔جب کہ ان کی اصل تاریخ پیدائش 29 جنوری 1931 تھی۔ یعنی ایک سال بڑھا کے داخلہ دلایا گیا۔اسکولوں اور مدرسوں میں داخلہ کروانے اور گھر پر پڑھانے کا ذمہ چچا نے لیا تھا۔اس ضمن میں وہ یوں رقمطراز ہیں:

”وہ میرے زور زور سے رونے دھونے کے باوجود مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر کندھے پر اٹھاتے،اور مکتب کی راہ لیتے۔میں خوب ہنگامہ کرتا،ہاتھ پیر مارتا،چیختا چلاتا لیکن چچا جان پر

اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔''۵۰؎

یہاں ایک بچے کی نفسیاتی کیفیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انہیں بچپن میں مشترکہ گھر میں جو محبت میسّر ہوئی اُس لاڈ پیار کے نتیجے میں وہ من مانی کرنے کی عادی ہو گئے تھے۔ اس اسکول سے انہوں نے آٹھویں درجہ تک کی تعلیم حاصل کی۔ نویں جماعت میں گورنمنٹ ہائی اسکول دلاری خان میں داخلہ لیا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل کود میں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ 1946ء میں پنجاب یونیورسٹی سولن سے میٹرکولیشن کا امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔ اسکے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے انہوں نے ایس پی کالج میں داخلہ لیا۔ ایس پی کالج سے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ پھر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی میں بطور لکچرر ان کا تقرر ہوا اور اسی دوران کشمیر یونیورسٹی سے ''اردو پر یورپ کے اثرات'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ تحریر کر کے 1966ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پی ایچ۔ ڈی کے بعد یہیں شعبۂ اردو سے منسلک ہو گئے۔ یہاں اردو ادب کے نامور اساتذہ اور ادیبوں کے صحبت میں رہنے کا موقع ملا۔ اس شعبے کے قیام سے لے کر پروان چڑھنے تک تمام چیزوں کو انہوں نے اپنے آنکھوں سے دیکھا۔ یہاں کے اساتذہ کے علمی و ادبی کارنامے، طلبہ میں جوش و خروش اور اعلیٰ تعلیمی معیار کی طرف ان کا لگن ان سب کا انہوں نے مشاہدہ کیا۔ حامدی کاشمیری تمام عمر علم و ادب کی آبیاری اور تعلیمی زندگی میں مصروف رہے۔ سیاست سے دور، اعلیٰ آفسروں کے پلیسیوں سے لاتعلق ایک بے داغ تعلیمی زندگی گزاری۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ان کی ذہنی، علمی، تعلیمی و ادبی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں اس یونیورسٹی کا اہم ہاتھ ہے۔ اس لیے تدریسی، تحقیقی اور انتظامی بحالی کو اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتے تھے۔ شعبۂ اردو میں تدریس کے دوران اساتذہ کے درمیان پیدا شدہ چاقیوں اور رنجشوں سے ہمیشہ خود کو دور رکھا۔ شعبے کو آگے لے جانے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہے۔ 1990ء سے 1993ء کے عرصے میں وہ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ طویل علالت کے بعد 17 دسمبر 2018ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

''*رہگزر در رہگزر*'' میں خودنوشت نگار نے واقعات و روداد کو روانگی اور خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس میں صداقت پسندی و حقیقت نگاری درجہ کمال پر ہے۔ خاص کر ان واقعات کا ذکر کرنا جن واقعات نے ان کی ذہن کو متاثر کیا اور کہیں نہ کہیں انہیں اپنی ذات کو پہچاننے، خدا کی ذات کو پہچاننے اور تخلیق کائنات کو سمجھنے اور پہچاننے

میں مدد ملی۔جیسے گلمرگ کے فلک بوس پہاڑوں میں . مرشد سے ملنا، ان کی پیشن گوئی اور حکم گوئی کے بمو . شیخ العالمؒ کی زیارت پر حاضری دینا، مانسبل کے جھیل کے سامنے اُس خوبصورت دیہاتی لڑکی کو دیکھنا، جس کی حسن ادا کو دیکھ انہیں تخلیق کائنات کی عظیم فنکاری اور معجزہ کاری کا اندازہ ہوجاتا ،سرزمین دکن سے وادی کشمیر میں علم کی شمع جلانے کے لیے تشریف لائے اردو کے دو مورا ساتذہ ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری کی صحبت وغیرہ ۔سال 2002ء میں انہیں حج . اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔جس کا تذکرہ اس خودنوشت میں ملتا ہے۔ اس مقدس مقام پر انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ارضی و دنیوی مال واسباب، اولاد ، مادّی خوشی وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ان کو ایک دن راہ حق میں فنا ہوجانا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''خالق کون ومکاں کی ہمہ گیر موجودگی، اسکی وحدانیت ،رحمانیت پر محیط ہے۔اور خالق ومخلوق کے درمیان پردے اٹھ جاتے ہیں۔میں نے دیکھا کہ اپنی تمام عاجزی، لاچاری، عبدیت ،عرفان ذات ،خود رفتگی اور یقین کی ملی جلی کیفیات میں دل سے جو دعا نکلتی ہے۔وہ معجزاتی طور پر مستجاب ہوتی ہے۔اور بندے کا وجود کیف تشکر میں ڈوب جاتا ہے۔''۱۵

دوران حج کے تمام واقعات فرائض، عبادات، جسمانی تکالیف اور علالت ساز حالات ذہنی پریشانی کے باوجود راہ حق پر چلنے کی خواہش، سجدہ وسجود اور تسکین ومسرت غرض ہر ایک بات کا تذکرہ کیا ہے۔

حامدی کا شمیری نے . کشمیر کی خوبصورت وادی میں جھیل ڈل اور دریائے جہلم کے کنارے، ن ون اور ہاری پر . کے چوٹیوں کے تمام عمارتیں، ان دلفریب اور بے نظیر، حسین وجمیل وادیوں میں فطرت کو قریب سے دیکھا اور صنائع قدرت پر فریفتہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔اس احساس کو الفاظ کے ذریعے خودنوشت میں کھل کر بیان کیا گیا ہے۔مناظر قدرت کی تصویر کشی اس اسلوب سے کی گئی ہے کہ قاری کی آنکھوں کے سامنے وہ تمام مناظر اور نظارے آجاتے ہیں اور قاری کتاب کا مطالعہ کرتے وقت تخیل میں اس ارض فردوس میں کی خوبصورتی میں کھو جاتا ہے۔مصنف کی مصّوری کی ایک عمدہ مثال پیش خدمت ہے:

> ''گلمرگ میں قدم رکھتے ہی ایک اجنبی اور شاداب ودلفریب دنیا کا احساس ہوا۔موسم کے بدلتے رنگ ،اجلی اجلی دھوپ اور شجر ایک ساتھ ،سایہ دار صنوبر ،سبز میدان اور سبز

ڈھلوان، آسمان کو چھوتی ہوئی فیلی چوٹیاں، کھلی اور تازہ ہوا، آوارہ بادل، آسماں کی ہم سائیگی، خواب اور بیداری کی خوبصورت فضا۔'' ۵۲؎

اس اقتباس میں وادی گلمرگ کی خوبصورتی کے ساتھ مصنف کی فن منظر نگاری اور عکاسی کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

اس خودنوشت میں جموں و کشمیر کی تہذیب و ثقافت اور تمدنی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ مقامات، کشمیری تہذیب و ثقافت کے مراکز خصوصاً یہاں کی درگاہیں، زیارات، خانقاہیں، مقبرے، آستانے اور مقدس مقامات یہاں کی عوامی زندگی میں کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ مصنف کو ان مقامات سے ذاتی اور دلی وابستگی رہی ہے۔ بچپن میں وہ اپنے والد صاحب کے ساتھ ان مقامات پر حاضری دینے جایا کرتے تھے۔ شیخ نورالدین نورانیؒ سے انتہائی درجہ کی عقیدت تھی جو ہمیشہ قرار رہی۔ انہیں شیخ نورالدین نورانیؒ کی علمی و ادبی، مذہبی و اخلاقی، اور سماجی مرتبہ کا احساس تھا۔ اسی احساس و عقیدت کے پیش نظر انہوں نے ان کی علمی و ادبی اور مذہبی و معاشرتی فلاح و بہبودی کے کارناموں کو ان کے عقیدتمندوں اور کشمیری عوام تک پہنچانے کے لیے ایک کتاب ''شیخ العالم حیات و کارنامے'' کے عنوان سے تصنیف کی۔ اس خودنوشت میں اس کتاب کا بھی اختصار کے ساتھ تعارف کیا ہے۔ جس سے یہاں کی تہذیب و تمدن اور شیخ العالمؒ کے تک حیات کی آئینہ داری ہو جاتی ہے۔

''**رہگزر در رہگزر**'' میں مصنف کی شخصیت کے تمام پہلو عیاں ہو جاتی ہے۔ ان کی خارجی و داخلی زندگی، بصارت و بصیرت، سیرت و صورت، داخلی کیفیات، سادگی، انکساری، رواداری غرض ہر پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ ایک صاف گو، صداقت پسند، شریف النفس، مخلص، ملنسار اور مشفق استاد تھے جو تمام عمر تعلیمی تدریسی کاموں سے منسلک رہے اور ایک ممتاز استاد کی حیثیت سے معاشرے میں اپنے لیے ایک الگ مقام بنالیا۔ اپنے شاگردوں، عزیزوں، مداحوں اور قارئین سے ملاقات کے لیے ہر دم تیار رہتے تھے ان کی مدد کرنے کو اپنا نصب العین سمجھتے تھے۔ وہ ایک ادب شناس، ادب دوست اور تخلیق کار تھے۔ انہیں زمانہ طالب علمی سے ہی مختلف ادبی تقاریب اور نشستوں میں شرکت کرنے میں دلچسپی رہی۔ انتظامیہ سے بھی منسلک رہے۔ یہ سلسلہ آخری عمر تک قرار رہا۔ تدریسی و تحقیقی کاموں کے علاوہ مختلف علمی و ادبی اداروں سے بھی وابستہ رہے جن میں ساہتیہ اکادمی، N.C.E.R.T، جموں و کشمیر کلچرل اکادمی قابل ذکر ہیں۔ اسکے علاوہ مختلف شعبوں سے وابستہ رہے اور ان قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ ملک اور بیرونی ملک کے

مختلف یونیورسٹیوں میں مختلف موضوعات مختلف سیمینار رواں، کا□□ں، بحث ومبا ۃ میں شر ۃ کرتے اور صدارت کے فرائض ا□ م دیتے رہے۔

مجموعی طور پر کہہ ۃ ہیں کہ پر وفیسر حامدی کا□ ی نے اپنی یادوں، روداد، واقعات، تجر بات ومشاہدات اور نشیب وفراز کو اختصار□ جامعہ طر□ سے قلم بند کیا ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے اس خودنوشت میں کشمیر، درس و تدریس، علم و ادب اور خودنوشت نگار کی ذات ہے۔ عام فہم زبان، شگفتہ اظہار و بیان، مبہم و پیچیدہ اسلوب سے پاک، رواں اور سلیس انداز میں ابتدا سے اختتام تک صحت مند طر□ سے تسلسل کے ساتھ واقعات کو پیش کیا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی اس خودنوشت میں وہ تمام لوازمات پائے جاتے ہیں جو ایک کامیاب خودنوشت کے لیے لازمی ہیں۔ جیسے حقیقت نگاری، شخصیت اور فن۔ یہ تینوں لوازمات کے اس خودنوشت میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

چنار کے سایے میں۔(۲۰۱۶ء)

خودنوشت ''*چنار کے سایے میں*'' عبدالرشید ہانجورہ ایڈوکیٹ کی تصنیف ہے۔ اس خودنوشت کا حصہ اول سال 2016ء میں میزان پبلشرز سری نگر سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ دوسرا حصہ ابھی زیر قلم ہے۔ اس ضمن میں مصنف خود لکھتے ہیں کہ ''دوسرا ابھی زیر قلم ہے کیو□ آج تک جو کچھ لکھا ہے اس کو کم از کم قار□ تک پہنچا دوں'' 11 ابواب، 87 صفحات پر مشتمل یہ کتاب عام فہم، سادہ وسلیس اور اختصار کے ساتھ بہترین انداز میں تخلیق کی گئی ہے۔

عبدالرشید ہانجورہ 1956ء میں ضلع بڈگام کے ایک گاؤں ہانجورہ میں ایک متوسط زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والدصا ب سے قرآن پاک کی تعلیم سے شروع ہوئی۔ چار سال کی عمر میں اسکول میں داخلہ لیا۔ چھٹی جما ت تک گاؤں کے اسکول سے پڑھا۔ چو□ گاؤں میں اس وقت صرف چھٹی جما ت تک کی پڑھائی ہوتی تھی اس لیے ساتویں جما ت میں قریب کے گاؤں زوہامہ میں داخلہ لیا۔ 1972ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسی اسکول سے بارہویں جما ت کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ڈگری کالج بمنہ میں داخلہ لیا۔ 1980ء میں کشمیر یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کر کے وکا ت کا پیشہ اختیار کر لیا۔

کالج میں پڑھائی کے دوران کئی نئے دو ت بن گئے۔ جن میں کشمیری پنڈت، سرینگر کے لڑکے اور دیہی

علاقوں کے لڑکے شامل تھے۔ ایک جگہ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کس طرح مصنف اور ان کے چند دوست ایک وادی کشمیر سے بمبئی کا سفر گھر والوں کو کالج ٹور کا بہانہ بنا کر فقط چار سو روپیہ لے کر روانہ ہوئے۔ اور گھوم گام کر واپس آ گئے۔ آج کی طرح مہنگائی آسمان کو نہیں چھو رہی تھی، لوگ مہمان نواز اور ملنسار تھے۔ بمبئی جیسے شہر میں ایک دوست کے بھائی کے گھر 12 دن قیام کیا۔ ان کے افراد خانہ سے گل مل گئے۔ اس زمانے کے سماج اور لوگوں کی سادگی، خلوص، شرافت، ایمانداری، تعلقات اور رواداری کی گواہی دیتی ہے۔

زمانہ طالب علمی میں ہی انہیں سیاست سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس زمانے میں کشمیر یونیورسٹی میں کئی سیاسی پارٹیاں وجود میں آئیں۔ خود نوشت نگار جموں و کشمیر نیشنل یوتھ کانفرنس کے ممبر بن گئے۔ نیشنل کانفرنس کے صدر جناب فاروق عبداللہ سے ملنے اور تعلقات بڑھانے کا موقعہ ملا۔ کچھ عرصے بعد اپنے گاؤں سے پنچایت کا چناؤ لڑ کر کافی ووٹوں سے کامیاب ہوئے اور سرپنچ کے عہدے پر فائز ہوکر چھ سال تک گاؤں کی ترقی کے لیے کام کرتے رہے۔ لوگوں کا بڑھتا اعتماد دیکھ کر چرار شریف حلقہ انتخاب سے اسمبلی الکشن کے لیے انہیں نامزد کیا گیا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اب انہیں عملی زندگی میں فکر و معاش نے گھیر لیا۔ چونکہ اس سے قبل سیاست میں زور آزمائی کر چکے تھے لیکن علاقہ کے چند بڑے لوگوں نے ان کی مخالفت شروع کی اور انہیں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے ملازمت تلاش کرنی پڑی۔ لیکن یہاں بھی کامیابی نہیں ملی۔ مصنف اپنے جد وجہد کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ حالات دیکھ کر میں مایوس ہوا اور میں نے ٹھان لی کہ بہتر ہے کہ سرکاری نوکری کیلئے بھی کوشش کی جائے چنانچہ میں نے کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس (KAS) کے امتحان میں شمولیت کی اور امتحان پاس کیا۔ سفارش مہیا نہ ہونے کی وجہ سے مجھے کامیاب امیدواروں کی لسٹ میں 362 نمبر پر رکھا گیا جبکہ کل ہم لسٹ 528 امیدواروں پر مشتمل تھی۔ میرا تجربہ رہا کہ میرے ساتھیوں نے جوڑ توڑ کر کسی بھی طرح سے اپنے لئے KAS میں جگہ حاصل کی اور کسی ایک ہمدرد نے مجھے بھی PSC کے ممبر سے ملایا جس نے ایک بڑے رقم کا تقاضا کیا جو کہ مجھے رشوت کے طور پر دینی تھی۔ میں نے انکار کیا اور کہا کہ میں اتنی بڑی رقم نہیں لا سکتا ہوں۔ کچھ میرے ساتھیوں نے سیاسی لیڈروں کا اثر و رسوخ استعمال کیا اور اپنے لیے اس لسٹ میں جگہ پالی۔''[۵۳]

یہاں انہوں نے اپنے مشاہدات، تجربات زندگی کے نشیب وفراز کو بیان کر کے آئندہ کے نسلوں کو مروجہ System کے بارے میں بتانے کی کوشش کی ہے۔ سلیکشن کمیٹی اور سیاست کے ہاتھوں غریب اور ہونہار امیدوار استحصال کا شکار ہو جاتے ہیں اور جن کی رسائی اعلیٰ حکام تک ہوتی ہے وہ اہل اور کامیاب قرار دئے جاتے ہیں۔ یہاں انتخابی کمیٹی اور انتظامیہ کی اصلیت کا انکشاف کیا گیا ہے۔

عبدالرشید کا بچپن دیہی علاقے میں گذرا۔ گاؤں میں مسلم اور پنڈت دونوں مل جل کر محبت، خلوص اور امن سے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے شادی وفوتگی میں شریک رہتے تھے۔ مشترکہ تہذیب وتمدن، رسم ورواج، زبان وبیان اور یکساں طرز زندگی تھی۔ پنڈت لوگ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے مسلمان بچوں کو دینی ودنیوی مروجہ تعلیم دیتے اور مسلم کسان ان پنڈتوں کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ اس ماحول نے مصنف کے رہن سہن اور شخصیت پر گہرا چھاپ چھوڑا۔

بقول خودنوشت نگار انہیں بچپن سے دوسروں کے مدد کرنے میں دلی مسرت ملتی تھی۔ اپنے سطح کے چھوٹے موٹے کام انجام دیتے رہتے تھے۔ وہ اپنے علاقہ کی تہذیب وتمدن کے تحفظ اور فروغ کے لیے کلچرل (ثقافتی) پروگرام منعقد کرتے رہتے تھے۔ کچھ عرصے بعد گاؤں میں درسگاہ کھول کر تدریسی شعبے سے منسلک ہو گئے۔ ملازمت کے سلسلے میں گاؤں سے دور رہتے تھے اس لیے زیادہ دیر تک یہ کام انجام نہیں دے سکے۔ کشمیر میں Open-Schooling کے نہج پر State Open School متعارف کرانے والا بھی خودنوشت نگار ہی ہیں۔ انہوں نے یہ عزم کر لیا تھا کہ زندگی میں کچھ ایسا کام انجام دیں جس سے معاشرے وسماج، قوم وملت اور انسانیت کی فلاح وبہبودی ہو اور جو تسکین قلب کا ذریعہ بنے۔ جموں کشمیر کینسر سوسائٹی سے بھی وابستہ رہے۔ وکیل ہونے کی وجہ سے Human Right Commission کے ممبر رہے۔ 1989 میں جموں وکشمیر یتیم ٹرسٹ سے منسلک ہو گئے بقول مصنف کچھ عرصہ بہتر طریقے سے چلنے کے بعد یہ ادارہ سیاسی انتشار کا شکار ہو گیا۔ بچوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بہت کوششوں کے بعد پھر سے چلنے لگا۔ اس احسن کام کو انجام دینے میں انہوں نے بے حد محنت کی۔ یتیم بچوں کی رہائش اور تعلیم کا انتظام پھر سے ممکن ہو سکا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''آہستہ آہستہ اور بھی لوگ اس ادارہ کے ساتھ وابستہ ہوئے اور آج کل ہم اس ادارہ کے
> ذریعہ سے بہت سارے فلاحی پروگرام چلاتے ہیں جن میں دارالاحسان یتیم خانہ

،دارالمحسنات یتیم خانہ، اقبال میموریل ایجوکیشنل سکول، وددیگر ادارے۔اور ہمارا خواب ہے کہ اس ادارہ کے تحت ایک کالج اور بعد میں ایک یونیورسٹی بھی قائم ہو۔اللہ کرے یہ خواب پورا ہو۔''۵۴؎

'چنار کے سایے میں' میں خودنوشت نگار نے اپنے سفرِ حج کی روداد بھی بیان کی ہے کہ کب اور کتنے مرتبہ اس مقدس مقام پر جانے کی سعادت نصیب ہوئی۔دو مرتبہ بطور خادم الحجاج کے انہیں اپنی ذمہ داری نبھانے کا موقع ملا جسکا تذکرہ انہوں نے کتاب میں کیا ہے۔حج کے ارکان، فرائض، عبادات اوران سے حاصل ہونے والے قلبی و روحانی سکون و مسرت کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔یہاں ان کی داخلی کیفیات اور شخصیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔جہاں انہوں نے لوگوں کے ساتھ اپنے مراسم، خلوص اوراخلاقی اور رفاعی کاموں پر روشنی ڈالی ہے وہیں اپنی کوتاہیوں ،کمزوریوں اور فطری خامیوں کا بھی بےباکی سے انکشاف کیا ہے۔جس سے ان کی صداقت پسندی اور بےباک شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔

من جملہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''چنار کے سایے میں'' میں عبدالرشید ہانجورہ نے عام فہم، سادہ وسلیس زبان میں اپنے تجربات، مشاہدات، زندگی کے نشیب وفراز اور خارجی وداخلی زندگی کے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔اس میں ذاتی زندگی، کشمیر کی سیاست ،مصنف کے رضا کارانہ اور امدادی سرگرمیوں، حسن خلق اوردیگر کاموں پر روشنی پڑتی ہے۔فنی اعتبار سے اگرچہ اس میں چند خامیاں بھی ہیں اس کے باوجود یہ جموں وکشمیر میں خودنوشت سوانح کے دائرے میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

لوح حیات۔(۲۰۱۸ء)

''لـــوح حیـــات'' ی تی کے ممتاز افسانہ نگار دیپک بُدکی کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔یہ کتاب 2018ء میں ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوکر منصۂ شہود پر آئی۔ 24 ابواب 324 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں دیپک بُدکی نے اپنی ابتدا کی زندگی کے تمام واقعات و حالات اور نشیب وفراز کے سمندر کو کوزے میں بند کر کے اپنے قلم کے جوہر کا مظاہرہ کیا ہے۔مصنف بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں، ڈرامہ بھی لکھتے ہیں اور نقاد بھی ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں تمام اصناف ادب کے ملے جلے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس کے عنوان بھی افسانوئی انداز و رنگ لیے ہوئے ہیں جیسے 'جستجو کیا ہے!'، 'مٹھی بھر لوگ'، 'میرے محسن میرے رہنما'، 'سیاہی کے بوند' اور 'طوافِ لالہ زار' وغیرہ۔

دیپک بُدکی کا تعلق ایک متوسط کشمیری پنڈت گھرانے سے ہے۔ وہ 15 فروری 1950ء میں سرینگر کے پرانے علاقہ وازہ پور، مہاراجہ گنج میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام دیپک کمار بُدکی ہے۔ والد کا نام رادھا کرشن بُدکی اور والدہ کا نام کملاوتی نہرو تھا جو فقط چالیس برس کی عمر میں اپنے پیچھے ایک بیٹا، تین بیٹیاں چھوڑ کر وفات پا گیں۔ دیپک بُدکی نے اس کتاب میں اپنے خاندانی پس منظر، آبا و اجداد، والدین، عزیز و اقارب کے ساتھ دوستوں یاروں کے اجمالی حالات بھی بیان کیے ہیں۔ ان کے والد کشمیر ایمپوریم میں ملازم تھے۔ بیوی کی وفات کے بعد ان کے والد نے دوسری شادی نہیں کی بلکہ بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں خود کو صرف کر لیا۔ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ عہدوں پر دیکھنا چاہتے تھے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت میں انہوں نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ ان کے والد کا ماننا تھا کہ اولاد کی تعلیم کے لیے بھیک مانگنی پڑے یا ڈاکہ ڈالنا پڑے تو بھی جھجکنا نہیں چاہئے۔ انہوں نے اپنی محدود آمدنی میں بھی بچوں کی بہترین پرورش کی اور انہیں زندگی کی تمام آسائش دینے کی کوشش کی۔ جس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہے۔

دیپک بُدکی اور ان کی بہنیں اُس مقام پر تو نہیں پہنچ پائے جس کے ان کے والد آرزومند تھے لیکن اچھی نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ضرور ہوئے بقول مصنف کشمیری پنڈت اعلیٰ سرکاری نوکری پر اعتبار رکھتے ہیں۔ تجارت اور بیوپاری سے انہیں دلچسپی نہیں ہوتی۔ دیپک بُدکی بچپن سے ذہین تھے۔ اس لیے ابتدائی جماعتوں سے ہی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ D.A.V اسکول سے سکینڈری سکول کا امتحان پاس کیا۔ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن داخلہ نہ مل سکا۔ اس لیے کشمیر یونیورسٹی سے علم نباتات (Botany) میں ایم ایس سی اور پھر بی ایڈ کی ڈگریاں حاصل کی۔ اسی دوران ایمپوریم ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت ملی۔ لیکن یہاں کی قلیل تنخواہ سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ اس لیے کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ استعفیٰ دے کر دوسری جگہ نوکری تلاش کرتے لیکن کہیں دوسری جگہ مناسب ملازمت نہ پا کر پھر اپنی سابقہ ملازمت کی طرف رجوع کرتے۔ بُدکی مسلسل کوششوں کے باوجود اچھی نوکری نہ پائی تو اپنے محسن پھوپھا کے مشورے پر (IAS) کی تیاری شروع کی۔ امتحانات کے لیے انہوں نے Indian postal services کا انتخاب کیا اور

کامیابی حاصل ہوئی۔ ''لوح حیات'' میں انہوں اپنے اس سفر کو تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔ Indian Postal Services میں ملازمت کے دوران انہیں جموں وکشمیر، ہندوستان کی بیشتر ریاستوں، گجرات وغیرہ ریاستوں میں کام کرنے کا موقعہ ملا۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنی سروس کے دوران رونما ہونے والے واقعات، حالات اور روداد کو بخوبی لکھا ہے۔ محکمہ ڈاک میں ہونے والے کاموں، احکامات اور حتیٰ کہ ہندوستانی محکمہ ڈاک کی پوری رپورٹ لکھی ہے۔

دیپک بُدکی کا تعلق کشمیری پنڈت گھرانے سے ہے۔ یہ قوم صدیوں سے اپنی منفرد تہذیب وتمدن اور روایت و عقیدے کی پاسداری کرتے آرہے ہیں۔ Shivism اور ریشی کے ماننے والی یہ قوم اپنی تہذیب اور مذہب کو آلودہ ہونے نہیں دیتی۔ کشمیری پنڈتوں کی منفرد تہذیب وتمدن، رسم ورواج اور ان کی طرز زندگی میں مذہب پسندی اور یک رنگی پائی جاتی ہے۔ کشمیری پنڈتوں کے رسوم ورواج اور تہوار دوسرے ہندوں سے مختلف ہیں۔ ان کی اپنی ایک مخصوص روایت اور تہذیب ہے جس کی آبیاری یہ قوم صدیوں سے کرتی آئی ہیں۔ دیپک بُدکی نے کشمیری پنڈتوں کی خوبصورت تہذیب وتمدن کو قدرے تفصیل سے صفحہ قرطاس پر رقم کیا ہے۔ اس منفرد تہذیب وتمدن پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''کشمیری پنڈتوں کے رسم ورواج اور تیوہار منانے کا طریقہ دوسرے ہندوؤں سے قدرے ہٹ کر ہے۔ مثلاً یگنو پویت (جینئو ڈالنے کا رسم) اور شادی کے روز پورے دن پوجا اور ہون کیا جاتا ہے۔ کشمیر کے موسم کے مدنظر شادیاں دن میں ہی ہوتی ہیں اور دولہے کو آتے وجاتے وقت ایک مخصوص رنگولی (ویوگ) پر کھڑا کیا جاتا ہے اور اس کی آرتی اُتاری جاتی ہے۔ جہیز کی لعنت عام ہے اور کئی لڑکیاں جہیز نہ دے پانے کی وجہ سے شادی نہیں کر پاتی ہیں۔ کشمیری پنڈتوں کا سب سے بڑا تیوہار شیوراتری ہے جس میں شیو اور پاروتی کی شادی کی رسمیں نبھائی جاتی ہیں۔''۵۵

مزید لکھتے ہیں

> ''کرشن کا جنم دن جہاں کشمیر سے باہر 'جنم اشٹمی' کے دن منایا جاتا ہے وہیں کشمیر میں ایک روز پہلے 'زرم ستم' کو منایا جاتا ہے اور رات کے بارہ بجے تک پوجا پاٹ ہوتی

رہتی ہے۔ای□ اور تیوہار کھیر بھوانی کا میلا ہے۔جس دن کشمیری پنڈت □ کچھ چھوڑ چھاڑ کر گا□ ربل کے□ د ی□ تولہ مولہ میں راگنیا بھگوتی (کھیر بھوانی) کی پوجا کرنے چلے جاتے ہیں۔وہاں ای□ میلہ سا لگ جا□ ہے۔ہاری□ .□□ واقعہ چکر یشوری مندر میں بھی لوگ اعلیٰ الصباح ہر روز نہ سہی تو کم از کم ہفتے میں ای□ دن پہنچ جاتے ہیں۔دیوالی اور دسہرہ کو اتنی دھوم دھام سے نہیں م□ی جا□ ہے جتنا کشمیر سے □ ہر۔''۵۶

ای□ زمانہ تھا کہ کشمیری پنڈت□ی □ جموں وکشمیر کے د□ ر سے سے منسلک تھے اور ہر اعلیٰ عہدے□ کشمیری پنڈت□ اجمان ہوتے تھے وہ زمیندار تھے اور خوشحال ن□ گی□ ارتے تھے۔لیکن وقت کے ساتھ ساتھ سماجی صورت حال میں□ لاؤ آ□ی۔وادی کشمیر کی صورت حال دن بہ دن بگڑتی گئی۔یہاں آئے دن کوئی نہ کوئی□ خوشگوار واقعات رو□ ہوتے رہتے ہیں۔پھر ای□ وقت ایسا بھی□ی کہ کشمیری پنڈت گھ□ ر چھوڑ کر ہجرت□ مجبور ہوئے۔اور بیسویں صدی کا ''عظیم ہجرت'' کا سا□ پیش□ی۔اس واقع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹اور ۲۰ جنوری کی درمیانی رات کو منصوبہ بند طر□ سے ساری وادی جاگ اٹھی۔مسجدوں میں لاوڑ سپیکر نصب کیے گئے تھے جن□ 'آزادی' 'آزادی' کے□ ے لگائے جارہے تھے، ہندوستانی □م کو للکارا جارہا تھا اور کشمیری پنڈتوں کو وادی چھوڑنے کی دھمکیاں دی جارہی تھیں۔لوگوں کو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ رات ختم ہوتے ہی . □ سورج □ع ہوگا تو ای□ نئ د□، □□م قائم ہو چکا ہوگا، یوں لگ رہا تھا کہ ہندوستانی فوج کہیں ہے ہی نہیں اور انتظامیہ □ لکل مفلوج ہو کر رہ□ی ہے۔کیوں اور کیسے اس□ یہاں بحث کرنے کا محل ہے نہ موقع۔وادی میں کشمیری پنڈتوں کی آ□ دی آٹے میں نمک کے□ □ تھی۔کسی کہ سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا کہ یہ □ کیا ہو رہا ہے۔سرکاری □م اور فوج کی یہ حا □ دیکھ کر □□ یشان ہو رہے تھے۔رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ لی اور صبح ہوتے ہی کشمیری پنڈت اپنے گھ□ ر چھوڑ کر بھاگ گئے۔کسی کو□ ک□، کسی کو سومو اور کسی کو لاری، جو جس میں □ی، چلتا بنا۔کسی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں جا□ ہے۔فرا□ نے کے لیے وادی سے ای□ ہی راستہ تھا اور وہ جموں

کی طرف جا رہا تھا۔ اس لیے سارا قافلہ جموں کی جانب روانہ ہوگیا۔ مہینے بھر میں وادی کشمیر پنڈتوں سے خالی ہوگئی ماسوا چند ایک کے جو حفاظتی فوجیوں کے کیمپوں کے آس پاس رہتے تھے یا پھر لاچاری ہو کر کسی بھی صورت حال کو مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔ اس کے باوجود ہم کو ایک موہوم سی امید تھی کہ چند مہینوں میں ہندوستانی فوج سرحد پار سے آئے دہشت گردوں پر قابو پا لے گی اور ہم واپس اپنے گھروں میں بس جائیں گے۔ اسی طرح کشمیری پنڈت اپنے ہی ملک میں رفیوجی بن گئے اور آج تک بے گھری جھیل رہے ہیں۔'' ۵۷

سرکار کی غفلت اور سیاست دانوں کی کوتاہی سے اسے شروع ہوتے ہی ختم نہیں کیا گیا اور یہ ایک عفریت بن کر وادی میں امن و سکون کو نگلنے لگا۔ وہ لکھتے ہیں:

''گورنر جگ موہن کے پہلے معیاد عہدہ میں جماعت اسلامی نے تبلیغ کے ذریعے علیحدگی پسندی کے لیے زمین ہموار کی، ملی ٹینٹوں نے اپنا پورا نیٹ ورک بچھایا اور اسلحہ کی ذخیرہ اندوزی کی جس کے بارے میں ہمارے خفیہ ایجنسیاں بے خبر رہیں۔ اس پر طرہ یہ کی فاروق عبداللہ کو چیف منسٹر کی کرسی سے ہٹا کر جی ایم شاہ کو وہاں بٹھایا گیا۔ جو ۱۹۵۳ء میں مرزا افضل بیگ کے ساتھ مل کر شیخ محمد عبداللہ کو ہندوستان سے ناتا توڑنے میں پیش پیش رہا تھا۔ وہ تب سے پاکستان کے ساتھ تعلقات بنائے ہوئے تھا اور مالی امداد لے رہا تھا۔ گورنر جگ موہن نے اپنی کتاب 'مائی فروزن ٹربیلونس ان کشمیر' (My Frozen Turbulence in Kashmir) میں لکھا ہے کہ کرسی چھوڑنے کے بعد شاہ نے کہا تھا کہ ''میں پاکستانی ہوں، ہر کشمیری پاکستانی ہے، اور ہم نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے الحاق کر کے بڑی غلطی کر لی ہے۔ سوال یہ ہے کہ . تب گورنر نے فاروق کے بجائے شاہ کو وزیر اعلیٰ بنایا، کیا اس نے اپنا ہوم ورک نہیں کیا تھا، کیا اس نے شاہ کے ماضی کے بارے میں چھان بین نہیں کروائی تھی؟ اسی ذہنیت کے آدمی کو کیسے سی ایم بنایا گیا؟ -----------------۔ لیکن جگ موہن نے محسوس کیا تھا کہ ریاست میں ہندوستان کی سالمیت کے خلاف تخریب کاری کا سامان ہو رہا ہے اور ان کی 'وارننگ سگنلز' کا راجیو گاندھی پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے تو اسے فوراً استعفیٰ دینا چاہیے تھا۔ پارلیمنٹ اور ملک میں اس مسئلے پر فوراً ہنگامہ کھڑا ہوتا اور راجیو گاندھی کاروائی

کرنے پر مجبور ہو جاتا ۔ جگ موہن کوئی سرکاری ملازم تو تھا نہیں کہ استعفیٰ دینے سے اس کی پنشن چلی جاتی ۔کم سے کم ساری قوم اس کی قربانی کو یاد رکھتی اور شاید کشمیر دہشت گردی کے لپیٹ میں نہ آجاتا ۔''۵۸

دیپک بدکی اردو ادب میں آج اپنے لیے ایک اہم مقام اور نام پیدا کر چکے ہیں ۔ان کے سات افسانوی مجموعے، کئی تنقیدی مضامین وتبصرے اور تحقیقی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور ان کا قلم رواں دواں ہے ۔آج ہندو پاک کی مختلف یونیورسٹیوں میں ان کے کارناموں اور ادبی خدمات پر تحقیقی کام ہورہے ہیں ۔کئی رسائل وجرائد میں خصوصی شمارے ان کی شخصیت اور ادبی سرگرمیوں اور کارناموں پر شائع ہو چکے ہیں ۔وہ اردو کے باقاعدہ طالب علم نہیں رہے ہیں نہ ہی کسی ادارے یا مکتبہ فکر سے منسلک رہے ہیں ۔یہ ان کی ذہانت لیاقت، محنت اور ذوق ادب کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ان کا شمار رواں صدی کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے ۔''لوح حیات'' میں دو ابواب 'سیاہی ایک بوند' اور 'ادب ۔ایک نئی شروعات' میں اپنی ادبی زندگی کی داستان رقم کی ہے ۔ان کی ادبی زندگی نہایت دلچسپ اور متاثر کن ہے ۔اپنے ادبی سفر کے محرکات کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھر میں تناؤ کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہی گیا ۔جس گھر کو بچانے کے لیے میں نے ادب سے کنارہ کشی کر لی تھی وہ اور بھی زیادہ منتشر ہو گیا ۔1996ء میں جب میں گھریلو زندگی کی بازی ہار کر غازی آباد سے دہلی پورٹ ٹرانسفر ہوا تو میں نے قلم کی سیاہی کو اکسیر اعظم سمجھ کر دوبارہ اس کا سیون کیا ۔ایک ریتی رواج کے تحت برہمن کو دوجہ جنما کہا جاتا ہے ۔پہلے اس کا جسمانی جنم ہوتا ہے اور جب وہ لڑکپن میں پہنچ جاتا ہے تو اس کا دوسرا یعنی روحانی جنم ہوتا ہے اور وہ وید اور شاستروں کا ادھین کرتا ہے ۔جنم سے تو میں برہمن تھا ہی یہاں تو ادبی زندگی میں بھی میں نے اس کا پالن کیا ۔پہلی بار جنم تو ہوا تھا ادب میں کوئی خاص مقام نہیں پا سکا ۔اب کے بحیثیت ادیب دوسرا جنم ہوا اور یہ جنم لگ رہا ہے سپھل ہو جائے گا ۔''۵۹

'لوح حیات' میں جا بجا اردو کے کلاسکی وجدید پیڑی کے شعراء کے اشعار درج کیے گئے ہیں:

پریشانیوں کو کھل کر بیان کیا ہے۔'لوح حیات' میں ایک مجبور و دل شکستہ انسان کی طرح اپنے بیٹے کو وصیت کرتے ہوئے وہ یوں رقمطراز ہیں:

> ''میری خواہش ہے کہ میرے مرنے کے بعد میرا لڑکا میری لاش کو بغیر کسی پوجا پاٹ کے برقی بھٹی میں ڈال کر آگ کی نذر کر دے یا پھر لاش کو ریسرچ کی خاطر کسی میڈیکل کالج کے سپرد کر دے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس روز میری بیزار رساں مطلقہ بیوی روتی پیٹتی اور سینہ کوٹتی چلی آئے گی اور کوئی اس سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں کرے گا کہ تم اپنے شوہر کے ساتھ رہی ہی کتنے سال کہ اب بین کر رہی ہو؟ کیا تم یہ بتا سکتی ہو کہ تم نے زندگی میں اپنے شوہر کی قمیص کے بٹن کتنی بار ٹانکے ہیں؟ کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ اس کو کون کون سی بیماری لگی ہے، کب اور کہاں پر؟ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کا پہلا ہارٹ اٹیک کب اور کہاں ہوا؟ وہ ان سب چیزوں سے بے تعلق مگر مچھ کے آنسو بہاتی رہے گی اور مجھے دل ہی دل میں بددعا دے گی کہ ''تم ابھی مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے، میں تو چاہتی تھی کہ تم ابھی اور جیو اور پستے رہو۔اس دکھ کی چکی میں تاکہ مجھے تشفی مل جاتی''۔یہی حال شاید میرے چھوٹے بیٹے اور بہو کا بھی ہوگا جنہوں نے ایک سال پہلے مجھ سے سارے رشتے ناتے توڑ دیے۔وہ بھی شاید لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے آئیں گے، چند گھڑیاں آنسو بہائیں گے اور پھر واپس اپنی بلوریں ایوانوں میں کھو جائیں گے جہاں وہ صبح شام لاکھوں کے خواب دیکھنے میں محو رہتے ہیں۔''۶۰؎

الغرض ''لوح حیات'' میں دیپک بدکی نے خودنوشت لکھنے کا نیا اسلوب اختیار کیا ہے۔انہوں نے اپنی زندگی میں رونما ہونے والے تمام واقعات کا انکشاف کیا ہے۔ذاتی و نجی زندگی، گھریلو مسائل، پیشہ ورانہ زندگی، اقتصادی مسائل غرض تمام چیزوں کو صداقت پسندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔زندگی میں کچھ تعلقات معاشرے میں معیوب سمجھی جاتی ہے انہوں نے ان رشتوں اور تعلقات کو بھی بیان کیا ہے۔'لوح حیات' میں سلیس زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ان کے انداز بیان میں شرینی ہے۔تحریر میں افسانوی انداز غالب ہے۔گاہ بگاہ ہندی اور انگریزی الفاظ

کے استعمال سے ایک حسن پیدا ہوا ہے۔ فن خودنوشت نگاری کے تمام بنیادی لوازمات اور اسلوب و تکنیک کا خیال رکھا گیا ہے۔ مختصراً یہ خودنوشت ایک ادبی سرمایہ ہے۔

میرے حصے کی دھوپ۔ (۲۰۲۰ء)

''میرے حصے کی دھوپ'' جموں و کشمیر کے مشہور شاعر پریتپال سنگھ بیتاب کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ جو تحریک ادب بنارس سے قسط وار شائع ہوتی رہی اور ۲۰۲۰ء میں تحریک ادب پبلیکیشنز بنارس سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ 278 صفحات اور 16 ابواب پر مشتمل اس کتاب میں مصنف نے اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں سے لے کر اشاعت تک کے حالات و واقعات، روداد سفر، مشاغل اور کامیابیوں و ناکامیوں غرض زندگی کے تمام نشیب و فراز پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے تعلیمی مراحل، پیشہ ورانہ زندگی کے مختلف روپ، ادبی زندگی کے نشیب و فراز اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد فراغت کی زندگی اور دیگر سماجی سرگرمیوں کا بھی احاطہ کیا ہے۔ اس خودنوشت کے مطالعہ سے بیتاب کی زندگی کے تین پہلو وا ہو جاتے ہیں۔ وہ ہیں فرض شناسی، ذمہ دار اور عرفان حق کے متلاشی۔ چونکہ وہ ایک فرض شناس سرکاری افسر، ایک ذمہ دار خانہ داری شخص اور عرفان حق کے متلاشی ایک شاعر و ادیب ہیں۔ یعنی ایک انسان اپنی جدوجہد زندگی میں ان تین روپ کو ایک ساتھ لے کر چلتا ہے اور مکمل طور پر تینوں پہلوؤں کو احسن طریقے سے نبھانے کی جتن میں لگا رہتا ہے، 'میرے حصے کی دھوپ' ایسے ایک شخص کی روداد سفر زندگی کی داستان پر مبنی خودنوشت ہے۔

پریتپال سنگھ بیتاب 26 جولائی 1949ء میں ا[illegible]لہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین کا تعلق پونچھ کے کھڑی دھرمسال نامی سرحدی گاؤں سے تھا۔ تقسیم ہند کے فسادات اور بعد میں [illegible] میں قبائلی حملوں میں یہ گاؤں کافی متاثر رہا۔ آزادی کے بعد فسادات اور علاقہ میں سرحدی کشیدگی کے باعث اس گاؤں کے باسیوں کو اپنی جان کے تحفظ کے لیے مختلف مقامات کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ پریتپال سنگھ کے والد گیانی پریم سنگھ بھی اپنے بچوں کو لے کر مختلف جگہوں کی طرف ہجرت کرتے رہے۔ بیتاب کے والدین گوردواروں میں سکھوں کی مذہبی کتاب گورو گرنتھ صاحب میں درج کلام کو گانے والے گارتی تھے۔ مختلف مقامات جیسے پنجاب، ہریانہ، دہلی اور ہماچل پردیش وغیرہ میں تلاش معاش کے

سلسلے میں مقیم رہے۔اس لیے آپ کا بچپن مختلف جگہوں پر گزرا۔آپ کو اپنے گاؤں میں زیادہ وقت گذارنے کا کبھی موقعہ نہ ملا لیکن ایک حساس ادیب کی فطرت رکھتے تھے ان کے کلام اور تحریروں میں آبائی گاؤں سے عقیدت اور والہانہ محبت جھلکتی ہے۔اسی محبت اور عقیدت کی بنا پر انہوں نے وطن کی تعریف میں خوبصورت نظمیں تخلیق کی ہیں۔اس خودنوشت میں اپنے گاؤں اور وطن کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کھڑی دھرمسال سے مجھے آج بھی محبت ہے۔عین سرحد پر واقعہ ہونے کی وجہ سے ہمارا گاؤں ہم سے چھن چکا ہے۔ہماری زمین ہمارے پاؤں کے نیچے سے کھسک چکی ہے۔میرے باپ نے آخری عمر میں ہمارے حصے کی زمین مٹی کے بھاؤ بیچ ڈالی۔لیکن میرا اب بھی جی کرتا ہے کہ کھڑی دھرمسال میں دس بیس کنال زمین خرید کر ایک چھوٹا سا فارم ہاوس بناؤں اور وہاں جا کے آباد ہو جاؤں اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک ،سرحد کے دونوں طرف سے ہر لمحہ چلتے ہوئے گولہ بارود سے بے پرواہ ہو کر یہ دیکھتا رہوں کہ پونچھ کی سرحد پر دونوں طرف سے ٹوم ڈم جاری رہتی ہے۔حالات بدلتے ہیں کہ ہوں چاہے امن کے۔''[61]

آپ کے بچپن کا کچھ حصہ پونچھ میں اپنے ننھال میں گزرا۔یہی وجہ ہے کہ پونچھ کی سرزمین سے انہیں فطری لگاؤ ہے۔پونچھ کے مناظر قدرت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے دل میں منقش تصویر کو یوں صفحہ قرطاس پر کھینچتے ہیں:

''پونچھ شہر کے چاروں طرف اونچے پہاڑ کبھی کبھار برف سے لدے ہوئے ہوتے تو انہیں دیکھنا بھی بجائے خود ایک روح افزا عمل ہوتا۔انہی پہاڑوں سے پگھلتی ہوئی برف پانی بن کر زمین دوز سفر کرتی ہوئی پونچھ شہر کی کچھ ایک خوبصورت باؤلیوں (چشموں) اور چھرنوں کی شکل میں صدیوں سے پونچھ کے لوگوں کی تہذیب و ثقافت کا ایک ضروری حصہ بنی ہوئی ہے۔''[62]

ابتدائی تعلیم فیروز پور چھاونی جالندھر میں ہوئی۔پھر ثانوی تعلیم کے لیے وہ اپنے بڑے بھائی بہنوں کے پاس پونچھ گئے۔اعلیٰ تعلیم ایل ایل بی کی ڈگری جموں یونیورسٹی سے حاصل کی۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس KAS کے مقابلاتی امتحان میں کامیابی حاصل کر کے 1977ء میں باضابطہ سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔اس طرح ملازمت کا سفر شروع ہوا اور ریاست میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔سیکریٹری،انڈر سیکریٹری،ایڈیشنل

سیکریٹری اور کمشنر سیکریٹری وغیرہ جیسے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۳۵ سال سے زائد عرصہ ملک وقوم کی خدمت کرنے کے بعد 2011ء میں اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوگئے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد اپنی اہلیہ اور اکلوتی بیٹی کے ساتھ پرسکون زندگی گزار رہے ہیں اور یکسوئی سے اپنی ادبی وتخلیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ پرتپال سنگھ بیتاب نے ریاست کے مختلف اداروں اور شعبوں میں کام کیا ہے۔ انہیں مختلف طبقوں اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے افسروں، ملازموں اور سیاسی عہدداروں کے ساتھ رہنے اور انہیں جاننے کا موقعہ ملا۔ انہوں نے سماج کے مختلف طبقے کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے۔ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انتظامی اور سیاسی دنیا کس قدر کھوکھلی اور بے بنیاد ہے۔ یہاں مطلب پرستی، ذاتی مفاد پرستی، رشوت خور واقربا پروری اور طبقاتی تفرقات اور ذات پات کی بنیاد پر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے والے لوگ اجمان ہیں۔ رشوت ستانی کے واقعات کا پردہ چاک کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''محکمہ خوراک سپلائی سے متعلق ایک اور بات جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گی وہ مٹی کے تیل (Kerosene oil) کی (Subsidised) سپلائی سے متعلق محکمے کی بد انتظامی ہے۔ مٹی کا تیل کچھ ٹرانسپورٹ کمپنیوں کے ذریعے ریاست میں پہنچتا ہے جسے آگے محکمے کے پرچون سپلائی مرکزوں تک پہنچایا جاتا ہے جو آگے صارفین تک سرکاری (Subsidised) نرخ پر اسے پہنچاتے ہیں۔ صوبہ جموں میں سب سے بڑا ضلع جموں ہے۔ لہٰذا سب سے زیادہ مٹی کا تیل ضلع جموں کے حصے میں آتا ہے۔ اب کی حقیقت یہ ہے کہ شہر جموں (جواب تک ایک Metropolitan شہر کی حیثیت اختیار کر چکا ہے) میں قریب قریب ہر گھر میں یا تو رسوئی گیس کا استعمال ہوتا ہے یا پھر چوری کی سرکاری بجلی پر چلنے والی رسوئی کے Electric Heater کا۔ مٹی کا تیل سرکاری ڈپو پر کچھ تو واقعی (چھوٹے موٹے) صارفین کو دیا جاتا ہے اور باقی یعنی زیادہ تر موٹر گاڑیوں میں استعمال ہونے والے ڈیزل (Diesel) میں ملایا جاتا ہے یا پھر سیدھے سیدھے ہی ڈیزل گاڑیوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مٹی کے تیل کے اس حمام میں اوپر سے نیچے تک سب ننگے ہیں۔ ویسے رشوت کے معاملہ میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ رشوت اوپر سے نیچے کی طرف چلتی

ہے۔''۶۳

□ تپال سنگھ کا تعلق سکھ مذہب سے ہے۔ جموں و کشمیر میں آ□ دی کے لحاظ سے تیسرے نمبر□ □ سے□ دہ سکھ مذہب کے ہی ماننے والے ہیں۔ اس کے□ وجود بھی اقلیتی درجہ ر□ □ ہیں۔ مصنف نے اپنے ذاتی تجر□ ت اور کچھ تلخ □ دوں کے شواہد کے بنا□ دورانِ تعلیم اور دورانِ □ زمت ان کی اقلیتی شنا□ □ کے□ □ ان کے ساتھ کی گئی□ سلوکیوں اور□ یشانیوں کا□ کرہ کیا ہے۔ بقول مصنف ا□ چہ وہ ا□ □ قابل، ہونہار، تجربہ کار اور اہل آفیسر تھے□ اس کے□ وجود کوئی سیاسی اور سماجی پشت پناہی حاصل نہ ہونے کی وجہ سے اعلیٰ حکام کا□ □ وان کے ساتھ منصفانہ نہ تھا۔ مصنف ملک اور□ □ کے انتظامی اور سیاسی □ م سے مطمئن نہیں ہیں۔ بقول ان کے مذہب اور قومی عصبیت نے □ م کو کھوکھلا کر رکھا ہے۔

خودنو□ □ اظہار ذات ہوتی ہے۔ اپنی □ گی میں جو کچھ ذاتی، □ اور پیشہ وارانہ معا□ ت اور واقعات پیش آتے ہیں ان تمام واقعات کو کھل کر من وعن بیان کر□ ، مصنف کی صداقت پسندی کا ثبوت ہو□ ہے۔ ''میرے حصہ کی د□ '' میں □ ب نے بے□ کانہ□ از میں ایما□ اری کے ساتھ اسی صداقت پسندی کا ثبوت□ یہ ہے۔

وہ ا□ □ تعلیم□ فتہ، تجربہ کار آفیسر ہونے کے ساتھ ساتھ ا□ □ حساس طبیعت کے مالک بھی ہیں۔ سماج میں موجو□ ائیوں، اور مسائل کا وہ بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ مختلف سیاسی وسماجی، اقتصادی ومعاشرتی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ان کا حل بھی تجو□ کرتے ہیں۔□ □ جموں و کشمیر خصوصاً کشمیر کی صورت حال سیاسی طور□ بحرانی کا شکار ہے جس کے چلتے آئے روز مختلف سماجی مسائل رو□ ہوتے رہتے ہیں۔ مصنف نے اپنی خودنو□ □ میں ان تمام سماجی و معاشرتی مسائل کو بھی بیان کیا ہے۔□ ب دونوں ملکوں کے□ سرحدی کشیدگی سے بھی□ لاں دکھائی دیتے ہیں۔ چو□ □ ب کا تعلق پونچھ سے ہے اور جموں و کشمیر کے اس سرحدی علاقہ میں آئے روز دونوں ملکوں کے□ آپسی کشیدگی کے نتیجے میں ہمیشہ تناؤ رہتا ہے اور اس لاحاصل □ کے چلتے لاکھوں عوام بے گھر ہو چکے ہیں اور ہزاروں مارے جا چکے ہیں۔ حالا□ دونوں ممالک کے اعلیٰ عہدوں□ فائض سیاستدان آپسی مصالحت سے اس کا کوئی دا□ حل تلاش □ تھے۔ لیکن□ □ کے بے بس عوام کے اس□ یشان حالی□ توجہ دینے والا کوئی نہیں۔ اس صورت حال سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ جس کا اظہار وہ اپنے شعروں کے ذریعے کرتے ہیں۔ ا□ □ □ حظہ فرمائیے:

میرے او□ نیچے دا □ □ آگے پیچھے

شؤں شوں شا □ شا □ دھا □ دھا □
کرتے ہوئے را □ گولے اور میزائل چل رہے ہیں
ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر
میں آرام کرسی □ بیٹھا ہوا
سامنے رکھی میز □ بند □ ڑی
فائلوں میں محفوظ
جمہور □ کو ڈسپوز آف کر رہا ہوں، (ڈسپوزل)
او □ او □ دیواروں والے
مکان کے دور □ روالے کمرے میں
تمہیں شا □
□ ہر چلنے والی گولیوں کی آواز
سنائی نہ دیتی ہو
لیکن □ ہر گلیوں □ زاروں میں
اور سڑکوں □
جو بے بس گھوم رہا ہے
وہ بھی تو تمہیں ہو
اس کا کیا کرو گے
وہ تو
اس قلعے میں داخل بھی نہیں ہوسکتا (اُس کا کیا کرو گے؟) ۔۶۴

اس خودنو □ میں مصنف نے اپنی ادبی □ گی کے مختلف مراحل کے □ رے میں بھی تفصیلات دی ہیں۔ شعر گوئی کا آغاز جموں میں قیام کے دوران سے کیا تھا۔ یہاں □ یو □ ان کی غزلیں نشر ہوتی تھیں۔ دھیرے دھیرے انہیں مختلف مشاعروں میں شر □ کرنے کے موقعہ ملنے لگا۔ بیرون □ □ میں بھی ان کے کلام کی □ ائی ہوتی رہی ۔عہد حاضر میں منفرد □ از کے شاعر □ تپال سنگھ □ ب نے اردو □ ن کو اپنا وسیلہ اظہار □ ۔ بعد میں ا □ شعری مجموعہ

دی□ □ی رسم الخط میں بھی تحر□ی کی۔ان کے غزلیات کا مجموعہ ''موج ر□'' کو 2005ء میں □ل انسٹی چیوٹ آف □ین لینگو یجز میسور کا بھارتی بھاشا سمّان سے نوازا □ ہے۔اور شعری مجموعہ ''□ اکیسویں صدی'' کو 2009ء میں یو پی اردو اکادمی ایوارڈ سے نوازا □ ہے۔اس خودنو□ میں مصنف نے جابجا اپنے اشعار کو□ کیا ہے اور موقع و محل کی منا□ سے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اپنے اشعار کا استعمال کرتے ہیں۔سلیس اور شائستہ □ن میں تحر□ی کردہ اس خودنو□ میں □تپال سنگھ □ب کے سوا□ کوائف کے ساتھ ساتھ ان کے دور کی سیاسی و سماجی،معاشی و معاشرتی ،تہذ□ و ثقافتی □گی کے مختلف گوشوں □ روشنی □ڑتی ہے۔تحر□ی کی □ن میں انگر□ی اور ہندی الفاظ کے امتزاج نے ا□ انوکھا حسن پیدا کیا ہے۔جابجا غزلوں اور نظموں کے اشعار کے استعمال سے تحر□ میں اور بھی نکھار دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس سے خودنو□ کی خوبصورتی میں اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

الغرض □ □ کے معاصر خودنوشتوں میں ''میرے حصے کی د□'' کا ا□ ممتاز مقام ہے۔اور یہ یہاں کے ادبی سرمایہ میں اضافہ کی حیثیت ر□ ہے۔

ب : سوانح حیات

سوانح حیات میں کسی بھی شخص کی زندگی کے حالات تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں اور اس فن کو فن سوانح کہلایا جاتا ہے۔ سوانح حیات میں سوانح نگار کسی معروف یا غیر معروف شخص کی زندگی کے محاسن و معائب دونوں بیان کرتے ہیں۔ اپنے موضوع کی حیات سے متعلق جامع اور مستند مواد کو پیش کرنا تو ضروری ہے ہی بلکہ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے کہ جس شخص کی سوانح لکھی جارہی ہے اس کی زندگی کے تمام کارناموں کو کتاب میں سلسلہ وار بیان کیا جائے۔ اگر کتاب میں صرف محاسن و کمالات بیان کئے جائیں تو اس سے سوانح ادبی معیار کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔ سوانح میں نہ تو شخصیت کے بارے میں فرضی واقعات بیان کیے جاتے ہیں اور نہ ہی مبالغہ آمیز اسلوب کا استعمال کرتے ہیں۔

جب ہم جموں و کشمیر میں سوانح حیات کی تاریخ سے متعلق بحث کرتے ہیں تو اس کی حدود محدود نظر آتی ہیں۔ سوانح مضامین پر کتابیں بھی مرتب اور شائع ہوئی ہیں۔ بعض سوانحی مضامین باضابطہ طور پر سوانح حیات کا درجہ نہیں رکھتے ہیں پھر بھی فرد کے حوالے سے ان تصانیف اور رسائل میں کافی سوانحی کوائف موجود ہیں۔ مختلف جامعات میں تحقیقی غرض سے سوانح لکھے گئے ہیں لیکن مکمل طور پر سوانح حیات پر کتابیں بہت کم ملتی ہیں۔

کشمیر کا گاندھی۔ (1934ء)

پنڈت پریم ناتھ بزاز نے شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی سوانح حیات بعنوان "کشمیر کا گاندھی"، لکھی۔ جو 1934ء میں دی کشمیر پبلشنگ کمپنی سری نگر سے کتابی صورت میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ یہ شیخ محمد عبداللہ کی ذاتی اور سیاسی زندگی کی روداد ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی تحریک آزادی کشمیر کے ابتدائی زمانے کا کارنامہ ہے۔ اس کتاب سے ہمیں شیخ محمد عبداللہ کی حالات زندگی، ذاتی و سیاسی زندگی اور خصوصاً تحریک کے ابتدائی ایام کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ شیخ محمد عبداللہ کی خواہش تھی کہ ریاست کے تمام عوام بلاتفریق مذہب و ملت کاروان تحریک آزادی کا حصہ ہو۔ تبھی شخصی راج سے ریاست کو آزاد کرنا ممکن تھا۔ مصنف شیخ محمد عبداللہ کے مشن یا تحریک کے ابتدائی دنوں کے واقعات اور کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’آپ نے حاضرین کو بتایا کہ مسلمان قوم بیدار ہو رہی ہے۔اور اپنے پیدائشی حقوق کو ڈھونڈ رہی ہے۔اس وقت موقع ہے کہ ہم آپس میں مل کر ایک دوسرے کی اعانت کریں۔یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر ہم حنفی، شیعہ، سنی، مرزائی، وہابی وغیرہ تفریقات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔اور اس پاک فریضہ میں اکٹھے ہوئے ہیں۔آپ نے اپنی تقریر میں پنڈتان کشمیر سے اپیل کی کہ وہ بھی قوم کے حقوق حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کا ہاتھ بٹائیں۔وہ تعلیم یافتہ ہیں اور مسلمانوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔وہ بیدار معزز ہیں۔کاش وہ مسلمانوں کے خلوص کو جان کر ان کے ساتھ مادر وطن کی آزادی کی پاک تحریک میں ہمارا ساتھ دیں۔‘‘ ۶۵

مصنف نے شیخ محمد عبداللہ کے مشن و تحریک کی بنیاد، تشکیل و تنظیم، اغراض و مقاصد، عملی سرگرمیوں اور منصوبوں کو مفصل انداز میں لکھا ہے یہ دونوں اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔مصنف نے شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی زندگی کے ابتدائی ایام کے روز و شب کی مصروفیات، ان کے منصوبوں و سرگرمیوں اور مختلف مجالس و محافلیں کی گئی ان کی تقریروں کو حرف بہ حرف کتاب ہٰذا میں مختلف عینی شواہد کے ساتھ ساتھ اخبارات و رسائل کے حوالے سے اور واقعات کو مستند بنایا ہے اور جو کچھ شیخ محمد عبداللہ اور مصنف کے مابین براہ راست گفتگو ہوئی ہوں ان کا ذکر بھی ملتا ہے۔انہوں نے ہر واقعہ کو اس کے پس منظر کے ساتھ بیان کیا ہے۔شیخ محمد عبداللہ کی گرفتاری کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

’’14 جولائی کے روز جامع مسجد کو ملٹری نے گھیر لیا ہے۔اور گیٹ پر سدر رلینڈ مسجد کے اندر آگیا۔آتے ہی اس نے دریافت کیا۔کہ عبداللہ کون ہے۔اور اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔اس کے بعد شیخ عبداللہ کو ایک ملٹری لاری میں بٹھا کر بادامی باغ چھاونی میں لے گیا۔جہاں اس کو کوارٹر گارڈ کے کمرے میں رکھا گیا۔جموں کے باشندے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ملٹری کوارٹر گارڈ میں قیدیوں کے لیے نہ کوئی بستر اتھا نہ کمبل۔اس لیے جب رات آگئی تو انہوں نے اپنے کوٹ فرش کی اینٹوں پر پھیلا دیے۔اور ان سے بستر ہ کا کام لیا۔جوتیوں کو نکال کر ان کو سرہانے کی جگہ رکھ لیا۔‘‘ ۶۶

شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی زندگی کے ابتدائی مراحل اور تحریک کے سفر اور روداد کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے

ان تمام واقعات کو بیان کیا ہے جو ان کی زندگی سے جڑی تھیں۔ان کی سیاسی زندگی کا آغاز، ان کے افکار و نظریات، منصوبوں اور ہر ایک لائحہ عمل کا بلاتکلف تذکرہ کیا ہے۔کشمیر کے محکوم ومقہور عوام کے تئیں شیخ کی محبت، خلوص و ہمدردی اور قربانیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔جس کی بنا پر وہ عوام میں نہ صرف ہر دلعزیز تھے بلکہ لوگ ان کو اپنا مسیحا قرار دیتے تھے۔اسی ہر دلعزیزی اور محبت سے ''شیر کشمیر'' بنائے۔انہوں نے مختصر وقت میں اتنے کارنامے انجام دئے تھے کہ مستقبل میں ان سے نیک خواہشات اور امیدیں وابستہ تھیں۔مصنف نے شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ ان کی نجی اور خانگی زندگی کی صورت حال پر بھی روشنی ڈالی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف اور موضوع یعنی شیخ محمد عبداللہ کے درمیان بے تکلف دوستانہ تعلقات استوار تھیں۔شیخ محمد عبداللہ کی شادی بقول مصنف ان کی زندگی میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔جس کا اعتراف شیخ محمد عبداللہ نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ''آتش چنار'' میں بھی کیا ہے۔اس ضمن میں □از یوں لکھتے ہیں:

> ''انہی دنوں آپ نے ایک معزز مسلم خاتون کو رفیق زندگی بنایا۔بیگم عبداللہ ایک انگریز عیسائی خاندان سے پیدا ہوئی۔آپ کے والد ماجد مسٹر ہری نیڈو نے ابتدائی عمر میں ہی اسلام قبول کر کے ایک کشمیرن سے شادی کر لی تھی۔جس سے بیگم عبداللہ پیدا ہوگئی ہے۔مسز عبداللہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، نیک باطن اور نیک سیرت خاتوں ہیں۔اس شادی سے مخالفین شیر کشمیر کے لیے پھر پروپیگنڈا کا موقعہ ملا۔اور عوام میں یہ خبر پھیلا دی گئی کہ اب شیخ محمد عبداللہ پولیٹکس سے علیحدہ ہو گئے۔انھوں نے ایک عیسائی لڑکی سے شادی کر لی لیکن جیسا کہ اخبار ''وتستا'' کے نامہ نگار خصوصی کا بیان ہے کہ ''شیر کشمیر کا خیال اس شادی سے یہ تھا کہ وہ قومی کام میں زیادہ سرگرم حصہ لیں کیونکہ جس کے ساتھ اس نے زندگی کے بقیہ ایام گزارنے کا فیصلہ کیا ہے وہ تعلیم یافتہ خاتون اور قومی سپرٹ رکھنے والی ایک دیوی ہے۔اس کے ساتھ کام کرنے میں کشمیری بہنوں کا سوشل سدھار کا کام بہت جلدی تکمیل تک پہنچا سکیں گے۔''۶۷

شیخ محمد عبداللہ تحریک آزادی کشمیر کے سربراہ تھے۔ان کے ساتھ ان کے رفقاء بھی قدم قدم پر شریک رہتے تھے۔ایک پوری تنظیم آسمان سیاست میں جلوہ گر ہو کر صدیوں سے غلام جموں و کشمیر کے اقوام، بالخصوص کشمیر کے مجبور و محکوم عوام کو بادشاہت اور ڈوگرہ شخصی راج سے آزادی اور نجات دلانے کے لیے کوشاں تھی۔یہ تنظیم نہ صرف کشمیر میں زوروں

پر تھی بلکہ پوری ریاست، جموں، پیر پنجال اور گلگت بلتستان کے دور افتادہ علاقوں میں بھی ان کے نعروں سے تحریک آزادی کی آواز گونج رہی تھی۔ جموں کے تعلیم یافتہ نوجوان بھی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کے حصہ لے رہے تھے۔ وہ مذہب، ملت اور ذات پات سے بالاتر ہوکر انسانیت کو ترجیح دیتے ہوئے بھائی چارگی، حب الوطنی اور اخوت، ہم آہنگی سے سرشار ہوکر ''شیر کشمیر'' کی آواز پر لبیک کہہ کر تحریک کا حصہ بنے تھے۔ یہی شیر کشمیر کا منشا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر کوئی چیز شخصی استبداد سے آزادی دلا سکتی ہے تو وہ ہے ریاست کے عوام کے بیچ اتحاد و اتفاق اور یہ تب ممکن نہیں۔ جب مذہب و ملت، ذات پات اور رنگ و نسل کی تفرقات سے بالاتر ہوکر آپس میں یگانگت کا اظہار نہ کرے۔ شیخ محمد عبداللہ کے دل میں بے لوث محبت، احترام، خلوص و ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف نے موصوف کی تقریر کا اقتباس پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''میرا ایمان ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ دنیا میں آکر تمام مخلوق خدا کو گوناگوں مصائب سے بچائے۔ ان کے لیے کلفتیں برداشت کرے۔ ان کو راحت وامن و سکون کی زندگی بسر کرنے کے مواقعات بہم پہنچائے۔ ان کو مظلومیت سے چھٹکارا دلائے۔ میرے نزدیک عبادت کا راستہ ہی یہی ہے۔ کہ دنیا میں بشر کی زندگی جسمانی اور روحانی آزادی کے حاصل کرنے میں صرف ہو۔ ورنہ حیوانوں کی طرح صرف اپنے فائدے کے لئے کوشش کرنا اپنا پیٹ پُر کرنا کوئی انسانی فضیلت نہیں۔ پس جو کچھ حقیر خدمت میں میں نے اپنے وطن یا اپنی قوم کی فلاح و بہبودی کے لئے انجام دیں۔ وہ میں نے کسی پر احسان نہیں کیا۔ بلکہ وہ صرف اپنے فرائض کی ادائیگی کا تقاضا تھا۔ نیز جو کچھ ہوا ہے خدا کی منشا سے ہوا ہے۔ یہ خدا کا احسان ہے۔ کہ اس نے مجھ ناچیز ہستی سے کام لیا۔ ورنہ میری ذات خود ایک ضعیف انسان کی کیا بساط ہے کہ وہ اتنا عظیم الشان کام انجام دے۔''۶۸

شیخ محمد عبداللہ کا منشا و مقصد ریاست جموں و کشمیر کے عوام کو سامراجی اور استبدادی حکومت سے آزادی دلانا اور ان کو آئینی و قانونی حقوق دلانا تھا۔ چونکہ پنڈت پریم ناتھ بزاز تحریک آزادی کشمیر کے روح رواں قائدین میں سے تھے۔ اور شیخ محمد عبداللہ کے قریبی مصاحبین میں شامل تھے۔ اس لیے انہوں نے موصوف کی شخصیت، نفسیات، عادات، محرکات اور سرگرمیوں کو قریب سے دیکھا اور سمجھا۔ بزاز کا تعلق اقلیتی طبقے سے تھا اور شیخ محمد عبداللہ کا ان پر

خاص رحم وکرم تھا اوران سے متاثر تھے۔ وہ بھی اس تحریک کو کامیاب بنانے میں شیخ محمد عبداللہ کے شانہ بہ شانہ ساتھ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سوانح میں شیخ محمد عبداللہ کے ابتدائی سیاسی زندگی، نظریات وافکار، شخصیت، تحریک آزادی کشمیر کے گوناگوں واقعات سے متعلق معلومات ملتی ہیں۔ اگرچہ شیخ محمد عبداللہ کی تحریک کو حکومت ہند کی حمایت حاصل تھی ڈوگرہ حکومت کی شاہی اثر ورسوخ کی بنا پر اس تحریک کو غیر قانونی قرار دیا گیا اور اس پاداش میں 1931ء اور 1934ء کے دوران انہیں چار مرتبہ قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑی۔ اور مخالفین ان پر غداری کے فتوے لگاتے رہے۔ ان پر مرزائیت کے مبلغ ہونے کا الزام بھی لگایا گیا۔ بے شک ایسی باتوں سے ان کو صدمہ تو پہنچتا تھا۔ لیکن ان کا عزم واستقلال کبھی متزلزل نہ ہوئے۔ ایسے ہی ایک واقعہ کے ضمن میں 'شیر کشمیر' کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''میر واعظ نے آپ کے خلاف احمدیت کا الزام لگا کر 1933ء کے آغاز میں جامع مسجد کے اندر زور دار پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ تو شیخ محمد عبداللہ بیرون ریاست چلے گئے تھے۔ آپ کو جب یہ خبر ملی تو آپ نے ۱۶ اپریل کے روز جموں میں شالہ مار باغ کے اندر نماز عید کے بعد مسلمانوں کے عظیم الشان جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ:
>
> 'وہ شخص صریح جھوٹ کہتے ہیں۔ جو مجھے احمدیت اور مرزائیت کی تہمت دے رہے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ اعلان کیا اور آج میں پھر سے اپنے عقیدے کا اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ رسول اکرم ﷺ کو ختم النبیین سمجھتا ہوں اور آپ کی بعث کے بعد نبی نہیں ہوسکتا اور میں ہر مدعی نبوت کو مسلمان نہیں سمجھتا۔''۲۹

من جملہ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ''کشمیر کا گاندھی'' شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی زندگی کی مختصر کہانی ہے۔ مختصر سے مراد ولادت سے 1936ء تک کے زندگی کے واقعات کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اس دور کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی صورت حال کی آئینہ داری ہوجاتی ہے۔ زبان وبیان میں مصنف نے سلیقہ مندی سے کام لیا ہے۔ انہیں زبان وبیان پر دسترس حاصل تھا۔ اور وہ ایک اچھے افسانہ نگار اور خاکہ نویس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ محمد عبداللہ کا سوانح حیات بھی بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب کو تاریخی اہمیت کے ساتھ ساتھ یہ جموں وکشمیر میں سوانح نگاری کی اولین تصنیفات میں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مصنف نے اپنی لیاقت اور زبان وبیان

واقفیت ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے سوانح نگاری کے فنی وتکنیکی اصولوں کو مد نظر رکھ کر کو بہترین انداز میں یہ سوانح تحریر کی ہے۔

زور آور سنگھ۔(۱۹۶۴ء)

اردو اخبار ''چاند'' کے مدیر اعلیٰ دیوان سنگداس نرگس نے ڈوگرہ دور سلطنت کے ایک بہادر ''جنگجو'' جنرل زروآور سنگھ کی سوانح حیات تحریر کی۔''انیسویں صدی کے ایک عظیم جنرل زور آور سنگھ'' کے عنوان سے 1964ء میں اخبار چاند پریس کے زیر اہتمام شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ سنگداس نرگس اردو ادب کے ایک کہنہ مشق ادیب و مدیر تھے۔انہوں نے جنرل زروآور سنگھ کی حالات زندگی، خارجی و داخلی اور ذاتی زندگی، ڈوگرہ دربار کے وقار کی بحالی اور اس کو وسعت دینے میں ان کے کردار، دوراندیشانہ فیصلوں کے ساتھ اس معاملہ فہم سپاہی کی مصروفیات زندگی، فتوحات وشکست کو بیان کیا ہے۔اگرچہ مصنف نے جنرل زور آور سنگھ سے متعلق ابتدائی معلومات مہاراجہ گلاب سنگھ کی تاریخ میں درج کی تھی۔بقول مصنف ایک تشنگی سی رہتی تھی۔اس لیے انہوں نے شرح وبسط کے ساتھ دیگر حقائق و واقعات کی روشنی میں اسے سوانح عمری کے طور پر کتابی صورت دے دی۔اس کی وجہ تصنیف کے متعلق مصنف لکھتے ہیں:

> ''اسطرح سے زور آور سنگھ کے بچپن سے آغازِ شباب تک کی جو باتیں پردۂ راز میں تھیں۔میں نے اکٹھی کر کے تاریخ گلاب سنگھ کے دوسرے ایڈیشن میں دے دیں۔اور اب جب کہ میں ونیز زور آور سنگھ کی مکمل سوانح حیات کو کتابی شکل میں پیش کر رہا ہوں تو اور بھی کئی باتیں نیل زور آور سنگھ کے متعلق درج کی جارہی ہیں جو کہ آج تک تاریخ کی زینت نہیں ہو سکی تھیں۔''۰۷

جنرل زور آور سنگھ کی نصف سے زیادہ زندگی رزم گاہ میں گزری۔انہوں نے ڈوگرہ سلطنت کے حدود اربعہ کو وسعت دی۔اور اس کی سرحدوں کو چین اور افغانستان تک پہنچایا۔ان تمام سرگرمیوں کو اگر سوانح حیات کے قالب میں ڈھالا جائے تو یقیناً تاریخ پر ایک ضخیم کتاب بن جاتی۔یہ مصنف کی ادبی لیاقت اور صلاحیت کا ہی کمال ہے کہ انہوں

نے ایک طویل عرصے پر محیط اس عظیم جنرل کی سوانح کو "سمندر کو کوزے میں بند کرنے" کے مصداق مختصراً بیان کیا ہے۔ اور موصوف کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے شروع میں ہی اس وقت کے وزیر اعظم خواجہ غلام محمد صادق کا انگریزی رقعہ بھی شامل ہے۔ جس میں انہوں نے مصنف کو مبارکباد پیش کی ہے اور زور آور سنگھ کے حالات زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاکر قارئین کے لیے مفید و معاون بنانے کی اس تحریر پر اپنی مسرت کا اظہار کیا ہے۔

نرسنگداس نرگس نے صبر آزما تحقیق و تفتیش اور بڑی محنت سے اس سوانحی داستان کو منظر عام پر لایا ہے۔ بقول مصنف اس سے قبل زور آور سنگھ کی زندگی پر مختلف مورخین نے مضامین لکھے ہیں لیکن باضابطہ کتابی صورت میں دستیاب نہیں۔ یہی احساس کی اٹھارویں صدی کا ایک باشجاعت و باصلاحیت عظیم جنرل جس نے ڈوگرہ سلطنت کا دائرہ وسیع کر کے نہ صرف ڈوگرہ دیس کے پہاڑوں کو مخلط کیا بلکہ سرحد کے حدود سے پرے پیر پنچال کے پہاڑوں، کوہ ہمالیہ کے دامن میں آباد علاقوں لداخ و بلتستان، کیلاش پربت، مانسرور، پورنگ اور تبت کے دور افتادہ علاقوں کو ڈوگرہ سلطنت میں شامل کر کے رہتی دنیا تک اپنی بہادری، فہم و فراست اور دانشمندی کا ثبوت چھوڑ گیا۔

جنرل زور آور سنگھ کی زندگی کے حالات اور واقعات تاریخ کے اندھیرے گوشوں میں پوشیدہ تھا۔ مصنف نے دقیق اور محنت طلب تحقیق کے ساتھ تلاش کر کے سامنے لایا۔ کانگڑہ ہماچل پردیش میں پیدا ہونے والا یہ لڑکا اپنی زندگی میں مختلف راستوں سے گزر کر ڈوگرہ شاہی دربار سے منسلک ہوا ہے۔ دربار تک کی رسائی معجزہ سے کم نہیں۔ یہ اس کی بہادری اور ذہانت کا کمال ہے۔ ابھی سن صغیری ہی میں تھے کہ اپنی خداداد فطانت اور ہنرمندی سے مہاراجہ گلاب سنگھ کو اپنا گرویدہ بنالیا اور دربار تک رسائی ہوئی۔ جس نے ان کی زندگی کا لائحہ عمل ہی بدل دیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ سے ہوئی اس ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں :

> "وہ ایسے وقت میں جموں پہنچا کہ جب وہ شہر کے ہر داخلی دروازہ دھونتلی کی ڈھکی پر ستا رہا تھا۔ اس نے ایک ایسے نوجوان کو دھوتی میں ملبوس سر پر راجپوتی پگڑی باندھے ہاتھ میں پانی کی گڑوی اٹھائے ڈھکی پر چڑھتے دیکھا جو دریائے توی سے اشنان کر کے آرہا تھا۔ جب وہ نزدیک پہنچا تو زور آور سنگھ نے اپنے ہاتھ خود بخود اس کے پرنام کے لئے جوڑ دیئے۔ یہ نوجوان گلاب سنگھ تھا جو لاہور سے ان دنوں جموں میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے چھٹی لے کر آیا ہوا

تھا۔اس نے اسے دیکھ کر پوچھا۔''تم کون ہواور تمہارا کیا نام ہے؟ زورآور سنگھ نے جواب میں کہا''میرا نام زوراور سنگھ ہے۔تو گلاب سنگھ ہنس دیا اور ازراہِ مذاق کہنے لگا کہ ایک شخص بہادر نام کا تھا لیکن میدان جنگ سے بھاگا تو لوگوں کے پوچھنے پر اس نے جواب دیا کہ مجھے میری ماں بہادر بھی کہتی تھی اور کھسکو کے نام سے بھی پکارتی تھی۔کہیں ایسے ہی زورآور سنگھ تم بھی تو نہیں ہو؟ اس پر زورآور سنگھ نے نہایت عاجزی سے کہا کہ اس بات کا جواب وقت ہی دے سکتا ہے...

....

زورآور سنگھ نے اپنے آقا گلاب سنگھ کی کس طور سے خوشنودی حاصل کی اس کے متعلق مختلف کہانیاں ہیں۔زورآور سنگھ کو ریاسی کے قلعہ میں ایک معمولی سپاہی کی ڈیوٹی سپرد کی گئی۔......
.... البتہ لوگوں میں زورآور سنگھ کی بہادری اور جانبازی کے چرچے تھے۔گلاب سنگھ نے زورآور سنگھ کے اس کارنامے پر خوش ہوکر انعام واکرام دیے۔اور ریاسی میں اس کی مستقل رہائش کے لیے مکانات بنوانے کے احکام دئے۔''اے

ٹھاکر گس نے جنرل زورآور سنگھ کے منصوبوں،محاصبوں اور جنگی حکمت عملیوں، فتح و کامرانیوں کے علاوہ مختلف جنگجوں کے دوران پیش آنے والے مسائل و دشواریوں اور سختیوں و پریشانیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔سطح سمندر سے پندرہ ہزار فٹ سے زیادہ کی اونچائی پر واقع خطہ تبت،لداخ و بلتستان ڈوگرہ فوجیوں کے لیے بالکل نیا تھا اور اس سرد موسم کے شدت کی سردی اور برف باری میں میدان جنگ کے منظر اور زورآور سنگھ کی جنگی تدبیروں کو مصنف نے فخریہ انداز میں پیش کیا ہے۔ٹھاکر گس کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے فن سوانح نگاری کے لوازمات کو مدِنظر رکھتے ہوئے تمثیلات و استعارات کے استعمال کے ساتھ سوانحی انداز میں اس نادر واقع کو نہایت دلچسپ اسلوب اور انداز سے بیان کیا ہے۔اس علاقے کا سرد موسم اور سخت ماحول ڈوگرہ سپاہیوں کے لیے نہایت ہی صبر آزما اور کٹھن تھا۔انہیں مختلف مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔زورآور سنگھ کا مہاراجہ گلاب سنگھ سے علاقہائے تبت،لداخ و بلتستان کے مہم کے لیے اجازت لینے کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

''ونیز زورآور سنگھ پانچ سال جموں میں رہا اور مہاراجہ گلاب سنگھ کے حکومتی کاموں میں امداد

کرتا رہا۔علاقہ جات ...سی۔بُدھل،،راجوری اور پونچھ کے انتظامات اس کے ماتحت تھے۔اس نے لوگوں کوامن وقانون کی حد کے اندر رہنے کی تلقین کی اوران علاقوں میں اپنے ا...ف کی دھوم مچادی۔زورآورسنگھ نے اپنے آقاسے مدار سے بلتستان کی تسخیر کے لئے اجازت طلب کی اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کا جھنڈااسکردو میں جسے چھوٹی تبت کہا جاتا ہے۔گاڑا جائے۔مہاراجہ گلاب سنگھ نے وزیر کومہاراجہ رنجیت سنگھ سے آشیرواد حاصل کرنے کے لئے کہا۔''۲؎

جنرل زورآورسنگھ تمام عمرڈوگرہ شاہی حکومت کے عزیز ترین اور وزیر خاص کی حیثیت سے بادشاہ پر اپنا جان نچھاور کرتا رہا۔زورآورسنگھ کواس بات پر فخر تھا کہ مہاراجہ نے اسے اپنا بھائی کہا تھا۔یہی وجہ ہے بادشاہ نے جووقار وعزت اور مال وزرعنایت کی تھی وہ بھی اس نے سلطنت کے لیے وقف کردی۔بادشاہ کی اس عنایت اور مہر کے صلے میں انہوں نے اپنی ساری زندگی ڈوگرہ سلطنت کے حدود وار بعہ کووسعت دینے میں وقف کردی۔پہلے ڈوگرہ سلطنت صرف جموں کے اطراف اورکشمیر تک محدود تھا۔...زورآورسنگھ نے کشتواڑ، پاڈر، لداخ، بلتستان اور تبّت کوبھی ڈوگرہ سلطنت میں ضم کرلیا۔یہ ایک ... حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی بادشاہ جبراً کسی علاقے پر قبضہ کرتا ہے تو اسے وہ اپنی فتوحات و کامرانوں کے اعمال نامے میں درج کرتا ہے۔لیکن اس فتح وکامرانی کی تاریخ کتنے مظلوموں کے خون سے لکھی جاتی ہے وہ کہیں درج نہیں ہوتا۔زورآورسنگھ نے ڈوگرہ سلطنت کے حدود کو یہ وسعت نہ دی ہوتی آج ... کا نقشہ ہی مختلف ہوتا۔اس سوانح عمری میں سوانح نگار نے زورآورسنگھ کی حالات زندگی کی سرگرمیوں کوقلمبند کرنے کے لیے ... واقعات کا سہارا لیا۔اس لیے اس کتاب میں فتوحاتِ ڈوگرہ سلطنت کی تاریخ کی جھلک دیکھنے کوملتی ہے۔اقتباس دیکھئے:

''وزیر زورآورسنگھ کی فتوحات نے لہاساوالوں کے دلوں پر سخت دہشت بپا کررکھی تھی۔وہ اسے ایک غیرمعمولی انسان خیال کرتے تھے۔کہتے ہیں کہ وزیر کے مارے جانے پر اس کا خون اور گوشت معتبر کاً لہاساوالوں نے اپنے درمیان تقسیم کیا۔اوراس کا سرکاٹ کراپنے ساتھ لے گئے جسے ایک عالیشان چھورتین تعمیر کرکے رکھا گیا۔یہ چھورتین آج بھی موجود ہے۔اورایک ٹکڑااس کے گوشت کا گونپہ ٹشی گانگ میں رکھاہواہے۔ان تبرکات کے سامنے

اوقات معین□□ھوں کے طریق کے مطابق عبادت کی جاتی ہے□ کہ وہ□یسورگباشی کی روح
کسی دوسرے جنم میں ا□نی لباس دھارکر ملک لہاسا کی تباہی کا□ □ نہ ہو۔''۳۳ے

اس کتاب میں جہاں جنرل زورآور سنگھ کی حالات □ گی ،اس کی کامیابیوں و کامرانوں ،اس کے کرداراور شخصی خوبیوں کو بیان کیا□ ہے وہیں اس وقت کے□ □ اور مفتو□ علاقوں کی صورت حال کو بھی بیان کیا ہے۔

اس کتاب میں زورآور سنگھ کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ جموں ، کشمیر ،لداخ او رگلگت بلتستان کی سیاسی ،سماجی ،اقتصادی اور معاشرتی □ گی□ روشنی ڈالی گئی ہے۔شمالی ہند کا یہ وسیع علاقہ جہاں کا جغرافیائی ،تہذ□ و ثقافتی ،لسانی ، مذہبی ،سماجی اور سیاسی نوعیت جود□ علاقوں سے مختلف ہے۔اس خطہ کے □ ربھی مختلف قبیلے□ وہ ،اور لسانی اکائیوں میں آپسی ہم آہنگی نہیں ہے۔اس متنوع تہذ□ والے علاقہ کوا□ سلطنت میں شامل ک□ اور لاکھوں عوام کے مستقبل کو ڈ□ ہ حکمران کے ہاتھوں سو□ دینا ا□ اہم منصوبہ بندی اور جا□ نی کا کام تھا۔بقول مصنف زورآور سنگھ نے اسے احسن طر□ سے ا□ م□ ۔چو□ گس کا تعلق جموں سے ہے۔اس لیے وہ اپنے موضوع کی حالات □ گی لکھتے وقت بعض جگہوں □ اس کی شخصیت سے اس قدر متا□ □ آتے ہیں کہ موصوف کی د□ شخصی کمزوریوں اور خامیوں سے صرف□ کرتے ہوئے□ آتے ہیں ۔ جوا□ کامیاب سوانح عمری لکھنے کے لیے ادبی نقطہ□ سے معیوب سمجھی جاتی ہے ۔ پوری کتاب میں زورآور سنگھ کو عظیم جنرل زورآور سنگھ ا□ ہیرو کے روپ میں پیش کیا □ ہے۔الغرض ان تمام□ ر□ ، سیاسی اور سماجی واقعات کو مصنف نے ادبی پیرائے میں□ ے خوبصورت □ از میں پیش کیا ہے جو قار□ کے لیے دلچسپ مطالعہ کا□ □ بن سکتی ہے۔

شیر ڈ□ لالہ ہنس راج۔(۱۹۶۷ء)

لالہ ملک راج صراف نے''□ □ جموں و کشمیر کے اولین عوامی رہنما 'شیر ڈ□ لالہ ہنس راج'' کے عنوان سے صوبہ جموں سے تعلق ر □ والے ا□ سماجی کارکن اور سیاسی رہنما لالہ ہنس راج کی سوانح حیات لکھی۔جو 1967ء میں راج محل پبلشرز د□ □ ھ روڈ جموں سے شائع ہوئی۔یہ کتاب لالہ ملک راج صراف کی اہم تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ملک راج صراف جنہیں''□ □ جموں و کشمیر کا□ ئے صحافت'' کہا جا□ ہے۔وہ صحافی کے ساتھ ساتھ ا□ کہنہ

مشق ادیب بھی تھے۔ کتاب کے دیباچہ اور پیش لفظ سے پوری کتاب کا موضوع اور اہمیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔30 ذیلی ابواب پر مشتمل اس کتاب میں صراف نے لالہ ہنس راج کی ابتدائی زندگی، تعلیمی زندگی، عملی زندگی، سماجی اور سیاسی زندگی اور عمر کے آخری دنوں کے واقعات کو 'دریا کو کوزے میں بند کرنے' کے مترادف مختصراً اور جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ان کے کمال فن سوانح نگاری اور زبان پر قدرت کا ہی نتیجہ ہے کہ تمام ابواب اگرچہ مختصر ہیں لیکن موضوع کی زندگی کے سارے واقعات کا احاطہ کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سوانح حیات مولانا الطاف حسین حالی کی 'حیات جاوید' کے طرز پر لکھی گئی ہے۔مصنف چونکہ اردو ادب کے شیدا تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ اس انداز میں لکھا گیا ہو۔

لالہ ہنس راج 2 اکتوبر 1866ء کو موضع ہمیر پور سدھر تحصیل اکھنور، ضلع جموں کے ایک ڈوگرہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم گاؤں کی ایک مسجد میں فارسی اور اردو سے شروع ہوئی۔ وہ مسجد میں ابھی زیر تعلیم ہی تھے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ شاہی دورے پر اس گاؤں میں آئے۔ بچے کی ذہنی صلاحیت دیکھ کر مہاراجہ نے لالہ ہنس راج کو جموں میں سرکاری اخراجات سے پڑھنے کا انتظام کیا۔ابتدائی تعلیم اور وکالت کی اعلیٰ تعلیم مکمل کرنے کے بعد مہاراجہ نے انہیں راجکمار راجہ رام سنگھ کی ملازمت میں لگایا۔ لیکن بہت جلد اسے ترک کردیا۔ بعد میں چیف جج کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ ترقی پا کر رجسٹرار کے عہدے پر فائض ہوئے۔لیکن ملازمت کے دوران بھی وہ پبلک کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔اس لیے حکام ان سے ناخوش رہنے لگے۔ بالآخر سرکاری ملازمت کو خیرباد کہہ کر عوام کی خدمت کے لیے عملی طور پر میدان میں اتر آئے۔ وہ جموں و کشمیر کے پہلی عوامی قومی تنظیم ڈوگرہ صدر سبھا کے بانی ہوئے۔ یہ سبھا ریاست کے تمام فرقوں اور طبقوں کی بلاتفریق مذہب وملت مشترکہ جماعت تھی۔ 9 جولائی 1936ء کو لالہ ہنس راج سٹیٹ اسمبلی، جس کا نام ان دنوں "پرجا سبھا" تھا کے بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوئے۔اسٹیٹ اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے انہوں نے کئی اہم کام، سماج اور خصوصاً دیہاتی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے انجام دیئے۔اس ضمن میں موصوف کی ایک تقریر کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> "اس لیے دیہات سدھار کے تعلق میں ایک کمیٹی ضرور مقرر کی جانی چاہیئے۔حکومت کو زیادہ ترقی یافتہ ریاستوں کے نقش قدم پر چل کر دیہاتی لوگوں کے سدھار پر زیادہ سے زیادہ روپیہ خرچ کرنا چاہیئے۔شہروں میں کوٹھیاں تعمیر کی جاتی ہیں۔اور بعض اشخاص اس سے ترقی کا

اندازہ لگایا جاتا ہیں کہ یہ درست بات نہیں ہے۔ دیہاتی رعایا کی حالت فی الواقع ناگفتہ بہ ہے۔ بے بس ان بے بس، لاچار اور غریب لوگوں کی ترقی کے لئے ٹھوس اقدامات نہیں کئے جاتے۔ اور ان کو جلد سے جلد عملی شکل نہیں دی جاتی۔ یہ قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ شیخ سعدیؒ نے کیا بجا فرمایا ہے:۔

شنیدم کی در وقت نزع رواں   بہ ہُرمز چنیں گفت نوشیرواں

کہ خاطر نگہدارِ درویش باش   نہ در بندِ آسائش خویش باش

''میں نے سنا ہے کہ جب نوشیرواں بستر مرگ پر تھا تو اس نے اپنے وزیر اعظم ہُرمز سے کہا کہ درویش کے دل کی رکھوالی اور دلجوئی کرا اور ذاتی آسائش کی پرواہ نہ کر۔''[۴۷]

لالہ ہنس راج ایک فعال سماجی کارکن تھے۔ انہوں نے خطۂ جموں کے دور دراز علاقوں کے غریب عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے بے شمار خدمات انجام دی۔ دیہاتی عوام کی زندگی میں درپیش تمام مسائل کو وہ بآسانی سمجھ پاتے تھے۔ کیونکہ ان کا تعلق ہی دیہات سے تھا اور ان مسائل کا حل بھی احسن طریقے سے انجام دیتے تھے۔ گاؤں کے لوگوں کی زندگی کی بنیادی ضرورت پوری کرنے کے لیے انہوں نے باضابطہ ایک کمیٹی تشکیل دی۔ جس میں مقامی نوجوانوں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ اگر ان علاقوں میں کسی ضرورتِ زندگی کی کمی درپیش آئے تو سب مل کر اس کا حل ڈھونڈیں۔ پینے کے لیے صاف پانی، نہریں اور آبپاشی کے لیے نہر کی تعمیر، سڑکیں، صاف صفائی اور طبی ضرورت مہیا کرائی جائیں۔ دوسری طرف حکومت کا ایک کارندہ ہونے کے باوجود حکومتی کام اور انتظامی امور پر ان کی گہری نظر تھی۔ سرکاری کارخانوں اور دکانوں کے آمدنی اور اخراجات کے سلسلے میں وہ بے جھجک ڈوگرہ شاہی دربار میں حکمرانِ وقت سے حساب مانگتے تھے۔ حالانکہ اس دور میں اظہارِ رائے پر پابندی عائد تھی۔ ایسے ہی ایک واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے صراف لکھتے ہیں:

''بجٹ پر تقریر کرتے ہوئے لالہ جی نے ایک بار اسمبلی میں فرمایا۔'' جو روپیہ لوگوں سے ٹیکس وغیرہ کی صورت میں وصول کیا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کے صلاح مشورہ سے ہی خرچ کیا جانا چاہیے۔ لیکن یہاں ریاست میں حالت ہی دگرگوں ہے پبلک کا روپیہ ایسے لوگ بے دریغ خرچ کر رہے ہیں جنہیں عوام کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اخراجات کا موجودہ

طریق ہی دُور نہیں ہے۔''۵؎

لالہ ہنس راج ایک انقلاب پسند سماجی رہنما تھے۔ وہ مہاتما گاندھی اور راما کرشن کے مشن سے بہت متاثر تھے۔ ملک گیر چل رہی سوشل ریفارمر (سماجی اصلاح) کی تحریک کو دیکھ کر اپنی ریاست میں بھی انقلاب لانے کی کوشش کرتے رہے۔ ڈوگرہ شاہی حکومت سے آزادی کے لیے بغاوت کرنا ممکن نہ تھا اس لیے عوام کی ترقی، بحالی اور معیاری زندگی میں سدھار لانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ مختلف شعبۂ ہائے زندگی میں تبدیلی لانے کے لیے ایک کمیٹی ''آئینہ ترقیات'' تشکیل دی اور اس کمیٹی کے مینی فیسٹو کو انہوں نے از خود تیار کیا۔ جسے وہ مہاراجہ ہری سنگھ کے دربار میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کسی وجہ سے پیش نہ کر پائے۔ البتہ جموں کے مختلف اضلاع میں عملی طور پر اس کمیٹی کے تحت بے شمار کام ہوئے۔ وہ تمام مذاہب وعقائد اور فرقے سے تعلق رکھنے والوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے رہے۔ سماجی انقلاب کے لیے انہوں نے گرام پنچایت اور پنچایتی راج کے قیام کی حمایت کی۔ صاف صفائی کے لیے ایک محکمہ قائم کرنے کی تجویز کی۔ سوادیشی اشیا کے استعمال پر زور دیتے ہوئے جموں میں پہلا کھادی انڈسٹری کھولا۔ عورتوں کی تعلیم و ترقی کے مد نظر استری سبھا اور انجمن مستورات قائم کی۔ جموں میں سیوا مندر، سیوا آشرم، سیوا ہسپتال، انادھ ودیالہ، وردھ آشرم اور گئو شالہ قائم کیا۔ ریاستی تعلیمی نظام سے وہ مطمئن نہیں تھے اس لیے اس کمیٹی کے ذریعہ اس میں تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں لالہ جی کی کاوشوں اور سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی مذہبی رواداری اور منصفانہ منصوبوں کا ذکر کرتے ہوئے صراف لکھتے ہیں:

> ''اس اسکیم کے شروع میں لالہ جی نے دھارمک اور مذہبی فرائض کی ادائیگی پر زور دیا ہے۔ مثلاً پانچ برس کی عمر کے بعد ہر ایک بچے نوجوان نیز بوڑھے اشخاص کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کے غرض سے ہندوؤں کو کم سے کم ہندی، گورمکھی پڑھ کر سندھیا، پوجا پن ہون، ہوم یگیہ، پاٹھ جپ پاٹھ وغیرہ اور مسلمانوں کو گلستاں، بوستاں، نام حق اور عربی پڑھ کر نماز وغیرہ ادا کرنے کی پابندی لازمی طور پر اختیار کرنی چاہئے'' نیز مذہبی مقامات اور قابل پرستش جگہوں مندر۔ مسجد۔ گوردوارہ وغیرہ کی اصلاح کروانی اور وہاں پوجاریوں، متولیوں کی نیک چلنی کی جانچ پڑتال کا مناسب انتظام اور ہر قسم کی منشیات کا انسداد۔''۶؎

الغرض یہ سوانح عمری تاریخی، سماجی اور ادبی لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب ریاست جموں وکشمیر کی

ابتدائی تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔اس سوانح عمری میں لالہ ملک راج صراف نے فن سوانح نگاری، اس کے اسلوب، تکنیک، لوازمات کا خاص خیال رکھا ہے۔اس لیے فنی اعتبار سے یہ ا□ عمدہ سوانح عمری ہے۔اس مختصر□ جامع کتاب میں□ ن و بیان کی□ ت کی جائے تو صاف وشستہ□ ن کے ساتھ موقع ومحل کی منا□ سے ہندی الفاظ ومحاوروں کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔لیکن کچھ اس خوبی سے کہ روانگی□ قرار رہتی ہے اور□ ن کی□ رت اور شائستگی میں اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہندی اور اردو الفاظ کا امتزاج اور ان کو جملے میں ضم کرنے کا ہنر صراف کو خوب آ□ ہے۔جس سے ان کی تحر□یوں میں□ رت اور شگفتگی□ ئی جاتی ہے۔اس کتاب سے□ □ خصوصاً صوبہ جموں کی□ ریخ ،سماج، معاشرہ، سیا□ اور عوامی□ گی کی تمام پہلوؤں□ روشنی□ تی ہے۔

صنم□ بو۔(۱۹۸۱)

سوانح حیات '**صنم□ بو**' خطۂ لداخ کے ا□ معروف قلمکار اور اسکالر جناب عبدالغنی شیخ کی تصنیف ہے۔انہوں نے لداخ کے ا□ ما□ زانجینئر اور سیا□ دان□ م شری ایوار□ فتہ شری صنم□ بو کی ہنگامہ خیز□ گی کو ضبط تحر□ میں لا کر یہ کتاب تخلیق کی۔سوانح نگار صنم□ بو سے بے پناہ محبت اور عقیدت ر□ تھے۔وہ اپنے موضوع یعنی صنم □ بو کی قابلیت، لیاقت، محنت اور کا□ موں کے قدردان تھے۔اس لیے صنم□ بو کی وفات کے فوراً بعد ہی ان کی□ گی اور حیات□ ان کی سوانح حیات لکھی۔یہ کتاب سال 1981ء میں جمال□ نٹنگ□ یس دہلی سے شائع ہوئی۔پیش لفظ جموں کشمیر کے سابق و□ اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے لکھا ہے۔پیش لفظ میں مرحوم صنم□ بو سے اپنی ذاتی وابستگی اور ان کے تئیں اپنی محبت و اعتماد کو بیان کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ صنم□ بو کی شخصیت□ روشنی ڈالی ہے۔صنم□ بو کے کا□ موں،□ □ ، ملک و بیرون ملک میں ان کے کا□ موں اور□ ستی عوام کی فلاح و بہبود او□ قی کے لیے ا□ م دئے ہوئے ا□ کا□ موں کا□ کرہ کیا ہے۔

عبدالغنی شیخ نے صنم□ بو کی وفات کے فوراً بعد مختلف مقامات، افراد اور اداروں سے مواد اور ر□ رڈ یکجا کر کے مستند مواد کے ساتھ یہ کتاب تخلیق کی۔انہوں نے ان تمام شخصیات، خا□ ان کے افراد، دو□ و احباب، colleague، ذاتی□ زم غرض ان تمام لوگوں سے جن سے صنم□ بو کا رشتہ□ وابستگی رہی ہوں□ قات کر کے

اور ذاتی انٹرویو لے کر ان کے خیالات و تاثرات کے ذریعہ مرحوم کی زندگی کے مختلف حالات و واقعات، روداد،
اور کارناموں اور ان کی شخصیت سے متعلق معلومات حاصل کر کے واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

صنم بو 27 جولائی 1909ء میں لیہہ کے پاس سکرہ محلّہ میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے
والد کسان تھے۔ ابھی وہ تیسری جماعت میں ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ نو برس کی عمر میں لیہہ کے پرائمری
اسکول میں داخلہ لیا۔ یہ اسکول خطۂ کا واحد اسکول تھا۔ کسی کے ذاتی مکان میں کلاسز ہوتی تھیں۔ صنم بو بھائی بہنوں میں
سب سے بڑے تھے۔ ان کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ وہ اوسط درجے کے طالب علم تھے۔ گو کہ ذہین طلباء میں ان
کا شمار نہیں ہوتا تھا لیکن بلا کی حد تک حساس اور محنتی تھے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کود میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ آٹھویں
جماعت کے بعد چند ماہ کے لیے اسی اسکول میں بطور مدرس کام کیا۔ وہ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن گھر کا حال
اچھا نہیں تھا اس لیے ہمت نہیں جٹا پا رہے تھے۔ ان کے شوق، محنت، ولولہ اور عزم کو دیکھ کر لیہہ کے ایک متمول شخص صنم
انگچک نے ان کو آگے پڑھنے کی تحریک دی اور امداد کا بھی یقین دلایا۔ 1927ء میں وہ حصول تعلیم کی غرض سے سرینگر
روانہ ہو گئے۔ اُن دنوں لیہہ اور سرینگر کا راستہ نہایت ہی دشوار گذار تھا۔ درّہ زوجیلہ کو عبور کر کے جانا پڑتا تھا۔ سڑکیں
نہیں بنی تھیں۔ حصول تعلیم کی خاطر وہ یہ مسافات طے کر کے آگے بڑھے۔ ان کی پڑھائی کے دوران گھر والوں کو مالی
پریشانیوں کا سامنا پڑتا تھا۔ چونکہ ان دنوں کشمیر میں سائنس کی تعلیم کا انتظام نہیں تھا اس لیے سرینگر سے
ایف۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد وہ جموں چلے گئے۔ جموں سے انہوں نے 1934 میں بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری
حاصل کی۔ گریجوشن کے بعد صنم بو نائب تحصیلدار کی ٹریننگ کے لیے منتخب ہوئے۔ اسی دوران حکومت نے
Engineering کی چند آسامیوں کے لیے اشتہار نکالا۔ صنم بو نے بھی اس کے لیے درخواست دی۔ نائب تھانہ
دار کی ٹریننگ ختم ہوتے ہی انجینئرنگ کی ٹریننگ کے لیے منتخب ہوئے۔ گیلنسی کمیشن نے آٹھ امیدواروں کی سفارش کی
تھی۔ لداخ سے صنم بو منتخب ہو گئے۔ ٹریننگ کے لیے انہیں انگلینڈ بھیجا گیا۔ انہوں نے تقریباً پانچ سال تک انگلینڈ
میں قیام کیا۔ فائنل میں کم کام ہونے کی وجہ سے ایک سال بڑھ گیا۔ پھر دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے وہ انگلینڈ میں پھنس
گئے۔ واپس آنے میں دو سال کی مزید دیر ہوئی۔ انگریزوں کی معاشرت نے صنم بو کی زندگی پر گہرے نقش چھوڑے
تھے۔ آخری وقت تک وہ انگریزوں کی اعلیٰ قدروں کو اپناتے رہے۔ انہوں نے مثبت اثرات قبول کیے۔ وہ ایک مثالی

انگ کی طرح وقت کے پابند، را گو، وسیع النظر اور فہم پسند تھے۔

15 جون 1943ء میں صنم بو جہلم دہلی روڈ کے اسسٹنٹ انجینئر کے طور پر منتخب ہوئے اور ڈ ڈ ث ر ہ مولہ کا چارج بھی ان کی تحویل میں دے دیا گیا۔ انہوں نے لیہہ ہوائی اڈے کی تعمیر کی۔ یہ کام نہایت پیچیدہ اور مشکل تھا انہوں نے اس کارِ دشوار کو کامیابی کے ساتھ مکمل کر کے دکھایا۔ لداخ جو سال میں چھ مہینے سے زائد عرصہ باقی د سے کٹا رہتا تھا اس کو د سے جوڑ دیا۔ 1958ء میں وہ سپرٹینڈنٹ انجینئر، لیہہ مقرر ہوئے۔ لیہہ ہوائی اڈے کی طرح ایک اور اہم کام انہوں نے اپنے ذمہ لیا یہ تھا لیہہ سرینگر قومی شاہرہ کی تعمیر کا کام۔ یہ کام نہایت دشوار گذار، Challenging اور حوصلہ شکن تھا صنم بو کی محنت، عزم اور تجربے سے 1964ء میں مکمل ہو گیا۔ 1965ء میں D.C لیہہ کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ 1959ء سے 1968ء کے دوران بستی محکمہ تعمیرات اور سرحدی سڑکوں کی تنظیم (BRO) کی مشترکہ تعاون سے لداخ میں مشترکہ طور پر 1060 کلومیٹر سڑک کی تعمیر کی گئی جس کا سہرا صنم بو کو جاتا ہے۔

1969ء میں وزیر اعظم اندرا گاندھی نے انہیں منگولیہ میں ہندوستان کے سفیر کی حیثیت سے بھیجا۔ تقریباً چھ سال تک منگولیہ میں مقیم رہے۔ واپس آ کے سیاست میں قدم رکھا۔ قانون ساز اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے۔ ان کی شریف النفسی، اور کردار کی پختگی کو دیکھ کر شیخ محمد عبداللہ نے انہیں اپنے کاروان میں شامل کیا۔ 20 فروری 1980ء میں لداخیوں کا رہبر، دیش کا یہ مایہ ناز فرزند دہلی میں مختصر علالت کے بعد اس جہاں فانی سے رخصت ہو گئے۔ ان کی میت کو ہوائی جہاز کے ذریعہ لداخ میں آخری رسوم کی ادائیگی کے لیے لایا گیا۔

سوانح نگار کا تعلق لداخ سے ہے شاید اس لیے انہیں مرحوم صنم بو کی قابلیت، محنت اور کارناموں کا شدّت سے احساس ہے۔ یہی وجہ یہ محبت اور احترام ہے کہ انہوں نے یہ خوبصورت سوانح حیات اختصار سے مستند مواد اور شواہد و دلائل کے ساتھ صفحہ قرطاس پر اتارا ہے۔ دوران تحقیق انہوں نے مختلف لوگوں سے ملاقاتیں کر کے اور رجوع ہو کر صنم بو کے بارے میں معلومات حاصل کیں ور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی۔ وہ صنم بو کی بے وقت موت کو لداخ اور لداخی عوام کے لیے ایک غیر تلافی نقصان قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"۔ جب کوئی بڑا آدمی مر جاتا ہے تو کئی دفعہ رسمی طور پر کہا جاتا ہے کہ مرنے والے کی موت سے ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ لیکن صنم بو کی موت سے لداخ میں سچ مچ

ا□ ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کو□ کو□ مشکل ہے۔'' ۷۷

سوانح نگار نے ان لوگوں کے□ ات و بیان اور اپنے ذاتی تجر□ ت کی بن□ صنم□ بو کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں□ روشنی ڈالی ہے۔صنم□ بو مخلص،ا□ ن دو □ ،صاف گو□ ر،خوش اطوار،خوش مزاج،□ □ پسند اور امن پسند شخصیت کے مالک تھے اور□ ھمت کی تعلیم کے□ تو وہ تصور''مر□ ں مرنج'' کے حامی تھے۔سوانح نگار لکھتے ہیں:

> ''صنم□ بو کے کردار میں اثبات □ دہ ہیں۔لیکن□ کم ہیں۔یہی ان کی□ ائی کی دلیل ہے۔آجکل کے زمانے میں ا□ ن میں اثبات کم ہوتے ہیں اور□ □ دہ۔وہ مخلص تھے۔دل کے صاف تھے۔کسی کو نقصان پہنچ□ نہیں چاہتے تھے اور□ ے محنتی تھے۔لیکن وہ کھلتے نہیں تھے۔انہوں نے اپنے ا□ ا□ مصنوعی خول□ ھالیا تھا اور ا□ ایسا□ از اختیار کیا تھا گ□ وہ مغربی کلچر کے دلدادہ ہیں□ کہ لوگ ان کی□ قی پسندی کی تعریف کریں۔ان کے لاشعور میں لداخ رچا بسا تھا۔لیکن وہ شعوری طور□ اس□ ت کو ظاہر ہونے نہیں دیتے تھے۔اور کئی دفعہ ان کی ادا ان کی سوچ کی چغلی کھاتی تھی۔میں اسے HYPOCRACY نہیں کہوں گا۔البتہ ہم اسے نمود و□ ئش کہہ □ ہیں۔ا□ انہوں نے لداخ کی□ قیات کے لیے کام کیا تو اس میں ان کی شان اور کامیابی کا راز مضمر تھا۔وہ خوش نصیب تھے کیو□ ماضی میں لداخ میں ان کے مقابل کوئی اور فرد نہیں تھا۔'' ۸۷

وہ تمام عمر□ ستی عوام خصوصاً لداخ کے پسما□ ہ غری□ عوام کی فلاح و بہبودی اور تعمیر□ قی کے لیے کام کرتے رہے۔انجینئر جیسے پیشے سے منسلک رہ کر انہوں نے کبھی اپنے ذاتی مفادات کے لیے کام نہیں کیا۔ٹھیکہ داروں کو اپنے ار□ دگھومنے نہیں دیتے تھے۔یہ صنم□ بو کی محنت لگن اور فرض شناسی کا ثبوت ہے کہ ا□ غری□ گھرانے میں پیدا ہونے کے□ وجود ملک کے سرکردہ انجینئروں میں ان کا شمار ہو□ تھا۔وہ لداخ کے عوام کے لیے ا□ مثالی کردار اور نوجوان□ کے لیے مشعل راہ۔

الغرض 'صنم□ بو' عبدالغنی شیخ کی ا□ اہم تصنیف ہے۔سوانح نگار نے جس دلکش و خوبصورت منظر کشی اور □ یت نگاری سے پس منظر کو ابھارا ہے وہ بہت ہی دلکش ہے۔سلیس، سادہ و شستہ اور عام فہم □ ن کا استعمال کیا □ ہے۔عموماً اکثر سوانح حیات میں مصنف واقعات و احوال کو اسی عہد میں پیش کرتے ہیں جس عہد میں وہ واقعہ ہوا

ہے۔□عبدالغنی شیخ کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے واقعات وواردات کو اُس□ ریخ اور زمانے میں رکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ شخصیات آج جی رہے ہوں۔ جموں کشمیر کی سوانح حیات کی میدان میں یہ تجر□ لکل منفرد ہے□ خوبصورت ہے۔ اس سوانح حیات کو نہ صرف خطۂ لداخ کی پہلی سوانح حیات ہونے کا شرف حاصل ہے بلکہ اس میں یہاں کی عوامی □ گی کے مختلف پہلوؤں سیاسی، سماجی، معاشی و معاشرتی اور اقتصادی غرض اس صدی کی تیز رفتا□ قی□ روشنی ڈالی ہے۔ عبدالغنی شیخ مورخ، فکشن نگار اور اسکالر ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں بے شمار□ ر□ واقعات بیان کئے ہیں اور ساتھ ہی لداخ کی□ ر□ وتہذ□ پس منظر کو ابھارا ہے۔ جس سے یہ اس عہد کی تہذ□ وتمدن او□ ریخ کا مرقع بن□ ہے۔

حامدی کا□ ی حیات اور شاعری۔ (2001ء)

مصرہ مریم کی تصنیف ''حامدی کا□ ی حیات اور شاعری''□ وفیسر حامدی کا□ ی کی حیات اور شاعری□ ہے۔ مصرہ مریم حامدی کا□ ی کی رفیقہ حیات ہیں۔ یہ کتاب سال 2001ء میں کمپیو□ سٹی راج□ غ سرینگر سے شائع ہو کر منظر عام□ آئی۔ اس کتاب کو مصنفہ نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول□ وفیسر حامدی کا□ ی کی حیات اور دوم ان کی شاعری□ ہے۔ مصنفہ نے یہ کتاب□ ہی تنقیدی غرض سے لکھی ہیں او□ ہی تحقیقی بلکہ صرف اپنے شر□ حیات□ وفیسر حامدی کا□ ی کی□ گی ان کے کا□ موں اور□ مات کو پیش کرنے کے لیے لکھی ہے۔ مصنفہ نے حامدی کا□ ی کی حیات قلم بند کرنے سے قبل سرزمین کشمیر کی□ ریخ□ مختصراً روشنی ڈالی ہے۔ پس منظر میں 2000ء سال قبل کی کشمیر کی□ ریخ کو سمیٹ لیا ہے جس سے ان کے وسیع مطالعہ کا□ ازہ ہو جا□ ہے۔ انہوں نے حامدی کا□ ی کے بچپن اور لڑ□ سے متعلق مواد ان کے خا□ ان کے□ رگوں اور عز□ واقارب سے حاصل کیں۔ وہ لکھتی ہیں کہ حامدی کا□ ی نے جس ماحول میں آ□ کھولی او□ ۔□ ئی۔ وہاں □ □ □ ،صوفی منش، درویشانہ مزاج کے لوگ تھے۔ متوسط گھرانے میں مشترکہ کنبہ تھا□ پ، چچا اور د□ اہل خانہ مل جل کر خلوص و محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے گھر میں صوفیانہ موسیقی کی محفلیں جمتی تھیں۔ درُود وازکار کی مجلس منعقد ہوتے تھے اور والدہ صاحبہ اکثر دل سوز□ از میں کشمیری اشعار گاتی ہوئی ا□ رہوتی تھیں۔ بچپن ایسے ماحول میں□ رنے کی وجہ سے انہیں شعروشاعری سے لگاؤ پیدا ہو□ □۔

اس دور میں کشمیر بحرانی دور سے□ رر رہا تھا، سیاسی ا□ ر، معاشرتی□ حالی، ہر طرف قتل و غارت□ ی، کشمیری عوام□ مفلسی ، مجبوری و مقہوری چھائی ہوئی تھی۔ ان تمام چیزوں کو حامدی کا□ ی نے قری□ سے دیکھا اور محسوس کیا۔ دھیرے دھیرے اپنے احساس و□ ت کو صفحہ قرطاس□ □ شروع کر□ ی۔ مصنفہ نے حامدی کا□ ی کی تخلیقی □ گی کے سفر کو نہای□ مستند طر□ سے لکھنے کی سعی کی ہے۔ حامدی کا□ ی کی علمی و ادبی □ گی کے سفر کا□ کرہ مصنفہ نے ان کی زمانہ طا□ علمی کے دنوں سے ہی کیا ہے۔ اور جو کچھ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ان کو بھی سمیٹ لیا ہے اور اس کتاب میں حامدی کا□ ی کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کی فہر□ بھی شامل کی ہیں۔

جہاں□ □ وفیسر حامدی کا□ ی کی ذاتی □ گی اور شخصیت کا تعلق ہے مصنفہ ان کے ساتھ رشتہ ازدواج میں شامل ہونے سے لے کر آ□ ی عمر□ ان کے ساتھ رہی ہیں۔ انہوں نے حامدی کا□ ی کو قری□ سے دیکھا، انہیں سمجھا، ان کی □ گی کے نشیب و فراز سے واقف تھیں۔ چو□ وہ موصوف کی رفیقہ حیات ہیں اس لیے وہ موصوف کی □ وجہد، ذاتی و داخلی □ گی، گھر□ مسائل غرض تمام چیزوں سے واقف ہیں شا□ یہی وجہ ہے کہ□ وفیسر حامدی کا□ ی □ جتنے لوگوں نے قلم اٹھا□ ہے مصنفہ نے ان تمام سے منفرد اسلوب اپنا□ ہے۔ مصنفہ نے حامدی کا□ ی کو شادی سے قبل ا□ طا□ علم کی حیثیت سے کالج کی لائبر□ ی میں کتابیں ڈھو□ تے ہوئے دیکھا تھا، پھر انہیں وادی کے ابھرتے ہوئے نوجوان تخلیق کار، شاعر،□ نگار محقق□ د اور اد□ کی روپ میں دیکھا اس کے علاوہ ا□ ذمہ دار فرد خانہ، شوہر، والد اور شہری کی حیثیت سے دیکھا اور سمجھا۔ وہ ان کی داخلی اور ا□ ادی فطرت سے واقف تھیں۔ ذہنی کیفیت جا□ تھیں۔ شا□ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں ان تمام چیزوں کی بھرپور عکاسی بغیر کسی جانبداری سے کی گئی ہے۔□ وفیسر حامدی کشمیری کی □ گی سے متعلق نقطہ□ کو مصنفہ یوں بیان کرتی ہیں:

> ''ا□ نی رشتوں کی□ مالی، رفتا عمر، رفتار وقت اور حقیقت ازلی کی تلاش جیسے ازلی مسائل کے □ رے میں ان کا رویہ منفرد اور حقیقت پسندانہ ہے۔ □ گی کے □ رے میں وہ□ دی طور□ وجودی رویے کے قائل□ آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ا□ ن کا □ سے پہلے سامنا اپنے وجود ہی سے ہو□ ہے اپنے وجود کی □ ہیاں، بوالعجبیاں، معذو□ ں اور امکا□ ت اس کے تجربے کی زد میں ہیں کیو□ ا□ ن جسمانی کمزوریوں اور حد بندیوں میں قید اور اس کا ہر قدم موت کی جا□ اٹھتا ہے اس لئے د□، رشتوں، □ گی، خوبصورتی اور تہذ□ کے□ رے میں

مثالی رویے ایک حد تک ہی ساتھ دیتے ہیں۔ حامدی اپنی سطح پر ایک حقیقت پسند انسان کی
طرح زندگی گزارنے کے حق میں ہیں، وہ انسانی دکھ سکھ کو زندگی کا لازمہ قرار دیتے ہیں اور
زندگی کے لئے مطلوبہ جد وجہد کو ضروری سمجھتے ہیں۔'' ۷۹؎

مصنفہ نے حامدی کشمیری کو ہر رخ اور ہر پہلو میں دیکھا۔ اپنے موضوع کے طرزِ زندگی، مسلسل جد وجہد، شعور وافکار اور ان کے آس پاس کے حالات کے اثرات کو بیان کیا ہے۔ حامدی کشمیری نے تمام عمر سیاست، منسٹری، اعزازات، مال وجاہ اور شہرت اور ناموری سے بے نیاز ایک بے داغ ادبی اور علمی زندگی گزاری۔ علم وادب کی خدمات کے لیے خود کو وقف کر رکھا اور آج جو عزت واحترام اور شہرت ان کو حاصل ہوئی ہے۔ وہ صرف ان کی محنت اور جہد مسلسل کا ہی نتیجہ ہے۔ مصنفہ حامدی کشمیری کی شخصیت پر یوں روشنی ڈالتی ہیں:

> ''حامدی کی شخصیت قوی ہے، وہ وقت پڑنے پر پہاڑ کی طرح مضبوطی سے جمے رہتے ہیں لیکن حد درجہ نحیف ونزار و کمزور بھی ہیں، ڈرا اور بے باک ہونے کے باوجود خوف زدہ رہتے ہیں۔ وہ انسانی شر سے خوف محسوس کرتے ہیں، یہ تضاد ان کی شخصیت کو انسانی سطح پر لے آتا ہے، یہ تضاد یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ آگے بھی جاری رہتا ہے۔ وہ بظاہر سمندر کی طرح شانت ہیں لیکن باطن سمندر کی پرشور لہروں کی طرح بے قرار رہتے ہیں، ایک طرف صبر و دانش کے مجسمے ہیں لیکن دوسری طرف بے چینی، اضطراب اور بے صبری کے پیکر ہیں۔ دشمنوں کے رویے کو نظر انداز کرتے ہیں اور ان کے طرزِ ناز سے دکھی ہوتے ہیں، زندگی کو لایعنی قرار دیتے ہیں اور دینوی کاموں سے جی نہیں چراتے موت کی دہشت کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور زندگی سے حد درجہ پیار کرتے ہیں، وہ زندگی کو ''بازیچۂ اطفال'' سمجھتے ہیں اور اس کا تماشا کرنے میں دلچسپی لیتے ہیں، عجلت پسندی ان کی طبیعت کا خاصا ہے منہ سے بات نکلی نہیں کہ پوری ہونی چاہئے کہتے ہیں وقت کم ہے اور ڈھیروں کام پڑے ہیں۔ میں ان کی اس عجلت پسندی کی عادی ہوگئی ہوں لیکن پھر بھی اکثر عاجز ہو جاتی ہوں۔'' ۸۰؎

من جملہ اس کتاب میں مصنفہ نے غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ انہوں نے پروفیسر حامدی کاشمیری کا اپنے شریکِ حیات ہونے کے باوجود بھی ان سے متعلق کوئی ایسی بات نہیں لکھی ہے جو ان کی زندگی میں پیش نہ آئی ہو اور نہ ہی

ان کی شخصیت کوفرشتہ صفت□ . □ کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ حامدی کشمیری کی تمام خوبیوں اور خامیوں کوبھی□ □ بیان کیا ہے۔مصنفہ نے مختصر اور جامع□ از میں سلیس اور عام فہم□ ن میں حامدی کا□ ی کی حیات وشخصیت کوقلم بند کیا ہے □ کہ ادب کے قار□ کوا□ ایسے اد□ سے متعلق معلومات حاصل ہوں،جس نے تمام عمر اپنے آپ کوعلم وادب کے لیے وقف کیا،درس□ ریس کو پیشہ□ اور شاعری کواظہار ذات□ ۔اس کتاب کی مستند (Authentic) ہونے کا ہمیں بخوبی□ ازہ ہوجا□ ہے . □ ہم□ وفیسر حامدی کا□ ی کی خودنو□ □ سوانح حیات''رہگزر در رہگزر''اور اس کتاب کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں۔اس کتاب میں وہ بے شمار واقعات وروداد بیان کیے گئے ہیں جو حامدی کا□ ی نے بھی لکھے ہیں۔مصرہ مریم نے اپنی مشاہدات،تجر□ ت اور معلومات کو عام فہم اسلوب میں بیان کیا ہے۔حامدی کا□ ی کی حیات□ قلم اٹھانے سے قبل اس گھر کے□ ے□ رگوں،شا□ دوں،ادیبوں اور عز□ وں سے بھی مواد حاصل کیا اور خود ان کی ز□ گی میں ہم سفر کی حیثیت سے تمام عمر ساتھ رہیں،انہیں حامدی کا□ ی کو□ ھنے،مطالعہ کرنے اور قر□ سے دیکھنے کا موقعہ□ اور اپنی مشاہدات□ ات کوقلم بند کیا۔

عام فہم وسلیس اور سادہ□ ن میں تحر□ یر کردہ یہ سوانح عمری نہ صرف حامدی کشمیری کی ز□ گی کا احاطہ کرتی ہے بلکہ □ □ کی ادبی وعلمی د□ کی سر□ میوں کی بھی عکاسی کرتی ہے۔

سردار فتح محمد خان کر□ ی۔(۱۹۹۵ء)

سوانح حیات''تحر□ آزادی کشمیر کے□ نی غازی کشمیر: سردار فتح محمد خان کر□ ی'' کومحمود محمد آزاد نے سردار علی شان جنہال کے تعاون سے تصنیف کر کے شائع کی۔یہ کتاب 140 ابواب اور 305 صفحات□ مشتمل ہے۔سوانح نگار نے اپنے موضوع (Subject) یعنی سردار فتح محمد خان کر□ ی کی طویل مجاہدانہ ز□ گی کوقلم بند کیا ہے۔ا□ ب سردار فتح محمد خان کر□ ی کے فر□ سردار سکندر حیات خان کے□ م شاعر مشرق علامہ اقبال کے اس شعر کے ساتھ کیا ہے۔

وہی ہے صا□ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

کتاب کا پیش لفظ جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے سینئر رکن اللہ رکھا ساغر نے تحریر کیا ہے۔ پیش لفظ میں ساغر نے کرنی صاحب کا تعارف کرتے ہوئے ان کی تحریک آزادی میں ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی شخصیت، اور ان کے ساتھ جماعت کے رکن کے حیثیت سے تعلقات بیان کئے ہیں۔ پیش لفظ کے آئینہ میں کرنی کی سیاسی زندگی، مشن اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

سوانح نگار نے اپنے موضوع سردار فتح محمد خان کرنی کے خاندانی پس منظر اور آباواجداد کے بارے میں اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے وقت راجگان پونچھ اور ڈوگرہ راجوں کی تاریخ بھی بیان کی ہے۔ پونچھ کا علاقہ برسوں سے کشمیری حکمرانوں کی جاگیر میں رہنے کے بعد مہاراجہ گلاب سنگھ نے اپنے بھتیجے کو بطور جاگیر دیا کیا اور وہ آزاد حکمران پونچھ رہا۔ چونکہ علاقہ زرخیز اور زراعت کے لیے مفید تھی اور آمدنی کافی اچھی ہوتی تھی اس لیے راجا نے مالیہ وصول کرنے کا رواج عام کیا۔ سوانح نگار نے کرنی کے آباواجداد اور شجرے کے بارے میں لکھتے وقت جموں کشمیر کے نامور محقق منشی محمد الدین فوق کی تصنیف ''تاریخ اقوام پونچھ'' سے استفادہ کیا ہے۔ اور ان کی اولاد، خاندانی کاغذات، دفتری دستاویزات، مختلف انجمنوں کے ریکارڈ، اور ان کے دوست واحباب سے کتاب کے لیے مواد حاصل کی۔ سردار کرنی کے خاندانی ریکارڈ کے مطابق فتح محمد خان کرنی، سردار فیروز خان کے گھر 1899ء میں پیدا ہوئے۔ کرنی نے اپنی ابتدائی تعلیمی نہایت کامیابی سے حاصل کی۔ پرائمری تعلیم میں پونچھ کے پرائمری اسکول سے پہلی پوزیشن میں پاس کیا۔ 1919ء میں ڈوگرہ سرکار کے محکمہ پولیس میں ملازمت اختیار کی۔ ابتدائی تربیت نہایت جانفشانی سے ہوئی۔ مختلف مقامات پر تعیناتی کے دوران ڈوگرہ حکام کے طرزعمل کو بھی پاس سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ڈوگرہ سپاہی عوام کے ساتھ نہایت بے رحمانہ اور توہین آمیز رویہ کرتے تھے۔ اور مسلمانوں کو خوفزدہ وحراساں کرنے کے لیے بھی ان کی یہی پالیسی ہوتی تھی کہ مسلمان دبے رہیں۔ دوسری طرف ہندوستان کی سیاسی صورتحال کے نشیب وفراز کا بھی مشاہدہ کرتے رہے ساتھ ہی دوسرے علاقوں کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کا جائزہ لے کر اس کا موازنہ اپنی پسماندہ ریاست سے کرتے تھے۔ پھلور پنجاب میں قیام کے دوران کانگریس، مسلم لیگ اور مجلس احرار کے جلسوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔

ان کی قابلیت اور صلاحیت سے متاثر ہو کر پھلور پولیس اکیڈمی نے راجہ پونچھ سے ان کی منتقلی کی درخواست کی

لیکن راجا نے ایسے قابل سپاہی کو□ی □ کی ضرورت اور□ شہ بتاتے ہوئے منتقل کرنے سے انکار کر□یا۔ لیکن□ .□
کے دوران انہوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ آگے جا کے □زمت□ ک کر کے قوم و ملت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر□
ہے۔ اس حوالے سے سوانح نگار نے موصوف کے ا□ بیان کو□ کیا ہے جو انہوں نے کسی ا□ نشست میں دی
تھی۔ اقتباس □حظہ فرما□ :

> ''یہ حالات دیکھ کر میں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ میں ڈ□ ہ حکومت کی □زمت
> ہر□ نہیں کروں گا بلکہ میری آئندہ □ گی میں اس کام میں صرف ہو گی کہ میں □ستی
> مسلمانوں کے دلوں میں□ ا□ پیدا کروں اور ان کے دلوں سے وہ خوف و ہراس زائل
> کروں جو ڈ□ ہ حکومت نے بے پناہ مظالم کے ذریعہ ان□ طاری کر رکھا ہے۔''[۸۱]

وہ تحر□ آزادی کشمیر کی □ وجہد کے ابتدائی دور ہی میں تحر□ میں شر□ ہو گئے۔ پہلی مرتبہ پولیس میں
□زمت کے دوران راجہ پونچھ کے تمام چوکیوں کو□ رآتش کر□یا۔ کیو□ ان چوکیوں سے ہی بھاری کسٹم وصول کئے
جاتے تھے۔ دوسری مرتبہ مزدوروں اور بیگاروں کو جمع کر کے مہاراجہ کے محل□ پتھراؤ کر□یا۔ سوانح نگار نے کر□ی کے
چند دوستوں اور رفقاء کا ذاتی انٹرویو لے کر، کر□ی کے□ رے میں معلومات حاصل کیں۔ ا□ دو □ نے ان کے
عقا□ سے متعلق کہا ہے کہ کر□ی اکثر و بیشتر قا□ین جاتے رہتے تھے۔ □ قا□یانی خلیفہ مرزا بشیر الدین اور اخبار
''یثرب'' کے□ یٹر کو□ی □ میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ انہوں نے مرزا بشیر الدین کے ذریعہ□ طانوی حکام سے
راجہ پونچھ□ □ؤ ڈالا اور خلیفہ مرزا بشیر الدین سے تعاون حاصل کیا۔

اس کتاب میں□ی □ جموں و کشمیر کے اہم سیاسی□ ر□ حالات و واقعات کی تصو□یر کشی کی گئی ہے۔ سوانح
نگار نے واقعات و روداد کے بیان کے وقت اپنی□ ت کی صداقت کے لیے دلائل و شواہد بھی پیش کئے ہیں۔□ی □ کی
سیاسی □ گی میں انقلاب پہلی □ عظیم کے بعد آئی۔ 1932ء میں مسلم کا□نس کے □ رہ منظم ہونے کے بعد
□ی □ کے تمام دیہی و شہری علاقوں میں سیاسی بیداری و انقلابی تحر□ کی لہر دوڑ گئی۔□ی □ کے سیاسی حالات اور
عوام کے رویہ کے پیش□ گلینسی کمیشن کی سفارشات کے عین مطابق حامی بھر لی۔ مسلم کا□نس کے سالانہ اجلاسوں اور
جما □ کی مجلس عالمہ میں کر□ی اپنے علاقے پونچھ، مینڈھر□ غ کوٹلی اور میر پور کی□ ئندگی کرتے تھے۔ ان تحصیلوں
میں جماعتوں اور تنظیموں کو مستحکم کر کے مسلم کا□نس کے کارکنوں کی شیرازہ بندی کرنے میں پیش پیش رہتے تھے۔ اس

جما ◘ اور اجلاس کو کامیاب بنانے کے لیے پونچھ کے دور دراز مقامات کا سفر کیا۔لوگ جوش و◘ بہ کے ساتھ ان کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔جو ان کے مجاہدانہ◘ بہ،خلوص،عوام کے تئیں لگاؤ اور لگن کا نتیجہ تھا۔ان کے◘ د ◘ ◘ ◘ میں مسلم کا□نس کی کامیابی سے مراد غری◘ و پسما◘ ہ عوام کی بیداری اور◘ بہ آزادی تھی۔ڈ◘ ہ حکومت اور اس کے اعلیٰ حکام اس سے خوفزدہ ہونے لگے کیو□ مسلمانوں کی اتحاد اور یکجہتی ان کے زوال کا پیش خیم◘ .◘ ہو سکتا تھا۔اس لیے م◘ اور ڈ◘ ہ حکومت نے مسلمانوں کو آپس میں لڑوانے کا منصوبہ بنالیا۔اس طرح مسلم کا□نس کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے نیشنل کا□نس کا وجود عمل میں ◘ ◘ ◘ ۔

کر□ی اپنے حلقہ مینڈھر،اور حو□ سے منتخب ہو کر◘ ستی اسمبلی کے ممبر بن گئے تھے۔لیکن انہوں نے ہمیشہ اسمبلی میں کُل ◘ ◘ جموں کشمیر کے عوامی مسائل کی◘ ت کی۔◘ ستی عوام کے مفاد کا مطالبہ کرتے ہوئے بلا جھجک پوچھتے تھے کہ ڈ◘ ہ سرکار عوام سے مالیہ اور چوکیوں کی صورت میں کس قدر◘ دستی رقم وصول ک◘ ہے۔اور عوام کی فلاح و بہبود اور ملک کی◘ قی کو کس طرح نقصان پہنچ◘ ہے۔◘ ستی عوام کو پسما◘ ہ اور مفلوک الحال رکھ کر حکمران صرف مخصوص طبقے کو نوازتے تھے۔جس کے خلاف انہوں نے آواز اُٹھائی۔سوانح نگار اپنے موضوع (کر□ی) کے کا◘ موں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سردار فتح محمد خان کر□ی 1934ء سے لے کر 1947ء◘ ◘ ستی اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے ایسے مطالبات و معا□ ت◘ زور دیتے رہے جن کا تعلق کل◘ ◘ جموں و کشمیر سے تھا' کسی ا◘ حلق◘ علاقہ سے نہ تھا۔ان کا مطالبہ تھا کہ مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت◘ ستی آمدنی کو فضول◘ چیوں◘ چ کرنے کے بجائے عوامی فلاح کے لئے◘ چ کرے۔ملک میں صنعتیں قائم کی جا□ اور رسل و رسائل کی سہولیت کے لئے سڑکیں اور پل تعمیر کئے جا□ کہ◘ ستی عوام اپنے◘ ؤں◘ کھڑے ہوں اور سرکاری مالیہ اور ٹیکس آسانی سے ادا کر سکیں۔''۸۲

سوانح نگار 1947ء میں◘ ◘ میں رو□ سیاسی صورت حال کا◘ کرہ کرتے ہوئے اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں کہ قا◘ اعظم نے چودھری غلام عباس کو◘ ◘ جموں کشمیر کو خود مختار ◘ کی ہدا◘ دی اور کر□ی نے اس◘ ت کی سخت مخالفت کی اور جلسہ میں اعلان کرتے ہوئے کہا کہ یہ پیغام جعلی ہے اور غلط طور◘ چودھری سے منسوب کی جا رہی

ہے۔اور وہ اس بات کی توثیق و تصدیق کے لیے یسی گئے جہاں چودھری غلام عباس نظر بند تھے جن سے ملنے پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ پھر بھی انہوں نے کوشش کر کے ان سے ملاقات کی۔اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''۔ جیل کے اندر چودھری غلام عباس نے سردار فتح محمد خان کریلوی کی آواز سنی تو وہ روشن دان کے قریب آئے اور سردار فتح محمد خان کریلوی ایک بانس کے ذریعہ روشن دان پر چڑھے اور چودھری صاحب کو دیکھا۔اندر سے چودھری صاحب نے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے 'آپ کیسے آئے ہیں؟ تو کریلوی صاحب نے ان سے تفصیلی بات کی،جس کے جواب میں چودھری صاحب نے کہا کہ قائد اعظم کبھی خواب میں بھی ایسی بات نہیں سوچ سکتے کہ کشمیر کو خود مختار رکھا جائے اور میں نے اس قسم کا کوئی پیغام نہیں بھیجا۔چودھری حمید اللہ کو قائد اعظم کے پاس بھیجو تا کہ وہ خود اس بات کی تصدیق کر لے۔'' ۸۳

مذکورہ بالا اقتباس میں سوانح نگار نے اپنے موضوع سے متعلق ایک اہم بات بتائی ہیں۔اس اقتباس میں سیاسی نظریات اور ذاتی تعلقات اور دوسرے پہلوؤں کی آئینہ داری ہو جاتی ہے۔ یہاں ایک اشکال پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر انہوں نے چودھری غلام عباس سے دوران نظر بندی ملاقات کی ہوتی تو چودھری غلام عباس اپنی خودنوشت سوانح ''کشمکش''میں ضرور اس ملاقات کا تذکرہ کرتے''کشمکش''میں اس سیاسی ملاقات کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔جس سے اس واقعہ کی صحت پر حرف آتا ہے۔

سوانح نگار کو کریلوی کے ساتھ رہنے،ان کو سمجھنے،دیکھنے،نظریات افکار،حرکات و سکنات،عادات و اطوار،عدل و انصاف،مہمان نوازی،عملی زندگی،سیاسی زندگی،مجاہدانہ عمل اور ان کی شجاع و بہادری کو بھی غور سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا یہ ساری باتیں جو اس کتاب میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں،جس سے سوانح نگار کی صداقت پسندی اپنے موضوع کے تئیں انصاف اور موضوع کی شخصیات کے تمام پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔عام طور پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں مرزائیت کو متعارف کرانے والا کریلوی ہیں اور قادیانیوں کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرم رہے ہیں۔اور جماعت کا خرچہ چلانے کے لیے وہ طاغوتی حکومت اور قادیانیوں سے مالی تعاون حاصل کرتے رہے ہیں لیکن سوانح نگار نے تفصیل کے ساتھ عوامی شک و شبہ کو دور کرنے کوشش کی ہے۔سوانح نگار نے 1970ء کے اس

اسمبلی کارروائی کا ذکر کرتے ہوئے جس میں کر□ی کے فرن□ ارجمند سردار سکندر حیات خان کی صدارت میں ای□ ہنگامی او□ ر□ فیصلہ لیا □ی تھا، لکھتے ہیں:

> ''اس اسمبلی کا □ سے□□ ر□ کا□ مہ مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرارداد تھی جو میرپور میں منعقد اجلاس میں منظور کی گئی تھی۔'' ۸۴

الغرض اس کتاب میں چند فنی خامیاں بھی ہیں اس کے□ وجود بھی□ی □ جموں وکشمیر میں غیر افسانوی ادب میں اس کی اہمیت ہے۔فنِ سوانح ادب کو کامیاب بنانے کے لیے جو فنی لوازمات درکار ہیں وہ اس کتاب میں کم□ پ ئے جاتے ہیں۔مصنف نے اپنے موضوع کی خوبیاں تو گنوائی ہیں لیکن بشری تقاضے کے تحت فطری خامیوں کا□ کرہ نہیں کیا ہے۔□ ن و بیاں کے اعتبار سے بہترین □ از میں، محاورات، مکالمات، اور صنعت و بلا□ □ کا استعمال ہوا ہے جس سے□ی تحر□ی کی کشش میں اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔اس کتاب سے کر□ی کی ن□ گی کی سفر کے ساتھ□ی □ کے 70 سالہ دور کی آئینہ داری بھی ہو جاتی ہے۔

ج: سوانح

زندانِ وجود (ایک صحافی کی سوانح)۔(۲۰۰۹ء)

’’زندانِ وجود (ایک صحافی کی سوانح) کالمنسٹ ساحل مقبول کی سوانح ہے۔ یہ کتاب سال 2009ء میں میزان پبلشرز سرینگر سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آئی۔ جسے عالمی ادارہ رپورٹرز وِدآؤٹ بارڈرز کا (RSF) انعام ملا۔ مقبول ساحل اردو ہفت روزہ ’’چٹان‘‘ میں بحیثیت رپورٹر (نامہ نگار) اور فوٹوگرافر کام کرتے تھے۔ یہ کتاب ان کی زندگی کے چار سالہ قید و بند کے ایام پر محیط ہے۔ انہیں 16 ستمبر 2004ء کو Counter Insurgency of Kashmir نے غیر قانونی طور پر کسی نامعلوم سازش میں ملوث بتا کر گرفتار کر لیا اور نہایت مشکل اور تکلیف دہ قید و بند کی صعوبتوں کا ایک دراز عرصہ گزار کر 9 مارچ 2009 کو رہائی ملی۔

ساحل مقبول 1968ء میں اڈحال کونگ کشمیر کے ایک پہاڑی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام جلال الدین تھا۔ ان کا اصلی نام محمد مقبول کھوکھر تھا۔ ان کے والد انہیں ساحل کہہ کے پکارتے تھے۔ لہٰذا بعد میں اسی کو ہی انہوں نے قلمی نام کے طور پر استعمال کیا۔ آبا و اجداد کا تعلق مقبوضہ کشمیر کے ایک پہاڑی علاقے سے تھا۔ ابتدائی تعلیم کوکرناگ میں ہی روایتی طرز پر ہوئی۔ پھر ایس پی کالج سرینگر سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کر لی۔ تعلیم کو جاری رکھنا چاہتے تھے لیکن فکرِ معاش سے دامن گیر ہوئے۔ پہاڑی ان کی مادری زبان تھی۔ کشمیری، اردو اور انگریزی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا اور مقامی روزنامہ ’مارننگ ٹائمز‘ سے اپنے کیریئر کی شروعات کی جہاں انہوں نے 1989-1986ء تک کام کیا۔ 80 کے دہائی کے وسط سے ہی ریڈیو کشمیر سرینگر اور ڈی ڈی کاشر کے ساتھ کام کرنا شروع کیا۔ انہوں نے پہاڑی پروگرام لشکارے سے کافی مقبولیت حاصل کی۔ 1989ء میں اردو روزنامہ ’’آفتاب‘‘ کے ساتھ اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور پر منسلک ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر علٰحیدگی اختیار کر لی۔ 1999ء میں روزنامہ ’’چٹان‘‘ سے منسلک ہو گئے۔ 1990ء کی دہائی میں کشمیر کی صورت حال یکسر مختلف تھی، اس ناساز گار حالات میں بھی کئی اہم سیاستدان، شخصیت، اعلیٰ فوجی آفیسر، عسکری تنظیموں، حریت پسند لیڈروں اور کمانڈروں سے روبرو ہو کر ذاتی انٹرویو لے کر ’’چٹان‘‘ میں چھپواتے تھے۔

ساحل مقبول 20 مارچ 2018ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ہمسائیوں کا کہنا ہے کہ لال چوک سرینگر

میں چلتے چلتے اچا□ پھسل گئے اور وہیں ان کی روح قفس عنصری سے□ واز کر گئے۔ ڈاکٹروں کے مطابق دل کا دورہ □ڑنے کی وجہ سے وفات□ ئی۔ اور اپنے پیچھے معمر والدہ، بیوی، ا□ بیٹی، چار □ اور ا□ معذور بھائی کو چھوڑ گئے۔

انہیں جاسوسی و مخبری او□ کستانی ایجنسی ISI کے ساتھ تعلقات کے الزام میں□ فتار کیا□۔ سرینگر کے موقّر رو□ مہ The Greater Kashmir کو دئے گئے ا□ انٹر یو کے دوران انہوں نے □:

When i was arrested on unproven charge of ''

espionage ,i was shattered, my entire career

and hard work was ruined in front of my eyes"

(. □ مجھے جاسوسی کے غی□ .□ شدہ الزام میں□ فتا کیا□ تو میں□ لکل ٹوٹ کر بکھر □۔ میرا پورا کی□ اور محنت میری آنکھوں کے سامنے تباہ ہوگئی۔۸۵)

□ ن ِ وجود (ا□ صحافی کی س□ □ '' 2009 میں میزان پبلشرز سرینگر سے شائع ہوئی۔ 10 ابواب 355 صفحات□ مشتمل اس کتاب میں مصنف نے اپنی چار سالہ طویل اسیری اور کچھ اپنے صحافی □ گی کے□ رے میں خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ تمام واقعات اور واردات کو ہنر مندی اور سلیقے سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب کا عنوان علامہ اقبال کے اس شعر سے ا□ کیا□ ہے۔

وہ سحر کہ جس سے لر□ ہے □ نِ وجود

ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا!

ا□ ب قوم کے ان مجبور اور بے بس لوگوں کے□ م کیا ہے جو حق اور صداقت کے لیے اذیتیں و تکالیف □ دا □ کرتے ہیں۔ پیش لفظ جموں و کشمیر کے Liberal ذہن کے ما□ □ نلسٹ سید شجا □ بخاری (مرحوم) نے تح□ کیا ہے۔ انہوں نے مصنف کے□ رے میں بہت کچھ قلمبند کیا ہے جس سے ان کی شخصیت، قید و بند کے اسباب و وجوہات، ان□ لگائے گئے الزاموں، ان کے فن اور کتاب کے□ رے میں جاننے میں کافی مدد ملتی ہے۔ سید شجا □ بخاری (مرحوم) لکھتے ہیں:

''ساح□ نے اس س□ □ میں کچھ اہم واقعات کو قلم بند کیا ہے، جس کا تعلق جاری حق خود ارادی□ کی تحر□ سے وابستہ لوگوں کے ساتھ ہے۔ انہوں نے کچھ ایسے واقعات کی بھی

ہی کی ہے جن کے بارے میں باہر کی دنیا کبھی بھی آشنا نہیں ہوسکتی تھی خاص طور سے اس صورت حال کا، جو کشمیر کی تحریک کے ساتھ وابستہ لیڈروں یا کارکنوں سے تعلق رکھتی ہے اور جس میں وہ جیل کے اندر بھی اپنے سیاست کو ترجیح دیتے ہوئے آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔اس کے علاوہ کئی ایسے انکشافات بھی کتاب میں شامل ہیں جو چشم کشا ہیں۔'' ۸۶

ساحل مقبول کو 17 اگست 2004ء میں بھارتی فوج کے 14 ویں کور واقع کرگل لداخ کی طرف سے عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے چلائے جا رہی آپریشن سد بھاونا اسکیم کی تشہیر کے لیے سرینگر سے صحافیوں کے ایک وفد کے ساتھ کرگل جانے کا موقعہ ملا جن کو اس آپریشن کی تحت چلائے جا رہے مختلف پروگراموں کی کوریج کرنی تھی۔20 اگست کو سرینگر واپس لوٹنے کے بعد ان تصاویر کو ایک فیچر بنا کر ہفتہ روزہ ''چٹان'' میں ''آپریشن سد بھاونا اور لداخی عوام'' کے عنوان سے ایک شمارے میں شائع کیا۔اس سلسلے میں انہیں اعلیٰ فوجی پبلک ریلشنز آفیسروں کے ساتھ ملاقات کرنے کے مواقع ملے۔اسی دوران 14 ستمبر 2004ء کو فوج کے ایک نئے P.R Officer نے اپنے دفتر میں مدعو کیا وہ کسی وجہ سے نہیں پہنچ پائے۔16 ستمبر کو فوجی آفیسران کے دفتر آ کے انہیں لال چوک اپنے ہمراہ لے گئے۔یہاں انہیں کچھ عجیب سا سماں محسوس ہوا دفتر سے نکلتے ہی چند ہتھیار بند نامعلوم افراد نے گھیر لیا اور بُلٹ پروف جپسی میں ان کو دستی بٹھا کر لے گئے۔مصنف نہایت پریشانی و حیرانی کے ساتھ خاموشی وافسردگی کے عالم میں ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' کی تصویر بنے بندوق بردار داروں کے ہمراہ ہو لئے۔نہ وجہ گرفتاری پوچھ سکتے تھے نہ کوئی شکوہ شکایت کر سکتے تھے۔دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی سرینگر کی بدنام زمانہ عمارت ''ہری نواس انٹروگیشن چیامبر'' کے گیٹ کے اندر داخل ہوگئی۔جہاں اسے Kashmir Bearue Special اور C.I.G آفیسروں کے سامنے پہنچایا گیا۔ان آفیسروں میں چند کشمیری آفیسرز بھی تھے ٹاسک فورس کے S.P مشکور وانی نامی آفسر بھی موجود تھا۔مصنف نے اس سے قبل کئی رشوت کے کیس میں ان کی حمایت میں ان کا انٹرویو ''چٹان'' میں شائع کر کے لوگوں کی بدگمانیاں دور کی تھیں لیکن آج کے اس نفسا نفسی روز محشر میں اس نے مصنف کی کوئی مدد نہیں کی۔یہاں کچھ بے تکے سوالات پوچھے جانے کے بعد C.I,G والوں نے فورس کے حوالہ کر کے ہری نواس کے تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دیا۔زندگی میں پہلی مرتبہ بغیر کسی جرم کے قید و بند کا یہ شام ان کے لیے نہایت صبر آزما تھی۔خود نہ وجہ جانتے تھے نہ مقصد، دوسری طرف اپنے اہلخانہ کی فکر دامن گیر تھی۔یہاں انہیں پولیس آفیسر، مختلف سراغ رساں ایجنسیوں اور Intelligence Bearue کے عملے نے

گھیر لیا۔ جواُن سے صرف ا▯ قسم اور ا▯ ہی نوعیت کے سوال پوچھ رہے تھے۔ سوال یہ تھا کہ حاجی عمران کون ہے؟ وہ حاجی عمران کو ISI کا چیف قرار دے رہے تھے۔ اور اس ا▯ سوال کو مختلف زاویوں اور پہلوؤں سے پوچھا جا رہا تھا۔ پوچھ▯ چھ کا یہ سلسلہ▯ رہ دن▯ ▯۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اس سلسلے میں اہم ▯ د میرے دورہ▯ پ کستان کو ▯ ▯۔ وہاں مجھ سے ملنے والے ہر شخص کو ISI کا ایجنٹ قرار▯ ▯ ▯۔ پھر چاہے وہ کشمیری مہا▯ تھا، کشمیر کا کوئی حر▯ لیڈ▯ کوئی دوک▯ ار جس سے میں نے اس دورے کے دوران کوئی چیز▯ ▯ ی ہو۔ گ▯ پ کستان کے عوام اول▯ آ▯ ISI کے لوگ ہوں اور سبھی کو بھارت کی خفیہ اطلاعات سے دلچسپی ہوں اور اس▯ طرہ یہ کہ میں ہی اس میدان کا واحد کھلاڑی (جاسوس) تھا کہ سبھی لوگ اپنا سبھی کام کاج چھوڑ کر مجھ سے ملنے آئے ہوں۔''۸۷

وہ ا▯ سیاسی شادی کے تقر▯ میں جموں و کشمیر ماس مئومنٹ کی چیئر▯ پ▯ سن محترمہ فر▯ ہ بہن کی اور د▯ اراکینِ وفد کے ساتھ رپ▯ کی حیثیت سے▯ پ کستان گئے تھے۔ ڈیلگیشن کے ساتھ اسلام آ▯ د، لاہور، راولپنڈی، مظفر آ▯ د اور میر پور کے اہم مقامات▯ پ جانے کا موقعہ▯۔ انہیں غیر ممالک کا دورہ کرنے کی ▯ یینہ خواہش تھی وہ ماس مئومنٹ کے توسط سے پوری ہوگئی۔ جس کو بعد ازاں ان کی ▯ فتاری کی وجہ ▯ ▯۔

اس دوران جو غیرا▯ نی ذہنی و جسمانی تکلیف سے دوچار ہوئے اس کا▯ کرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> '' CIK کی سفید عمارت سے نیچے▯ تے ہوئے ان لوگوں نے مجھ▯ ▯ جا▯ ▯ سی آر پی ایف کے▯ رکوں کے بیچوں ▯ ا▯ خال▯ رک میں لی▯ رک کا دروازہ کھلا تو ▯ ر معمولی ▯ رٹ بچھے ہوئے تھے اور درجن بھر کرسیاں لگی ہوئی تھیں، کمرے کے▯ را▯ اور دروازہ کھلا تو ▯ رہ قابل ▯ تھا۔ چھت میں موٹی سی رسی لٹک رہی تھی اور نیچے ا▯ ٹول رکھا ہوا تھا جو ▯ لکل سولی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سامنے▯ نس کے کئی ڈ▯ ے، ا▯ چاقو اور لکڑی کے کئی رولز کے علاوہ ہاتھ▯ پ ؤں▯ ▯ ھنے کیلئے چا▯ پ ئی بنانے میں کام آنے والا پٹا (نوار) رکھا ہوا تھا۔ اب ک▯ ▯ ر گپتا نے کپڑے▯ رنے کیلئے کہا، ہاتھ میں ڈ▯ ا اٹھا کر دو تین گالیاں دیں جموں کے ہی ا▯ اور ڈ▯ ہ سپاہی منگت رام نے میرے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف نوار سے

□□ ھ دیئے۔ مجھے سامنے رکھے ہوئے ٹول □□ ھنے کیلئے کہا □، چھت میں لٹک رہی رسی کو
ا□ کشمیری سپاہی (عصمت) نے نیچے □ اور رسی کو میرے بندھے ہوئے ہاتھوں کے □
میں گذار□ □۔ سبھی انٹرا گیٹر جلادوں کی طرح میرے چاروں اور کھڑے تھے لیکن آئی بی کا
یہ □ آفیسر □ دہ جلدی میں دکھائی دے رہا تھا۔ رسی کو کھینچا □ اور ٹول کو نیچے سے کھسکا
□ □۔ میں دیکھتے ہی دیکھتے اپنے پیچھے کی طرف بندھے ہو □ زوؤں کے بل □ ہوا میں
جھول رہا تھا اور مجھ سے پھر وہی گھسے پٹے سوال کیے جا رہے تھے۔ لٹکتے ہی میر □ زووٗں
خاص طو □ کندھوں کے پٹھے (Muscles) □ ی طرح د □ لگے او □ دن کے نیچے □ ھ
کی ہڈیوں میں سخت تکلیف ہوئی۔ دوسری جا □ گیتا میری □ نگوں □ ٹ □ ے □ سا رہا
تھا۔ تقریباً چار مرتبہ اسی طرح □ نے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میر □ ز □ کارہ ہو چکے
ہو نگے کیو □ مجھے □ ر رگوں اور پٹھوں کے ریشوں کے ٹوٹنے کا احساس ہو رہا تھا۔ تقریباً ا □
گھنٹہ □ نے کے بعد مجھے نیچے □ را □۔ ہاتھ بندھے ہی تھے اب □ ؤں بھی □ ھے گئے اور
منہ کے بل □ کر میر □ ؤں کے تلوؤں کی پٹائی کی گئی۔'' ۸۸؎

دن بھر مختلف ایجنسیوں کے اہلکار، سخت مزاج انٹروگیشن آفیسروں کا □ را □ ہی نوعیت کے سوال کر □ اور ان کا ا □ ہی جواب سن کر آفیسروں کو اپنے توقع کا جواب منفی (□) میں ملنے □ غضبناک ہو کے اور سختی □ تتے۔ مز □ انہیں نہ صرف جسمانی بلکہ ذہنی تکلیف دیتے رہے۔ مصنف مار پیٹ سے مجروح، دل شکستہ ہو کر اپنے خا □ ان کی فکر میں محزون اور غرقاب رہتے۔ وہ خود نہیں جا □ رہے تھے کہ آ □ انہیں کس □ م و □ ہ عظیم کی ایسی سزا دی جا رہی ہے۔ اور کس خطا و قصور کی □ داش میں وہ سزا بھگت رہے ہیں۔ اس طرز کے ہزاروں سوال ذہن کے نہال خانوں میں ابھر رہے تھے۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرتے، ماضی کو کر □ نے کی کوشش کرتے، سابقہ □ گی کی تمام گوشوں کو □ □، شعور کی تہہ □ جا کر اس روداد کو □ د کرتے، لیکن اپنے ضمیر و روح کو □ ا کے سامنے پیش کرتے تو نتیجہ یہ □ کہ وہ ابتدا سے ا □ صداقت پسند، صاف گو □ ر، حق □ □ صحافی کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔ شا □ انہیں اپنی صاف گوئی کی سزا مل رہی تھی۔ کیو □ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو زہر ہلاہل کو کبھی قند نہ کہہ سکے۔

. □ پولیس کے آیفیسر یکے بعد د □ ریما □ اور وار □ لے کے آتے رہے اور عدا □ کی طرف سے ضما □

کے لیے کوئی دستاویز تیار نہیں کرتے تو پریشان ہو جاتے۔ ایک طرف career کے سوں کی محنت خاک ہونے کا اندیشہ، دوسری طرف ایک بڑے کنبے کی ذمہ داریوں سے بندھے ہونے کا احساس اور فکر ان کو دامن گیر تھی۔ یکم نومبر کو Public Safety Act کے مطابق انہیں سینٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اب JIC کی جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں داخل ہوئے۔ البتہ انہیں ایک فرق یہ محسوس ہوا کہ یہاں پوچھ گچھ، مار پیٹ نہیں ہوتی بلکہ دوسرے قیدیوں کے ساتھ رہ سکتے تھے۔ جج سے ریمانڈ کا پروانہ ملتے ہی JIC سے کپڑے کمبل پکڑا کے ہاتھوں میں ہتکڑی باندھے انہیں سینٹرل جیل پہنچایا گیا۔ جیل کے داخلے میں دو گیٹ پر جامع تلاشی ہوئی، کپڑے اتارے گئے، جسم پر زخموں کو دیکھنے لگے۔ اس منظر کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے:۔

> ''شاید وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کہیں میرے جسم پر انٹروگیشن کے دوران آنے والے زخم یا دوسرے نشانات تو نہیں ہیں لیکن خوش قسمتی سے میں اپنے جسم کے ساتھ ساتھ JIC میں لگے زخموں کو اپنے ذہن سے بھی نکال چکا تھا اور کسی شخص یا آفیسر کو قصوروار ٹھہرانے کی بجائے اُن سبھی حالات کو مرضئ ربِ ذوالجلال قرار دے رہا تھا کیونکہ میرا کامل ایمان ہے کہ اس ذات باری کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔''[۸۹]

یہاں ان کی قوت برداشت، صبر و تحمل، خدا کی ذات پر یقین اور ایمان کا اندازہ ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے دل میں ان آفیسروں کے لیے کوئی کدورت، کوئی ملال نہیں جو دو مہینوں سے انہیں اذیت پہنچاتے رہے۔ انہیں احساس تھا کہ ان سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے وہ لوگ بھی اپنی ذمہ داری نبھا رہے ہیں یہ ان کا کام اور فرض ہے۔

سینٹرل جیل کشمیر کی تصویر کشی اور جزئیات نگاری انھوں نے بہترین انداز میں کی ہے۔ اس جیل میں ساڑھے چار سو سے زائد قیدی تھے جن میں سے متعدد کشمیر کے مختلف تنظیموں، عسکریت پسند لیڈروں، حریت پسند لیڈروں، دختران ملت آسیہ اندرابی کے شوہر ڈاکٹر قاسم متو اور اسلامک اسٹوڈنٹ لیگ کے کارکن وغیرہ بند تھے جنہوں نے مصنف کے ساتھ کافی اچھا سلوک روا رکھا۔ وہ ان سے بات چیت کر کے گذشتہ دنوں کے زخموں کو بھلانے کی کوشش کرتے رہے۔ انہیں یہاں کے ماحول نے بھی کافی متاثر کیا، وہاں وافر مقدار میں کتابیں موجود تھیں۔ روزہ، نماز اور دینی و روحانی تعلیم دینے کی درس گاہ کا سا ماحول بنا ہوا تھا۔ یہاں باہر کی دنیا کے حالات پر تبصرے بھی کیے جاتے تھے۔ اخلاقی جرائم میں ملوث قیدی بھی حریت پسندوں کے ہمراہ وقت پر نماز ادا کرتے۔ جیل

کے بیرونی حکام ہیں عسکریت پسندوں کا غلبہ تھا۔ جیل میں ان کی تعداد زیادہ تھی۔ کبھی کبھی نظریاتی اختلافات کی بنا پر حریت پسندوں اور عسکریت پسندوں کے درمیان تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ بحث ومباحثہ ضابطہ مکالمہ بازی کی سی صورت اختیار کر جاتا۔

وہ جیل کے اندر بے بس، مجبور اور بے یارومددگاری کے عالم میں تھے۔ اپنے اہل وعیال، بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے اخراجات اور کفالت کی فکر انہیں ہر دم ستاتی رہتی تھی۔ جن کی کفالت ان کے پیر سے معذور چھوٹا بھائی کر رہا تھا۔ ان تمام مسائل پریشانیوں، ذہنی تناؤ اور اپنے بے گناہ ہونے کے باوجود بھی کسی غیر قانونی جرم کی پاداش میں مقید ہو کے رہ جانا ان کے ضمیر اور وجود کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ ان تمام جسمانی وذہنی اذیتوں کے علاوہ جس چیز نے انہیں زیادہ تکلیف دی وہ ان کے دیرینہ ساتھیوں، صحافتی برادری اور رشتہ داروں کے رویے سے ہوا۔ وہ ان کے ساتھ ہر دکھ تکلیف اور خوشی میں شریک رہتے تھے لیکن جب وہ خود قید ہو گئے انہیں جب ان کی سخت ضرورت تھی تو ایسے نازک وقت اور نامساعد حالات میں کسی نے انکا حال احوال تک نہیں پوچھا اور کسی طرح کی مدد نہیں کی۔ جن سے امید تھی انہوں نے بھی اپنے اخباروں کے سرخیوں کے ذریعہ ان کی قید کی مزاحمت یا رہائی کے لیے ان کی حق میں آواز تک نہیں اٹھائی۔ وہ نہایت رنجیدہ و دل شکستہ ہو گئے تھے۔ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انہوں سے 18 ستمبر کے پریس ریلیز میں کہا تھا کہ CIK نے ایک صحافی (مقبول ساحل) کو گرفتار کر کے اس کے قبضے سے انتہائی حساس اور اہم دستاویزات ضبط کر لیے ہیں اس بیان کو مقامی اخبارات نے (چٹان سمیت) من وعن شائع کیا تھا۔ جب کہ چٹان نے مزید ایک سطر بڑھا کر کہ مقبول' ساحل کا تعلق چٹان سے ہے لیکن انہوں نے تقریباً دو سال چٹان سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد بیورو جوائن کر لیا تھا'۔ اس سطر نے مجھے کافی پریشان کیا کیونکہ مجھے امید تھی کہ چٹان میں میری گرفتاری پر کم از کم ایک اچھی خاصی خبر شائع ہو گی اس اس کی مذمت کی جائے گی۔ اگر چہ مقامی اخبارات سے بھی اس طرح کی امیدیں وابستہ تھیں''۹۰

مزید لکھتے ہیں:

> 'چٹان' گذشتہ ۳ برسوں سے میرا مسکن ہی نہیں بلکہ تربیت گاہ اور میدان جنگ بھی تھا کیونکہ اول تو میری ذہنی تربیت جسمانی یہاں ہوئی تھی اور دوم میرے قلم سے نکلنے والی تحریر کو چھاپنا اسی اخبار

کی بس کی□ ت تھی، اس کے علاوہ میں نے کچھ ایسے مضامین بھی گذشتہ□ سوں کے دوران
اس ہفتہ وار کے لئے لکھے تھے، جو شا□ ہی کوئی دوسرا رپو□ لا سکتا تھا کیو□ اس کام کے لئے
رپو□ کا ' □ گل ' □ ضروری تھا۔ جو اپنی جان ہتھیلی□ رکھ کر حالات سے بے □ ز ہو، لہٰذا
میری مشکل میں اس کا جو فریضہ□ تھا، وہ پورا نہ ہو سکا۔'' [91]

جس اخبار کے ساتھ سالہا سال وابستہ رہے۔ جس میں اپنی جان کی□ زی لگا کر اہم سیاسی لیڈروں، شخصیات، عسکر□ پسندوں، مختلف تنظیموں کے اہلکاروں اور کما□ روں سے ر□ وہو کر انٹرویو لے کر صداقت کے ساتھ شائع کرتے رہے جس کی بنا□ عوام وخواص میں یہ اخبار کافی مقبول بھی ہو□ تھا۔ □ مصیبت کی گھڑی میں اس نے موصوف کی مدد نہیں کی۔

یکم نومبر کو ان کی جوڈیشنل ریما□ (عدالتی حرا □) ختم ہونے□ CIK والوں نے انہیں □ رہ پبلک سیفٹی ا □ کے تحت □ ل جیل جموں منتقل کرلیا۔ چو□ عید الفطر قر□ تھی۔ اس لیے انہوں نے اقتدار اعلیٰ سے گذارش کی کہ چند دن بعد سرینگر جیل میں رک جاتے ہیں۔ عید کے بعد چلے جا □ گے اپنے اہل خانہ سے ملنا چاہتے تھے، ان کے ساتھ عید منا□ چاہتے تھے۔ وادی سے دور جموں جا□ ان کے لیے نہا□ تکلیف □ ت تھی۔ لیکن بقول مصنف ہتھکڑی پہنا قیدی مویشی کی طرح ہے۔ ان کی فر□ د والتجا یہاں صرف رب کائنات کے علاوہ کون □ والا نہ تھا۔ دل میں مایوسی □ یشانی اور رنج وغم لے کر 12 دسمبر 2004ء کو □ ل جیل کوٹ بلوال میں پہنچے۔ یہ جیل جموں وکشمیر کا □ سے□ ا جیل ہے۔ یہاں بھی مختلف □ ائم میں ملوث قیدیوں کے علاوہ مختلف تنظیموں سے وابستہ قیدی بھی رکھے جاتے ہیں۔ جیل جانے سے قبل عدا □ میں حاضری دینے گئے وہاں جج نے بتا□ کہ '' آپ غلط □ دوں□ □ بند ہو'' لہٰذا آپ کی رہائی جلد ہو جائے گی۔ اس سے مصنف کو قدرے مسرت وتسکین ملی لیکن انہیں پبلک سیفٹی ا □ کے تحت یکے بعد □ ے حکم□ مہ تھما کر مز□ مقید رکھا □۔ رہائی کی کوئی صورت □ نہیں آرہی تھی۔ 2006ء میں PSA کی مدت ختم ہونے□ میراں جی جموں کے JIC انٹروگیشن سینٹر منتقل کروائے گئے۔ اس Tourter room کی □ ت نگاری انہوں نے ہنر مندی سے کی ہے۔

انہیں چار□ س کی قید میں چا□ ر PSA کے مطابق نئے حکم□ موں کے ذریعہ□ ریخ رہائی ملتوی کرتے ہوئے مز□ عرصہ مقید رکھا □۔ صرف جیل خانے□ لتے تھے۔ جیل حکام انہیں کسی نہ کسی بہانے کبھی PSA کے حکام □ موں کے ذریعہ، تو کبھی جیل کے رول توڑنے کی□ داش میں مختلف جیلوں جیسے □ ل جیل سرینگر، ڈسٹر □ جیل

امپھالہ جموں وغیرہ میں گھماتے رہے۔ اگست 2007ء کو چوتھی اور آخری PSA کے مطابق پھر سے سنٹرل جیل میں بند کر دیا گیا۔ مختلف انٹروگیشن سنٹر میں گھومتے بلاآخر اپنے بلاک میں آ گئے۔ آخر 4 جنوری 2008ء کو وہ مبارک دن بھی آ گیا کہ انہیں رہائی نصیب ہوئی۔ مدتوں کی قید بندی اور قید سے رہا ہو کر اپنے اہل خانہ سے ملنے کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی۔ چار سال کی طویل مدت کے بعد رہائی ملی۔ ماضی کی ان سختیوں، تلخیوں، تکلیفوں، تجربات و مشاہدات اور تلخ وشیرین تجربات اور یادوں کو اپنے سینے میں چھپا کے نکلے اس سے قبل سیدھے جا کر اہل خانہ سے ملنے گئے۔ اس خوشی اور انبساط کے لمحے کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:

’’جے آئی سی ہمہامہ کے پنجرے میں آگ لگا کر میں ہمیشہ کیلئے باہر نکل آیا تھا اور آج کے دن آزادی کی قیمت کوئی مجھ سے پوچھے تو میں اسے بتاؤں کہ ان لمحات کی نہ کوئی قیمت ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی ان کا دام چکا سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ لمحے انمول ہیں، قیمتی ہی نہیں بلکہ بیش قیمت بھی ہیں اور انہی لمحوں کے دام پر دنیا قائم ہے۔‘‘ ۹۲

جیل سے نکلنے کے بعد اپنے آبائی گاؤں اڑحال چلے گئے۔ اہل و اعیال کی مدتوں کا انتظار بھی ختم ہوا۔ گھر کے تمام افراد موجود تھے ماسوائے والد ماجد کے۔ وہ اپنے بیٹے کی ہجر میں ہی اس دنیا سے چل بسے تھے۔ اس مبارک موقعہ پر یہ ماتم کی گھڑی ان کے لیے اور زیادہ المناک اور صبر آزما تھی۔ لیکن صبر و تحمل کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

’’زندانِ وجود‘‘ میں مصنف نے جیل کے اندر کی منظر نگاری اور اسیروں کے مسائل پریشانیوں، تکالیف، اذیتوں، تجربات، مشاہدات اور ساتھ ہی قیدیوں کے اہل خانہ کو جن مشکلات و پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان سب کو بیان کیا ہے۔ انٹروگیشن سنٹر میں ہونے والی مار پیٹ،، زدو کوب، جسمانی اذیتیں، نازیبا اور اخلاق سوز گالیوں، قیدیوں کی ذہنی و نفسیاتی کیفیات غرض اس طرح کی سینکڑوں باتوں کو مصنف نے اپنے مشاہدات و تجربات کی بنا پر بیان کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کتاب صرف مقبول ساحل کی سرگزشت نہیں بلکہ ان کی طرح نہ جانے کتنے بے قصور لوگ ایسے ہیں جو جیل کی چار دیواری کے اندر سڑ رہے ہوں گے جن کہ آواز سننے والا ربِ کائنات کے علاوہ کوئی نہیں۔ یہ کتاب اس طرح کی بے شمار وہ بے قصور قیدیوں کی داستان حیات ہے۔

من جملہ اس کتاب میں مصنف نے اپنی چار سالہ اسیری کی سرگزشت کے ساتھ ساتھ مختلف واقعات، روداد، حالات کو صفحۂ قرطاس پر اتارا ہے۔ زبان و بیان کے حوالے سے اگر بات کریں تو اس کتاب کو بہترین

سرگذ ش کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔فن کے اعتبار سے اس کتاب کو دیکھا جائے تو اس میں وہ تمام خوبیاں آتی ہیں جوا ی کامیاب سرَ ن ش کے لیے لازمی ہے۔اس کتاب میں مصنف کی چار سالہ اسیری کی ن گی کے یم کی دلسوز داستان ہے۔انہوں نے اپنا نشیب وفراز،غم ورنج ی س ومحرومی امید وخواہشیں غرض تمام واقعات وروداد کو جوان چار سالوں میں ان کے اپ َ ن رے چاہے وہ ظاہری وجسمانی ہ ی داخلی وروحانی،تمام گوشوں پ روشنی ڈالی ہے۔جس سے ی جموں وکشمیر کی سیاسی وسماجی قانونی وانتظامی غرض ن گی کے مختلف گوشوں پ روشنی پ ڑتی ہے۔

حوالہ جات

(۱) ش، آپ نمبر، ۱۹۵۵ء، ص: ۵۸

(۲) ایضاً، ص: ۵۹

(۳) فوق، منشی محمد الدین فوق، ۱۹۰۷ء، ص: ۴۰۷

(۴) محمد الدین فوق کی کتابیات، اجمل زی، ڈاکٹر، ص: ۱۷

(۵) اردو روز نامہ، کشمیر اعظمیٰ، ۱۸ دسمبر ۲۰۱۶ء

(۶) کشمکش، چودھری غلام عباس، کشمیر فاؤ سری نگر، ۲۰۱۷ء، ص: ۶۷۔۶۸

(۷) ایضاً، ص: ۱۴۲

(۸) ایضاً، ص: ۱۱۷

(۹) کشمیر اعظمیٰ، حوالہ سابقہ

(۱۰) ر آزاد، امین بنجارا، مونومینٹل پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۵

(۱۱) میرے شتہ روز و ، جگن تھ آزاد وفیسر، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۵ء، ص: ۴۹

(۱۲) ایضاً، ص: ۹

(۱۳) ایضاً، ص: ۲۶۔۲۷

(۱۴) جگن تھ آزاد فکر و فن، محمد منظور عالم، محروم میموریل لٹی سوسائٹی، نئی دہلی، ص: ۱۹۹۹ء، ص: ۲۲۲

(۱۵) میرے وروز، بیگم ظفر، دہلی، ۱۹۷۳ء، ص: ۴۷

(۱۶) کشمیر: ا منظر مہ، کمال احمد صدیقی، پینگوئن ، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۵

(۱۷) آتش چنار، شیخ محمد عبداللہ، علی محمد اینڈ ، سرینگر، ۱۹۸۶ء، ص: ۱۹۳۔۱۹۴

(۱۸) ایضاً، ص: ۹۵۴۔۹۵۵

(۱۹) ایضاً، ص: ۵۷۳

(۲۰) ایضاً، ص: ۲۶۷

(۲۱) ایضاً، ص: ۴۳۱

(۲۲) ایضاً، ص: ۵۴۲

(۲۳) ایضاً، ص: ۵۲۲

(۲۴) ایضاً، ص: ۷۰۵

(۲۵) ایضاً، ص: ۸۴۱

(۲۶) اردو کے شہرہ آفاق خودنو ا تجزیاتی مطالعہ، لیس۔ مظفر الدین، ڈاکٹر، سرمدی پبلکشن چنئی ز، 2005

ء،ص:۲۳۹

(۲۷) کشمیر:ا□ منظ□ مہ،حوالہ سابقہ،ص:۱۵

(۲۸) شہاب□ مہ،قدرت اللہ شہاب،فر□ □ ڈ پولمٹیڈ ،نئی دہلی،۲۰۱۴ء،ص:۴۷

(۲۹) ایضاً،ص:۱۴۰

(۳۰) ایضاً،ص:۲۳۷

(۳۱) ایضاً،ص:۲۳۰

(۳۲) ایضاً،ص:۲۶۶

(۳۳) ایضاً،ص:۳۵۵

(۳۴) ایضاً،ص:۲۵۱۔۲۵۲

(۳۵) ایضاً،ص:۵۲۶۔۵۲۷

(۳۶) ایضاً،ص:۵۲۲

(۳۷) مہماتِ حیات،ابوااشرف صدیقی،جے کے آ □ ،دہلی،۲۰۰۱ء،ص:۲۱

(۳۸) افکارِ□ یشاں(□ دوں کے دوش□)،کاچوسکندر خان،شاہین □ شرز،کرگل لداخ،۲۰۰۱ء،ص:۱۱

(۳۹) ایضاً،ص:۹۸

(۴۰) ایضاً،ص: ۱۵۰

(۴۱) ایضاً،ص: ۱۶۷

(۴۲) □ دوں کے□ اغ،ڈی ڈی ٹھاکر،ایجوکشنل □ ہاوس،دہلی،۲۰۰۶ء،ص:۱۶

(۴۳) ایضاً،ص:۱۲۴

(۴۴) ایضاً،ص:۲۱۰

(۴۵) ایضاً،ص:۳۳۵۔۳۳۶

(۴۶) □ دوں کے لمس،شہاب عنا□ ملک □ وفیسر،میزان پبلشرز،سری نگر کشمیر،۲۰۱۲ء،ص:۲۲

(۴۷) ایضاً،ص:۵۱

(۴۸) ایضاً،ص:۱۳۳

(۴۹) رہگزر در رہگزر،حامدی کشمیری □ وفیسر،سی ٹی کمپیو□ سینٹر،سری نگر کشمیر،۲۰۱۳ء،ص:۱۹

(۵۰) ایضاً،ص:۲۵

(۵۱) ایضاً،ص:۲۰۸

(۵۲) ایضاً،ص:۸۸

(۵۳) چنار کے سایے میں،عبدالرشید ہانجورہ،میزان پبلشرز،سری نگر،۲۰۱۶ء،ص:۳۵

(۵۴) ایضاً،ص:۷۶

(٥٥) لوحِ حیات، دیپک بُدکی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۲۰۱۸ء، ص:۴۰

(٥٦) ایضاً، ص:۴۱

(٥٧) ایضاً، ص:۲۲۰۔۲۲۱

(٥٨) ایضاً، ص:۲۲۱۔۲۲۲

(٥٩) ایضاً، ص:۲۸۸

(٦٠) ایضاً، ص:۳۲۱

(٦١) میرے حصے کی دھوپ، تپال سنگھ ماجب، تحریر ادب پبلکیشنز، بنارس، ۲۰۲۰ء، ص:۳۸

(٦٢) ایضاً، ص:۲۸

(٦٣) ایضاً، ص:۲۲۶۔۲۲۷

(٦٤) ایضاً، ص:۱۱۶

(٦٥) کشمیر کا گاندھی، پنڈت پریم ناتھ بزاز، دی کشمیر پبلشنگ کمپنی، سری نگر ۱۹۳۴ء، ص:۴۵۔۴۶

(٦٦) ایضاً، ص:۵۳

(٦٧) ایضاً، ص:۱۳۱۔۱۳۲

(٦٨) ایضاً، ص:۱۵۲

(٦٩) ایضاً، ص:۱۶۶

(٧٠) انیسویں صدی کے ایک عظیم جنرل زورآور سنگھ، سنگداس، اخبار چاند پریس، جموں، ۱۹۶۴ء، ص:۲۔۳

(٧١) ایضاً، ص:۱۱۔۴۱

(٧٢) ایضاً، ص:۴۱

(٧٣) ایضاً، ص:۶۶۔۶۷

(٧٤) شیرِ ڈوگرہ لالہ ہنس راج، لالہ ملک راج صراف، راج محل پبلشرز، ریذیڈنسی روڈ جموں، ۱۹۶۷ء، ص:۲۶

(٧٥) ایضاً، ص:۲۹

(٧٦) ایضاً، ص:۳۴

(٧٧) صنم پو، عبدالغنی شیخ، جمال پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۸۱ء، ص:۳۴

(٧٨) ایضاً، ص:۱۶۳

(٧٩) حامدی کشمیری حیات و شاعری، مصرہ مریم، کمپیوٹر سٹی، راج باغ، سری نگر، ۲۰۰۱ء، ص:۵۸

(٨٠) ایضاً، ص:۵۹

(٨١) سردار فتح محمد خان کریلوی، محمود محمد آزاد، کوٹلی میر پور، ص:۳۱

(۸۲) ایضاً،ص:۱۱۰

(۸۳) ایضاً،ص:۱۱۵

(۸۴) ایضاً،ص:۲۱۹

(۸۵) انگریزی روزنامہ، Greater Kashmir

(۸۶) ن وجود (ایک صحافی کی سرگزشت)، ساحل مقبول، میزان پبلشرز، سری نگر، ۲۰۰۹ء، ص:۱۱

(۸۷) ایضاً،ص:۲۹۔۳۰

(۸۸) ایضاً،ص:۳۳۔۳۴

(۸۹) ایضاً،ص:۴۴

(۹۰) ایضاً،ص:۳۷

(۹۱) ایضاً،ص:۳۷

(۹۲) ایضاً،ص:۳۵۴

□ب چہارم: □ی □ جموں وکشمیر میں خاکہ نگاری

الف: ابتدا سے 1960ء

ب: 1960ء سے 1980ء

ج: 1980ء سے□ حال

الف: ابتدا سے 1960ء

خاکہ نگاری بھی سوانح نگاری کی طرح شخصیت کی تصویر کشی کرتی ہے۔انگریزی لفظ Sketch یا Character Sketch کو اردو میں خاکہ یا قلمی تصویر کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔عام طور پر خاکہ نگار اپنے ذاتی مشاہدے، تجربات اور تعلقات کی بنیاد پر ہی کسی شخصیت کی سیرت وصورت یا کردار کو پیش کرتا ہے جس میں مختلف قسم کے خیالات و واقعات سے رنگ بھر دئے جاتے ہیں۔خاکہ سے مُراد ایسی نثری صنف ہوتی ہے جس میں کسی بھی شخصیت کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔بہترین خاکہ کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی شخص کے بعض پہلوؤں کی نقاب کشائی اس فنی چابکدستی اور مہارت کے ساتھ کرے کہ اس کے کردار و افکار کی بھرپور عکاسی ہوجائے۔اردو لغات میں خاکہ کے معنی پنسل سے نقشہ کھینچنا یا ڈھانچہ بنانے یا کسی کی تصویر کو لفظوں میں بیان کرنے کے ہیں۔خاکہ کو انگریزی میں سکیچ یا پورٹریٹ کہا جاتا ہے۔دراصل خاکہ میں کسی شخصیت کے چند ایسے پہلو اُجاگر کیے جاتے ہیں جو اس شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر قاری کے ذہن میں پیدا کر دیتے ہیں اور جو ممدوح شخصیت کے منفرد پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔اس لیے ڈاکٹر عطش دُرانی جو اصطلاحات کے ماہر ہیں انہوں نے اسے ''شخصیہ'' کا نام دیا ہے۔ڈاکٹر صابرہ سعید فنِ خاکہ نگاری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''خاکہ ایک صنف ادب ہے۔اس کا سانچہ افسانوی کا ہوتا ہے۔اور اس میں کسی شخصیت (حقیقی یا خیالی) کی زندگی، سیرت وصورت اور کارناموں کی کچھ جھلکیاں پیش کی جاتی ہے۔اور وہ شخصیت کے ایک ایسے مطالعے کو پیش کرتا ہے، جس سے پڑھنے والے کو جمالیاتی حظ حاصل ہو۔''[1]

نثار احمد فاروقی خاکہ نگاری کو ''شخصیت کے معروضی مطالعے'' کا نام دیتے ہیں۔خاکہ نگاری کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''خاکہ نگاری شخصیت کی عکاسی کا نام ہے۔یہاں کمزوریاں بھی ہوتی ہیں اور ان سے شخصیت کی دھندلی تصویر کو چمکایا بھی جاتا ہے۔اور ان پر تنقید یا ان کی تنقیص خاکہ نگار کے فرائض میں داخل نہیں۔''[2]

فرہنگِ ادبیات میں خاکہ (Sketch) کی تعریف اور مفہوم اس طرح بیان کی گئی ہے:

خاکہ (sketch) کے مفہوم میں ای تحریر جس میں کسی معروف شخصیت کے حالات مزاحیہ اسلوب میں بیان کیے گئے ہوں۔اردو میں اس قسم کے خاکے کی ابتدائی صورتیں تذکروں میں آتی ہیں۔'اودھ پنچ' کے خاکے بھی ادبی اہمیت کے حامل ہیں جن کے بعد مولوی عبدالحق، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، شاہد احمد دہلوی وغیرہ خاکہ نگاری میں ممتاز مقام پر آتے ہیں۔ایک ادبی صنف کی حیثیت سے خاکہ بیسویں صدی کے حالیہ دنوں میں خاصی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔مجتبیٰ حسین کے خاکے جس کی عمدہ مثالیں ہیں جن میں ادبی شخصیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔'آدمی نامہ' ان کے خاکوں کے کئی مجموعوں میں سے ایک ہے۔فضا افاضلی کی 'ملاقاتیں' بھی صنف خاکہ میں اہمیت رکھتی ہے۔معاصر شخصیات پر لکھے گئے انور ظہیر خان، جاوید صدیقی اور عارف خورشید کے خاکے اس کے عمدہ نمونے ہیں۔''[۳]

خاکہ میں کسی شخص کی صورت وسیرت، مزاج وخصلت، شعور وافکار، عادت واطوار، خوبی وخامی اور ظاہر وباطن یعنی تمام پہلو شامل ہو جاتے ہیں۔اردو میں خاکہ کے ابتدائی آثار ''آب حیات'' میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔اردو ادب میں مرزا فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی کے خاکے بے حد مقبول ہیں ان کے علاوہ خاکہ نگاروں میں خواجہ حیدر، شوکت تھانوی، خواجہ حسن نظامی، عبدالماجد دریابادی، عصمت چغتائی اور ملک رام نے بہت اچھے خاکے لکھے ہیں۔خاکہ نگاری ایک مشکل فن ہے کیونکہ کسی انسان کی سیرت وصورت اور کردار کو دیکھنے اور پرکھنے کا معاملہ خاکہ نگار کی صوابدید پر منحصر ہوتا ہے۔گویا خاکے کا آرٹ بصیرت وبصارت دونوں کا متقاضی ہے۔

اگر چہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان کے ابتدائی دور کے بعد نثری ادب کی طرف بہت کم توجہ دی گئی تاہم 1947ء تک افسانوی ادب میں کسی حد تک اچھا خاصا سرمایہ جمع ہو چکا تھا۔البتہ غیر افسانوی ادب میں ریاستی ادیبوں کے کچھ خاص کارنامے دیکھنے کو نہیں ملتے۔اسی وجہ سے یہاں بہت سے نثری اصناف بہت عرصے تک پیدا رہے ہیں۔وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ریاست کے قلمکاروں کو کوئی مناسب پلیٹ فارم نہ مل سکا، کیونکہ ڈوگرہ دورِ حکومت میں ایک لمبے عرصے تک پریس پر پابندی عائد رہی۔1938ء سے وادی کشمیر سے باقاعدہ اردو اخبار ''ہمدرد'' اور ''مارتنڈ'' جاری کیا گیا جس میں باصلاحیت لوگوں نے اپنے قلم کے ذریعے اظہار خیال کرنا شروع کیا۔ان میں صنف خاکہ بھی شامل

ہے۔اور دھیرے دھیرے ریاست کے دیگر ادیب اور قلمکار اس دور میں جاری ہونے والے اخبارات اور رسائل میں اپنے مضامین اور تخلیقات چھپوانے لگے۔1947ء سے قبل یہاں تین اخبار نکلتے تھے۔جموں سے ''رنبیر'' اور کشمیر سے ''ہمدرد'' اور ''مارتنڈ''۔ان اخباروں میں وقتاً فوقتاً قلمی چہرے (خاکے) بھی چھپتے رہتے۔لیکن آج تک ان خاکوں کو کسی ادب نواز نے مرتب نہیں کیا نہ ہی کسی ادارے نے اس کی ذمہ داری لی۔نتیجہ یہ ہوا کہ اس طرح اس ابتدائی دور کے یہ سرمائے زمانے کی نذر ہو گئے۔اگرچہ ریاست میں اس کی شروعات ذرا تاخیر سے ہوئی لیکن ریاست کے تخلیق کاروں نے اپنی صلاحیت کے مطابق خاکہ نگاری میں لوہا منوالیا۔ریاست اور بیرون ریاست میں مقیم ریاست کے ادیب اس صنف میں گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ابتدا سے آج تک کئی صاحب ذوق ادیب ملتے ہیں جنہوں نے اس صنف میں کافی ذخیرے چھوڑے ہیں۔جن میں پنڈت دینا ناتھ مٹو دلگیر (فرضی نام علامہ ساحری) جگن ناتھ خیبری نشتر کاشمیری، موتی لال ساقی، قدرت اللہ شہاب، آغا حسن حسرت (سندباد جہازی)، پریم ناتھ ناز، پشکر بھان، شمیم احمد شمیم، نور شاہ، کشمیری لال ذاکر، محمد یوسف ٹینگ، ثناء اللہ بٹ اور سلیم سالک وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

دینا ناتھ مٹو دلگیر: جموں وکشمیر میں خاکہ نگاری میں اگرچہ 1947ء سے قبل ریاست کے ادیبوں نے طبع آزمائی کی ہے۔لیکن سنجیدگی سے اس صنف کو کسی نے مستقل وسیلۂ اظہار نہیں بنایا۔اسی زمانے میں وادی کشمیر میں ایک صاحب قلم پنڈت دینا ناتھ مٹو دلگیر، بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے کشمیری ادیبوں میں پیش پیش تھے۔وہ ایک ذی علم خاندان کے چشم و چراغ تھے 1844ء میں سری نگر میں پیدا ہوئے، پورا نام پنڈت دینا ناتھ مٹو تخلص دلگیر اور علامہ صدیقی ساحری کے فرضی نام سے ''مارتنڈ'' کے ادبی شمارے میں اپنے معاصر ادیبوں اور شاعروں کے چہرے لکھا کرتے تھے۔انہوں نے ''آراکین محفل ادب'' کے نام سے مستقل طور پر ایک کالم شروع کیا جس میں وہ مختلف شخصیات کے خاکے لکھتے تھے۔انہوں نے علمی وادبی ماحول میں تربیت پائی تھی۔بچپن ہی سے علم وادب اور شعر وشاعری کی طرف طبیعت مائل تھی اور اردو کے علاوہ کشمیری میں بھی شعر کہتے تھے۔قومی اور ہندو مذہبی تحریکات کا دلگیر پر بہت اثر تھا۔افسانہ نگاری میں بھی اپنا جوہر دکھایا ہے۔سماج اور سماجی مسائل کے موضوعات پر ان کے کئی مضامین شائع ہوتے رہے۔ان کا ایک مزاحیہ خاکہ ''پردیسی کاشمیری'' کے عنوان سے ''مارتنڈ'' کے 17 مارچ 1935ء کے شمارے میں شائع

ہوا تھا۔اس میں انہوں نے پ یم تھ پ دیسی کے عادات و اطوار ،حلیہ ، داخلی کیفیات اور مزاج پ روشنی ڈالی ہے۔اقتباس حظہ ہو:

''پہلا فرشتہ بولا ،ان کا اسم شریف ظاہر کہ ہ ہے۔البتہ ان کا مشہور عام تخلص پ دیسی ہے۔کسی قدر دراز ،خوش شکل ،کم گو،ہنس مکھ اور شرمیلے ،آنکھوں پ عینک لگاتے ہیں۔دوسرا فرشتہ بولا ،ہماری بھی سنو،ان کا ای ہی تخلص نہیں بقول ان کے صرف تین تخلص ہیں۔کشمیر کے لئے ای ، پنجاب کے لئے دوسرا، یو پی کے لئے تیسرا،کبھی پ دیسی کا لفظ مرغوب،کبھی بو کا خطاب مطلوب،کبھی رونق سے ہم آغوش ہیں۔''[۴]

اور ای شمارے میں انہوں نے خود اپنا خاکہ پیش کیا تھا۔جس کا آغاز اس طرح کیا ہے:

'' حضرت دلگیر ذرا سنبھل کر بیٹھ جائے ، ملئے جلئے نہیں ،تصو کھینچتی ہے۔آپ کی طرح شعر نہیں کہتا۔کیا کہ ی؟ چھپوا ی؟ خبردار، ای ،دو، تین، لیجئے جناب یہ رہی آپ کی تصو ی، پیش کردی مصّور کے خلاف کہیں سازش نہ کیجئے گا۔۔۔۔۔۔''[۵]

ان کے خاکوں سے ہمیں از ہ ہوجا ہے کہ دلگیر کو قلمی چہرہ اور حلیہ نگاری کا فن آ تھا۔انہوں نے متعلقہ شخصیات کی گو گوں عادات واطوار کو بیان کیا ہے۔ان کی تحر یوں کی عبارتیں چُست ،اور از دلکش ہے اور ن و بیان میں محاورے اور کبھی کبھی معمّا نگاری کے چٹخارے بھی پ ئے جاتے ہیں۔

پنڈت وشنو تھ در جو تخلص کرتے تھے اور کا ی اور جموی دونو موں سے لکھتے تھے۔وادی کے اچھے صاحبِ ذوق ادیبوں میں ان کا شمار تھا۔شاعری کا شوق ر تے تھے ان کا بھی ای خاکہ علامہ سا نے لکھا ہے۔اقتباس حظہ ہو:

'' م وشنو تھ' تخلص کبھی ' کبھی ۔ جموں چلے جاتے ہیں تو جموی کہلاتے ہیں۔۔۔جن دنوں کشمیر میں قیام رہتا ہے تو اپنے آپ کو کا ی سے موسوم کرتے ہیں۔۔۔۔غرض کا ی اور جموی مترادف ہیں۔''خاصے جوان ہیں' قد کسی قدر پست' خوبصورت ' چُست ن' عینک پہننے کے عادی' انگر ی وضع پ فریفتہ' سگر اور پ ن کے دلدادہ' راگ ور کے مشتاق' خوش گلو' خوش تمیز' صاحبِ ہمت اور ملنسار''

''آپ شاعر بھی ہیں، نثر بھی ہیں، ڈرامانویس بھی، مزاح نگار بھی۔
''آپ کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔انکشاف حقیقت، تلاش حقیقت۔اب ہیں طبیعت ڈرامانگاری کی طرف خصوصیت کے ساتھ جگ جھک گئی ہے۔''[6]

علامہ سا□ی کے خاکے میں وہ تمام اوصاف اور لوازمات پائے جاتے ہیں، جو فن خاکہ نگاری کے لیے لازمی ہے۔یعنی، حلیہ نگاری، شخصیت نگاری، جزئیات کا انتخاب اور داخلی کیفیات وغیرہ۔انہوں نے وشوناتھ کو قریب سے دیکھا تھا۔ان کے معاصر تھے۔ایک ہی ماحول میں رہتے تھے۔اُن سے قربت حاصل رہی۔اس خاکہ میں انہوں نے نہ صرف وشوناتھ کی قلمی تصویر کھینچی ہے بلکہ اس پورٹریٹ میں وہ تمام رنگ بھرا ہے جس سے وشوناتھ کی مکمل شخصیت عیاں عیاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔زبان و بیان میں دلکشی، سلاست ولطافت، نکتہ آفرینی اور تحریر میں شوخی و ظرافت کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ان کا قلم کسی بھی انسان کی شخصیت کی تصویر کشی کے فنکارانہ صلاحیت وذہانت سے کام لیتا ہے۔ان کا ایک ایسا ہی چہرہ خاکہ جو انہوں نے وادی کے مشہور ادیب وشاعر پنڈت دینا ناتھ وار□االمعروف شاہد کا□ی پر لکھا تھا''مارتنڈ''کے کالم''محفلِ ادبِ کشمیر''میں شائع ہوا۔اس کا ایک اقتباس □حظہ فرما□ :

> ''خُدا رکھے اپنے وضع کے ایک رنگ سے دکھائی دیتے ہیں۔دینا ناتھ صاحب، جن کا تخلص شاہد ہے، ایک دبلے پتلے نوجوان، پست قد، سادہ وضع، وجود نوجوان ہونے کے جوش شباب کی نعمت سے محروم، شعر بہت کم کہتے ہیں، البتہ □اپنے رنگ میں خوب لکھتے ہیں، کچھ دن افسانے لکھتے رہے۔آپ کا طرزِ تحریر مولانا حالی کی طرزِ تحریر سے ملتا جلتا ہے۔اب درسی کتابیں لکھ رہے ہیں۔''[7]

اس تعارفی خاکے میں خاکہ نگار نے کم الفاظ میں موصوف کے تمام اوصاف پر روشنی ڈالنے کی سعی کی ہے۔اُن کی سیرت وصورت، بصیرت و بصارت، داخلی کیفیات، اور تخلیقی حسن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔قاری کو اس مختصر سے خاکہ سے بہت حد تک موصوف کے متعلق کافی جانکاری فراہم ہوتی ہے۔

علامہ سا□ی نے بھی جموں وکشمیر میں خاکہ نگاری کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ان کے خاکوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہوتی ہیں، جو فن خاکہ نگاری لے لیے لازمی ولابدی ہیں۔ان کے خاکوں میں شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی □□ ہی کے علاوہ مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ علامہ سا□ی کے خاکوں میں خاکہ نگاری کی تمام

خصوصیات□ رجہ اتم موجود ہیں ۔ رت□ ن و بیان، اسلوب میں روانی وسادگی کے ساتھ لطافت وشوخی اور مزاح ان کے خاکوں کی پہچان ہے۔ جن کی مدد سے وہ شخصیت نگاری اور حلیہ نگاری کچھ اس □ از میں کر دیتے ہیں کہ جس سے ممدوح کی خارجی وداخلی کوائف□ روشنی□ تی ہے اور خاکہ نگار اور متعلقہ شخصیت کے□ ہمی تعلقات، اقدار اور رشتوں کے استحکام کا□ ازہ ہو جا□ ہے۔

پنڈت کشپ بندھو: پنڈت کشپ بندھو کشمیر کے قدیم اہل علم وادب میں اپنی قابلیت اور صلا□ کی وجہ سے □ ں رہے ہیں۔ وہ 1900ء میں گیرو (نور پورہ) میں پیدا ہوئے۔ وہ ا□ ذوق او□ صلا□ شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے ''مارتنڈ'' کے علاوہ کئی اخباروں کی ادارت کے فرائض ا□ م دئے۔ شاعری میں بلبل□ تخلص کرتے تھے۔ اپنے وقت کے کئی اہم اخبار جیسے ''دیش''، ''کیسری'' اور ''مارتنڈ'' میں مزاحیہ اور فکاہیہ کالم لکھتے تھے۔ وہ علامہ مجہول کے فرضی□ م سے بھی ''چلنت'' اور ''□ گل کی ڈ□ ی'' کے عنوان کے تحت مستقل کالم لکھا کرتے تھے۔ ''چلنت'' میں انہوں نے بعض معاصرین کے قلمی چہرے بھی لکھے ہیں۔ انہوں نے ایم۔اے صا□ ی کا ا□ خاکہ لکھا ہے۔ اس خاکہ میں ہلکے پھلکے □ از میں ایم۔اے صا□ ی کا تعارف کیا ہے۔ اقتباس درج ذیل ہے:

> ''ہمارے ملک میں ایم۔اے تو بہت موجود ہیں، لیکن جو امتیاز ہمارے محترم دو□ صا□ کو حاصل ہے، شا□ کسی اور ایم۔اے کو حاصل نہیں۔۔۔۔شا□ اس کی وجہ یہ ہوگی کہ صا□ صا□ کے ایم۔اے کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر ا□ ایم۔اے□ س شخص کے پیچھے ایم۔اے کے حروف لکھے جاتے ہیں لیکن صا□ صا□ کے اسم□ امی کے پہلے یہ حروف درج ہوتے ہیں۔''[۸]

جگن□ تھ خیبری نشتر کا□ ی سری نگر کے رہنے والے تھے۔ وہ □ □ کے ا□ اسکول میں مدرس تھے۔ □ □ کے□ انے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ عموماً مزاحیہ □ از کے ا□ یئے اور خاکے لکھتے تھے۔ کئی تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ صحافت میں بھی دلچسپی ر□ تے تھے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کشمیر سے شائع ہونے والے اردو اخبار ''چمن'' اور

''جموں سے شائع ہونے والے اخبار ''چاند'' کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالتے رہے۔نشتر کا ای□ خاکہ رسالہ ''وکیل'' سری نگر کے دسمبر 1949ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔اس میں ظرافت اور مزاح کی . □ی ں□ی ں ہیں۔اس خاکہ کا آغاز اس طرح سے ہ□ ہے:

''ہندوستان کے مفکر اعظم حضرت شیخ چلی علیہ الرحمتہ کو□ ا . □ بخشے جن کی□ □ میں اب بھی خیالی پلاؤ کا لطف اٹھاتے ہیں'اور . □ بھی جی چاہتا ہے پیٹ بھر کر اور شکم سیر ہو کر خیالی پلاؤ پکاتے ہیں۔ . □ ا□ ن کو پلاؤ نہ ملے تو یہ خیالی پلاؤ ہی پکانے لگتا ہے۔''9

پنڈت موتی لال ساقی: ساقی کا شمار کشمیر کے اچھے شعرا میں ہ□ ہے۔وہ بجبہاڑہ (اننت□ گ) ای□ علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔بعد میں ان کا قیام ماہ نور□ ڈ گام میں رہا۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد□ یو کشمیر سری نگر میں □ زمت سے منسلک ہو گئے۔کشمیری شاعری ان کا میدان ہے اردو میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔جن میں مضامین، تبصرے، خاکے، تنقید اور ا□ یئے شامل ہیں۔جو□ ی د□ ہفتہ وار ''□ مت'' کی اتوار کی اشا □ میں شائع ہ□ کرتے تھے۔وہ□ ضابطہ نئی کتابوں خاص طو□ کشمیری تصانیف کا تعارف لکھتے رہے اور ساتھ ہی ان مصنفین کے تعارفی خاکے بھی لکھتے تھے۔ان کے ای□ دو □ شاعر پشکر بھان تھے۔ساقی نے '□ مت' میں 1946ء کے ای□ شمارے میں پشکر بھان کا ای□ □ اعمدہ تعارفی خاکہ ''پشکر بھان'' کے عنوان سے لکھا تھا۔اس خاکہ میں پشکر بھان کے حالات، ان کی شخصیت اور ان کی ادبی □ مات□ روشنی□ ڈتی ہے۔اس کی ابتدا کچھ اس طرح سے ہوتی ہے:

پشکر بھان□ م نہیں نغمہ ہے۔
فر د نہیں ا نجمن ہے۔
فن نہیں فنکا ر ہے۔

پشکر کے اور میرے درمیان جو تعلقات ہیں وہ ابھی اتنے گہرے نہیں کہ انہیں دوستی کا□ م□ جائے۔بلکہ یہ تعلقات ابھی□ شناسائی اور دوستی کی سرحد کے درمیان ای□ موڑ□ کھڑے ہیں۔میں نہیں جا□ کہ کیا کبھی یہ تعلقات دوستی کا روپ دھار بھی لیں گے□۔۔۔''10

(نوٹ: ا□ چہ کشمیر میں اردو جلد سوم از عبدالقادر سروری میں اس خاکہ کی سال اشا □ ۱۹۴۶ بتائی گئی

ہے۔جبکہ ساقی کی پیدائش ۱۹۳۹ء میں ہوئی تھی۔اس حساب سے وہ فقط دس سال کے تھے۔اور اتنی کم سنی میں خاکہ لکھنا اور وہ بھی اپنے پیشہ ورانہ پختگی کے حوالے سے بعید از قیاس ہے۔ہو نہ ہو یہ کتابت کی غلطی سے ۱۹۶۴ کے بجائے ۱۹۴۶ لکھا گیا ہو۔راقمۃ الحروف کی تلاش و بسیار کے باوجود 'جامعہ' کے قدیم شمارے کہیں سے دستیاب نہ ہو سکے۔)

آغا حسن حسرت: مولانا آغا حسن حسرت کا تعلق جموں وکشمیر کے ضلع پونچھ سے تھا۔وہ ایک ذی علم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ابتدائی عمر میں علم وادب سے ذاتی لگاؤ پیدا ہوا۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد کلکتہ،دہلی اور لاہور جیسے علمی گہواروں میں قیام رہا۔صحافت کو کسبِ معاش بنایا۔مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جیسی شخصیات کی سرپرستی اور شاگردگی میں رہ کرفنِ صحافت میں ایسا نام پیدا کیا کہ آج بھی اردو کے بڑے بڑے صحافی انہیں فخریہ طور اپنا استاد مانتے ہیں۔صحافت کے علاوہ انہوں نے مختلف شعبہ ہائے ادب میں معتدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔مختلف اصناف ادب جیسے سوانح نگاری،انشائیہ و مضمون نگاری،خاکہ نگاری اور تاریخ میں بھی اس قدر نمایاں کام انجام دی ہیں۔ان کا اصل موضوع ''کشمیر'' رہا ہے۔ان کے مضامین اور دیگر کتابوں کے مطالعے سے سرزمین کشمیر اور کشمیر کے عوام سے ان کی محبت و ہمدردی،حبُ الوطنی کا جذبہ اور کشمیریت کا احساس جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔سند باد جہازی کے قلمی نام سے مزاحیہ مضامین اور سوانحی خاکے لکھتے تھے۔وہ صحافی تھے اور اسی پیشے کو وسیلہ رزق بنایا اور اس کا بھر پور حق ادا کیا۔حسرت کے یہاں مختلف زبانوں کا امتزاج خوبصورتی کے ساتھ ملتا ہے۔چونکہ وہ مختلف زبان جانتے تھے۔کشمیری ،پہاڑی،گوجری،پنجابی،ہندی،انگریزی،فارسی اور عربی پر دسترس رکھتے تھے۔اردو تو تخلیقی زبان تھی ہی۔یہی وجہ ہے کہ مختلف زبانوں کے الفاظ کو ایک ہی لڑی میں پرونے کا ہنر انہیں خوب آتا تھا۔جس سے ان کی تحریروں میں ایک انوکھا حسن اور دلکشی دیکھنے کو ملتی ہے۔

آغا حسن حسرت کوفن خاکہ نگاری اور اس کے لوازمات کا گہرا مطالعہ تھا۔ان کے خاکوں سے مصنف کے وسیع مطالعے،گہرے مشاہدے،اور عمیق و بلیغ نظر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔مرقع کشی اس فنی چابکدستی اور مہارت سے کرتے ہیں کہ مذکورہ شخصیت کی زندہ تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔'فسانہ آزاد' کے کردار ''خوجی'' کا خاکہ اس کی

عمدہ مثال ہے۔ مصنف نے 'خوجی' کی قلمی تصویر اس انداز سے کھینچی ہے کہ 'خوجی' ایک افسانوی کردار نہ ہو کر ایک حقیقی کردار کی صورت میں ہمارے آنکھوں کے سامنے چلنے پھرنے لگتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''لیجیے ان سے ملیے۔ ان کا نام خوجی ہے وطن لکھنؤ پیشہ امیروں کی مصاحبت۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں، چھوٹا سا قد، کالی رنگت۔ گلیور صاحب کے سفرنامے میں آپ نے بونوں کی بستی کا حال پڑھا ہوگا۔ میاں خوجی کو دیکھ کے بے اختیار بونے یاد آجاتے ہیں۔ خوجی کا اصلی نام کیا ہے؟ ان کے باپ دادا کون تھے؟ انہوں نے بچپن اور جوانی کا زمانہ کیسے گذارا؟ یہ باتیں ہمیں معلوم نہیں۔ ہاں خود ان کی زبانی سے ان کی ابتدائی زندگی اور اصل وطن کے متعلق بعض باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ مثلاً میاں خوجی کا بیان ہے کہ ان کا اصلی نام خواجہ بدیع الدین الزمان ہے۔ اودھ کی بادشاہت کے آخری زمانے میں وہ وگلہ والی پلٹن کے کمیدان تھے۔ لیکن خوجی کی بات کا کیا اعتبار؟ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اگر خوجی کہہ کے پکاریے تو وہ فوراً بگڑ جائیں گے۔ اب چاہے رستم مقابلے پر ہو۔ کیا مجال کہ قدم پیچھے ہٹے۔ وہ پیٹتے پیٹتے تھک جائے اور یہ پٹتے پٹتے نہیں تھکتے۔ پٹخیاں کھاتے ہیں لیکن پھر بھی جھاڑ پونچھ کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ خم ٹھونکتے ہیں اور لپٹ جاتے ہیں۔ جہاں ہاتھ نہیں چلتا وہاں زبان چلتی ہے۔ یعنی چیختے ہیں چلاتے ہیں۔ شور مچاتے ہیں۔ اپنی جوانی کے زمانے میں وگلہ والی پلٹن کی کمیدانی کو یاد کرتے ہیں۔''[11]

''مردم دیدہ'' اور ''دو ڈاکٹر'' کے نام سے ان کے خاکوں کے دو مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جن میں انہوں نے مختلف ادبی اور سیاسی شخصیات کی قلمی تصویریں کھینچی ہے۔ ''مردم دیدہ'' سوانحی نوعیت کے سات خاکوں پر مشتمل ہیں جو وقتاً فوقتاً ''شیرازہ'' میں شائع ہوئے تھے۔ جسے مصنف نے ۱۹۳۹ء میں مرتب کر کے کتابی صورت میں منظر عام پر لائے۔ امتیاز علی تاج نے ان خاکوں کو اردو سوانح نگاری کا ایک نیا طرز قرار دیا ہے۔ کتاب کے دیباچے میں وہ ان خاکوں کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مردم دیدہ چند ایسے مشاہیر کی زندگی کے متعلق مضامین ہیں جن سے مصنف کے ذاتی طور پر عرصہ تک مراسم رہے۔ چنانچہ تعلقات اور واقفیت کی بنا پر ان کی شخصیت نے جو اثر مصنف

کے دل میں پیدا کیا اسے مصنف نے ان مضامین میں منتخب واقعات کے ذریعے پیش کیا ہے۔اوران واقعات کو ایسی سے اور ایسے از میں لکھا ہے کہ ان مشاہر کی جیتی جاگتی تص آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔[۱۲]

''مردم ہ'' میں حسر نے ان ما زشخصیات کا خاکہ پیش کیا ہے جن کی مصاحبت انہیں حاصل رہی اور جن سے انہیں ملنے، ان کے خیالات کو سمجھنے اوران کے عادات واطوار غور کرنے کا موقع ۔اس میں مع الاسلام (جلال الدین طہرانی)، خیال عظیم دی، آغا حشر کا ی، شفاء الملک (حکیم فقیر محمد صا چشتی)، علامہ اقبال، ظفر علی خان، اور مو ابوالکلام آزاد کے خاکے شامل ہیں۔حسرت نے اس از میں مذکورہ مشاہیر کی قلمی تص کشی کی ہے کہ ممدوحین متعلقین کی جیتی جاگتی صورت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔مع الاسلام جلال الدین طہرانی کے وضع قطع کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مع الاسلام دبلے پتلے سے آدمی تھے۔رنگت کبھی بہت گوری ہوگی لیکن کلکتہ کی می میں کس قدر سنولا گئی ہے۔پتلے پتلے ہو ۔چھوٹے چھوٹے ہاتھ وں۔خشخشی داڑھی۔سیاہ قباہ اوعمامہ جو ان کے علماء کا عام لباس ہے۔''[۱۳]

حسرت متعلقہ شخصیت کا تعارف لطیف پیرائے میں ظر نہ از میں ی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔یہ از انہیں دوسرے خاکہ نگاروں سے ممتاز بنا ہے۔مو ظفر علی سے پہلی قات اپنا پیش کرتے ہوئے خاکے میں ان کا تعارف کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

تھوڑی میں مو ظفر علی کھٹ کھٹ کرتے تشریف لے آئے۔میں نے انہیں اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔تص یں ضرور دیکھی تھیں۔لیکن تص وں سے کسی شخص کی صورت شکل کے متعلق صحیح ازہ نہیں کیا جاسکتا۔بہرحال اتنا تو یقین تھا کہ ان کی ت ضرور ڈھی ہوئی ہوگی۔آ ۔ معمولی قومی کارکنوں کا قبہ شکم گنبد فلک سے ہمسری کر ہے تو مو ظفر علی خان تو جنہیں آل لیڈر کی حیثیت حاصل ہے۔ای عد ڈیل ت کا مالک چاہئے۔لیکن انہیں دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی کہ ت نہ عمامہ۔آ یہ کیسے مو اور کیسے لیڈر ہیں۔''[۱۴]

اسی طرح علامہ اقبال کے خد وخال کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کوٹھی کے صحن میں چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی پر اوجلی چادر۔ اس پر علامہ اقبال ململ کا کرتہ پہنے، تہبند باندھے، تکیہ سے ٹیک لگائے حقہ پی رہے تھے۔ سرخ وسپید رنگت، بھرا ہوا جسم، سر کے بال کچھ سیاہ کچھ سپید۔ داڑھی منڈی ہوئی۔ چارپائی کے سامنے کچھ کرسیاں تھیں ان پر دو تین آدمی بیٹھے تھے۔ دو تین اٹھ کے جا رہے تھے۔ سالک صاحب میرے ساتھ تھے۔ علامہ اقبال نے پہلے ان کی مزاج پرسی کی پھر میری طرف توجہ فرمائی۔''[۱۵]

یہ ان کی خاکہ نگاری کی فنی چابکدستی اور کمال کا نتیجہ ہے کہ خاکوں کی طوالت کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ مزید جاننے کی جستجو میں قاری پورا خاکہ مکمل نہ کرلے تشنگی سی رہتی ہے۔ آغا حشر کا شمیری سے اپنی پہلی ملاقات کے تاثرات اور ان کا تعارف خوبصورت اور حسین پیرائے میں کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''چارپائی پر آغا صاحب صرف تہبند باندھے اور ایک کرتا پہنے بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے۔ اب جو دیکھتا ہوں تو بینگ والے آغا اور اس آغا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سر پر انگریزی فیشن کے بال، داڑھی منڈی ہوئی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، دہرا جسم، سرخ وسپید رنگ، میانہ قد، ایک آنکھ میں نقص تھا۔ محفل میں بیٹھے ہوئے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ میری طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔ بڑے تپاک سے ملے، پہلے مزاج لال سے خیر و عافیت پوچھی، پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور ادبی ذکر و افکار چھڑ گئے۔''[۱۶]

ممدوح کی مرقع نگاری کرتے ہوئے وہ متعلقہ شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں، ظاہری اور باطنی دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جس سے متعلقہ شخصیت کی ظاہری خد وخال کے ساتھ اس کے افکار و نظریات اور نفسیاتی پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ آغا حشر کے متعلق لکھتے ہیں:

''آغا بڑے حاضر جواب اور بذلہ سنج شخص تھے جس محفل میں جا بیٹھتے تھے اس پر چھا جاتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔جس شخص سے بے تکلفی برتنا منظور ہوتا۔ اسے اس بے ساختگی سے گالی دے بیٹھتے تھے کہ بچارا حیران رہ جاتا تھا۔ ''گالی'' کا نام سن کر لوگ کہیں گے کہ گالی دینا کہاں کا اخلاق ہے؟ لیکن آغا کنجڑے قصابوں جیسی گالیاں تھوڑے ہی دیتے تھے۔ انہوں

نے گالی کو ادب و شعر سے ترکیب دے کر ایسی خو چیز بنا دی تھی۔ کہ مرحوم اگر کچھ دنوں اور زندہ رہتے تو ان کا شمار فنون لطیفہ میں ہونے لگتا۔ اصل میں آغا ایسے تو یوں بھی بڑے ذہین اور طباع شخص تھے۔ پھر انہوں نے جوانی میں ہی تھیٹر کی طرف توجہ کی جہاں دنیا بھر کے بگڑے لوگ جمع تھے۔ رات بھر نوک جھونک کا بازار گرم رہتا تھا۔ کچھ تو ان صحبتوں میں ان کی طبیعت نے جلا پائی۔ اس پر مطالعہ کا شوق سونے پر سہاگہ ہو گیا۔'' [۱۷]

فراغ حسن حسرت آغا حشر کشمیری اور ان کے کارناموں کے ابتدائی دنوں سے ہی شیدائی تھے۔ بقول خاکہ نگار پہلے پہل ان کو دیکھا نہیں تھا بلکہ لفظ ڈراما سنتے ہی ان کے ذہن میں آغا حشر کا نام آنے لگتا تھا۔ اس زمانے میں پورے ہندوستان میں ڈرامے کے میدان میں آغا حشر کی طوطی بولتی تھی اور جب حسرت کلکتہ پہنچے تو ان سے ملاقات ہوئی، ان کی صحبت میں رہنے کا موقعہ ملا۔ وہ آغا کی ذہانت، قابلیت، فطرت، کمال فن اور شخصیت کے اس قدر گرویدہ بن گئے کہ ساری زندگی آغا کے قدردان رہے۔ اس خاکہ میں انہوں نے آغا کی ذاتی اور کاروباری زندگی کے ساتھ ان کے عادات و اطوار پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کی عادات و اطوار کے متعلق وہ یوں رقمطراز ہیں:

''وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھتے تھے۔ ہر قسم کے بازاری ناولوں، اخباروں، رسالوں سے لے کر فلسفہ اور مابعد الطبعیات تک کی اعلیٰ تصانیف پر ان کی نظر تھی۔ اور فضل بک ڈپو سے دار المصنفین تک وہ سارے اداروں کی سرپرستی فرماتے تھے۔ کلکتہ میں ان کا معمول یہ تھا کہ سہ پہر کو گھر سے نکلتے اور بخط مستقیم اخبار عصر جدید کے دفتر میں پہنچے۔ پہلے سارے اخبار پڑھے۔ پھر رسالوں کی نوبت آئی۔ کبھی ریویو کے لئے کوئی کتاب آ گئی تو وہ بھی آغا صاحب کی نذر ہوئی۔ کچھ اخبار اور رسالے تو وہیں بیٹھے بیٹھے دیکھ لیے۔ جو بچ رہے انہیں گھر لے گئے بازار میں چلتے چلتے کتابوں کی دکان نظر آ گئی، کھڑے ہو گئے۔ اچھی اچھی کتابیں چھانٹ کے بغل میں دبائیں اور چل کھڑے ہوئے۔ راستہ میں کسی کتاب کا کوئی اچھا ورق دکھائی دیا تو اسے اٹھا لیا اور وہیں کھڑے کھڑے پڑھ ڈالا۔'' [۱۸]

حسرت کے خاکوں میں نہ صرف متعلقہ شخصیت کی داخلی و خارجی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ بلکہ متعلقہ شخصیت کی زندگی کے تمام پہلوؤں، ذاتی و نجی زندگی، خارجی زندگی، ادبی زندگی، مشاغل، دوست واحباب اور محافل

کے ساتھ ساتھ اس کے طرزِ عمل اور تعلقات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اقتباس حظہ فرما :

''آغا چہ لاکھوں کمائے اور لاکھوں ہی اڑائے لیکن تنہا خوری کے عادی نہیں تھے۔ روپیہ تھا۔ تو اس میں عزوں کے حصے لگائے جاتے تھے۔ قریب کے رشتہ داروں کو تو انھوں نے ہزاروں لاکھوں دے ڈالے۔ والدہ کی ایسی مت کی کہ کوئی کیا کرے گا۔ لیکن دور کے رشتہ داروں کو بھی وہ کبھی نہ بھولے، ان کے عزوں میں کئی بیوہ عورتیں اور یتیم بچے تھے۔ ان کے درماہے مقرر تھے۔ روپیہ تھا تو جس کا جو حصہ مقرر تھا اسے گھر بیٹھے پہنچ جا تھا۔ غرض آغا کی ذات کئی بے کسوں کی گی کا سہارا بنی ہوئی تھی۔ ان کے اٹھتے ہی یہ سہارا مٹ۔''[19]

اغ حسن حسرت کی خاکہ نگاری کا ای اور وصف یہ ہے کہ وہ عقیدت کی بنا پر ممدوح کی تعریف وتوصیف میں زمین وآسمان کے قلابے نہیں تے اور نہ ہی اختلاف کی بنا پر کسی شخصیت کی تنقیص یل کا پہلو تلاش کرتے ہیں۔ بلکہ وہ لطیف پیرائے میں حقیقتِ حال بیان کرتے ہیں۔ مولا ابوالکلام آزاد سے حسرت کو حد درجہ عقیدت تھی۔ مولا کے ی کلام کے وہ ہ تھے۔ کہا کرتے تھے۔

سے دیکھی ابوالکلام کی

حسرت میں بھی مزا نہ رہا

وہ مولا کی انی کے قائل ہی نہیں بلکہ ہ تھے۔ لیکن مولا کی انگی دانی کے متعلق لکھتے ہیں تو حقیقت بیانی کرتے آتے ہیں۔ اقتباس حظہ فرما :

مولا ابوالکلام آزاد انگی بول بھی ہیں۔ لکھنے میں بھی بند نہیں۔ البتہ ان کا انگی تلفظ کچھ اچھا نہیں۔ میں نے انہیں ای مرتبہ انگی کی ای عبارت پڑھتے سنا تھا۔ جس کی بنا پر میں نے یہ رائے قائم کی ہے اور یہ بھی چاہیے تھا کیو انہوں نے انگی قاعدہ نہیں پڑھی بلکہ مطالعہ سے اس میں استعداد بہم پہنچائی ہے۔''[20]

''دو ڈاکٹر'' حسرت کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جس میں ڈاکٹر ستی پل اور ڈاکٹر عالم کے سوا خاکے یکجا ہیں۔ جو شروع میں شیرازہ میں شائع ہوتے رہے۔ اس میں ان شخصیات کے حالات وکوائف کے ساتھ ان کے متعلق

اپنی ات بھی دلنشین از میں پیش کیے ہیں۔ کرشن چندر کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> یہ مضامین دوا نوں کے جیتے جاگتے مرقعے ہیں۔ ان میں زن گی کی لہر ہے۔ کشمکش اور اضطراب دقیق سیاسی رموز مزاح کے لطیف پیرائے میں کچھ اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ انہیں پڑھنے میں ای لطف حاصل ہے۔ حسرت صا کے دل آ از بیان سیرت نگاری اور سوا تصو کشی سے ہمارے سوانح نگار بہت کچھ سیکھ ہی۔''۲۱

حسرت مرقع نگاری میں طولیٰ ر ہیں۔ لطافت وظرافت ایسا کمال حاصل ہے کہ قاری بے ساختہ ہنسنے مجبور ہوجا ہے۔ سنجیدہ تحر کے لطیف پیرائے کا استعمال انہی کا ہی خاصہ ہے۔ اپنے خاکوں میں متعلقہ شخصیت ممدوح کا تعارف ہمیشہ ایسی ظرافت سے کرتے ہیں کہ قاری اس شخصیت کے متعلق مز پڑھنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر ستی پ ل کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جو لیڈر اس موقع موجود تھے۔ ان میں ای پست قامت مہاشے بھی تھے۔ جو کھدر کا سفید جامہ، سفید کوٹ اور سپید پگڑی پہنے میز کے سرے بیٹھے تھے۔ وہ آلو کا ای قتلہ منہ میں رکھ چکے تھے اور دوسرا قتلہ ان کے منہ اور میز کے درمیان خلا میں اپنی ری کا انتظار کر رہا تھا کہ شیخ محمد حیات نے میرا ان سے تعارف کر ا۔ یہ مہاشے ڈاکٹر ستی پ ل تھے۔ اور مجھے قابوں کے دور اور چھری کا س کی جھنکار میں پہلی مرتبہ ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔''۲۲

خاکہ نگار متعلقہ شخصیت کی خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں تو وہیں اس کی خامیوں کی بھی ہد ہی کرتے ہیں اور اسی طرح کسی خامی کا کرہ کرتے ہیں تو موصوف کے محاسن بھی شمار کرنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر عالم کے خاکے میں ان کی سیاسی یت اور ان کے منفی گوشوں کے ذکر کے ساتھ موصوف کی ذاتی خوبیوں کا کرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> '' ڈاکٹر عالم کی سیاسی زن گی سے قطع کر کے دیکھئے تو ان میں ی خوبیاں ہیں۔ جس سے ملتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملتے ہیں اور ہر شخص سے بآسانی گھل مل جاتے ہیں۔ ''حضور'' ان کا تکیۂ کلام ہے۔ ہر فقرہ اسی لفظ سے شروع ہے اور اسی ختم ہوجا ہے۔ پہلی قات میں ہی اتنے بے تکلف ہوجاتے ہیں گو سوں کی جان پہچان ہے۔ وہ ''بھاری بھرکم پن'' جو لیڈری کا خاص وصف سمجھا جا ہے ان میں م کو نہیں۔ البتہ جسمانی لحاظ سے ضرور بھاری

بھر کم ہیں۔اور اس وصف نے ان کی بہت سی خامیوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔''۲۳؎

چراغ حسن حسرت کو فن خاکہ نگاری اور قلمی تصویر کشی کا ہنر خوب آتا ہے۔وہ جس شخص کی قلمی تصویر کھینچتے ہیں اسے وہ تمام لازمی رنگوں سے رنگا دیتے ہیں کہ مذکورہ شخص کی مکمل تصویر یں ہو جاتی ہے۔خاکے کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص جیسا بھی ہو ویسا کچھ قاری کے سامنے آجائے۔یہ خصوصیت حسرت کے خاکوں میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے خاکوں میں مزاح، وقت اور ملیان زمانہ کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس شخصیت کی نفسیاتی کیفیت کا احوال بھی ملتا ہے۔وہ ممدوح کے اوصاف ومحاسن کے ساتھ اس کی خامیوں اور کو بھی بیان کرتے ہیں۔یہی ایک کامیاب خاکہ نگار پہچان ہوتی ہے۔

قدرت اللہ شہاب: قدرت اللہ شہاب اردو ادب کے ایک نامور ادیب ہیں۔جنہوں نے ناول،افسانے،سوانح ادب کے علاوہ خاکہ نگاری میں بھی اپنی قدرت مات انجام دئے ہیں۔ان کے خاکوں میں غیر معروف شخصیات ہوتے ہیں۔جنہیں قدرت اللہ شہاب کے علاوہ اور کوئی نہیں پہچانتا لیکن خاکہ نگار اپنے زورِ قلم سے ان شخصیات کی ایسی تصویر کشی کرتے ہیں کہ ادب سے ذوق رکھنے والے ان غیر معروف شخصیات سے واقف ہو جاتے ہیں۔انہیں فنِ خاکہ نگاری اور مصوّری پر ایسا درک اور کمال حاصل ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو''ماں جی'' جیسا بہترین اور مثالی خاکہ دیا۔ماں جی کے بچھڑ جانے کا غم اور اس کرب کو کم کرنے کے لیے انہوں نے یہ خاکہ تحریر کیا۔اس خاکہ میں خاکہ نویس ماں سے جڑے جذبات،احساسات،خیالات اور محبت و ہمدردی کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔اپنے والد کے گزر جانے کے بعد والدہ کی تنہائی کے درد اور تکلیف کو کم کرنے کے لیے وہ ان کے زیادہ قریب آئے۔اس خاکہ میں ماں جی کے بچپن، جوانی اور پیری یعنی ان کی حیاتِ زندگی کے ہر پل،ان کی عادات واطوار،اخلاق وکردار اور نفسیاتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔پس منظر میں والدہ کی شخصیت کو اس روپ میں پیش کیا ہے جس روپ میں ماں جی نے زندگی گزاری۔ان کی والدہ نہایت شریف النفس،سادگی پسند،درویشانہ مزاج والی،خاموش طبع اور سادگی کی پیکر خاتون تھیں۔خاکہ نگار نے ان کی عادت واطوار،رہن سہن،طرزِ زندگی،لباس اور خورد ونوش،دوسروں کے ساتھ تعلقات اور ایمان وعقائد کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔وہ اپنی ماں جی کی عادت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''کھانے پینے میں وہ کپڑے لتّے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی، دھنیئے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھی۔ پھلوں میں کبھی بہت ہی مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے کے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کا کھاتی تھیں۔ اکثر و بیشتر دوپہر کا۔ شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی نمکین لسّی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھی۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں۔ اور ہمیشہ یہ دعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا۔'' ۲۴

قدرت اللہ شہاب فن خاکہ نگاری کی تمام خصوصیات اور تقاضوں سے واقف ہیں۔ ''ماں جی'' میں موصوفہ کی مرقع کشی، حلیہ نگاری، جسمانی خد وخال کے علاوہ موصوفہ کی داخلی کیفیات، عادات واطوار، اخلاق وکردار کی آئینہ داری بھی ہو جاتی ہے۔ اس خاکہ میں کھینچی گئی ماں جی کی تصویر میں ان کا عکس یوں آتا ہے جس سے ان کی مزاج واخلاق اور رہن سہن منعکس ہو جاتا ہے۔ بقول خاکہ نگار ماں جی نے زندگی کی ابتدائی دنوں میں غربت و مفلسی دیکھی، پھر زندگی اور مقدر نے ایسا رخ لیا کہ دوسروں کے کھیت میں مزدور کرنے والے ان کے خاندان اپنے بستی میں صاحب حیثیت لوگوں میں شمار ہونے لگے اور کچھ عرصے بعد ان کے والد ''عبداللہ صاحب، گورنر گلگت کے ساتھ ماں جی کی شادی ہوگئی۔ قدرت اللہ شہاب جیسا بیٹا پیدا ہوا۔ لیکن ان کی زندگی، عادات واطوار اور مزاج میں وہی فقیری رہی۔ اقتباس دیکھئے:

''ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ رقم تھی، نہ کوئی زیور/اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی کئی چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑوں کے، ایک جوڑا دیسی جوڑا، ایک جوڑا ربڑ کی چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جن میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے، ایک جائے نماز، ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔'' ۲۵

قدرت اللہ شہاب بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں کی زبان و بیان اور طرزِ تحریر میں افسانوی رنگ غالب ہے۔ پس منظر، منظر نگاری، جزئیات نگاری، جذبات نگاری، واقعہ نگاری، لطافت و

ظرافت اور الفاظ کے انتخاب پ انہیں ملکہ حاصل ہے۔ جس کی وجہ سے خاکہ دلکش اور دلچسپ بن جا ہے۔ وہ شخصیت کو فرشتہ صفت کے روپ میں سامنے لانے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ممدوح کو اصل روپ میں عام فہم ن میں صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے۔

پ بم تھ از: پ بم تھ از کا تعلق ی جموں و کشمیر کے فعال و متحرک ادیبوں میں ہے جنہوں نے کشمیر اور بیرون کشمیر میں رہ کر اپنی ساری ن گی ادب، سماج اور سیا کے لیے وقف کی۔ وہ ادب کے دلنواز تھے، ادیبوں کے ساتھ عمر اری، مختلف شعبہ ہائے ادب میں اپنی صلاحیتوں کا زور آزماتے رہے۔ وہ ی جموں و کشمیر کے اولین اردو اخبار ''ہمدرد'' اور مارٹنڈ'' کے نی ہیں۔ انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مل کر یہ دو اخبار جاری کیے۔ انہوں نے ''کاغذ کا وسدیو'' اور ''ب ل لمحے'' جیسے مشہور افسانوی مجموعے، کشمیری اوپیرا ڈرامہ ''ذوی گا ر(Zui-Gabbar) اپن ی دگار چھوڑے ہیں اور کئی اہم سیاسی ر تصانیف کے بھی مصنف ہیں۔ انہوں نے خاکے اور قلمی چہرے بھی لکھے ہیں۔ ان خاکوں سے ان کے فن خاکہ نگاری اور شخصیت نگاری کی صلاحیتوں کا ازہ ہے۔ وہ اپنے مخصوص از و بیان، ولہجہ اور الفاظ کے انتخاب سے اپنے احساس کو جس رَ وروغن میں ڈبو کر تص ی کشی کرتے ہیں اس سے متعلقہ شخصیت کی مکمل تص ابھر کر سامنے آتی ہے اور اس کی ظاہری و داخلی کیفیات بھی آشکار ہو جاتی ہیں۔ وہ سوں حلقہ ا بِ ذوق کے ساتھ منسلک رہے اور مختلف ادیبوں کے ساتھ دوستانہ تعلق رہا۔ اپنے غور وفکر، فرد آشنا صلا اور عمیق نگاہوں سے لوگوں کے دلوں جھانکنے کا ہنر ر تھے اور اپنے مشاہدات کو صفحہ قرطاس پ خوبصورتی سے آ تھا۔ انہوں نے اردو کے ما ز افسانہ نگار غلام عباس کا ا خاکہ لکھا ہے۔ جس سے موصوف کی عادات واطوار اور مزاج کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ اقتباس حظہ فرما :

> ''غلام عباس فوراً ہی بے تکلف نہیں ہوجاتے۔ گفتگو ھتی جاتی ہے' تکلف ٹ جا ہے ت جو کہیں تھی کہیں پہنچ جاتی ہے اور غلام عباس جو صرف مسکرا رہے تھے ہنسنے لگتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ کھلکھلا کر کبھی نہیں ہنستے۔ ی دہ ہنسی آئے گی' منہ پ خون بھی لپکے گا لیکن وہ سر کو جھکا کے آواز کو دانتوں کے نیچے روک روک کر ہی ہنستے رہیں گے۔ جیسے ان کو یہ ڈر ہو کہ

منہ کے زاویے بہت بگڑ جا □ گے ۔غلام عباس کو میں نے کبھی غصے میں بھی □ تے نہیں
سنا۔ کچھ بھی ہو□ ہو، کنپٹیاں □ لال ہوگئی ہوں ۔غلام عباس آپ کی طرف ایسے دیکھیں
گے جیسے انھیں غصہ نہیں تعجب ہو رہا ہو۔''۲۶

انہوں نے اس خاکہ میں غلام عباس کی ہرا□ پہلو اور روپ، ادبی مصروفیات، تصانیف اور□ ت کے تمام گوشوں□ روشنی ڈالی ہے۔ سلیس□ ن و بیان میں سلیقے سے غلام عباس کی تص□ کو تح□ کے فریم میں□ رتے وقت انہوں نے لطافت وظرافت اور شوخ اسلوب اپ□ ہے۔ جس سے خاکے کہ دلکشی د□ لا ہوگئی ہے۔

ب: 1960ء سے 1980ء

غلام رسول سنتوش: ریاست اور بیرونِ ریاست میں ایک مصوّر کی حیثیت سے اپنا مقام بنانے والے غلام رسول سنتوش کا نام فنون لطیفہ میں اہمیت کا حامل ہے۔اگرچہ ایک مصوّر کے طور پر انہوں نے کئی اشخاص کی تصویریں بنائی ہے اور ان تصاویر کو مختلف رنگوں کے امتزاج سے رنگین بنایا ہے تاہم قلمی تصویر کشی کی بھی انہوں نے کوشش کی ہے اور کئی اچھے خاکے لکھے ہیں۔جس میں انہوں نے نقش کے بجائے قلم سے رنگ بھرے ہیں۔انہوں نے اپنے قلم کے ذریعہ صرف مختلف شخصیات کے ظاہری خد وخال،حلیہ اور جسامت کی تصویر ہی صفحہ قرطاس پر ہی نہیں اُتارے ہیں بلکہ ان کی ذاتی دکھ اور اندرونی الجھن کو بھی اپنے اسکیچ سے ابھارا ہے۔ان کے یہاں اظہار کی کاریگری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔انہوں نے ایک خاکہ وادی کشمیر کے نامور ادیب اختر محی الدین پر لکھا ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''چہرے کے خد وخال سے ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ابھی نوائی کے تنور سے جلی ہوئی روٹی برآمد ہوئی۔''[۲۷]

سنتوش اپنے خاکے ''بکواس کشمیری'' کے فرضی نام سے بھی شائع کرتے رہے۔انہوں نے ایک خاکہ کشمیر کے ایک افسانہ نگار بنسی نردوش پر لکھا ہے۔وہ رقمطراز ہیں:

> ''مونسپل لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین بن کر کشمیری پنڈتوں پر احسان کیا، چند مضامین لکھ کر شیر بھارت نامی اخبار میں اسسٹنٹ ایڈیٹر اور پہلا پرچہ پیتا جی کو بھیجا اور اپنی قابلیت کا روپ جمایا۔''[۲۸]

محمد یوسف ٹینگ: محمد یوسف ٹینگ جموں کشمیر میں ہی نہیں بلکہ عالمی اردو ادب میں ایک ممتاز محقق اور نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔محکمہ اطلاعات میں ملازمت کے دوران کی صحافتی صلاحیتوں ابھر کر سامنے آئیں۔رسالہ ''تعمیر'' میں ان کے صحافتی جوہر نمایاں ہوئے اور وہ ایک سنجیدہ،اداریہ پرداز کے طور پر ابھرے۔ان کے اداریے اور خاکے مقامی اور قومی اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔اس دوران کئی اخباروں کے لیے کالم لکھتے رہے۔کچھ عرصہ اخبار ''آئینہ'' کے ساتھ وابستہ رہے۔پھر جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ' کلچر اینڈ لینگویجز

میں سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ جہاں سے ان کی نگرانی میں ادبی رسالہ ''ہمارا ادب'' نکلتا تھا۔ یہاں ان کی تخلیقی شعور اور تنقیدی نقطہ نظر کو جلا ملی اور ''آئینہ'' سے ان کی خاکہ نگاری کو تقویت حاصل ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے متعدد ادبی شخصیات کی قلمی تصویر کھینچ کر اپنے خاکہ نگاری کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ جب وہ کسی کی قلمی تصویر کھینچتے ہیں تو اس شخصیت کے تمام ظاہری و باطنی پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں۔ جس سے ان کے فن خاکہ نگاری میں دسترس کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس سلسلے میں پریم ناتھ در پر لکھا ہوا ان کا ایک خاکہ اہم ہے۔ جس سے ان کی مرقع نگاری اور قلم کی لطافت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''در صاحب آخری وقت تک ایک دلنواز حلیے کے مالک رہے۔ جس پر سفید بالوں نے ایک فلسفانہ اور رگانہ وقار کا اضافہ کیا تھا۔ لیکن جن لوگوں نے انہیں نسبتاً جوانی کے دنوں دیکھا ہے انہیں یاد ہوگا کہ وہ کشمیر کی شہرہ آفاق خوبصورتی کے کسے دلنواز نمونے تھے۔ اس کا لال بھبھوکا چہرہ ایسا لگتا تھا جیسے ارغوانی شراب سے بھرا ہوا کرسٹل (بلوّر) کا بنا ہوا جام۔ ان کے گہرے سہنری رنگت کے بال سونے کے چمکتے تاروں اور ریشم کے گچھوں کی طرح محسوس ہوتے تھے۔''۲۹

محمد یوسف ٹینگ کو در کے ساتھ رہنے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ اس خاکے سے خاکہ نگار کی قوتِ مشاہدہ اور بصیرت و بصارت کا اندازہ ہوجات ہے۔ وہ اپنے موضوع کے نہ صرف ظاہری خد وخال کی تصویر پیش کرتے ہیں بلکہ اس کے شعور و افکار اور نفسیاتی گوشوں کو بھی واضح کرتے ہیں۔ اپنے خاکہ کے ذریعے انہوں نے در کے کاموں، مشاغل، نظریات اور ان کے اوصاف کے ساتھ ان کی شخصیت کی کمزور پہلوؤں کو بھی سامنے لایا ہے۔ اس تعارفی خاکہ میں انہوں نے در کی سوانحی کوائف پیش کرنے کے ساتھ ان کے نظریات و افکار کی تصویر کشی کی ہے۔ در کی سیکولر سوچ کے وہ قائل نظر آتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

> ''مہاراجہ نے یادداشتوں پر غور کرنے کی غرض سے ایک اعلیٰ انگریز آفیسر بی۔ جے گلنسی کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا۔ در کشمیری پنڈتوں کے نمائندے نامزد ہوئے۔ یہ کشمیری پنڈتوں کی رائے عامہ سے ان کا آخری مصافحہ ثابت ہوا۔ در نے خود لکھا ہے اور خود مجھ سے بھی کہا ہے کہ جب مختلف فرقوں کی شکایات اور مطالبات پر غور کرنے کا مرحلہ آیا تو انھوں

نے اپنے آپ کو کشمیری پنڈتوں کی اپنی مرتب کردہ یدداشت سے وہ منصف مزاج انگریز سربراہ کی سوچ کے قریب پہنچ گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ان پر یہ بات آشکار ہو گئی کہ پنڈت تو مقابلے میں بڑے مزے میں ہیں۔لیکن ملک کی اکثریت یعنی کشمیری مسلمان ہر لحاظ میں مصیبت زدہ اور مظلوم ہیں۔''۳۰

محمد یوسف ٹینگ کے انداز میں منجھے ہوئے خاکہ نگار کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ان کا انداز بیان سادہ اور دلکش ہے۔متعلقہ شخصیت کی مرقع نگاری اس انداز سے کرتے ہیں کہ اس کے تمام اوصاف و محاسن نمایاں ہو جاتے ہیں۔اللہ رکھا ساغر پر لکھا ہوا ایک خاکہ دلچسپ ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''میں نے موٹے شیشے کی عینک پہنے ہوئے ایک قد دراز چھریرے بدن آدمی کو دیکھا۔سر پر قراقل،شیروانی زیب تن اور چہرے پر ایک عجیب متانت کن رعونت۔ساغر صاحب کے فرزند وہاں کاغذ کا کاروبار کرتے ہیں۔کوٹھی کے باہر ایک دوکان میں کاغذ کے کچھ بنڈل آئے۔ساغر صاحب کا کبھی کوٹھی کے اندر دل اوب جاتا ہے تو وہ دکان پر جاتے ہیں۔لیکن وہ کاروبار میں نہیں اُلجھتے۔''۳۱

وہ اپنے مخصوص انداز اور طرز تحریر کے ذریعے اپنے موضوع کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں جس طرح مجسمہ ساز پتھر کے ٹکڑے سے مجسمے کے خد و خال اور جسم کو تراش کر بناتے ہیں۔ظاہری جسامت و خد و خال اور اندرونی احساسات ان کو اس انداز میں سامنے لاتے ہیں جس طرح خودکار کیمرے میں صورت capture کیا جاتا ہے۔

ٹینگ ادب کے مختلف شعبوں میں اپنا کمال دکھا چکے ہیں۔ان کا شمار ریاست جموں و کشمیر کے ممتاز اور باذوق ادیبوں اور محققوں میں ہوتا ہے۔وہ بیک وقت ایک بہترین نثر نگار اور کہنہ مشق صحافی ہیں۔انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے اپنے معاصر ادبی شخصیات کے قلمی چہروں (خاکے) لکھے ہیں۔اپنے مشاہدات و تجربات،بصیرت و بصارت،تخلیقی صلاحیت اور وسعت علمی سے خاکہ نگاری کے وسیع کینوس کے تمام لوازمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے ادبی شخصیات کی قلمی تصویر کشی کی ہے۔عام فہم اور سادہ زبان میں تحریر کردہ ان کے خاکوں میں ظرافت و لطافت کی چاشنی پائی جاتی ہے۔جس سے خاکہ کے حسن میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔اور انداز بیان میں دلکشی اور خوبصورتی پائی جاتی ہے۔

شمیم احمد شمیم: شمیم احمد شمیم کا تعلق کشمیر کے ایک دور افتادہ گاؤں آ رشوپیان کے ایک علمی ورخانہ ان سے تھا۔ان کے دادا قا ی کے مبلغ تھے۔ان کے والد نے قا ی کو ترک کر لیا۔جس کی وجہ سے انہیں گاؤں سے نکال دیا گیا۔شمیم ایس۔پی کالج سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصے تک فکر معاش میں سرگرداں رہے۔پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔کشمیر لوٹنے کے بعد کشمیر کی سیاسی حالات کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔اپنی صلاحیت وقابلیت کے بل بوتے پر اپنی ایک پہچان بنالی۔اور سیاسی حلقوں میں رسائی حاصل کر لی۔بہت جلد ہی بخشی غلام محمد کے قریب آ گئے۔جنھوں نے شمیم کو سرکاری رسالہ ''تعمیر'' کی ادارت سونپی۔جہاں پر ان کی صحافیانہ صلاحیتوں کو جلا ملی اور ایک قلیل عرصے میں صحافت میں اپنا نام ومقام پیدا کر لیا۔کئی اخبارات اور رسائل سے منسلک رہے۔وہ ایک بے باک اور نڈر صحافی تھے اس لیے حکمران وقت کے خلاف اور ان کے غلط کاموں کا پردہ فاش کرنے سے کبھی نہیں جھجکتے تھے۔جس کی پاداش میں انہیں ''تعمیر'' سے الگ کیا گیا۔انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کی سرپرستی میں پارلیمنٹری الیکشن میں آزاد امیدوار کے طور پر انتخاب لڑی۔پارلیمنٹ میں وہ پہلا کشمیری ممبر تھا جو کشمیری عوام کے مسائل کے لیے احتجاج کرتے تھے۔ایمرجنسی کے دوران اندرا گاندھی کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔یہاں بھی ان کے مخالفین نے انہیں ستانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔اپنی حق گوئی اور بے باکانہ روش سے۔ جب میدان سیاست میں ان کے حریفوں کی سازشیں حد سے بڑھنے لگی تو انہوں نے سیاست کو خیرباد کہہ کر میدان صحافت کو اپنالیا اور 1964ء میں ہفتہ وار اخبار ''آئینہ'' جاری کیا۔''آئینہ'' اپنے دور کے تمام مسائل کی آئینہ داری کرنے میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔اس اخبار کے ذریعہ وہ ملک وریاست کی سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی اور عوامی مسائل کو ابھر تیر ہے۔اس اخبار کے بارے میں شمیم احمد شمیم یوں لکھتے ہیں۔دیکھئے:

> ''آئینہ میری دیرینہ خواب کی تعبیر ہے'' چونکہ آئینہ ایک خاص مقصد کے لیے جاری کیا گیا تھا۔روپیہ کمانے لے لیے نہیں۔اس لیے ابتدا سے ہی اس کا ایک خاص مزاج بن گیا تھا۔''۳۲

جلد ہی ''آئینہ'' نے ریاست کے حدود سے نکل کر پورے ہندوستان میں شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی۔اس

اخبار نے اس وقت کے ادبی و سیاسی حلقوں میں ہلچل مچا کے رکھ دی۔ ان کی صحافتی ذہانت نے طنز و مزاح سے بھر پور تلخ وتند داور شیرین ولہجہ کا ایسا امتزاج قائم کیا کہ پڑھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس ادبی پرچہ میں خاکہ نگاری اور انشائیہ دازی کے لیے ایک جگہ مختص تھی۔ اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ ''آئینہ'' کے ذریعہ ان کی انشائیہ دازی، مضمون نویسی اور خاکہ نگاری کی صلاحیت ابھر کر سامنے آ گئی اور خاکہ نگاری کے اعلیٰ نمونے منظر عام پر آنے شروع ہو گئے۔ شمیم احمد شمیم نے بہت کم عمر میں سیاست میں اپنا مقام بنالیا تھا۔ وہ فرد آشنا بھی تھے اور سماج کے نبض شناس بھی۔ وہ سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اردو میں لکھنے کا ان کا ایک الگ اسلوب اور مزاج ہے۔ اس رسالہ میں انہوں نے بہت سے بہترین خاکے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ وہ ''آئینہ'' میں شخصیت نمبر نکالا کرتے تھے۔ جس میں ریاست اور بیرون ریاست کے سیاسی و ادبی شخصیات کے خاکے لکھا کرتے۔ معروف و غیر معروف دونوں طرح کی شخصیات کو اس میں جگہ ملتی تھی۔ جن سے ان کے مراسم تھے یا جن سے منفی یا مثبت انداز میں وہ متاثر ہوتے۔ ان کی بے وقت موت کے بعد 1969ء سے ''آئینہ'' بند ہو گیا۔ ان ادبی چوں کو ان کی بہن قرۃ العین نے آٹھ جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ اور خاکوں کے مجموعے کو ''آئینہ: شخصیات نمبر'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ جس میں لگ بھگ ۲۷ مشاہیر کے خاکے شامل ہیں۔

شمیم احمد شمیم کو خاکہ نگاری کے فن میں کمال حاصل ہے۔ ان کے خاکوں میں متعلقہ شخصیت کی ہو بہو تصویر سامنے آتی ہے۔ انہوں نے جن اشخاص کا بھی خاکہ لکھا ہے، ان میں نامی گرامی سیاستدان، ادیب اور غیر معروف شخصیات بھی شامل ہیں۔ وہ خاکہ کشی کرتے وقت ہمیشہ متعلقہ شخصیت کے کردار کے انسان کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ وہ انسان کو صرف انسان کے روپ میں پیش کرتے ہیں نہ کہ فرشتے کے روپ میں۔ شمیم احمد شمیم کے فن خاکہ نگاری کے متعلق ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

> ''اچھا خاکہ وہی ادیب لکھ سکتا ہے جو غیر معمولی طور پر ذہین، حساس، باشعور، دانشور، انسان دوست اور انسانی نفسیات کے ماہر ہونے کے ساتھ فکر و شعور کی سطح پر اس میں ایک دانشورانہ آن بھی ہو۔ یہی نہیں وہ ایک گہرا سماجی سیاسی شعور بھی رکھتا ہو۔ تخلیقی جوہر کا مالک ہو اور اسے زبان پر نہ صرف غیر معمولی قدرت حاصل ہو بلکہ صاحب طرز بھی ہو۔ خاکہ نگار کسی شخصیت کو ہمارے سامنے پوری طرح بے نقاب تو کرتا ہے لیکن اس طرح کہ اس شخصیت کی حرمت اور

احترام بھی باقی رہتا ہے۔ اور ہمیں تمام خرابیوں کے باوجود اس شخص سے ہمدردی سی پیدا
ہوجاتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اچھا خاکہ لکھنے کے لیے ادیب میں جو صلاحیتیں ہونی
چاہئیں، وہ سب ان میں تھیں۔''۳۳

وہ نہایت بےباک نڈر اور خود اعتماد شخصیت کے مالک تھے۔ اس لیے آنکھوں سے جو کچھ دیکھا، محسوس کیا اور دل میں جو بات آئی بےخوف لکھ دی۔ اس بات کا وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ وہ منہ فٹ اور بڑا بدزبان ہیں، وہ کبھی کسی کے بارے میں کچھ بھی لکھ دیتے ہیں اس سے متعلقہ شخصیت کی تمام پہلوؤں اجاگر ہوجاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ کسی کی کردارکشی کرتے وقت نہایت تلخ زبان استعمال کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی کچھ ایسی باتیں لکھ دیتے ہیں کہ ان کی ساری بدزبانی کی تلافی ہوجاتی ہے۔ ادب کے پیرائے میں سخت وسست کہنے کا ہنر انہیں آتا ہے۔ جس سے ان کی صداقت پسندی اور صاف گوئی کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ انہوں نے خود اپنا بھی ایک خاکہ ''شمیم صاحب'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے آپ کو مختلف رنگوں کے آمیزش میں پیش کیا ہے۔ جس میں انہوں نے اپنی ذات، داخلی کیفیات وفطرت کو عیاں کیا ہے اور ظاہری خد وخال کی بھی مرقع کشی کی ہے۔ یہ ان کا ہی کمال ہے کہ وہ جس پیمانے پر دوسروں کے قلمی خاکے کھینچتے ہیں بالکل اسی پیمانے اور انداز میں اپنا خاکہ پیش کیا ہے۔ ان کی صاف گوئی اور صداقت پسندی ہے کہ اپنی نہ کوئی تعریف نہ کوئی خوبی بیان کی ہے بلکہ انہوں نے اپنی ذات وفطرت کے مختلف گوشوں بشمول اپنی خامیوں، کمزوریوں اور نفسیاتی پہلوؤں کو کھل کے بیان کیا ہے۔ خاکہ کی شروعات اپنے لیے بڑے سخت الفاظ سے کرتے ہیں۔ اقتباس پیش خدمت ہے:

''وہ بڑا بے ایمان ہے''
''وہ ایک نمبر کا فراڈ ہے''
''وہ باتوں کا سوداگر ہے''
''وہ بڑا منہ فٹ اور گستاخ ہے''
''شمیم احمد شمیم کے متعلق بہت دیر تک ایک ہی رائے پر قائم رہنا مشکل ہے۔ اس کی شخصیت بیک وقت اتنی متضاد اور مختلف کیفیات کی حامل ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والے کو ہر قدم پر اپنی رائے میں ترمیم اور تصحیح کی ضرورت محسوس ہوگی۔''۳۴

اپنا سراپا نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بی اے پاس کر کے جب اُس نے سری نگر کے ایس، پی کالج میں داخلہ لیا تو اس کی وضع قطع اور گفتگو کا انداز اور طور طریق دیہاتیوں کا سا تھا۔ سخت اور کھردرے بالوں والا یہ دبلا پتلا اور منحنی لڑکا اکثر ایک ہی سوٹ پہنے کالج آتا۔ اس کے چہرے سے افلاس، اس کے لباس سے بے چارگی اور اس کی چال ڈھال سے ایک عجیب بے ہنگم پن ٹپکتا۔''۳۵

آئینہ کے ''شخصیت نمبر'' میں انہوں نے کشمیر کے نمائندہ سیاستدانوں جیسے شیخ محمد عبداللہ، مرزا محمد افضل بیگ، خواجہ غلام محمد صادق، مولانا مسعودی، مولانا محمد فاروق، سید میر قاسم، محی الدین قرہ کے علاوہ مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے خاکے لکھے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے قائدین اور عوامی نمائندوں کے بھی خاکے لکھے ہیں۔ جن کے بارے میں ممکن ہے ہم نے سنے تو ہونگے لیکن ان کی سیاسی اور سماجی کارناموں اور سرگرمیوں سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ کچھ ایسی شخصیات کے بھی خاکے ہیں ہیں جن کے نام اور کارنامے دونوں سے ہم واقف نہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کشمیر کے کئی شاعروں اور ادیبوں کے بھی خاکے لکھے ہیں۔ ان میں بنسی نردوش، حاجنی صاحب، دینا ناتھ نادم وغیرہ کے خوبصورت خاکے ہیں۔ شمیم احمد شمیم چونکہ ایک نبض شناس صحافی تھے اس لیے وہ انسانی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں۔ جو ایک کامیاب خاکہ نویس کی کامیابی کا ضامن ہے۔ یہی وجہ ہے انہیں اس فن میں کمال حاصل ہے۔ مختلف طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والی مختلف شخصیات کی انہوں مرقع کاری کی ہے۔ ہر ایک کو اس کے فکر و فن کے میزان پر تولا ہے۔ غرض ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے ہر نوع کی شخصیات پر شمیم احمد شمیم نے خاکے لکھے۔ ان تمام شخصیات سے راست یا بالواسطہ مصنف کے مراسم تھے۔ اور جس کو جیسا پایا انہوں نے ویسا ہی پیش کیا ہے۔ مصنف اپنے خاکہ نگاری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ خاکے نہ سوانح حیات کا درجہ رکھتے ہیں اور نہ عدالتی فیصلوں کا۔ اُن میں افراد کے کارناموں سے زیادہ ان کی شخصیت اور کردار کی ان نمایاں خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن کو میری نگاہ میں اُن کے عناصر ترکیبی کی حیثیت حاصل ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں میری پسند ناپسند کا عمل دخل رہا ہوگا''۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے ایمانداری سے لکھا ہے۔ لیکن ایمانداری بھی ایک اضافی قدر ہے اور اس لیے مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ ہر

فرد کے متعلق میری رائے بالکل صحیح اور میرا بالکل تجزیہ ایماندارانہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض شخصیات کے بارے میں، میں نے ذہنی تشدد کا مظاہرہ کیا ہو۔ اس کے بہت سے سیاسی اور نفسیاتی اسباب ہیں۔ 1964ء سے 1965ء تک کا زمانہ میرے لیے بغاوت بھی اور بیزاری کا زمانہ تھا۔ اور میں ہراس بت کو توڑنے کے لیے کوشاں تھا کہ جس کو بخشی صاحب کے دورِ استبداد میں اقتدار کے مندر میں جگہ مل گئی تھی اور اسی لیے اس دور کے بہت سی شخصیات کے متعلق میرا رویہ بے حد جارحانہ بلکہ دشمنانہ تھا۔ لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ نئے دور کے فرعون پرانے دور کے فرعونوں سے زیادہ مخلص نہیں۔ ان میں صرف سٹائل کا فرق ہے۔''۳۶

شمیم احمد شمیم نے اپنے زورِ قلم سے متعلقہ شخصیات کی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ جس سے ان شخصیات کی ظاہری خد و خال کے ساتھ ان کی داخلی کیفیات، فطرت، اور جذبات بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جہاں وہ متعلقہ شخصیت کی انسانی خوبیوں کو سامنے لانے میں تعصب سے کام نہیں لیتے وہیں وہ پس پردہ اس کی کوتاہیوں اور لغزشوں سے چشم پوشی بھی نہیں کرتے۔ مثال کے لیے خواجہ غلام محمد صادق پر لکھے گئے۔ خاکہ سے ایک اقتباس دیکھیے:

''صادق صاحب کے قریبی ترین ساتھیوں کا کہنا ہے کہ وہ بے حد شریف، با اخلاق، وضع اور بھلے مانس آدمی ہیں لیکن شفقت، مروت اور محبت کے جذبات سے عاری، صادق صاحب کا کہنا ہے کہ ''میں اداکاری اور ظاہرداری کا قائل نہیں ہوں۔ اسی لیے اپنے جذبات کی نمائش نہیں کرتا'' میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ صادق صاحب کی شخصیت میں وہ آنچ نہیں جو دوستی اور محبت کے لیے بے حد ضروری ہے اور اسی لیے ان کی محبت اور دوستی پر بھی ظاہرداری کا گمان ہوتا ہے۔''(۳۶)

شمیم کے خاکوں کا اسلوب نہایت بے باکانہ لطافت سے بھرپور ہوتا ہے۔ ان کے خاکوں کی زبان و بیان اور انداز تحریر اور لب و لہجہ میں علی گڑھ کی ادبی و تہذیبی زبان کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی تلخ و تند بات بھی لکھتے ہیں تو اس میں بھی شائستگی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ خاکہ ''کار صاحب'' میں موصوف کی لغزشوں اور کوتاہیوں کا

ذکر کس شائستگی سے کرتے ہیں□ حظہ فرما □ :

''کارصا □ کے جوش □ وش، □ بۂ عمل، عقائ□ کی صحت اور ان کی صلاحیتوں کا □ ازہ کر کے انہیں نیشنل کا□نس میں سنجیدگی سے لیا جانے لگا۔ ۱۹۵۱ء میں انہیں سوپور سے آ □ ساز اسمبلی کا ممبر قرار □ □ ۔ اس کے بعد وہ سوپو□ ون □□ کمیٹی کے چیئر مین ہوگئے ۔ اس کی چئیر □ کا دوران کے لیے فائ□ ہ مند اور اہل سوپور کے لیے تکلیف دہ (نقصان دہ) □. □ ہوا ۔ کو□ ٹیو سے بھی ان کا تعلق اہل سوہور کے لیے فائ□ ہ مند □. □ نہ ہوا۔ مختصراً یہ کہ تجارتی اور انتظامیہ عمور میں وہ نسبتاً کم کامیاب رہے ۔ ۱۹۵۳ء میں وہ شیر کشمیر□ فدا ہوتے ہوتے رہ گئے ۔ بعض مقربین خاص کا کہنا ہے کہ انہیں شیخ صا □ کی □ فتاری کا اتنا قلق ہوا کہ بہت دنوں □ گھر سے□ ہر ہی نہ آئے۔ (ان کے دشمنوں کا کہنا ہے کہ روپوش تھے)۔''۳۸

کشمیر کے ا□ افسانہ نگار بنسی □ دوش کا خاکہ جس □ از میں لکھا ہے ۔ اس سے ان کی لطافت گوئی کا □ ازہ ہوجا□ ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''آپ □ کسی محفل میں جا □ اور وہاں □ ٹے سے قد کا میلا، کچیلا، سوکھا مریل سا □ ن گلا پھاڑ پھاڑ کے □ رہا ہو تو سمجھ □ چاہئے کہ یہ بنسی □ دوش ہے۔ □ آپ شہر کے کسی قہوہ خانے میں کسی میز کے □ د چھ سات آدمیوں کو ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھا ہوا دیکھ لیں تو آپ کو جان □ چاہئے کہ اس میز کے کسی کونے میں □ دوش بیٹھا ہوا کوئی قصہ کہانی بیان کر رہا ہوگا۔ آپ □ کسی ادبی محفل میں کسی □ ن ادی□ کے چہرے کو غیر معمولی □ ر□ ھاؤ اور احساس کی پوری شدّت کے ساتھ افسانہ □ ڑھتے ہوئے دیکھ لیں تو وہ بنسی □ دوش ہوگا۔ □ کبھی ر□ یو اسٹیشن جانے کا اتفاق ہو اور کسی کمرے میں میز □ جُھکا ہوا کوئی آدمی منہ بسور کر لکھنے میں مصروف □ آئے، تو وہ بنسی □ دوش ہوگا، کیو□ . □ وہ لکھنے بیٹھتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ شد□ قبض کی شکا□ رفع کرنے کے لیے اپنی ساری قوتِ اداری سے کام لے رہا ہے۔''۳۹

شمیم احمد شمیم اپنے منفرد اور دلنشین □ از و بیان اور خوبصورت تح□ وں سے قار□ کے ذہن و دل کو متا□ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ انہوں نے □ □ کے چوٹی کے سیاستدانوں، ادیبوں اور سماجی کارکنوں کو اپنے طنز و مزاح کا

□ نہ □ ۔ان کے قلم سے کوئی بھی نہ بچ□ ۔شمیم سماج کے □ □پ ہاتھ رکھ کے اس میں موجود سقم کی نہ صرف □ ہی کرتے ہیں بلکہ اسکا ممکنہ علاج بھی تجو□ کرتے ہیں ۔شا□ یہی وجہ ہے کہ شمیم کی تحا□ ہر طبقہ اور مکتبہ فکر کے عوام و خواص میں مقبول ہیں ۔□ □ کے سابق وز□ اعلیٰ خواجہ غلام محمد صادق کے سیاسی کا□ موں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سیاسی میدان میں انھوں نے اپنے حریفوں کو ہر ہر قدم □ کوں چنے چبوائے'لیکن میدان □ میں ہر فتح نے انہیں اپنی شکست سے قری□ کر□ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں اپنی ''فتوحات'' کی دیکھ□ ل کا سلیقہ نہیں آ□ ۔ای□ □ منسٹر کی حیثیت سے انھوں نے جس □ ہل ،تغافل اور لا□ واہی کا مظاہرہ کیا ہے ۔اس نے انتظامیہ میں کرپشن □ نظمی □ □ □ اور بے راہ وری کو غیر معمولی فروغ □ ہے۔اس طرح صادق صا □ نے ی□ بات □ □ کر دی ہے کہ بے عمل آدمی کے لیے شرافت ،شائستگی اور روشن دماغ□ پاؤں کی زنجیر بھی بن سکتی ہے۔ان کی جن صلاحیتوں نے سیاسی ز□ گی میں انہیں عزت اور وقار بخشا تھا۔انتظامیہ میں ان کی رسوائی اور □ می کا□ □ بن گئی ہیں ۔اور ستم ظریفی یہ کہ صادق صا □ □ کچھ جا □ اور سمجھتے ہوئے بھی بے بس ہیں ۔اور یہی ان کی ز□ گی کا المیہ ہے۔''[۲۸]

شمیم احمد شمیم کو شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ سے خلوص و محبت تھی ۔انہیں احساس تھا کہ شیخ محمد عبداللہ نے ساری ز□ گی □ ستی عوام اور کشمیر کے لیے وقف کیا ہے ۔بے شمار قر□ □ ں دی ہیں ۔جس کے□ □ انہیں بہت سی مشکلات کا سامنہ کر□ پڑا ۔لیکن انہوں نے کبھی کوئی شکوہ شکا□ نہیں کی ۔اقتدار کے حوس میں □ ستی سیا □ کے اُفق □ □ دش کرنے والے حکمرانِ وقت نے انہیں تمام قسم کی اذیتیں دی لیکن عوام کی محبت انہیں ہمیشہ حاصل رہیں ۔شمیم نے شیخ محمد عبداللہ کا ای□ خاکہ لکھا ہے ۔جس میں انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کے □ یت و افکار اور سر□ میوں □ روشنی ڈالی ہے۔اقتباس □ حظہ ہو:

''کشمیر کے حسین اور خوشگوار مستقبل کا خواب ۱۹۴۷ء کے □ ر □ فیصلہ کا جواز تھا اور ۱۹۵۳ء کا انقلاب اسی خواب کے ٹوٹنے کا نتیجہ تھا ۔میں یہاں شیخ صا □ کی دانشمندی اور عاقبت □ یشی کی □ ت نہیں کر رہا ہوں ۔ای□ عاشق کی محبت اور مایوسی کا تجزیہ کر رہا ہوں ۔۱۹۵۳ء

سے لے کر اب تک کتنے ہی ایسے مواقع آئے کہ شیخ صاحب اپنی ضد چھوڑ کر وہ کچھ حاصل کر سکتے تھے کہ جس کو حاصل کرنے کے لیے بہت سے لوگ اپنے ضمیر اور خودی کو بیچنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، لیکن وہ آج سے بے نیاز اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ رہے ہیں کہ جو حقیقت کی سرحدوں سے دور۔ بہت دور۔ عالمی سیاست کے اس بھنور میں پھنس گئے ہیں کہ جہاں اس سے پہلے کئی خوابوں کے جزیرے ڈوب چکے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ محمد عبداللہ نے نامساعد حالات اور ناموافق حالات کے سامنے ہتھیار ڈال کر فرار کی راہ اختیار کر لی ہے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن جو لوگ ان کی سیاسی نبض کی رفتار اور اتار چڑھاؤ سے واقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ خاموشی ایک تجاہل عارفانہ ہے۔ اور یہ کسی طوفان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی موت کے بعد بھی بہت دنوں زندہ رہیں گے۔ اور ان کا کشمیر کے سیاسی افق سے غروب ہونا اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر نظر آ رہا ہے۔‘‘[۲۱]

وہ جب بھی کسی کی خاکہ کشی کرنے کے لیے قلم کاغذ سنبھالتے ہیں تو یہ کوشش رہتی ہے کہ متعلقہ شخصیت کو بحیثیت انسان ابھاریں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بنائے ہوئے کینواس پر متعلقہ شخصیت کی حقیقی تصویر ابھرتی ہے۔ اس میں جہاں اس شخصیت کی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں وہیں اس کی کمزوریاں بھی آشکار ہو جاتی ہیں۔

خاکہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ اس میں خاکہ نگار کو نہ صرف ظاہری خد وخال کی تصویر کشی کرنی ہوتی ہے بلکہ اس کے باطنی گوشوں کو بھی سامنے لانا ہوتا ہے۔ یعنی جسمانی خد وخال اور چہرے کی تصویر کشی کے ساتھ باطنی کردار کی نقاب کشائی بھی کرنی ہوتی ہے۔ شمیم احمد شمیم نے اپنے خاکوں میں متعلقہ شخصیات کی ہر دونوں پہلوؤں کو آشکار کیا ہے۔

ج: 1980ء سے تا حال

آنکھیں ترستیاں ہیں: ''آنکھیں ترستیاں ہیں'' پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب 1981ء میں موڈرن پبلشنگ ہاوس نئی دہلی سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس مجموعے میں مصنف کے مختلف واقعات و حالات میں لکھے گئے خاکے شامل ہیں۔ ان خاکوں سے مصنف کے ادیبوں و شاعروں کے تئیں خلوص و محبت اور عقیدت کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس کتاب میں مختلف ادبی شخصیات پر لکھے گئے ۲۲ خاکے شامل ہیں۔ جن میں رنجیب آئی۔ دی، صلاح الدین احمد، شاعر علامہ اقبال، تلوک چند محروم وغیرہ پر لکھے گئے خاکے اہم ہیں۔

خاکوں کے متعلقہ شخصیات ادیب و شاعر ہیں جن سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو عقیدت و محبت تھی۔ اور وہ ان لوگوں سے کہیں نہ کہیں متاثر تھے اور مصنف کی شخصیت کی تشکیل تعمیر میں ان شخصیات کا اہم رول ہے۔ ان خاکوں کے ذریعے سے اپنے تاثرات و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں جتنے بھی مشاہیر کے خاکے شامل ہیں وہ اردو ادب غیر معروف تو نہیں ہیں۔ لیکن پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اپنی ذاتی و قریبی تعلقات و وابستگی اور تاثرات سے ایسی تصویر کشی کی ہے کہ ان مشاہیر کے متعلق بے شمار ایسے واقعات و حالات آشکار ہو جاتے ہیں جو کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتے اور جس سے متعلقہ شخصیات کی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں عیاں ہو جاتی ہے۔ یہ تمام خاکے انہوں نے ان اشخاص کی وفات پر تعزیت کا اظہار کرنے یا ان کی جدائی کے درد کے اظہار کے لیے قلمبند کیے ہیں۔ اس کتاب میں اولاً تو ہر خاکے میں دو اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔ اول خاکہ نگار کی دلی کیفیات و احساسات دوم متعلقہ شخصیات کی حالات زندگی، داستان حیات، فن، ادبی کارنامے، تحریکات اور نظریات۔ ان خاکوں کی وجہ تحریر کے متعلق کتاب کے 'حرف اول' میں وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ مختصر سی کتاب 'آنکھیں ترستیاں ہیں' میری یادوں کی داستان کا ایک ورق ہے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ یہ میری داستانِ حیات کا ایک ورق ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس داستان میں جن شخصیتوں کا ذکر آیا ہے۔ ان کے ساتھ میرا تعلق خاطر ایک ساتھ نہ تھا اور ہو بھی ہیں سکتا تھا۔ لیکن ان سب نے میری زندگی کو کسی نہ کسی طرح ضرور متاثر کیا ہے...... یہ مقالات (دو ایک کو چھوڑ کے) جو ان تمام حضرات کی موت کے بعد میں نے لکھے ایک طرح سے اپنی زندگی

کے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش ہیں۔ جو یہ ہم سے ان عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں کے یکے بعد دیگرے اٹھ جانے سے وسیع تر ہوتا گیا ہے۔''۴۲؎

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو شاعری و نثر نگاری دونوں میں قدرتِ کاملہ حاصل ہے۔ چونکہ ان کا میدان شاعری عشق ہے۔ اس لیے نثر میں بھی شاعری کی شیرینی و چاشنی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان خاکوں میں انہوں نے متعدد جگہوں پر شاعری کا بھی سہارا لیا ہے۔ جس سے تحریر کی خوبصورتی میں اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو شاعری و نثر نگاری دونوں میں اردو کے مشہور شاعر تلوک چند محروم اور نجیب آبادی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے کا شرف اور افتخار حاصل ہے۔ جب جگن ناتھ آزاد بی اے پاس کر کے لاہور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے آئے تو اس شہر کی ادبی و علمی فضا نے ان کے ذہن و فکر اور شخصیت پر گہرے نقوش چھوڑا۔ یہاں انہیں ادیبوں، شاعروں اور اردو ادب کے معتبر بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ ایسے ہی ایک معتبر شخصیت مصنف کے استاد مولانا تاجور نجیب آبادی ہیں۔ جن کے متعلق مصنف کا کہنا ہے کہ ''والد محترم کے بعد جس شخصیت کا زیادہ سے زیادہ اثر میری طبیعت اور میرے مزاج نے قبول کیا ہے تو وہ مولانا کی شخصیت ہے۔'' یہی وجہ ہے مصنف نے مولانا سے اسی عقیدت کی بنا پر ان کے خاکے کو سرفہرست رکھا ہے۔ اس خاکہ میں انہوں نے تاجور نجیب آبادی سے اپنی عقیدت و محبت اور خلوص کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ خاکے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتی ہے:

> ''شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی میرے استاد تھے۔ اسکول یا کالج یا یونیورسٹی میں نہیں بلکہ ادبیات میں۔ مجھے اپنی شاعری اور نثر دونوں میں ان سے اصلاح لینے کا شرف حاصل ہوا۔''۴۳؎

مولانا کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''مولانا مرحوم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ ایک کثیر الجہت شخصیت تھے۔ اس وقت جب میں ان کے بارے میں بات کر رہا ہوں ان کی زندگی کے مختلف گوشے ایک فلم کی طرح میری نظر کے سامنے رواں دواں ہیں۔ اور میں حیراں ہوں کہ ان کی بھرپور شخصیت کے کس کس پہلو کا ذکر کروں۔ ان کی علمیت، ان کی زبان دانی، ان کی اصلاحِ سخن، اصلاحِ نثر، ان کا طنز و مزاح، ان کی کردار نگاری، شاعری، بذلہ گوئی، نثر نگاری، مکاتیب ۔۔۔۔۔۔ ان

تمام باتوں کے مختصر ذکر کے لیے بھی دفتر درکار ہیں۔ یہ وہ کہانی نہیں کہ باتوں باتوں میں سنا دی جائے۔ اردو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ اس کی خدمت کے لیے انہوں نے اردو مرکز قائم کیا۔ ''ادبی د'' کی بنیاد ڈالی۔ جہازی سائز کے چھیانوے صفحات پر اردو کا یہ ماہنامہ شائع ہوتا تھا۔ اگر چہ اس زمانے میں ''نیرنگ خیال'' کا طوطی بول رہا تھا۔ لیکن ''ادبی د''''نیرنگ خیال'' سے بھی کچھ آگے ہی نکل گیا۔ ''ادبی د'' کے بعد آپ نے ''شاہکار'' جاری کیا۔ بچوں کے لیے ہفتہ وار 'پریم'' نکالا' جس کے سرِ ورق پر بھارت ماتا کی رنگین تصویر کے اوپر یہ اشعار لکھے رہتے تھے:

بھارت ماتا ہم کی مائی	ہم ہندی ہیں بھائی بھائی
من میں بہا پریم کی گنگا	ہند و مسلم سکھ عیسا ئی ۴۴

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے 1937ء سے مولانا تاجور نجیب آبادی کے ساتھ تعلقات رہے اور آخری عمر تک محبت وعقیدت کا یہ رشتہ قرار رہا۔ ایک ایسے سیاہ ادبی دور میں جہاں اردو کو مسلمان اپنی زبان سمجھ کر غیر مسلم ادیبوں کی پذیرائی کے بجائے ان کی حوصلہ شکنی کرتے تھے، ایسے دور میں مولانا مرحوم اردو کی ترقی و ترویج کے لیے غیر مسلموں میں اردو کی مقبولیت کے خواہاں تھے۔ جس کے لیے وہ دامے، درمے، سخنے ہمیشہ سرگرم رہتے۔ اس دور میں مولانا کی کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے اس دور کا ایک دلچسپ واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ جس سے ایک مخصوص طبقے کی کوتاہ اندیشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''مولانا کے ہندو شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پنجاب میں بلکہ سارے ہندوستان میں اردو کی ترویج و اشاعت کے بارے میں مولانا مرحوم کا ایک خاص نظریہ تھا۔ اور وہ یہ کہ جب تک اردو ہندوؤں میں مقبول نہیں ہوگی اس کا کوئی مستقبل نہیں۔ ارود ہندوؤں میں اردو کو مقبول بنانے کے لیے مولانا نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ بدقسمتی سے یہ وہ دور تھا کہ بعض مسلّمہ حیثیت کے مسلمان حامیانِ اردو اپنے اس نظریے پر سختی سے قائم تھے کہ ہندوؤں کو اردو نہیں آتی۔ مجھے یاد نہیں آ رہا کہ مولانا ظفر علی خان کے اخبار 'زمیندار' میں میرے والد کے علاوہ کسی غیر مسلم اردو شاعر کا کلام شائع ہوا ہو۔ مولانا ظفر علی خاں نے اسی

زمانے میں یہ اشعار بھی کہے تھے:

ہیں وہ ہندو شعراء دشمنِ جانِ اردو — میٹنا چاہتے ہیں نام و نشانِ اردو

فارسی سے انھیں ضد ہے کہ جو ہے روحِ ادب — عربی سے انھیں کد ہے، ہے جو جانِ اردو

ٹ ہندی کا بنارس میں اٹھ کر چمکی — آر یہ ورت کی منڈی میں دکانِ اردو

چہ گن ہندی کا گاتے ہیں پاپ — جس سے چاندی ہوئی ان کی وہ ہے کانِ اردو

اس کا جواب مولانا ظفر علی خان کے استاد بھائی پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی نے ان اشعار میں دیا تھا:

ہے وہ مسلم شعراء دشمنِ جانِ اردو — جو مٹانے کو ہیں تیار نشانِ اردو

جو مٹانے کی جگہ میٹنا لکھ جاتے ہیں — روئے گی ان کی اس اردو پہ زبانِ اردو

دور اردو ئے معلا کرم سے ہے — ہم سے آئے گی بہار آئے گی زبانِ اردو [۴۵]

مولانا طبیعتاً بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج شخصیت کے مالک تھے۔ علامہ ظریف کے قلمی نام سے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس سوانحی خاکہ میں مصنف نے مولانا جو رنجیب آبادی کی داخلی زندگی کے بھی تمام گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''درد و گداز کا یہ پیکر، شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی اور طنز و مزاح کا بھی مرقع تھا۔ زبان کی بات تو خیر یہ تھی کہ باتیں کرتے تھے تو پھول جھڑتے تھے۔''[۴۶]

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو مرقع نگاری اور سراپا نگاری میں کمال حاصل ہے۔ وہ متعلقہ شخصیت کی اسکیچ Protrait کھینچنے میں طوالت سے احتراز برتنے کی کوشش کرتے ہیں اور کم لفظوں میں وہ متعلقہ شخصیت کا سراپا اور چہرہ اس کے سامنے لاتے ہیں۔ مثال کے لیے سجاد ظہیر پر لکھے گئے خاکے سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''یہ نوجوان سیّد سجاد ظہیر تھے۔ سر وزیر حسن مرحوم کے فرزند۔ نکھرا ہوا گورا، چٹا رنگ، کسا ہوا قد، مجھے ان کا یوپی کا شستہ لہجہ بہت بھلا لگا۔۔۔۔ کتنی عمدہ اردو وہ بول رہے تھے۔ جیسے کانوں میں رس گھول رہے ہوں۔''[۴۷]

ان خاکوں میں جہاں ان بزرگوں کی سوانحی کوائف، فن اور ادب سے واقف ہو جاتے ہے وہیں ان بزرگوں کی

زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ مختلف واقعات وحوادث جن کا اردو ادب کی تاریخ میں کہیں تذکرہ نہیں ملتا وہ اس کتاب میں دستیاب ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال اردو کے ایک نوجوان شاعر نریش کمار شاد کی دریائے جمنا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کا واقعہ ہے۔ نریش کمار شاد پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے دوست تھے اور وہ شاد کی شاعری سے کافی متاثر تھے۔ لیکن شاد نے کم عمری میں ہی دنیا کی غم دنیا سے نڈھال ہو کر خودکشی کر لی۔ جس کا مصنف کو ہمیشہ قلق رہا۔ خوشتر گرامی کو لکھے ہوئے اپنے مکتوب میں شاد کا خاکہ پیش کرتے ہوئے اور اس کے ساتھ اپنی مصاحبت کا ذکر کرتے ہوئے اس سانحہ کو بیان کیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

> ''شاد ایک ایسا فن کار تھا جس نے دنیا کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا تھا اور اپنی احتیاج کے باوجود دنیا سے اس نے نفرت کی تھی۔ شدید نفرت...... اس نے کسی کو اپنا دوست نہیں سمجھا تھا اور اس کا کوئی دوست تھا بھی نہیں۔ اس نے محبت بھی کی، عشق بھی کیا لیکن اس کا یہ عشق نفرت کی بنیادوں پر استوار ہوا...... اور ظالم نے خودکشی بھی کی کس وقت؟ رات کے دو بجے...... اور جمنا ندی میں چھلانگ لگا کر کہ جس دنیا سے اس نے ہمیشہ نفرت کی ہے اسے پتہ بھی نہ چلے اور وہ دنیا سے دور نکل جائے۔ صبح کو اس کی لاش ملی۔ کہتے ہیں کہ پہچاننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ پولیس کے ایک سپاہی نے پہچانا...... اور پوسٹ مارٹم کے بعد جب ارتھی چلی تو ساتھ کون لوگ تھے۔ صرف دو شخص جن کے بارے میں شاد کی زبان پر کبھی کلمۂ خیر نہیں آیا تھا...... محمود ہاشمی اور بلراج مینرا۔ محمود ہاشمی نے مجھے لکھنو میں بتایا کہ شمشان بھومی میں اس شخص کو جس کا کام مردوں کو جلانا ہے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ یہ نریش کمار شاد تھا تو اُس نے کہا کہ یہ تو میرے پاس بھی اکثر آیا کرتا تھا۔ مجھے اپنا کلام سناتا تھا اور مجھ سے شراب کے لیے روپیہ لے کر جایا کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے محمود ہاشمی اور بلراج مینرا سے شمشان بھومی کے لئے اجرت لینے سے انکار کر دیا! ۔ آخر شاعر کو ایک قدر دان تو ملا۔ زندگی کے بعد ہی سہی۔''۴۸

ایسا ہی واقعہ 'ادبی دنیا' لاہور کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد کی بے لوث خدمات اور قربانیوں کے بارے میں ہے۔ جنھوں نے اردو کی آبیاری کے لیے اپنی ساری جائداد لٹا دی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے جگن ناتھ آزاد رقمطراز ہیں:

''یہ تو بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اردو سے مولانا کا عشق کس قدر والہانہ صورت اختیار کر چکا تھا۔ 'ادبی دنیا' کو انہوں نے جس طرح مختلف ادوار میں زندہ وسلامت رکھا یہ انہی کی ہمت تھی۔ بیگم صاحبہ کے انتقال کے بعد وہ کسی حد تک دل گرفتہ رہنے لگے تھے اور اس دل گرفتگی کا اظہار ان کے بعض خطوط سے ہوتا ہے۔ جو انہوں نے مجھے لکھے۔ زندگی کے اس خلا کو انہوں نے بڑی حد تک عشق اردو کی بدولت پُر کر لیا تھا۔ اور ایک دن جب میں نے لاہور کے کسی اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ مولانا نے اپنی ساری جائیداد فروخت کر کے اردو فاؤنڈیشن کی نذر کر دی ہے۔ تو غائبانہ طور پر فرد عقیدت سے میرا سر اردو کے اس عاشق کے سامنے جھک گیا۔ اردو کی ساری تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اتنا بڑا ایثار اس زبان کے لیے کتنی ہستیوں نے کیا ہوگا۔ اور حیرت ہے کہ اس ایثار کا ذکر مولانا نے مجھ سے اپنے کسی خط میں نہیں کیا ...... میں اس درویش کے مزاج سے واقف ہوں۔''[۴۹]

اس مجموعہ میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ''محروم میرے والد'' کے عنوان سے اپنے والد تلوک چند محروم کا بھی ایک خاکہ لکھا ہے۔ اردو کے نامور شاعر تلوک چند محروم کے خاندان، پیدائش، ادبی زندگی، درس و تدریسی زندگی، علمی زندگی، داخلی وخارجی زندگی اور دلی جذبات و کیفیات غرض تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ آزاد نے کہیں بھی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ ایمانداری اور حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ چونکہ وہ محروم کی ذاتی زندگی سے واقف تھے۔ اس لیے انہوں نے محروم کی داخلی کیفیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جس سے موصوف کی زندگی کے نشیب و فراز پر روشنی پڑتی ہے۔ تلوک چند محروم کی جواں سالہ بیٹی (ودیا) نے سسرال میں ایک جھگڑے کی بنا پر خودکشی کر لی تھی۔ جس نے محروم کو دلبرداشتہ و دل شکستہ کر دیا تھا اور آخری عمر تک وہ زخم پر یشان رہے۔ وہ اپنے اس غم میں کسی کو شریک نہیں کرتے البتہ اپنے اشعار میں اس غم کو سمونے کی کوشش کرتے۔ مصنف نے اس ضمن میں بہت سے اشعار نقل کیے ہیں۔ ان میں سے بعض اشعار اس طرح ہیں:

شمشان کا رستہ دکھاتی ہے دنیا	افسوس اسی شمشان میں کھا کے گے پیں گیتو
مرنے پہ مجبور ہوئی مر گئی جل کر	ہم جینے پہ مجبور ہیں جل جل کے جئیں گے
دلِ بیتاب جلتا ہی رہے گا اس حدت سے	زوالِ عمر میں جو داغِ پنہاں دے گئی ودیا

جگر۔ ہے میرا آگ لگتی ہے کلیجے میں   تصور میں آتی ہے۔ جلتی ہوئی

۵۰

یہ خاکہ خاصا طویل ہے۔ آٹھ حصوں پر مشتمل اس خاکہ میں انہوں نے محروم کی حالات زندگی، ادبی کارنامے، شعر وشاعری، خانگی مسائل، ادبی تحریکات وسرگرمیوں، افکار ونظریات، زبان وبیان، عادات واطوار اور مشاغل غرض محروم کی بحیثیت والد، استاد، دوست اور شاعر کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔

الغرض اس کتاب میں جگن ناتھ آزاد نے اردو ادب کے اہم ہستیوں اور رگوں اور قلم کاروں کی یاد میں خاکے لکھ کر اس انداز میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ کہ ان شخصیات کے مخفی وعیاں کارنامے منظر عام پر آئے ہیں۔ انہیں زبان وبیان اور فن خاکہ نگاری پر مہارت حاصل ہے۔ ان خاکوں میں مصنف نے اپنی صلاحیت ولیاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے جس سے قاری محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہمارا ادب (شخصیات نمبر): (1985ء۔1986ء)

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز کی طرف سے جاری ہونے والا رسالہ ''ہمارا ادب'' نے ریاست میں اردو زبان کی بنیاد کو مستحکم بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس رسالہ کے ذریعہ نہ صرف ریاست کی مشترکہ تہذیب وتمدن کو فروغ ملا بلکہ ریاست اور بیرون ریاست کے ادیبوں، ادب نواز شخصیات اور تخلیق کاروں کو ایک پلیٹ فارم ملا ہے جس کے ذریعہ وہ اظہار خیال کرتے ہیں۔ اس کے مخصوص شماروں کی وجہ سے اس کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ جن میں مختلف ادبی موضوعات پر تحقیقی وتخلیقی مقالات شامل ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک اہم اور یادگار شمارہ ''شخصیات نمبر'' 1985ء تا 1986ء ہے۔ جس میں ریاست کے ادیبوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات اور رگوں کے سوانحی وشخصی خاکے لکھے ہیں۔ اس میں مختلف شخصیات اور مشاہیر کے پندرہ سوانحی خاکے شامل ہیں۔ ان شخصیات میں شاعر وادیب، فنکار وتخلیق کار، سیاستدان ومورخ غرض تمام لوگ شامل ہیں اور جنہوں نے خاکے لکھے ہیں وہ بھی ادب میں اپنا ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان میں محمد یوسف ٹینگ، موتی لال ساقی، مولوی محمد عبدالرحیم، رشید تاثیر، حاجی پریمی، نور محمد بٹ اور طاہری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس شمارے میں کئی ایسے خاکہ نگاروں کے تحریر

کردہ خاکے شامل ہیں جن کی خاکہ نگاری کے بارے میں اس باب میں پہلے بھی تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ اس لیے اس باب میں اُن خاکہ نگاروں کے خاکوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ جن کا ذکر اس سے قبل نہیں آیا۔ ان میں مولوی محمد ابراہیم، خوش دیو منی، ارجن دیو مجبور، مرزا غلام حسن بیگ عارف، غلام علی مجبور، سید رسول پونپر، بشیر اختر اور رشید تاثیر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولوی محمد ابراہیم: ان کا شمار ریاست جموں وکشمیر کے ایسے علماء میں ہوتا ہے جن کے دم سے جماعت اسلامی جموں وکشمیر اور ملت اسلامیہ کی جماعت مستحکم ہوئی اور ان کی زیر نگرانی کئی دینی وفلاحی کام کا انجام عمل میں آیا۔ اپنے دور کی سیاسی وسماجی صورت حال پر ان کی گہری نظر تھی۔ مذہبی وادبی میدان میں بھی انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ادب میں ان کے کارنامے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ انہوں نے علماء ومشاہیر ادب کے سوانح وشخصی خاکے لکھے ہیں۔ اس شمارے میں ان کے تحریر کردہ دو خاکے شامل ہیں۔ ایک خاکہ میر واعظ مولانا رسول شاہ کے متعلق ہے جبکہ دوسرا خاکہ محمد امین داراب پر لکھا گیا ہے۔

مولوی محمد ابراہیم کو زبان وبیان پر دسترس حاصل ہے۔ جس کا اندازہ ان کے تحریروں سے ہوتا ہے۔ ان کو مرقع نگاری اور قلمی تصویر کشی کا فن خوب آتا ہے۔ میر واعظ مولانا رسول شاہ کی سراپا نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا رسول شاہ میانہ قد کے ایک وجیہہ اور خوبصورت رنگ تھے۔ چہرے سے وقار اور سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ سر منڈا تھا۔ داڑھی کو خضاب کیا کرتے تھے۔ آپ کے زمانے میں لوگ حقّہ بیڑی، سگریٹ سے عموماً اجتناب کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا حقّہ کی تقریباً حرمت کے قائل تھے۔ اسلئے جدھر سے بھی گذر ہوتا لوگ حقّہ اٹھا کر مخفی جھگوں میں رکھا کرتے تھے۔ آپ کی مجلس میں انتہائی درجہ کی خاموشی ہوا کرتی تھی۔ لباس میں ایک شرعی پاجامہ اور سر پر سفید گول دستار پہننا زیادہ پسند کرتے تھے۔ محافلِ وعظ کے موقعہ پر کا مدار مائل بہ سبزی چوغہ جسم پر ہوتا تھا۔ موسم سرما میں پشمینہ کا دوشالہ اوڑھتے تھے۔''[15]

ان کے تحریر کردہ خاکوں میں متعلقہ شخصیت کے ظاہری خد وخال کے علاوہ عادات واطوار، ظاہری باطنی کیفیات اور نفسیاتی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ محمد امین داراب پر لکھے گئے خاکے میں موصوف کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

''مرحوم انتہائی خوددار اور قدیم طرز کے وضعدار شریف تھے۔ نہایت آن بان اور شان و

شوق کے ساتھ صاف ستھرے اور اعلیٰ لباس میں ملبوس رہا کرتے تھے۔ کشمیر کی روایتی طرز
اور وضعداری کا خاص خیال تھا۔ غالباً اس وجہ سے بھی کہ کشمیر میں بیسویں صدی کا نصف اول
میں مغربی تہذیب سے اتنا زیادہ قریب نہ تھا جتنا کہ آج مشاہدہ میں آرہا ہے اور پھر اس
وجہ سے بھی کہ ان کی فطرت ہی قدیم روش کی دلدادہ تھی اور پھر یہ کہ قدیم رہن سہن اور
تہذیب کی چھاپ ان پر شدید قسم کی گہری تھی۔ مختصر یہ کہ کشمیر کی روایتی اور آبائی تہذیب اور
طرز فکر ان کی … میں …ڑا ہوا تھا۔ اور اخیر میں مناظر قدرت اور سیر سپاٹے کے بے حد
شوقین تھے۔''۵۲

خوش دیومنی کا تعلق … کے صوبہ پونچھ سے ہیں۔ وہ اردو، پنجابی اور پہاڑی میں افسانے، ڈرامے اور مضامین
لکھنے کے علاوہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں چاندنی، عرفان، پہلا پتھر اور ڈھوک کی رات اہم ہیں۔
انہوں نے کئی خاکے لکھے ہیں جن میں آغا حسن حسرت کا سوانحی خاکہ اہم ہے۔ اس خاکہ میں مصنف نے آغا
حسن حسرت کی سوانحی کوائف، تعلیمی زندگی، صحافتی زندگی اور علمی و ادبی زندگی کے کئی گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس خاکہ
میں آغا حسن حسرت کا خاندانی پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مولانا آغا حسن حسرت کے والد کا نام لالہ کشمیر چند کپور اور دادا کا نام لالہ فقیر چند کپور
> تھا۔ جو تبت خورد میں سرکاری ملازم تھے لیکن لالہ کشمیر چند کپور عہد شباب میں مشرف بہ اسلام
> ہوئے تھے۔ اور اپنا اسلامی نام شیخ …رالدین رکھ کر اپنے وطن سے ہجرت کر کے تحصیل
> بارہمولہ کے گاؤں بمیار میں آگئے۔ یہاں شیخ صاحب نے جاگیر کٹھالی کے منشی حسن علی خان
> کی صاحبزادی سے شادی کر لی۔ ...... مولانا آغا حسن حسرت کی ولادت سن ۱۹۰۲ء میں
> جاگیر کھٹالی کے موضع بمیار میں ہوئی۔''۵۳

اس خاکے میں خوش دیومنی نے آغا حسن حسرت کی زندگی کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ جس سے
آغا حسن حسرت کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

بشیر اختر اردو اور کشمیری کے ایک محقق اور ادیب ہیں۔ وہ ریاستی کلچرل اکیڈمی کے اردو اور کشمیری دونوں شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اکیڈمی سے شائع ہونے والے درجنوں ادب پاروں کی شیرازہ بندی اور ان کی تشہیر میں اُن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مختلف صنف میں ان کے مضامین مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوکر دادِ تحسین پا چکے ہیں۔ اس شمارے میں ان کا تحریر کردہ ایک سوانحی خاکہ شامل ہے۔ جو ریاست جموں وکشمیر کے مشہور شاعر عبدالقدوس جو ادبی دنیا میں رسا جاودانی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان پر تحریر کردہ ہے۔ مصنف نے اس سوانحی خاکہ میں رسا جاودانی کے خاندانی پس منظر سے لے کر ان کی آخری عمر تک کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں ان کی ذاتی وخانگی زندگی گھریلوی صورت حال، خاندانی پس منظر، اولاد، ادبی وعملی زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کی آئینہ داری ہوجاتی ہے۔ اگرچہ یہ ایک سوانحی خاکہ طوالت کی وجہ سے خاکہ کم سوانح عمری زیادہ لگتی ہے۔ ایک ماہر مصور کی طرح بشیر اختر رسا جاودانی کی مرقع کشی کرتے ہوئے ان کی قلمی تصویر کچھ اس طرح سے پیش کرتے ہیں:

> ''میانہ قد ...... داڑھی مونچھ سے صفا چٹ چہرہ۔ سر پر برف جیسی سفید کسی ہوئی دستار۔ بھرے بھرے گالوں پر عام پہاڑی لوگوں کی طرح کشمیر کے مشہور عنبری سیب کی سی لالی اور ادا میں یگانہ شان اور سلوک کی گھمبیرتا۔ میں نے رسا جاودانی کو ایک بار کلچرل اکادمی کی ایک محفل مشاعرہ میں دیکھا تھا۔'' ۵۴

رشید تاثیر کا شمار ریاست کے ممتاز محققین میں ہوتا ہے۔ ان کا نہایت اہم کارنامہ ''تحریکِ حریتِ کشمیر (۱۹۴۶ء......۱۹۴۹ء)'' ہے۔ ان کے مقالے اور مضامین بھی کافی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس شمارے میں شمیم احمد شمیم پر لکھا گیا ان کا ایک خاکہ بھی شامل ہے۔ اس سوانحی خاکہ میں انہوں نے شمیم احمد شمیم کے خاندانی پس منظر، حالات زندگی اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس طویل خاکہ میں شمیم احمد شمیم کی ذاتی وخانگی اور خارجی زندگی، شخصیت، افکار ونظریات، مشاغل ومصروفیات اور سیاسی وصحافتی سرگرمیوں غرض تمام چیزوں کی آئینہ داری ہوجاتی ہے۔ خاکہ نگار نے جہاں شمیم کی سیاسی وصحافتی سوجھ بوجھ اور ان کی پیشہ وارانہ صلاحیتوں اور دیگر خوبیوں کا ذکر کیا ہے وہیں ان کی بعض ذاتی کمزوریوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

''شمیم احمد شمیم اپنے عہد شباب میں بڑے ہی رنگین مزاج تھے۔ انہوں نے اپنے نام آئے ہوئے حسیناؤں کے خطوط اور تصویریں بتاں اپنے ایک لنگوٹیا دوست کے پاس امانتاً رکھے ہیں۔ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے ضایع کیے جارہے ہیں۔ شمیم بادہ کشی کے عادی نہ ہونے کے باوجود مے خوار تھے گاڑی، [illegible]، رکشی، دیسی شراب، بیئر اور غالباً اعلیٰ درجہ کی شاذ ہی کوئی ایسی شراب ہو جس کی لذت سے وہ نہ آشنا رہے ہوں۔ لیکن نہ ایسا کہ بند بوتلوں کے سمندر میں کبھی نہیں ڈوبے۔ شراب پی کر سنجیدہ ہو جانا مے کشوں میں ان کی شناخت تھی۔''۵۵؎

موتی لال ساقی: موتی لال ساقی کی خاکہ نگاری کا دورانیہ نصف صدی سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ ان کی خاکہ نگاری کے متعلق اس سے قبل بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس شمارے میں ان کے دو خاکے ''صمد میر'' اور ''سومناتھ سادھو'' شامل ہیں۔ جس سے ساقی کی فن خاکہ نگاری میں دسترس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کا ایک اور عمدہ خاکہ'' کامگار صاحب'' ہے۔ یہ خاکہ انہوں نے غلام رسول کامگار کشتواڑی کی وفات پر خراج عقیدت کے طور پر لکھا تھا جو 'شیرازہ' جولائی 1987ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس میں موصوف نے کامگار کی حلیہ سازی اور مرقع نگاری اس انداز میں کی ہے کہ کامگار کی مسکراتی ہوئی جیتی جاگتی صورت ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''پشتوں پہلے ان کے آبا و اجداد کشمیر چھوڑ کر کشتوار کی زعفران زار اور عطر آگین وادی میں آباد ہو گئے تھے۔ لیکن ان کے کشمیری طرز میں سرمو فرق نہیں آیا تھا۔ وہی رکھ رکھاؤ، وہی وضعداری، وہی مہمان نوازی، لہجے کی ملاہٹ اور توازن جس کے لیے کشمیر کے شرفاء کسی زمانے میں مشہور تھے۔ کامگار صاحب کی شخصیت میں یہ سبھی چیزیں سمٹ کے آگئی تھیں۔ ان کا کشادہ ماتھا اور گول گول چہرہ بات کرتے وقت ایسے کھل اٹھتا تھا جیسے گلاب کا پھول کھل اٹھے۔ سفید داڑھی، سر پر سفید رنگ کی پگڑی اور 'پھیرن' پہنے کامگار صاحب کا نورانی چہرہ دیکھ کر فرشتے کا گمان ہوتا تھا۔ بڑھاپے کے باوجود ان کے چہرے پر کھیلتی معصومیت دیکھنے والے کو مسحور کیے بنا نہیں چھوڑتی تھی۔''۵۶؎

الغرض 'ہمارا ادب' کا یہ خصوصی شمارہ یہ کے ادبی منظرنامہ میں خصوصاً خاکہ نگاری کے تعلق سے اہمیت کا حامل ہے۔ اور اس میں شامل خاکے یہ کے ادبی سرمایہ میں اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کشمیری لال ذاکر: یہ کے کثیر التصانیف اور کثیر الجہت شخصیت کشمیری لال ذاکر کا تذکرہ پہلے بھی آ چکا ہے۔ انہوں نے مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہیں۔ اور کامیابی حاصل کی ہے۔ دیگر اصناف کی طرح خاکہ نگاری میں بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ خاکہ نگاری چونکہ کسی شخصیت کی قلمی تصویر کشی اور مرقع نگاری ہے جو خوبصورت الفاظ و بیان اور الفاظ کے ماہرانہ انتخاب سے دلچسپ اور کامیاب بنتی ہے۔ چونکہ کشمیری لال ذاکر کو زبان و بیان پر مہارت اور موزوں الفاظ کے انتخاب پر ملکہ حاصل ہے۔ اس لیے ان کو خاکہ نگاری کے فن میں قدرت حاصل ہے۔ اور ان کے خاکوں میں گہری زندگی کی رمق پائی جاتی ہے۔

کشمیری لال ذاکر کے خاکوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جن میں اپنی ہواؤں کی خوشبو، درد آشنا چہرے اور یادِ رفتگاں اہم ہیں۔

اپنی ہواؤں کی خوشبو: یہ کشمیری لال ذاکر کے خاکوں کا اولین مجموعہ ہے۔ جو 1989ء میں نئی آواز جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں ادیب، قلم کار، شاعر اور فن کار غرض فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والی ان اہم شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔ جن سے کشمیری لال ذاکر کسی نہ کسی طرح سے متاثر ہوئے۔ ان میں بیشتر وہ ادبی شخصیات ہیں چونکہ کشمیری لال ذاکر خود نہ صرف نثر نگار تھے بلکہ اچھے شاعر بھی تھے اور شعر و ادب کے قدردان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام عمر جموں و کشمیر، دہلی، پنجاب ہریانہ جیسے مقامات پر اپنے قلمی اور ادبی سرگرمیوں کے ذریعہ ادب کی خدمات خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ اس میں اردو و ہندی ادیبوں کے علاوہ مختلف فنون و ادب سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے خاکے بھی شامل ہیں۔ جن سے کشمیری لال ذاکر کے ذاتی مراسم و تعلقات تھے یا ان کے افکار سے وہ متاثر تھے۔ مصنف نے صداقت و حقیقت کے آئینہ میں متعلقہ شخصیات کی تصویر کشی کی ہے۔ اس میں چودہ خاکے شامل ہیں۔ جن میں کرشن چندر، جان نثار اختر، ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض، نرگس دت اور مہندر ناتھ وغیرہ قابل ذکر ہے۔ خاکوں کے عنوان کے انتخاب کا انداز اچھوتا اور نرالا ہے۔ بعض خاکوں کے عنوان اس طرح ہیں جیسے لکونی کا تماشائی (

کرشن چندر)، میرادو اپنادشمن (اعجاز صدیقی)، تیسرے درجے کا مسافر (ساحرلدھیانوی)، آ ی گواہی (گس دت)، موسموں کا شاعر (قتیل شفائی) وغیرہ۔

اس مجموعہ کا پہلا خاکہ لکونی کا تماشائی'' ہے جس میں موصوف نے کرشن چندر کو ان کی تین کہانیوں ' گی کے موڑ'' ' جن کی ا شام' او لکونی' کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ مصنف نے کرشن چندر کے فن، ت اور شخصیت کی آئینہ داری کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذاکر لکھتے ہیں کہ انہیں کرشن چندر سے ذاتی مراسم و محبت تھی۔ کیو وہ بھی ابتدائی گی کشمیر میں ار چکے ہیں اور ان کی کہانیوں میں کشمیری تہذ اور کشمیر کی ئندگی ہوتی ہے۔ کشمیری لال ذاکر نے کرشن چندر کو ان کی کہانیوں کی م ی کرداروں اور م ی نقط کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ کرشن چندر کی تخلیقی صلا اور ان کے مقاص روشنی ڈالتے ہوئے ذاکر لکھتے ہیں:

> '' گی کے موڑ گم ہوئی اس صبح کی رانی کو کرشن چند سوں سے تلاش کر رہا ہے اپنی کہانیوں میں۔ اس کی ہر تخلیق ا کوشش ہے۔ اس صبح کی رانی ک کی۔ اور وہ صبح کی رانی مجبور و بے کس ا ن کے مستقبل کی رانی ہے۔ جس کے سپنے اس کی آنکھوں کو نور بخشتے ہیں۔ اس مجموعے کی تین کہانیوں میں کرشن چندر کے فن کے دی عناصر مہین دے کے پیچھے سے ابھر رہے ہیں۔ اور یہ دہ ے ے وقت کے ساتھ اس کی فنی ضت کی انگلیوں سے اٹھتا ہے۔ اور اب اس کی تخلیقات میں وہ مقام آ ہے جہاں اس کا فن پوری نیوں سے جلوہ ہے۔ اور صبح کی رانی کو عوام میں لا کھڑا کرنے کا اس کا خواب حقیقت جا رہا ہے۔'' ۵۷

کشمیری لال ذاکر کی خاکہ نگاری کی یہی خوبی ہے کہ وہ کم لفظوں میں اپنے موضوع، متعلقہ شخصیت کی ظاہری وخال، س نگاری، شخصیت و داخلی کیفیت مزاج اور مشاغل کو بہترین از میں پیش کرتے ہیں۔ متعلقہ شخصیت کی س نگاری اس طرح سے کرتے ہیں کہ اس کی جیتی جاگتی تص ابھر کر سامنے آتی ہے۔ بلو سنگھ کی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''بلو سنگھ تو شکل و صورت سے بھی تھانے دار لگتا تھا۔ ڈیل ڈول سے بھی اور ن کے لہجے سے بھی۔ ریوالور لر ہر وقت ر تھا اپ س۔ تھانے دار کو کبھی بھی تو ضرورت سکتی

ہے۔خاص طور پر وہ اپنی گشت پر ہو اور وہ بھی منڈا اور بیٹ کے اس علاقے میں جہاں چور، چاند کی روشنی میں رات کا سہارا لے کر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور سارے گاؤں کو للکار کر اور زور زور سے ڈھول بجا کر ساہوکار کو لوٹتے ہیں۔''۵۸؎

اس خاکہ میں مصنف نے بلونت سنگھ کی ظاہری خد وخال، ان کے مشاغل زندگی، ادبی کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

کشمیری لال ذاکر نے اپنے خاکوں میں متعلقہ شخصیات سے جڑی ہر ایک بات کا تذکرہ کیا ہے۔جس سے ان شخصیات کی خارجی و داخلی زندگی عیاں ہو جاتی ہے۔خاکہ 'تیسرے درجے کا مسافر' میں ساحر لدھیانوی سے جڑے ایک واقعہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ ساحر لدھیانوی کے اعزاز میں لدھیانہ میں ایک مشاعرہ کرایا گیا۔جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ کلب کے پیچھے والی سڑک کا نام 'ساحر روڈ' رکھا جائے گا۔اس موقع پر منتظمین کا شکریہ کرتے ہوئے ساحر نے کہا :

''ساحر نے ڈپٹی کمشنر کا اور لدھیانہ کے دوستوں کا شکریہ ادا کیا تو کہا 'میں ڈپٹی کمشنر صاحب کا اور آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے وہ اعزاز بخشا ہے جس کا میں واقعی مستحق ہوں۔' لوگوں نے تالیاں تو بجائیں لیکن ساحر کے لطیف اشارے کو نہ سمجھ پائے تالیوں کی گونج ختم ہوئی تو ساحر نے کہا 'میں اس اعزاز کا اس لیے حقدار ہوں کہ میری تمام عمر سڑکوں پر گزری ہے' تمام حال قہقہوں سے گونج اٹھا۔اور اس مترنم گونج میں تالیوں کی گونجیں بھی شامل ہو گئیں۔ساحر نے اپنی دھرتی کے سینکڑوں کے سامنے یہ قبول کی تھا کہ وہ تیسرے درجے کا آدمی تھا۔جس کی تمام عمر انہی سڑکوں پر جن پر عوام اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور چھوٹے چھوٹے غم جھولیوں میں ڈالے گھومتے رہتے ہیں۔اور زندگی سے مایوس نہیں ہوتے۔''۵۹؎

مشہور ہندوستانی اداکارہ نرگس دت کا خاکہ ''آئینہ گواہی'' کے عنوان سے لکھا ہے۔اس خاکہ میں مصنف نے نرگس دت کی زندگی و ذاتی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔اس خاکہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نرگس دت کے شوہر سنیل دت کشمیری لال ذاکر کے پھوپھیرے بھائی تھے۔اس تعلق سے نرگس دت ان کی بھابھی ہوئی۔انہوں نے بھابھی دیور

کے اس رشتے کو مقدس انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نرگس دت ایک مسلم خاتون تھیں لیکن ٹھیٹھ ہمن گھرانے میں شادی کر کے سلیقے کے ساتھ اس خاندان میں اپنا مقام بنا لیا۔ اپنے زمانے کی مشہور و معروف اداکارہ ہونے کے باوجود ایک خالص مشرقی عورت کی طرح سنیل دت اور اس کے خاندان کے لیے بیوی اور بہو تھیں۔ اس بین مذہبی رشتے کی بنا پر نرگس کو کن کن سماجی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور کس طرح انہوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا۔ اور نرگس کی بیماری، سنیل دت کے پریشانیاں غرض نرگس کی تمام داخلی و خارجی حالات کو نہایت سلیقے سے بیان کیا ہے۔ جس سے خاکہ نگار کی پیش کش اور انداز بیان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

کشمیری لال ذاکر نے ایک مختصر خوبصورت خاکہ اردو کے ایک اہم غیر معروف ادیب مہندر ناتھ کا لکھا ہے۔ مہندر ناتھ کرشن چندر کے چھوٹے بھائی تھے۔ مہندر ناتھ نے کئی افسانے اور ناول لکھے ہیں۔ ان کی ناولوں میں 'آدمی اور سکے'، 'ارمانوں کی سیج'، 'رات اندھیری ہے' اور 'ات' وغیرہ لکھی ہے۔ ان کی تحریروں میں دبے کچلے، کمزور اور مظلوم طبقہ کی کہانی ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کا وہ مستحق تھا۔ خاکہ نگار نے اس بات کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''کاش اس کے دوست اور اس کا سماج بھی اسے وہی سلوک کرتے جو سلوک وہ ان سے کرتا رہا۔ وہ بھی اگر چاہتا تو اپنے آرام و آسائش اور دنیوی وقار حاصل کرنے کے لیے اہل اقتدار لوگوں سے سمجھوتے کرتا اور ٹھاٹ کی زندگی گذارتا۔ لیکن وہ تو آخری وقت تک اسی طبقے کی نمائندگی کرتا رہا۔ جس کی خاطر اس نے اپنا تمام ادب تخلیق کیا تھا۔ وہ اسی طبقے کے ایک عام فرد کی طرح جیا اور اسی طرح مر بھی گیا۔''[٦٠]

ذاکر نے مہندر ناتھ کی نہ صرف خارجی زندگی اور ادبی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ بلکہ داخلی کیفیات کو بھی بیان کیا ہے۔ انہوں نے اسے ایک دوست کی حیثیت سے سمجھا، ان کی ذہنی، فکری، داخلی و معاملات کو جانا اور اپنے احساسات کو قلمبند کیا۔ یوں بھی ادیب حساس ہی ہوتے ہیں۔ ذاکر نے اپنے دوست مہندر ناتھ کے دکھ و درد اور اندر سلگتی آگ کو محسوس کیا جس کا عکس کہیں نہ کہیں ہمیں اس خاکہ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ خاکہ نگار نے مہندر ناتھ کی وضع داری، اخلاق، ذاتی پہلوؤں کو سمجھا اور اس کو صفحہ قرطاس پر اتارا۔

اس مجموعے میں کشمیری لال ذاکر نے اپنے دوست واحباب اور عزیز و اقارب کے خاکے کھینچے ہیں۔ یہ وہ

شخصیات ہیں جن سے وہ کسی نہ کسی طرح متاثر ہوئے ۔ اور مصنف کی ذہنی وقلبی ،فکری وتخلیقی نشوونما میں جن کا دخل تھا۔ایسے محبوب شاعروں میں ایک قتیل شفائی بھی ہیں۔جن کا خاکہ انہوں نے ''موسموں کا شاعر'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ یہ بھی دلچسپ خاکہ ہے جس میں نہ صرف قتیل شفائی کی زندگی کے بارے میں بلکہ ان کی شعری کائنات،تخیلات اور فن پر بھی روشنی پڑتی ہے۔خاکہ نگار نے قتیل شفائی سے اپنی دوستی،محبت اور خلوص وعقیدت کو اچھی طرح بیان کیا ہے۔قتیل شفائی سے انہیں کتنی محبت تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہوجاتا ہے کہ مختلف مشاعروں میں سنائی ہوئی قتیل کی نظمیں ایک زمانہ گزر جانے کے باوجود بھی انہیں زبانی یاد ہے۔اور جا بجا خاکے میں شامل کیا ہے۔ایک ایماندار اور صاف گو خاکہ نگار کی طرح ذاکر محض اپنی عقیدت کی بنا پر قتیل کے ہر سیاہ وسفید کو قبول نہیں کرتا ۔ جہاں انہیں کسی چیز میں کوئی کسر دکھے اس کی طرف دوٹوک اشارہ کر دیتے ہیں۔جیسے کہ قتیل شفائی کا فلموں کے لیے نغمہ نگاری کرنے کو وہ پسند نہیں کرتے ۔اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''قتیل سے میری یہی مانگ ہے کہ وہ وہی رہے جو کہ وہ ہے ۔فلموں کے لیے گانے لکھتے ہوئے وہ دوسرے شاعروں کی طرح فلمی مصرعوں کی ٹکسال نہ بن جائے ۔اس کے قلم کی نوک سے چاند اور ستارے تشکیل پائیں ۔صرف فلمی گانوں کے مکھڑے نہیں۔جن کی چمک کبھی بھی ماند پڑ سکتی ہے۔''۱۶

اس مجموعے میں سب سے دلچسپ خاکہ کشمیری لال ذاکر کا خود اپنا قلمی خاکہ ہے۔''لمحوں کا پجاری'' کے عنوان سے لکھے گئے اس سوانحی خاکہ میں مصنف نے اپنے بچپن ،ماضی ،ذاتی وخارجی زندگی اور تخلیقی سفر غرض تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔مصنف نے جہاں اپنی صلاحیتوں ،ذوق وشوق اور محنت وجد وجہد کو قلم بند کیا ہے وہیں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو بھی کھل کر بیان کیا ہے ۔اس خاکہ میں ان کی حالات زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔انہوں نے اپنے جنم پتری کے مطابق لکھا ہے کہ وہ 1919ء میں پونچھ میں پیدا ہوئے۔ان کے خاندان کا تعلق بیگا خان گجرات موجودہ پاکستان کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ان کا نام کشمیری لال اس لیے رکھا گیا کیونکہ ان خاندان میں دور کے چچاؤں کے نام پشاوری لال ،ولایتی لال وغیرہ ہوتے تھے وہ چونکہ کشمیر میں پیدا ہوئے تھے اس مناسبت سے کشمیری لال نام رکھا گیا ۔ ذاکر ان کا تخلص ۔ان کے والد پونچھ میں مہاراجہ کی وزارت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ذاکر کا بچپن اور جوانی کشمیر میں گزری۔وہ اپنی تحریروں میں کشمیر،کشمیری تہذیب اور کشمیریت کی آواز کو ہمیشہ بلند کرتے رہے۔

کشمیری لال ذاکر اردو ادب کے پرچم کو بلند کرنے والے ادیبوں میں سے ہیں۔ وہ نصف صدی سے زائد عرصہ سے درس و تدریس کے عمل کے علاوہ شعبہ تعلیم میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے اور ساتھ ہی ادبی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ ان کے خاکوں میں جابجا انگریزی اور ہندی الفاظ مستعمل ہوتے ہیں۔ جو تحریر کے حسن میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔ چونکہ وہ ایک ماہر تعلیم ہیں اس لیے وہ متعلقہ شخصیت کی نفسیات کو اچھی طرح پڑھ کر اس کی شخصیت اور فطرت کا جائزہ لینے کا ہنر جانتے ہیں۔

درد آشنا چہرے:

کشمیری لال ذاکر کے خاکوں کا یہ مجموعہ 1998ء میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں ایسے مشاہیر پر لکھے گئے خاکے شامل ہیں جن سے مصنف کے ذاتی مراسم یا تعلقات نہیں تھے۔ بلکہ ان کے ادبی کارناموں سے اور علم و حکمت سے وہ مستفیض ہوئے۔ اور یہ ادبی وابستگی اس قدر مستحکم ہوگئی کہ ذاکر کی ذاتی و ادبی زندگی میں ان خاصا اثر رہا۔ ان اہم شخصیات میں علامہ اقبال، مولانا شبلی، حالی، مولوی عبدالحق، حسرت موہانی، سروجنی نائیڈو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس مجموعے کے بارے میں تفصیلات دیتے ہوئے کشمیری لال ذاکر لکھتے ہیں:

> ''درد آشنا چہرے' میری تیسری کتاب ہے۔ جس میں ان بزرگوں کے خاکے ہیں۔ جن سے میں کسی نہ کسی طرح متاثر ہوا۔ ان تخلیق کاروں کے خاکے ہیں جو میرے ہمعصر تھے یا مجھ سے کچھ برس پہلے اپنے قلم کا جادو جگاتے رہے تھے۔ یہ کتاب بھی کچھ ایسے بزرگوں، دوستوں اور ساتھیوں کے خاکوں پر مشتمل ہے۔ جن سے کسی نہ کسی صورت میری ذہنی یا قلبی وابستگی رہی۔''۶۲

کشمیری لال ذاکر نے شاعر مشرق علامہ اقبال کا خاکہ ''بچوں کی معصومیت والا شاعر'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ جس میں مصنف نے علامہ اقبال کی شخصیت کے کئی معصوم و طفلانہ انداز تکلّم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بقول

مصنف علامہ اقبال کی شاعری میں بچوں کی سی معصومیت اور معصوم جذبوں کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔وہ اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کرتے وقت اپنے وجود کو سامنے لاتے ہیں۔اور عام ہو کر لکھتے ہیں،بچوں کی طرح سوال کرتے ہیں،سوال کرنے کے عادی ہیں۔تبھی تو شکوہ جواب شکوہ،آدم و ابلیس جیسی تخلیق کی۔اور اسی معصومیت میں زندگی کے بڑے بڑے مسائل کا حل بتا گئے۔اقبال کی شاعری کے بعض نکتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذاکر لکھتے ہیں:

''بہت دن ہوئے میں نے کہیں پڑھا تھا کہ ہر آدمی کے تحت الشعور میں ایک بچہ زندہ رہتا ہے۔اور اسی کی تمام زندگی پر مختلف طریقوں اور زاویوں سے اثر انداز رہتا ہے۔اور اسی میں اس کی شخصیت کے ارتقاء کا راز پنہاں ہے۔جس لمحہ کسی داخلی و خارجی وجہ سے وہ بچہ مر جاتا ہے۔آدمی کے ارتقاء کا عمل ایک دم رک جاتا ہے۔اور اس کی زندگی ایک دم سپاٹ راہگزر بن کر رہ جاتی ہے۔جس پر علم و دانش رکھنے والا کوئی مسافر گامزن نہیں ہوتا............میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اقبال کی شاعری میں ہمیں جو تضاد ملتا ہے۔اور جو Inconsistency نظر آتی ہے وہ ویسا ہی تضاد ہے اور ویسی ہی Inconsistency ہے۔جو ایک بچے کی پھول جیسی خوبصورت شخصیت کا حصہ ہے۔اقبال کی شاعری میں یہ تضاد اسی لیے ہے کہ اس کے اندر چھپا ہوا بچہ ابھی زندہ ہے۔اور اس میں تجسس کا جذبہ بڑی شدت سے موجود ہے۔اور وہ ان رازوں کو جاننا چاہتا ہے جو گہرے پردوں کے پیچھے چھپے پڑے ہیں۔تضاد تو ارتقاء کا سمبل ہے۔تضاد نہ رہے گا تو انسانی زندگی میں ارتقاء کا عمل ہی منقطع ہو جائے گا۔''[۶۳]

ایسا ہی ایک عمدہ خاکہ ''زلف عنبر میں شکن'' ہے۔اس خاکہ میں ذاکر نے اپنے محبوب شاعر جگر مرادآبادی کی شخصیت اور شاعری کو بڑی باریکی سے بیان کیا ہے۔انہوں نے جگر مرادآبادی کی شاعری و افکار میں ان کی داخلی کیفیات،جذبات اور مشاغل زندگی کو ان کی کلام کے آئینہ میں دکھایا ہے۔بقول مصنف ابتدائی عمر میں فانی بدایونی کی شاعری سے ان کے اندر قنوطیت طاری ہو گئی تھی۔حتیٰ کہ انہیں زندگی اور دنیا سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔اسی دوران جگر مرادآبادی کی شاعری ان کی نظروں سے گزری اور جگر مرادآبادی سے غائبانہ ملاقات ہوئی تو انہیں ایسا لگا جیسے برسوں سے بیمار ذہن اور دل و دماغ کو کوئی دوا ملی ہو اور وجود کو زندگی۔

’ ذلف عبر میں شکن‘ میں کشمیری لال ذاکر نے جگر مراد□ دی کی شاعری ، ان کا □ ازِ بیان کے علاوہ جگر مرا□ دی کی □ □ گی ، د□ مشاغل و مصروفیات □ بھی روشنی ڈالی ہے۔

□ ران تیز گام:

کشمیری لال ذاکر کے خاکوں کا یہ مجموعہ 2006ء میں ایجوکیشنل □ ہاوس دہلی سے شائع ہوکر منظر عام □ □ ۔اس میں متعدد خاکے ایسے ہیں جو ان کے پہلے دو خاکوں کے مجموعوں میں شامل ہیں۔البتہ کچھ نئے خاکے ایسے ہیں۔جن کو وہ وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں کے لیے لکھتے رہے تھے۔کشمیری لال ذاکر کا منفرد اسلوب ہے کہ انہوں نے عموماً مختلف ادیبوں و شاعروں کے خاکے لکھے ہیں۔اور ان کے عنوان انہی شخصیات کی تخلیقات کے مطابق رکھے ہیں۔ بیشتر خاکے متعلقہ شخصیات کی وفات □ بطور □ اج عقیدت تحر□ کیے گئے ہیں۔ایسا ہی ا□ خاکہ ’کہا□ں بولتی ہے‘ جس میں مصنف نے عصمت چغتائی کا خاکہ کھینچتے ہوئے ان کی شخصیت اور ان کی نفسیاتی کیفیت کو واضح کیا ہے۔بقول مصنف عصمت ہمیشہ سے ا□ ضدی اور اپنی پہچان بنا کے ر□ والی شخصیت تھیں۔مصنف عصمت کی اس خواہش کو کہ ’مرنے کے بعد اسے □ رآتش کیا جائے‘، اسی تناظر میں دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’ وصیت میں کیوں لکھا کہ مرنے کے بعد اُس کی لاش کو دفنانے کے بجائے □ رآتش کیا جائے۔یہ وصیت عصمت نے اس لیے نہیں کی تھی۔کہ اس کو قبر کے □ ھیرے سے خوف آ□ تھا بلکہ وہ گمنامی سے ڈرتی تھی۔اور اس لیے کہ آگ کے شعلے اسے مرنے کے بعد بھی ’’لائم لائ□ ‘‘ میں رکھیں گے۔سچ تو یہ ہے کہ عصمت چغتائی جنم سے موت □ اس ایمبشن سے دکھ □ تی رہی کہ دوسروں کی □ یں ہمیشہ اس □ جمی رہے اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہی۔‘‘ ۶۴

اپنے خاکوں میں کشمیری لال ذاکر متعلقہ شخصیات کے ساتھ جہاں اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں وہیں ان کے تئیں اپنے دلی □ ت اور احساسات کو بھی بیان کرتے ہیں۔جہاں متعلقین کے ساتھ □ رے لمحوں کو □ گی کا سرمایہ سمجھتے ہیں وہیں ان کے ساتھ چھوڑ کر جانے کو □ تلافی نقصان ما □ ہیں۔خاکہ ’’کہاں سے کوئی ہمارا جواب لائے گا‘‘

کنور مہندر سنگھ بیدی کے وفات کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے اس سے مصنف کی ا□ ادی و داخلی کیفیات کا احساس ہ□
ہے کہ انہیں بیدی کی وفات سے نہ صرف صدمہ پہنچا ہے بلکہ وہ خود ک□ لکل تنہا محسوس کرتے ہیں۔ اقتباس دیکھئے:

''بیدی صا □ کے اچا □ چلے جانے سے میرا ذاتی او□ قابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ وہ
میرے دو □ اور کرم فرما ہی نہیں تھے بلکہ راز دار بھی تھے۔ آج . □ وہ نہیں ہیں تو مجھ ایسا لگتا
ہے جیسے کہ وہ مضبوط□ ی جس نے مجھے ان کے □ یوار کے ساتھ □ ھا ہوا تھا اب ٹوٹ گئی
ہے۔ میں اب ا □ دم اکیلا ہو□ ہوں اور اب مجھے جوڑ جوڑ□ ہوا لگتا ہے۔''[۶۵]

اس طرح د□ شخصیات کے خاکوں میں کشمیری لال ذاکر نے اپنی دلی وابستگی اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔□
ساتھ میں ا □ صاف گو اور ایما□ ارخاکہ نگار کی حیثیت سے انہوں نے اس وابستگی اور عقیدت کی بنا□ حقیقت بیانی کو
نہیں چھوڑا ہے۔ کیو□ حقیقت بیانی کا پل صراط طے کرنے کے لیے جس غیر جا □ دارانہ اور ایما□ ارانہ□ از نگارش کی
ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ایسی صورت میں خاکہ نگار کے لیے ا □ آزمائش کا مرحلہ بن جا□ ہے۔□ ذاکر اپنی قوت مشاہدہ
اور قوتِ فیصلہ کی □ و □ اس پل صراط کو□ ی خوبی سے□ پر کر □ ہیں۔ جہاں وہ متعلقہ شخصیات کی خوبیوں کا ذکر کرتے
ہیں وہیں ان کی خامیوں اور ک□ ہیوں کا بھی □ □ اظہار کرتے ہیں۔ چو□ وہ ا □ افسانہ نگار ہیں اس لیے ان کے خاکوں
میں افسانوی ر□ غا □ ہے۔ قصہ ک□ ہ کشمیری لال ذاکر کے خاکے نہ صرف □ □ جموں وکشمیر کے ادبی سرمائے میں
اضافہ ک□ □ ہے بلکہ عالمی ادب میں بھی ان کی اہمیت مسلم ہے۔

ہم کہہ □ ہیں کی □ □ جموں وکشمیر میں خاکہ نگاری کی صورت حال دوسرے اصناف ادب کی طرح خوش
کن ہے۔ یہاں کے اد□ رسائل و□ ل□ میں آئے دن مختلف شخصیات وموضوعات □ لکھتے رہتے ہیں۔ جس سے
□ □ میں فن خاکہ نگاری کے روشن مستقبل کی امید کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱) اردوادب میں خاکہ نگاری،صلا ہ سعید،ڈاکٹر،مکتبہ شعروحکمت،لکڑی کاپل،حیدرآباد،۱۹۷۸ء، ص:۶۴

(۲) وہ صورتیں،□ راحمد فاروقی،آزاد کتاب گھر،محلّہ کالاں دہلی،۱۹۶۴ء، ص:۱۷

(۳) فرہنگ ادبیات،مرتبہ:سلیم شہزاد،قومی کو□ □ ائےفروغ اردو،نئی دہلی،۲۰۱۸ء،ص:۳۶۱

(۴) کشمیر میں اردو،حصہ دوم،عبدالقادر سروری □ وفیسر،ص:۴۳۲

(۵) ایضاً،ص:۳۱۴

(۶) ایضاً،ص:۳۰۴

(۷) ایضاً،ص:۴۵۰

(۸) ایضاً،ص:۵۵۰

(۹) کشمیر میں اردو،حصہ سوم،سروری،ص:م۲۷۶

(۱۰) ایضاً،ص:۳۰۱

(۱۱) مضامین □ اغ حسن حسرت،مرتبہ عبدالمجید سالک،۱۹۵۶ء،ص:۴۲

(۱۲) مردم □ ہ،□ اغ حسن حسرت،ص:۲

(۱۳) ایضاً،ص:۹

(۱۴) ایضاً،ص:۶۹

(۱۵) ایضاً،ص:۵۷

(۱۶) ایضاً،ص:۳۳

(۱۷) ایضاً،ص:۳۴

(۱۸) ایضاً،ص:۳۵

(۱۹) ایضاً،ص:۱۶۱

(۲۰) ایضاً،ص:۸۷

(۲۱) دوداکٹر،□ اغ حسن حسرت،ص:۳

(۲۲) ایضاً،ص:۷

(۲۳) ایضاً،ص:۳۹

(۲۴) ماں جی،قدرت اللہ شہاب،ص:۱۳

(۲۵) ایضاً،ص:۱۲

(۲۶) □ش،شخصیت نمبر،۱۹۵۵ء،ص:۶۵۵

(۲۷) ی جموں وکشمیر میں خاکہ نگاری، نور شاہ، مضمون مشمولہ رسالہ یفت، شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی، دسمبر ۲۰۰۶، ص:۶۱

(۲۸) ایضاً، ص:۶۲

(۲۹) مشاہیر کشمیر، محمد امین راہی، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر، ص:۲۹۰

(۳۰) ایضاً، ص:۲۹۷

(۳۱) ہمارا ادب شخصیت نمبر، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر، ۱۹۸۷ء، ص:۱۲۸

(۳۲) آئینہ، مرتبہ قرۃ العین، سری نگر، ۲۰۰۸ء، ص:۹

(۳۳) ایضاً، ص:۷۔۱۰

(۳۴) ایضاً، ص:۱۷۰

(۳۵) ایضاً، ص:۱۷۲

(۳۶) ایضاً، ص:۲۲۔۲۳

(۳۷) ایضاً، ص:۵۳

(۳۸) ایضاً، ص:۹۹

(۳۹) ایضاً، ص۱۲۷

(۴۰) ایضاً، ص:۵۲۔۵۳

(۴۱) ایضاً، ص:۳۳۔۳۴

(۴۲) آنکھیں ں ہیں، جگن تھ آزاد وفیسر، موڑرن ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص:۵

(۴۳) ایضاً، ص:۱۶

(۴۴) ایضاً، ص:۱۹۔۲۰

(۴۵) ایضاً، ص:۱۸۔۱۹

(۴۶) ایضاً، ص:۲۲

(۴۷) ایضاً، ص:۱۴۶

(۴۸) ایضاً، ص:۱۶۶

(۴۹) ایضاً، ص:۳۹

(۵۰) ایضاً ص:۱۸۷۔۱۸۸

(۵۱) ہمارا ادب، شخصیت نمبر۔ کلچرل اکیڈمی، سری نگر، ۱۹۸۵ء۔۱۹۸۶ء، ص:۳۴

(۵۲) ایضاً، ص:۹۶۔۹۷

(۵۳) ایضاً، ۴۳

(۵۴) ایضاً، ص:۱۴۶

(۵۵) ایضاً، ص:۱۷۶

(۵۶) شیرازہ، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر، جولائی، ۱۹۸۷ء، ص:۲۶

(۵۷) اپنی ہواؤں کی خوشبو، کشمیری لال ذاکر، نئی آواز، جامعہ نگر دہلی، ۱۹۸۹ء، ص:۱۸۔۱۹

(۵۸) ایضاً، ص:۶۶

(۵۹) ایضاً، ص:۴۷

(۶۰) ایضاً، ص:۹۲۔۹۳

(۶۱) ایضاً، ص:۱۲۶

(۶۲) درد آشنا چہرے، کشمیری لال ذاکر، موڈرن □ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص:۹

(۶۳) ایضاً، ص:۱۴۔۱۵

(۶۴) □ رانِ تیز گام، کشمیری لال ذاکر، ایجوکیشنل □ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۶، ص:۱۰۸

(۶۵) ایضاً، ص:۱۱۱

باب پنجم: ریاست جموں وکشمیر میں انشائیہ نگاری

الف: ابتدا سے 1960ء

ب: 1960ء سے 1980ء

ج: 1980ء سے تاحال

الف: ابتدا سے 1960ء

انشائیہ کے نام کے ساتھ ہی زبان کے تخلیقی امکانات کا ایک واضح تصور وابستہ ہے۔ انگریزی Light Eassy کے لیے اردو میں لفظ انشائیہ اپنایا گیا ہے۔ یہ نہ صرف ایک ادبی صنف کی حیثیت سے اپنی شناخت متعین کر چکا ہے بلکہ اپنی مخصوص خصوصیات کے سبب تخیلی وفکری جہتوں کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ انشائیہ کے لغوی معنی عبارت بات سے بات پیدا کرنا اور طرز تحریر وغیرہ کے ہیں۔ اصطلاح میں انشائیہ نثری ادب کی وہ صنف ہے، جو ایک مختصر ادبی مضمون کی مانند ہوتے ہوئے بھی مضمون سے الگ انداز رکھتا ہے۔ اس میں تاثرات ومشاہدات وغیرہ بیان کیے جاتے ہیں۔ شگفتگی و شائستگی اس کا اہم عنصر ہے۔ انشائیہ نگار کا انداز و بیان خشک نہ ہوکر پُر لطف اور دلچسپ ہوتا ہے۔ اس کی ہیئت گرچہ نثری صنف کی ہے لیکن یہ اپنے اندر شاعری کا سا لطف رکھتا ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار اپنی تحریر سیل رواں کی مانند آزادانہ طور پر شعوری رو میں بہتا ہوا پیش کرتا ہے۔ جس میں اس کی شخصیت کے پہلو بھی نمایاں آتے ہیں اور بغیر کسی خاص نتیجے کے بات کو ختم کیے فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتا ہے۔ بقول وزیر آغا:

> ''انشائیہ' اس مضمون کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیا یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس قدرت فت میں رکھتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔'' [1]

واضح رہے کہ مفہوم اور ہیئت کو کسی ایک تعریف میں سمیٹنا یا اس کی کوئی ایک ترکیب بیان کرنا قدرے دشوار ہے۔ انشائیہ میں ہونے والی مسلسل تبدیلیوں اور مختلف پیرائے اظہار کے اپنائے جانے کے سبب کئی انداز تحریر یا اسلوب میں اس صنف سے جڑتے چلے گئے جس کی وجہ سے یہ ممکن ہی نہیں رہا کہ اس کی کوئی ایک جامع تعریف کی جا سکے البتہ اس کو کئی طرح سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ جس سے انشائیہ کے خد و خال کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی کو واضح کرتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''انشائیہ کیا ہے؟ بہ لحاظ مواد کیا بہ لحاظ تکنیک ایک سب اگانہ کیفیات کا حامل ہے ہر اعتبار سے بیکن، لیمب اور چسٹرٹن کے طریق کار میں اتنا تفاوت ہے کہ ان کے لکھے ہوئے مضامین کو ایک ہی زُمرے میں شامل کرتے ہوئے سخت ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح دور

انشائیہ کے بیشتر لکھنے والوں نے انشائیہ کے سلسلے میں کافی حد تک آزادی سے کام لیا ہے اور
اس قدر کے لئے انشائیہ کے متقاضیات اور امتیازی محاسن کو علاحدہ کر کے دکھانا مشکل ہوتا
ہے تاہم غائر نظر سے دیکھنے پر انشائیہ کی متنوع کیفیات اور ابلاغ و اظہار کے مختلف سانچوں
کے پس پشت ایک علاحدہ صنف ادب کے نقوش واضح طور پر دیکھائی دیتے ہیں اور ہم ذرا
کوشش سے انشائیہ کے حدود کو متعیّن اور محاسن کو بے نقاب کر سکتے ہیں۔'' ۲؎

انشائیہ میں انشائیہ نگار موضوع کی حدود و قیود سے آزاد ہو کر اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین لکھتے
ہیں:

''انشائیہ ادب کی وہ کمین گاہ ہے جہاں قلمکار محفوظ اور مطمئن بیٹھ کر جس پر اور جس پر چاہے تیر
چلا سکتا ہے۔ اکرام و دشنام سے بے پرواہ ہو کر وہ ہر نام اور کام کی عظمت اور ذلت کا جائزہ
لے سکتا ہے۔ اپنی بیکاریوں کے اظہار اور اشتہار پر بھی انشائیہ نگار پر کوئی قانونی دفعہ نہیں لگ
سکتی۔ کیونکہ ادب کے اس گوشے میں قلمکار کو ہر طرح کے بیان کی چھوٹ ہے۔ یہ گفتار کا وہ
غازی ہے جسے سات نہیں سینکڑوں خون معاف ہیں۔'' ۳؎

ایک انشائیہ نگار بغیر کسی طلب و تمنا کے سماجی صورتحال کو شگفتگی اور لطافت سے پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر علی آدم شیخ انشائیہ کی
تعریف اور وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

انشائیہ ایک ذہنی اور ادبی چیز ہے۔ لہٰذا اس کے حدود کا تعین کرنا یا اسکی منطقی اور قطعی تعریف کرنا
سعی لا حاصل ہے۔'' ۴؎

وہ مزید لکھتے ہیں:

جہاں تک انشائیہ کا تعلق ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ ایک انشائیہ فنکار کی انفرادیت اور
شخصیت کا پر تو ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار فرد کو جماعت پر، جز کو کل پر ترجیح دیتا ہے۔ اسے نہ کسی
ستائش کی تمنا ہوتی ہے اور نہ ہی کسی صلہ کی پرواہ۔ دراصل انشائیوں میں انسان کی اس فطری
آواز کا زیر و بم ہوتا ہے۔ جسے کوئی اصول یا کوئی فنی اصطلاح پابند نہیں کر سکتی۔'' ۵؎

اردو ادب میں محمد حسین آزاد، سر سید، مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی

،□اس بخاری وغیرہ کے بعد نئی پیڑی میں ا□ ئیہ لکھنے والوں کے فہر □ خاصی طویل ہے۔

جہاں □ □ی □ جموں وکشمیر میں اردو ا□ ئیہ نگاری کا تعلق ہے یہاں □ ابتدائی دنوں میں □ قی اصناف ادب کے مقابلے میں ا□ ئیہ نگاری □ توجہ کم دی گئی تھی۔ جموں وکشمیر کی اد □ رت□ □ ڈالنے سے □ ازہ ہو جا□ ہے کہ یہاں ابتدا میں ادیبوں نے اس صنف کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ا ی□ وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس دور میں یہاں کے اد ی□ سنجیدہ مضمون نگاری کی طرف توجہ مرکوز کر رہے تھے۔ ا ی□ تو اس وقت یہاں کے عصری حالات کا تقاضا تھا دوسرا شخصی راج میں آزادی رائے کی □ بندی کے □ ۔ اس دور میں یہاں کے اد ی□ سنجیدہ اور علمی □ ر□ مضامین لکھتے ہوئے □ آتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ یہاں فارسی □ ن اپنی زوال کی طرف تھی اور اردو یہاں نومولود بچہ کی ما□ تھی اور وسیلہ اظہار کے تمام وسائل □ ڈ□ ہ حکمرانوں نے □ بندی عائد کر رکھی تھی۔ اس لیے □ ستی ادیبوں نے اس کی طرف کم توجہ دی ہوگی۔

□ ی □ جموں وکشمیر میں ابتدائی دنوں میں ا□ ئیہ لکھنے والوں کی تعداد گنتی کے چند ہیں جیسے سالگ رام سالک، علامہ صدیقی سا□ ی ماہ، پنڈت □ ائن جو رینہ عنقا اور پنڈت تیرتھ کا□ ی وغیرہ وقتاً فوقتاً مختلف اخباروں جیسے، مارتنڈ، جیوتی اور وتستا وغیرہ میں لکھتے رہے۔ لیکن آج ان کے ا□ ئیے □ پید ہیں □ منتشر دستا□ ات کی صورت میں سرکاری اور ذاتی کتب خانوں کے گوشوں میں دفن ہیں □ زمانے کی □ رہو چکے ہیں۔ اس کے بعد کے □ میں صا □ زادہ عبدالرحمٰن ذکی جو صا □ زادہ محمد عمر کے بھائی تھے وہ بھی شعر و ادب کے ساتھ ساتھ ا□ ئیہ نگاری کا بھی ذوق ر □ تھے۔ لیکن آج ان کے ا□ ئیے صرف ان مقدموں کی صورت میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ جو انہوں نے اپنے نظموں کے مجموعوں میں لکھا ہے □ دوسرے ساتھیوں کی کلام میں لکھتے تھے۔ جن میں مصنف نے شوخی و لطافت کے ساتھ ساتھ اپنی ذات اور داخلی کیفیات کو بھی عیاں کیا ہے اور کشمیر میں اردو ادب کی تحر ی□ اور اس کی ارتقا □ بھی خاصی مبصرانہ گفتگو کی ہے۔

سالگ رام سالک: بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں کشمیر کے دو اد ی□ بھائی پنڈت ہر گو□ ل خستہ اور پنڈت سالگ رام سالک نے ا□ ئیہ نگاری کو استحکام بخشا۔ لاہور اور □ لہ میں انہوں نے قیام کیا۔ انہیں ان

شہروں کا ادبی ماحول راس آ□ی، یہاں کی فضا نے ان کی ادبی صلا□ی□ کو جلا بخشی اور انہوں نے اپنے آپ کو□ ریخ و ادب کے لیے وقف کیا۔ کئی درجنوں تصانیف قلمبند کیے۔ سالک کے ا□ ئیوں کا مجموعہ ''گنجینہ فطرت''□ی ''مناظر کشمیر'' کے عنوان سے ہے۔ اپنے ا□ ئیوں میں انہوں نے سرزمین کشمیر اور اس کے کو□ نوں و کوہساروں کے مناظر، اس کرۂ ارض کی خوبصورتی اور یہاں کے مسائل و واقعات کو بیان کیا ہے۔ یہ ا□ یئے □ی د□ کشمیر کے مناظر سے متعلق ہیں۔ مثلاً کو''□ ن کی عام سیر''، ''ان کے □ رے''، ''وادیوں اور جنگلوں کی□ بہار رونق''، ''پہاڑی چشمے اور آ□ ر''، ''پہاڑ'' اور ''کھیت کھلیان'' وغیرہ۔ ان کے ا□ ئیوں سے متعلق□ وفیسر عبدالقادر سروری رقمطراز ہیں:

> ''ان ا□ ئیوں کو□ ڑھتے ہوئے اردو کے ابتدائی دور کے ا□ ئیہ نگاروں' جیسے ماسٹر رام چند□ی ذکا اللہ کی□ی د آجاتی ہے کہیں کہیں سرسید اور ذکاء اللہ کی تحر□ی وں کا سا البیلا پن ان ا□ ئیوں میں دکھائی دیتا ہے۔'' ۶

سالک کے ا□ ئیوں□ مضمون نگاری کا ر□ غا□ ہے۔ انہوں نے بعض ا□ ئیوں میں سنجیدہ موضوع□ قلم اٹھا□ی ہے۔ ان کے ا□ ئیوں میں متنوع موضوعات□ ئے جاتے ہیں۔ لیکن کشمیر کو م□ □ی□ حاصل ہے۔ کشمیر کے تمام مناظر، قدرتی وسائل اور کشمیری عوام کو موضوع بنا□ی ہے۔ ان کے ا□ ئیوں میں کشمیر کے کوہساروں اور ان کے دامن میں بسنے والے عوام، یہاں کے پہاڑوں، جنگلوں، آ□ روں، پہاڑی □ ل اور مکانوں کی تص□ی ابھرتی ہے۔ سالک نے اپنی فطری شائستگی کے ذریعہ پیچیدہ و خشک موضوع میں بھی ا□ ئیہ کی لطافت و چاشنی پیدا کی ہے۔ نمونہ کے طور□ ا□ی اقتباس □ حظہ کریں:

> ''جہاں کہیں□ ف کا ا□ رموجود ہو□ ہے۔ وہاں سے□ نی کی دھاریں□ □ جاری ہوجاتی ہیں اور سوائے□ دل کے' بلکہ سخت دھوپ میں اس طرح موسلا دھا□ رش کا ہو□ خوب لطف دکھا□ ہے۔ اس مصنوعی□ رش میں ا□ چ□ دل، بجلی او□ دلوں کے□ جنے کا□ م و□ ن نہیں ہو□' لیکن تیزی اور تندی میں یہ□ رش بھی یخ بستہ قدرتی□ رش کے مشابہ ہوتی ہے......لیکن آفتاب غروب ہونے اور رات کے آنے کہ□ی ہے کہ ی□ کرنے والے قطرہ اپنے اپنے□ نے کے مقاموں□ جم کر لٹک جاتے ہیں۔ ان لٹکنوں کی ش□ جو مخروطی قسم کی ہوتی ہیں، بلکہ جیسے ہرن کے سینگ□ی کھانے کی گا□ یں اور مولیاں۔'' ۷

موسم□ اں کی آمد اور موسم بہار کی زوال کی اپنی فطری خوبصورتی اور دلکشی ہوتی ہے۔لیکن وادی کشمیر میں چنار اور دیودار کے درختوں کے پتے □ تے ہیں تو سرما کی آفسردگی کا پیغام دیتے ہیں۔اس کو سالک اپنے منفرد اور دلکش □ از میں اس طرح بیان کی□ ہے:

''وہاں □ سے □ یدہ م□ اور دلگداز دہ آواز ہے، جو ا□ غمزدہ اور زردی مایل خشک پتے کے مُنہ سے اس وقت آہستہ سے □ ہے۔ □ کی وہ اپنی پیاری شاخ کی آغوش سے □ اہوکر زمین □□ ہے اور ا□ بے جان چیز کی طرح بے حس وحر□ ہو جا□ ہے۔یہ دردمند صدا اور آوا□ شاد،اس کے صدمئہ □ ائی کی آ□ ی فر□ د ہے،ہائے کیسا بیداد ہے کہ در□ □ کی شاخ کی آنکھوں کا□ را،اس سے □ اہوکر زمین □□ ہے،دونوں صدمئہ □ ائی سے بے ہوش ہیں۔ا□ سے ا□ □ یدہ مغموم ہے،لیکن پھر ملنے کی آس نہیں۔''۸ؔ

پنڈت وش□ تھ در (ماہ□) : وہ درکا□ ی اور ماہ جموی دونوں□ موں سے لکھتے تھے۔وادی کے ا□ بہترین اور صا□ ذوق ادیبوں میں سے تھے۔□ اہ کا تعلق ا□ خوش حال کشمیری گھرانے سے تھا۔ان کے والد پنڈت درگا □ شادو□ لداخ رہے۔ماہ نے □ یجو□ لاہور سے اور ماسٹرس کی تعلیم دہلی سے حاصل کی۔دہلی اور لاہور میں قیام کے دوران ان کی ادبی صلاحیتوں کو مہمیز ملی۔یہیں □ ان کی □ قات مو□ ابوالکلام آزاد،پنڈت کیفی اور علامہ اقبال جیسی شخصیات سے ہوئی۔اپنے زمانے کے اہم شعراء سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔کشمیر واپسی کے بعد وہ محکمہ تعلیم میں □ زم ہوگئے۔ان کا ذوق شاعری کی طرف □ یدہ تھا۔اس کے علاوہ انہوں نے ڈرامے مضامین اور ا□ یئے بھی لکھے۔ان کے ا□ ئیوں کے موضوع □ یدہ□ مذہبی ہیں۔ان میں''□ یم کی آہوتی''،''بھکشا''وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

قیس شیروانی: پنڈت وش□ تھ در□ کے معاصرین میں سے ہیں۔وہ جموں کے رہنے والے تھے۔وہ ا□ ء □ دازی اور شاعری کے فن میں □ طولیٰ ر□ تھے۔عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''قیس ا□ سکول میں معلّم تھے،لیکن ان کو ا□ ء□ دازی اور شاعری کی □ و□ کافی شہرت

حاصل تھی ۔اس زمانے کے کچھ نوجوان شعراءقیس سے مشورہ سخن بھی کرتے تھے ۔ان کے
شاگردوں میں فلانی وچان گی کا تذکرہ آگے آرہا ہے، جو اچھے شاعر اور انشاءپرداز تھے۔قیس
اور غلام حیدر خاں چشتی دونوں کی مشترکہ ادارت میں ''پرسباں'' شائع ہوتا تھا۔'' 9

جموں وکشمیر میں انشائیہ نگاری کے اس سفر میں ایک عرصے تک ایک خلا رہا۔کچھ عرصے کے لیے چونکہ یہاں ادیبوں کے لیے کوئی اظہار کا وسیلہ نہیں تھا۔ایک دہائی تک اس صنف کا کوئی نمونہ نہیں ملتا ہے۔پھر اردو اخبار ''مارتنڈ'' جاری ہونے کے بعد پنڈت ترلوک ناتھ جورینہ عنقا کا نام منظر پر آتا ہے۔

پنڈت ترلوک ناتھ جورینہ عنقا: عنقا کا تعلق سری نگر سے تھا۔وہ محکمہ ترقی میں ملازم تھے اور ادب میں دلچسپی رکھتے تھے۔ان کی اسی دلچسپی کی وجہ سے انشائیہ مضمون نگاری کی طرف رجحان ہوا اور کئی اچھے انشائیے لکھ کر اپنی صلاحیت کا لوہا منوالیا۔ان کا ایک تخلیقی انشائیہ ''شکستہ دل اور بلبل'' مارتنڈ میں شائع ہوا تھا جس میں ایک غمزدہ انسان کا بُلبل کے چہچہے کو سن کر جو صدمہ ہوتا ہے،اس کو بیان کیا ہے۔وہ بُلبل کو مخاطب کر کے کہتا ہے!

> ''مجھ مایوس محبت اور شکستہ دل کے چھیڑنے سے تجھے کیا ملے گا۔کچھ نہیں' حسرت و افسوس کے سوا کچھ نہیں......'' 10

پنڈت ترلوک ناتھ جورینہ عنقا کے انشائیوں میں خارجی ماحول کے شوروغل واضطراب کے ساتھ ساتھ داخلی دنیا کی بے چینیاں، دلی کیفیات کا سکون واطمینان بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔انہوں نے ان کیفیات کو انشائیہ کا موضوع بنایا ہے۔اس لیے عنقا کے انشائیوں میں ان کی ذات کی عکاسی ہوتی ہے جو ایک کامیاب انشائیہ نگار کا ضامن ہے۔

پنڈت شیام لال ولی المعروف تیرتھ کاشمیری: تیرتھ کاشمیری 1903ء میں سری نگر کے ایک ذی علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم یہیں سے پائی اور انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد محکمہ ناظم حسابات میں ملازم ہوگئے۔جہاں سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ تک ترقی کر کے سبکدوش ہوئے اور ادبی،سماجی اور مذہبی خدمات میں مصروف رہے۔چنانچہ انہوں نے 1923ء سے ہفتہ روزہ ''جیوتی'' سے اپنا ادبی سفر کا آغاز کیا اور 1931ء میں ہفتہ روزہ

’مارتنڈ‘ اور ’وتستا‘ میں باقاعدہ سے لکھ کر اپنے خوبصورت انشائیوں سے ان اخبارات کی زینت بڑھاتے رہے۔ تیرتھ کا بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے تاہم انہوں نے انشائیہ نگاری میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انشائیہ اور ادب لطیف کی وجہ سے وہ کشمیری ادیبوں میں بہت مقبول تھے۔ ان کی انشائیہ نگاری کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر سروری کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> ”تیرتھ کا خاص میدان انشائیہ اور ادب لطیف ہیں۔ یہ انداز کشمیر کے اس دور کے اکثر ادیبوں میں بہت مقبول رہا ہے اور ان میں لکھنے والوں میں تیرتھ کو ایک خصوصیت حاصل ہوگئی ہے۔“[11]

ان کے کئی انشائیے ملتے ہیں جیسے ”پارس کا پتھر“، ”سنسان بستی“، ”کتاب“، ”ہم ایک ہیں“ اور ”میں نے کہا“ وغیرہ۔ ان انشائیوں کے عنوان افسانوی انداز کے ہیں۔ ان میں موضوع، اسلوب اور زبان و بیان میں ندرت و لطافت پائی جاتی ہے اور نئے اور اچھوتے پن کے ساتھ ساتھ قاری کو سوچنے کے لیے دعوت فکر دیتا ہے۔ انشائیہ ”کتاب“ سے ایک اقتباس نمونے کے طور پر پیش خدمت ہیں:

> ”علم اور علم کی باتیں، گیان اور دھیان کے جھمیلے، فلاسفی اور فلاسفروں کے اقوال ریگستان میں ایک پیاسے سے مسافر کی طرح سُراب ثابت ہوئے ......شاید میں سمجھنے کے اہل نہ تھا......“[12]

تیرتھ کشمیری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ادبی و معاشرتی اور اصلاحی کاموں میں مصروف رہے۔ اسی دوران انہیں سماج اور سماجی رسوم، عوامی زندگی کے تیور اور معاشرتی صورت حال کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا۔ سماج کی تصویر کشی کرتے ہوئے سماج کے تمام ظاہر و پوشیدہ گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ کشمیر کی ایک اجڑی ہوئی نگری ابھیمنو رپور پر ان کا ایک اچھا تیر انشائیہ ہے۔ جس میں اس گاؤں کی زندگی اور مناظر کو یوں پیش کیا گیا ہے:

> ”اس گاؤں کا نام تھا، ابھیمنو رپور، جہاں کبھی ابھیمنو جی کا آشرم تھا لیکن اب چشمے سے دور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جس میں چند ہندو گھر آباد ہیں۔ زمینداری ان کا پیشہ ہے۔ غضب خُدا کا ایک گھر بھی ایسا نہیں جہاں عورت کی صورت دیکھنے میں آئے......عورت ان کے لیے گراں بہا جنس ہے، کیونکہ دیہاتیوں کے گھروں میں جہاں لڑکی پیدا ہو، اس کا پارسل شہریوں

کےلئے م ہوجاتا ہے اور شہری بھی وزدانِ عرب کی طرح ان کی تاک میں رہتے ہیں۔ جہاں موقع □ ، بلا تمیز عمر، اپنے لیے ایک نو □ دُلہن تلاش کی اور اپنی غیرآباد وادی کو زرخیز بنالیا۔''[۱۳]

اس انشائیہ میں مضمون نگاری کا رنگ غالب ہے۔ چونکہ وہ □ ر □ اور سنجیدہ موضوعات پر بھی لکھتے تھے اس لیے ان کے انشائیوں میں اس قسم کی پختہ کاری جھلکتی ہے □ انشائیہ نگار مضمون کی ظرافت اور لطافت کو قلم سے پھسلنے نہیں دیتے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ تاریخ جیسے خشک موضوع پر بھی ظرافت و مزاحیہ انداز میں لکھ کر اپنے ہنر کا لوہا منوایا ہے۔

پنڈت دینا تھ وار □ (شاہد کا □ ی) : پنڈت دینا تھ وار □ (شاہد کا □ ی) ایک صاحب ذوق ادیب تھے۔ وہ شاعری کرتے تھے □ ساتھ میں بہترین انشائیہ پرداز کے طور پر مقبول تھے۔ انہوں نے مذہبی اور سماجی موضوعات سے لے کر سنجیدہ اور □ ر □ نوعیت کے موضوعات پر بہترین فن پارے تخلیق کیے ہیں۔ شاہد کی ایک معرکۃ الآراء تصنیف ''رہنمائے کشمیر'' ہے۔ جو انہوں نے امرناتھ کی یاترا کے بارے میں لکھی جسے انہوں نے 1926ء میں مہاراجہ ہری سنگھ کے راج تلک کے موقع پر پیش کی تھی۔ حالی کے فن سے □ کے □ ہ تھے اور اسی کی متابعت کرتے تھے۔ لطافت اور مزاح نگاری پر ان کو کافی عبور تھا۔ شاہد کا □ ی کے انشائیوں میں ''اظہار محبت'' کو ایک بہترین فن پارہ شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مکالمے اور مضامین جو اس زمانے کے اخبار اور رسائل میں چھپتے تھے کافی معیاری ہوتے تھے۔ شاہد کا □ ی کی فنی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے عبدالقادر سروری رقمطراز ہیں:

''پنڈت دینا تھ وار □ ، جو شاہد کا □ ی کے نام سے لکھتے تھے، ایک اور وسیع دلچسپیاں رکھنے والے ادیب ہیں۔ دراب یار محلّہ ان کی جائے سکونت تھی، اور تیسرے اور چوتھے دہے میں ان کی طبیعت کی روانی عروج پر تھی۔ وہ شاعر تھے، اور خوش فکر۔ اپنے زمانے میں وہ اچھے انشا پرداز بھی تسلیم کیے جاتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شاہد کے افسانوں میں '□ پ'، 'بکھان'، اور ایک مزاحیہ افسانہ 'جواب' دلچسپ ہیں۔ ان کے دوسرے افسانے '□ ذ'، 'انتقام' اور '□ ہ' بھی قابل مطالعہ ہیں۔ ادب لطیف کے انداز کے انشائیوں میں 'اظہار محبت' اچھا پارہ ہے۔''[۱۴]

عبدالقادر سروری نے ''مارتنڈ'' کے ایک کالم کا حوالہ دیا ہے جس میں علامہ صدیقی ساقی (پردیسی) نے شاہد کاشمیری کا ایک چہرہ لکھا ہے۔ اور انہوں نے اسے نقل کیا ہے۔ اس سے شاہد کاشمیری کی نثر نگاری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

> ''[illegible] پرانی وضع کے نئے رنگ سے دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھئے یہ صاحب، جن کا تخلص شاہد ہے، ایک دبلے پتلے نوجوان، پست قد، سادہ وضع باوجود جوان ہونے کے جوش شباب کی نعمت سے محروم، شعر بہت کم کہتے ہیں، البتہ نثر اپنے رنگ میں خوب لکھتے ہیں۔ کچھ دن افسانے لکھتے رہے۔ آپ کا طرز تحریر مولانا حالی کے طرز تحریر سے ملتا جلتا ہے۔ اب درسی کتابیں لکھ رہے ہیں۔''۱۵

پنڈت گنگادھر بھٹ (دیہاتی کاشمیری): دیہاتی کاشمیری نے وادی کشمیر میں انشائیہ نگاری کا ایک نیا رُخ متعین کیا۔ طنزیہ و مزاحیہ رنگ اور ادب لطیف نے ان کے انشائیوں کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ دیہاتی 1917ء میں سری نگر سے تیس میل دور مورن میں پیدا ہوئے۔ پھر سری نگر آئے جہاں سے میٹرک تک کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد صحافت سے وابستہ ہو گئے۔ 'مارتنڈ'، 'کیسری'، 'پریورتن'، 'سواستکا' اور 'دیہاتی دنیا' جیسے رسالوں کے حلقہ ادارت میں کام کرتے رہے۔ 1940ء میں انہیں ایک سرکاری اسکول میں ملازمت مل گئی اور انٹرمیڈیٹ، ادیب کامل، ادیب فاضل، بی اے اور بی ایڈ کے امتحانات کامیاب کیے اور 1969ء میں کشمیر یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کا امتحان بھی پاس کیا۔ ان کا تخلیقی سفر بیسویں صدی کے چوتھی دہائی سے شروع ہوئی۔ بعض اوقات وہ ''دلکش کاشمیری'' کے فرضی نام سے بھی لکھتے رہے۔ ان کے انشائیوں میں مزاحیہ پن کی جھلکیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں لیکن انہیں انشائیہ نگاری میں زیادہ دلچسپی تھی۔ ان کی فطرت اور ذوق سلیم انشائیہ نگاری کی طرف مائل رہی کیونکہ وہ فطرتاً بذلہ سنج اور ظریف الطبع تھے۔ ان کے انشائیوں میں جہاں پطرس بخاری کے مزاح کی جھلک ملتی ہے تو وہیں کنہیا لال کپور کا طنزیہ لہجہ بھی پایا جاتا ہے۔ انشائیہ '[illegible]' اور 'میری پیاری' اسی کی مثال ہے۔ 'میری پیاری' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہوں:

''میری پیاری!

نہیں صا ب آپ کا قیاس غلط ہے، میں اپنی کسی محبوبہ کا حال بیان نہیں کرنے لگا ہوں بھلا چار بچوں کے باپ کی محبوبہ کون بن سکتی ہے۔عمر بھی ماشاءاللہ اڑتیس (۳۸) سے تجاوز کرنے لگی ہے۔اس لئے محبوبہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔میری پیاری بیوی! نہیں، یہ بھی نہیں، بی بی کے بارے میں کہا بھی جا سکتا ہے۔ماں باپ نے ایک لڑکی پلے باندھ دی، بندھ گئے۔اور دوسروں کی دیکھا دیکھی آپ بھی بنا اور خانہ داری بھی۔شوکت تھانوی اور امتیاز علی تاج کے سوا آج تک کسی نے بھی اپنی بیوی کے بارے میں زبان نہیں کھولی۔کھولی ہوتی تو سرکے بالوں کا صفایا ہو جاتا............''[۱۲]

آغا حسن حسرت : آغا حسن حسرت کا شمار جموں و کشمیر کے ان مایہ ناز ادیبوں میں ہوتا ہے۔جو بیرون ریاست رہ کر اپنے قلم اور ہنر کے ذریعہ اپنا اور اپنے قوم کا نام روشن کرتے رہے۔اپنی صلاحیت اور لیاقت سے میدان صحافت میں ایسا نام کمایا کہ آج بھی بڑے سے بڑا صحافی انہیں اپنا استاد مانتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔تمام عمر ادب وصحافت کی خدمت کرتے رہے۔انہوں نے مختصر عمر پائی تھی۔26 جون 1955ء میں ساٹھ برس کے عمر میں وفات پائی۔اس مختصر سی زندگی میں اتنا نام کمایا اور شہرت ملی کہ آج بھی عزت سے انہیں یاد کیا جاتا ہے۔انہوں نے کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبار ''نئی دنیا'' سے اپنی صحافیانہ زندگی کا آغاز کیا اور متعدد اخبارات سے وابستہ رہے۔جن میں 'احسان'، 'شہباز'، 'امروز'، 'نوائے وقت' اور 'زمیندار' وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔اخبارات اور رسائل کے علاوہ وہ ریڈیو سے بھی منسلک رہے۔آغا حسن حسرت کا شمار اردو کے صف اول کے انشائیہ نگاروں اور طنز نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کی تصانیف میں ''کیلے کا چھلکا''، ''پربت کی بیٹی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔دراصل ''پربت کی بیٹی'' کا موضوع ان دیوی دیوتاؤں کو بنایا گیا ہے جو ہندو عقائد کے مطابق کوہ ہمالیہ کے بلند و بالا پہاڑوں میں مقیم ہیں اور جو دنیا کے دوراں اور کارسازِ کائنات کو چلاتے ہیں۔اس میں افسانوی انداز غالب ہے اور مضمون نگاری کا اسلوب بھی نمایاں ہے۔اگر چہ یہ تاریخی کتاب ہے مصنف نے انشائیہ کے روپ میں ڈھال کر اسے دلچسپ بنایا۔''مردم دیدہ'' یہ کتاب خاکوں کا مجموعہ ہے اس میں انشائیہ نگاری کا انداز تحریر نمایاں ہے۔اس کے علاوہ ''دو ڈاکٹر'' ''پنجاب کا جغرافیہ''،

''مضامین حسرت''وغیرہ ان کے اہم کا□ مے ہیں۔انہوں نے علامہ اقبال کی ایما □''ارطغرل غازی'' کی ا□ مختصر سوانح عمری بھی لکھی ہے۔□ اغ حسن حسرت عموماً ''سن□ د جہازی'' کے قلمی□ م سے بھی لکھتے تھے۔

ان کے د□ ا□ یئے وقتاً فوقتاً مختلف رسائل و□ ئ میں شائع ہوتے رہے اسے یکجا کر کے ان کے فر□ ارجمند ظہیر الحسن جا□ نے دو مجموعوں میں شائع کیا ہے۔اس مجموعے میں بیشتر ا□ یئے طنزیہ □ از میں لکھے گئے ہیں۔انہوں نے اپنے دور کے سماجی مسائل،فرسودہ رسوم و رواج اور عقائ□ طنز کیا ہے۔سماج کے ان گوشوں □ بھی قلم اٹھا□ ہے۔جس □ عام ا□ ان کی نگاہ کی رسائی نہیں ہوتی۔ان کی خوبیوں و خامیوں □ بھی قلم اٹھا□ ہے اور صورت حال کو موضوع بنا□ ہے۔□ اغ حسن حسرت اس دور کے اد□ تھے جس دور میں مکمل اظہار رائے کی آزادی نہیں تھی۔وہ بے □ ک صحافی تھے اس لیے سماجی و سیاسی مسائل کو ا□ یئے کے ذریعے سامنے لاتے رہے۔یہ ا□ ئیہ نگار کا کمال □ ہے کہ وہ ایسے مخفی چیز کو بھی بے □ ب کرتے ہیں جس کے افشائے راز سے ا□ عام مضمون نگار کو خطرہ ہو□ ا□ ئیہ نگار کو اس کا خسارہ نہیں چک□ پ□ ہے اور اپنی □ ت کہہ کے نکل جا□ ہے۔ہلکے پھلکے □ از میں اہم □ تیں بتائی جاتی ہیں۔ان کا ا□ ا□ ئیہ بعنوان ''ر□ یو□ '' ہے۔جس میں جہاں ر□ یو کی اہمیت و افادی□ اور خامیوں کو بیان کیا ہے۔وہیں ر□ یو□ وڑ کاسٹر اور قلمکاروں کو طنز کا □ نہ بنا□ ہے۔ر□ یو میں نشر ہونے والے □ اموں اور خبروں کی تصدیق،□ ن و بیان اور معیار میں □ اوٹ آنے □ ا□ صحافی کی حیثیت سے اظہارِ افسوس کیا ہے۔□ ایسے اسلوب اختیار کیا ہے کہ اپنے اس طنزیہ وضع کو کھل کر واضح ہونے نہیں □ ہے۔اقتباس دیکھئے :

> ''اپنے و□ ء کو میری وصیت ہے کہ وہ میری قبر پکی بنا □ کہ ر□ یو کی آواز مجھ □ نہیں پہنچ سکے۔ورنہ □ ا جانے قیامت سے پہلے کتنی □ ر مجھ □ قیامت □ ر جائے اور صور اسرافیل پھو □ سے بیشتر کتنی دفعہ چو□ کے لحد میں اٹھ بیٹھوں۔''[2]

□ اغ حسن حسرت کے ا□ ئیہ لکھنے کا □ از و اسلوب □ لکل منفرد ہے۔وہ ا□ ئیوں میں ظرافت و لطافت کے ساتھ،غیر سنجیدہ موضوع اور خشک موضوع کو بھی ایسے تحر□ کرتے ہیں کہ □ ڑھنے والا کچھ لمحے کے لیے اپنے آپ کو بھول کر ان ا□ ئیوں میں کھو جا□ ہے اور تسکین □ پ□ ہے اور وہ معمولی □ اہم □ توں کا انکشاف کرتے ہیں۔ان کے یہاں دعوت فکر ملتی ہے□ ت سے □ ت نکل جاتی ہے اور ہلکے پھلکے □ از سے آغاز کرتے ہوئے کسی اہم نقطۂ عروج □ پہنچ جاتے ہیں۔ان کی مر□ □ سماجی طور طر□ اور ا□ انی □ گی کی پوشیدہ عادت و اطوار ہے۔ا□ ا□ ئیہ ''مانگ□ نگے کی

چیزیں‘ اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

’’اگر آپ نے نئی نئی شادی کی ہے اور آپ کی بیوی غیر محتاط ہے تو اسے ایک دن چپکے سے کہہ دیجیے کہ اس گھر میں جتنی چیزیں ہیں سب مانگے تانگے کی ہیں۔ اس لیے انہیں احتیاط سے برتنا۔ اسے یہ سن کر صدمہ تو ضرور ہوگا کہ لیکن آپ کی چیزیں برتنے میں احتیاط سے کام کر لیا کریں گے اور آپ کو آئے دن نئی چیزیں خریدنے کی مصیبت سے نجات مل جائے گی۔‘‘۱۸

پنڈت رام چند داس سالک: آپ کشمیر کے ایک آسودہ حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس خاندان میں علم و ادب کی روایت زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ سالک کے دادا پنڈت بیج رام داس، ڈوگروں کے ابتدائی دور میں فارسی کے اچھے شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ سالک کے والد پنڈت وشنو داس بھی شعر و ادب کا مذاق رکھتے تھے۔ اپنی خاندانی روایت اور عہد کے تقاضے کے مطابق سالک نے فارسی کی تعلیم اچھی پائی اور عربی میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ تعلیم ختم کر کے وہ سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے اور تحصیلداری کے عہدے تک پہنچے۔ کچھ عرصہ وہ بلدیہ سری نگر میں کمشنر بھی رہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے وکالت شروع کی لیکن ان کا زیادہ وقت ادبی مشاغل میں صرف ہوتا تھا۔ سالک نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ ایک اچھے انشائیہ نگار تھے اور ان کا رجحان زیادہ تر ادب لطیف کی طرف تھا۔ ان کے اسلوب میں رنگینی پائی جاتی ہے۔ زبان و بیان، انداز و تحریر، عبارات و تراکیب، تشبیہات واستعارات، محاورات و تمثیلات اور مکالموں میں ظرافت و مزاحیہ انداز پایا جاتا ہے۔ ’نوروز‘ کے موقع پر انہوں نے ’’نوروز مبارک اور میرا پیغام‘‘ کے عنوان سے ایک انشائیہ لکھا تھا۔ جس میں انہوں نے تخلیق کائنات کے فلسفیانہ موضوع کو سادہ اور دلچسپ انشائیہ کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی زندگی کے حقائق، سماجی رسوم اور تہذیب و تمدن کی تہوں کو کھول کر رکھ دیا ہے اور مذاہب کے بنیادی اتحاد پر زور دیا ہے:

’’میرے خیال کے مطابق دنیا میں تو دو ہی مذہب ہیں یعنی جتنی سرشٹی ہے اتنے ہی مذاہب ہیں۔ قسم اول میں وہ مذاہب داخل ہیں جن کا اعتقاد ناپید ہے۔ قسم دوم وہ تمام خلقت ہے جن کا اعتقاد خود اپنا اپنا الگ عقیدہ ہے خواہ وہ مقر بخدا ہوں یا نہ ہوں......‘‘۱۹

سالک کے دیگر انشائیوں میں ’جاکو راکھے سائیاں‘، ’واکو مار سکے نہ کوئی‘، ’’تیری پرارتھنا‘‘ وغیرہ قابل ذکر ہے۔

مرزا غلام حسن بیگ عارف: مرزا غلام حسن بیگ عارف کی ولادت 1910ء میں اسلام آباد اننت ناگ میں ہوئی۔ اننت ناگ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سری نگر سے سائنس مضامین کے ساتھ انٹر پاس کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی ایس سی کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حیاتیات میں ایم ایس سی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ کشمیر لوٹنے کے بعد ایس پی کالج سری نگر میں بطور ڈیمانسٹریٹر مقرر ہوئے۔ بعدازاں محکمہ سیری کلچر میں ڈپٹی ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ جہاں سے ناظم (ڈائریکٹر) کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ عارف کے والد مرزا سرفراز بیگ عالم اور فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ عارف کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی وہاں شعر و ادب کو اہمیت حاصل تھی۔ اس پُر لطف فضا میں طبیعت میں شعر و شاعری کی طرف جھکاؤ فطری بات تھی۔ قیام لاہور اور علی گڑھ کے دوران مختلف ادبی شخصیات سے فیضیاب ہوئے۔ جس سے ان کی ادبی کاوشوں کو مہمیز ملی۔ علامہ اقبال کی صحبت سے بھی مستفید ہوئے۔ انہی کے کہنے پر عارف کشمیری ادب کی طرف متوجہ ہوئے۔ عارف اردو اور کشمیری میں اچھی شاعری کرتے تھے۔ مدتوں سے ''گلریز'' کی ادارت سنبھالتے رہے۔ مزاحیہ انشائیے بھی لکھتے تھے۔ انشائیہ ''در مدح ہوٹ'' ان کی انشائیہ نگاری کی ایک عمدہ مثال ہے۔ دیکھئے:

> ''ہیون سانگ کو تم جانتے ہو؟ وہ ایک چینی سفیر تھا، جو کوئی چودہ سو برس پہلے برصغیر ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے، ایک بین الاقوامی بُدھ کانفرنس میں شرکت کے لیے کشمیر آیا تھا۔ اُس نے اور باتوں کے علاوہ ہمارے کردار کو اس طرح بیان کیا ہے، جیسے کوئی غیر ملکی سفیر آج کل کے کیریکٹر کا خاکہ کھینچ رہا ہو۔ اس نے برصغیر میں گھوم کر، لوگوں کو گائے کے دودھ کا شیدائی پایا، دودھ کی خرید و فروخت کو لوگ پاپ سمجھتے تھے لیکن کشمیر ہی ایک ایسا خطہ تھا' جہاں دودھ کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ اس میں پانی کی ملاوٹ کی جاتی تھی، بیہودہ اور لغو قسمیں کھائی جاتی تھیں۔ باوجودیکہ بڑے بڑے لامائی بڑے بڑے دانشور' اور علاّمہ اسی سرزمین سے پیدا ہوئے تھے۔''[۲۰]

پنڈت □یشیشور: پنڈت □یشیشور کا اصل□ م□تھو□ تھ مٹو تھا۔ ان کے والد پنڈت دی□ تھ مٹو دلگ□ر فارسی اور اردو کے ا□ بلن□ پا ادی□ تھے۔ جو صدیقی سامبوی کے□ م سے بھی جانے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں ایس، پی کالج سے تعلیم حاصل کی۔ کالج کے ادبی رسال□پ□ ب' کے ہندی حصہ کا □یڈ یٹر بھی رہے اور اسی میں اردو میں بھی مضامین لکھتے تھے۔□ یجو □ کے بعد انہوں نے اپنا ہفتہ وار ادبی شمارہ' ہمالیہ' نکالا۔ جو□ی دہ □ی نہ چل سکا۔ اس لیے وہ ''سواستکا'' کے ساتھ□ڑ گئے۔ ادب لطیف کے□ از میں ا□ یئے لکھتے تھے۔ ان ا□ ئیوں میں ''دو آغاؤں کی تص□ی''، ''□ گی اور موت''، ''مجھ سے نہ پوچھو''، ''گمنام قبر'' اور ''گنبد'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ''□ گی اور موت'' سے ا□ اقتباس درجہ ذیل ہے۔ جس میں ا□ ماں اپنے بچے کو سمجھاتی ہوئی یوں مخاطب ہے:

> ''یہ جیون کیا ہے؟ یہ ا□ سنگرام ہے، میرے لال، جہاں □ سے مضبوط نیز□ کام رہ جائے، جہاں ہوشیار آنکھیں دھوکا کھا جا □، اور معصوم کچلے جا □ ...... جہاں دشمن ہر دور سے رکھے ہوتے ہیں، □ وروز آرام نہیں کرنے دیتے اور ہم سنگرام کے درمیان کھڑے ہیں۔''[۲۱]

1947ء کے تقسیم ہند نے جس طرح ہن□پ ک کے تمام علاقوں کو مت□ث کیا تھا□ی □ جموں و کشمیر میں بھی اس بحرانی دور نے تمام شعبہ ہائے □ گی کو مفلوک الحال بنا□ی تھا لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ ادیبوں نے اپنے اپنے قلم کو رواں کیا اور آزادی کے بعد یہاں ا□ ئیہ لکھنے والوں کی لمبی قطار ملتی ہے۔ جو اپنی تحا□ی وقتاً فوقتاً مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع کرواتے رہے۔□□ قسمتی سے ہمارے یہ سرمایے آج ہم □ کلی طو□ نہیں پہنچ پ□ ئے۔ کچھ زمانے کی □ رہو چکے ہیں تو کچھ سیلاب کے زد میں آ گئے۔ جو کچھ مختلف اداروں اور ادب دو □ نوازوں نے اپنی ذاتی دلچسپی سے محفوظ کر کے رکھے ہیں۔ وہ بھی ان ذاتی کتب خانوں کے تہہ خانوں میں مدفون ہماری دسترس سے دور ہیں۔□ی □ کے جن ادیبوں نے 1947ء سے 1960ء□ کے عرصے میں ا□ ئیہ لکھے ہیں۔ ان میں غلام قادر، عز□ کا □ ی، غلام نبی، جگن□ تھ گوردھن سنگھ، ہنس راج ہنڈ□ ا، وش□ تھ کھجوریہ، نواب محمد۔□، بنسی لال رینہ، بلدیوراج شاستری، ڈاکٹر شری دوم، محمد□ احیم، غلام محمد مشتاق، غلام نبی، صراف، رشی□ زی، □ رکرشن رہبر، عبدالسلام او□ راچند بسمل وغیرہ کے اسمائے□ امی شامل ہیں۔

اس دور میں اور اس سے قبل بھی ا□ ئیہ نگاری شائع ہونے کا وسیلہ اخبار تھا۔ آزادی کے بعد□ی □ میں

بہتات کے ساتھ اخبار جاری ہونے لگے اس کے مد□ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ یہاں اس دور میں ان گنت ا□ ئیہ نگار پیدا ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ تمام ا□ یئے محفوظ نہیں ہیں اور ان کی کھوج وتحقیق □ ے پیمانے پر نہیں ہوئی ہیں۔ □ □ جموں وکشمیر میں اخبار کے □ اء کی اجازت سے قبل کشمیر کے اہل ادب بیرون □ □ کے مختلف شہروں سے □ والے رسائل واخبارات میں ا□ یئے، کالم اور مضمون لکھتے رہتے تھے۔ ان کے ا□ یئے اور مضامین موضوعاتی لحاظ سے کافی وسعت ر □ تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہاں کے ادیبوں میں ا□ ئیہ لکھنے کا ذوق وشوق زور پکڑ □ □۔ □ □ میں اخبارات ورسائل پر سے پابندی کے ہٹائے جانے کے بعد سے اس صنف ادب کو اور استحکام □۔

عز□ کا □ ی: اردو اخبار ''روشنی'' کشمیر کے مر□ تھے۔ وہ اپنے ا□ یئے اور مضامین ''صحافت'' میں شائع کرواتے تھے۔

جگن□ تھ خیبری نشتر کا □ ی: نشتر کا □ ی سری نگر کے رہنے والے تھے۔ وہ ای□ سرکاری اسکول میں مدرس تھے۔ ان کا شمار □ □ کے پرانے قلمکاروں میں ہو□ ہے۔ وہ عموماً مزاحیہ □ از کے ا□ یئے لکھتے تھے۔ انہوں نے تنقیدی وتحقیقی نوعیت کے مضامین بھی لکھے ہیں۔ صحافت سے دلچسپی ر □ تھے۔ جموں میں اردو اخبار ''چا□'' کے ادارئے میں لکھتے تھے۔ نشتر کا ای□ مضمون ''کھا□'' کے عنوان سے چھپا تھا۔ ان کا ای□ ا□ ئیہ جو ''خیالی پلاؤ'' کے عنوان سے ہے۔ یہ ا□ ئیہ 1949ء میں ''وکیل'' سری نگر میں شائع ہوا تھا۔ اس ا□ یئے میں ان کا ای□ خاص □ از □ یں ہو□ ہے۔ جس کو □ ے دلچسپ □ از میں پیش کیا ہے۔ اس ا□ ئیہ کا آغاز کچھ اس طرح سے ہو□ ہے:

> ''ہندوستان نے مفکر اعظم حضرت شیخ چلی علیہ الرحمتہ کو □ ا. □ بخشے کہ جن کی □ □ سے اب ہم خیالی پلاؤ کا لطف اٹھاتے ہیں اور □ جی چاہتا ہے پیٹ بھر کر شکم سیر ہو کر خیالی پلاؤ پکاتے ہیں. □ ا□ ان کو پلاؤ نہ ملتے تو یہ خیالی پلاؤ پکانے لگتا ہے۔''[۲۲]

جموں کے ای□ ذی علم خا□ ان کے تین بھائی **وشن□ تھ کھجوریہ، رام□ تھ شاستری، او□ یندر**

□ **تھ کھجوریہ** تھے۔جنہیں علم وادب سے کافی لگاؤ تھا۔وشن□ تھ کھجوریہ ڈ□ ی کے اچھے ا□□پ داز تھے۔ڈ□ ہ ادب و مصنفین کو اردو سے روشناس کروانے کے لیے وہ اردو میں بھی لکھتے تھے۔ان کے دوسرے بھائی□ وفیسر رام□ تھ شاستری مول□ آزاد میموریل کالج جموں میں سنسکرت کے□ وفیسر تھے۔ان کا شمار بھی ڈ□ ی کے اچھے ادیبوں و شاعروں میں ہو□ ہے اور اردو سے بھی انہیں لگاؤ تھا۔وہ جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز کے اردو سیکشن کے مجلس مشاورت کے بھی رکن رہے ہیں۔انہوں نے کئی علمی ومعلوماتی مضامین لکھے ہیں اور کئی ا□ یئے بھی لکھے ہیں۔ان کے چھوٹے بھائی□ یند□ تھ کھجوریہ بھی علم وادب میں اپنے بھائیوں کی طرح ذوق ر□ تھے۔انہوں نے مزاحیہ□ از کے ا□ یئے تحر□ یر کر کے ڈ□ دیس میں اس صنف کی□ ی دکو مستحکم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

غلام محمد مشتاق: غلام محمد مشتاق جو اردو اخبار ''□ مت'' کی حلقہ ادارت سنبھالتے تھے،اردو میں چند ا□ یئے لکھے ہیں۔ان کا ای□ ا□ ئیہ ''تو بھی فلک□ ل کہ زمانہ□ ل□ ی'' 1949ء میں شائع ہوا تھا۔اس زمانے کی سیاسی صورت حال متلاطم تھی۔ان کے اس ا□ یئے سے اس عہد کی عکاسی ہوتی ہے:

> ''ہمارے ملک کی□ بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہے او□ □ راس سمندر کی متلاطم خیز موجوں کو مز□ ما کر شکس□ وکودا□ الجھن اور اضطراب میں رکھے ہوئے ہیں۔لوگ کشتی کے حال اورا□ م سے بے خبر ہیں۔''۲۳

مشتاق سیاسی وسماجی مسائل□ غور وفکر کرنے کے علاوہ ادبی ذوق بھی ر□ تھے اور ادبی،سیاسی وسماجی ماحول کے□ ر□ □ زک مسائل کو ادبی□ اکتوں کے ذریعہ ا□ ئیہ کی□ ی میں□ ونے کا ہنر جا□ تھے۔ان کے ا□ ئیہ'' تنہائی'' سے ای□ اقتباس□ حظہ فرما□ :

> ''میں سوچتا ہوں اور سوچنے میں حق بجا□ ہوں کہ تنہائی ای□ ی نعمت ہے۔تصوّرات کی د□ میں کھو کر لطف□ وز ہو□ ہوں۔میں اپنے کو اکیلا اور بے بس نہیں□ ۔جن سے ملنے کی کبھی امید نہ تھی وہ□ لکل میرے قری□ بیٹھے ہیں اور بے تکلفی کے ساتھ معشوقانہ□ از میں میرے ہر سوال کا حوصلہ افزا جواب دے رہے ہیں۔''۲۴

□ وفیسر ارجن□ تھ رینہ: رینہ جغرافیہ کے استاد تھے اور□ □ کے مختلف کالجوں میں□ پڑھاتے رہے۔ وہ علم وادب کے شائقین میں سے تھے۔ سری□ ب کالج میں □ زمت کے دوران کالج کے □ ین ''□ ب'' میں لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے '□ ب' کے اگست 1950 کے شمارے میں پنڈت وش□ تھ در ماہ کے□ رے میں ای□ مضمون ا□ ئیہ کے ا□ از میں لکھا تھا۔ جس کا عنوان تھا ''ای□ شاعر جسے اردو شاعری سے بہت لگاؤ تھا''۔ مضمون کے آغاز میں رینہ دورِ غلامی کی کسمپرسیوں کا□ کرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''غلامی کی اس□ ی سل کے نیچے کتنے دبے ہوئے تھے، فرسودہ □ م کی□ ریکیوں میں کتنے کھو گئے تھے! یہ □ کچھ آج ہم کو پتا لگ رہا ہے۔ آج ہم ای□ ایسے ہی شاعر کو لا کھڑا کریں گے جسے بہت کم لوگ جا□ ہیں۔''۲۵

غلام محمد میر راجپوری: غلام محمد میر راجپوری□ □ جموں وکشمیر میں کئی اعلیٰ عہدوں□ فا□ رہے۔ وہ وز□ بھی رہے اور قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر بھی منتخب ہوئے□ قی پسند تحر□ سے کافی متا□ تھے اور□ ستی سیا□ □ میں ان کا □ ں کردار ہے۔ وہ وز□ ائے صحت اور سیا□ □ بھی رہے ہیں۔ اسی منا□ □ سے وہ بیماریوں سے بچنے کے لیے مضامین لکھتے تھے۔ سیا□ □ کے امکا□ ت□ انہوں نے کئی ا□ یئے لکھے ہیں۔ جن میں سیا□ □ کی اہمیت اور خوبیوں کا بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس کے ذریعے نوجوانوں کو حاصل روزگار کے وسائل□ بھی ا□ یئے لکھے ہیں۔ جس کے ذریعے انہوں نے نوجوانوں کی مہم پسندی کے□ ت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

□ وفیسر محی الدین حاجنی: □ وفیسر حاجنی سری نگر سے آٹھ میل کے فاصلے□ حاجن میں 1917ء میں ای□ آسودہ حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ □ وہ دو□ س کے تھے۔ ان کے والد کا انتقال ہو□۔ حاجنی ذہین اور □ صلا□ طا□ علم تھے۔ اپنی تعلیم کو جاری رکھا□ ب کالج میں عربی کے لکچرر مقرر ہو گئے او□ قی کر کے□ وفیسر بن گئے۔ ان کی اردو، عربی، کشمیری اور انگ□ ی میں درجنوں کتابیں ہیں۔ متنوع موضوعات□ ان کے بے شمار مقالے اور

مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ انہوں نے کئی انشائیے لکھے جو مختلف رسائل کی زینت بنتے رہے۔ وہ کئی علمی و ادبی اداروں سے وابستہ رہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔ اپنی آزاد طبیعت کی وجہ سے وہ تُحکم اور ناانصافی کے خلاف ہمیشہ بغاوت پر کمر بستہ رہے اور کئی مرتبہ جیل کی ہوا کھانی پڑی۔

پروفیسر حاجی اچھے انشائیہ نگار اور مضمون نگار تھے۔ ''کتاب الطّواسین'' پر ان کے مسلسل مقالات ''گلبن'' میں شائع ہوتے رہے تھے۔ اس قسم کے اہم، سنجیدہ، عالمانہ اور فلسفیانہ موضوعات سے انہوں نے اپنے وسیع مطالعہ اور پختہ شعوری کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی طبیعت میں مزاح وشوخی بھی بھری ہوئی تھی۔ وہ مزاحیہ انداز میں ادب لطیف کے چٹخارے پن میں انشائیے لکھتے تھے۔ ان کا ایک مزاحیہ انشائیہ 'بیوقوفی' رسالہ 'شہاب' کے 1953ء کے ایک شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس انشائیے میں لفظ ''وقوف'' کی وضاحت مزاحیہ انداز میں جس خوبی کے ساتھ کی ہے اُس سے انشائیہ نگار کی ظرافت اور لطافت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''چنانچہ ''وقوف'' کو ''سکون'' کا مترادف مان کر لغوی معنوں کی رو سے ہم متحرک چیز کو ''بے وقوف'' کہہ سکتے ہیں۔ اس دلیل کے پیش نظر مادی موجودات میں سوائے جمادات کے کوئی چیز ''وقوف'' نہیں بلکہ حالیہ جوہری تحقیقات کی بنا پر جمادات بھی داخلی حرکت سے بے نیاز ہونے کے سبب ''بے وقوف'' ہی کہلائی جائیں گی۔''۲۶

ان کا ایک اور دلچسپ انشائیہ ''غلط فہمی'' کے عنوان سے اسی رسالے کے دسمبر 1955ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک نمونہ دیکھئے:

> ''سطحی ملاحظہ پر یہ ظاہر ہے کہ ''غلط فہمی'' دو لفظوں سے مرکب ہے ''غلط'' اور ''فہمی''، لیکن آپ غلط کس واقعہ کو قرار دیں گے اور فہم کا کون سا مطلق انداز استعمال کر کے کہہ سکیں گے کہ سوچنے اور سمجھنے کا یہ معیار صحیح ہے اور حقیقی ذرائع درست ہیں اور بغرض محال آپ صحت معیار پر قادر ہوں گے بھی تو یہ انفرادی فیصلہ ہوگا، اجتماعی نہیں، کیونکہ آپ کے وسائل شعور میں آپ کی شخصیت سب سے زیادہ کارفرما ہے، جس کا ذاتی تقاضا یہ ہے کہ وہ باقی شخصیتوں سے ممتاز اور منفرد ہو......۔'' ۲۷

محمد علی لون : محمد علی لون□ی □ کے ای□ منجھے ہوئے فکشن نگار تھے۔ادبی ذوق کی وجہ سے طنز ومزاح اور ظرافت ولطافت میں بھی طبع آزمائی کی۔ان کے ا□ یئے معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہتے تھے۔

□ی □ جموں وکشمیر میں ابتدا سے 1960ء□ جن لوگوں نے ا□ یئے لکھے ہیں۔ان میں اختر محی الدین، مسکین□،اللہ رکھا ساغر،عبدالرحمٰن □زی اور میر محمد □زنے بھی ا□ یئے لکھے ہیں ۔□آج ان ا□ ئیوں کے قیمتی سرمائے محفوظ نہیں ہیں۔جس طرح پچھلی صدی میں□ی □ جموں وکشمیر کی صورت حال ہر اعتبار سے□ گفتہ بہ رہی ہے۔سیاسی اتھل پتھل،سماجی ومعاشرتی بحران،اقتصادی کمزوریوں اور تہذ□ ا□ رنے□ی □ جموں وکشمیر کی روزمرہ □گی کو متا□ کر کے رکھا۔اس سے یہاں کے ادی□ بھی متا□ ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔تقسیم ہند کے المیہ نے اس صورت حال کو مز□ خستہ کر□ی۔اس کے□ وجود بھی اکثر ا□ ء کی کاوشوں سے□ی □ میں ا□ یئے اور مضامین کے جو کچھ توشے تھے وہ حالات اور زمانے کے□ رہو گئے۔اور بیشتر سرمایہ ہمیں محض حوالہ جاتوں میں ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

ب: 1960ء سے 1980ء

پنڈت دینا ناتھ نادم (1916-1988): ریاست جموں و کشمیر کے مایہ ناز پنڈت دینا ناتھ نادم کی پیدائش 1916ء میں سرینگر کے ایک متوسط گھرانے میں ہوئی۔ ان کے بچپن میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ان کی والدہ نے تمام مشکلات کے باوجود انہیں تعلیم دلوائی۔ لیکن مالی مشکلات کے باعث وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ محکمہ چونگی میں ملازمت اختیار کر لی۔ جموں میں تعیناتی کے دوران انہیں شعر و شاعری کو سمجھنے کا موقعہ ملا تو وہاں کے ادبی محفلوں میں شرکت کرنے اور شاعری میں طبع آزمائی بھی کرنے لگے۔ ان دنوں اطراف کے حالات اور خود ان کی داخلی کائنات دونوں میں انتشاری صورتحال تھا۔ اور یہی درد و کیفیات ان کی شاعری کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اردو اور کشمیری دونوں زبانوں کے ادب کے فروغ میں نادم کا اہم حصہ ہے۔ پہلا کشمیری ادبی رسالہ ''کونگ پوش'' شروع کیا۔ ان کے ادبی خدمات اور کارناموں کے اعتراف میں سال 1986ء میں کشمیری شعری مجموعہ ''شیتل کول'' کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے اور دیگر کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ایک معرکتہ الآراء نظم ''میون وطن'' میرے وطن'' بہت مشہور ہے۔ ادب سے دلچسپی کے باعث انہوں نے ادب لطیف کی طرف توجہ دی۔ اپنے زمانے کے اہم اخباروں میں ان کے انشائیے شائع ہوتے تھے۔ ان کی تخلیقات وسیع عنوانات پر منقسم ہیں۔ نظم اور غزل کے علاوہ انہوں نے چند منظوم کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ کچھ مضامین اور ڈرامے بھی لکھے ہیں لیکن ان کے انشائیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ایک اچھا انشائیہ ''کاغذ کے ٹکڑے'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ جس سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''جیون خود بھی ایک حادثہ ہے...... جیون ایک حادثات کی کہانی ہے۔ جہنم کا حادثہ...... لگاؤ اور اُنس کا حادثہ...... حق کے رشتوں کا حادثہ...... کیا کیا جائے' چھٹکارے کی سعی لاحاصل ہے......'' آپے'' سے کیسے بھاگا جائے ...... ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!''۲۸

شمیم احمد شمیم: شمیم احمد شمیم ایک حقیقت پسند اور جہاں دیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنے اخبار

''آئینہ'' کے ذریعہ نہ صرف اپنی صحافیانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا بلکہ اپنے اندر پوشیدہ انشائیہ نگاری کو بروئے کار لانے میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔انہوں نے ''آئینہ'' کے ذریعہ اپنے انشائیوں کو قارئین تک پہنچایا۔ان کے انشائیوں میں جموں وکشمیر اور بیرون ریاست کی سیاسی وسماجی صورت حال،موضوع بحث گفتگو ہوتی ہے۔وہ اپنے عہد کے تمام مسائل وحالات پر غور وفکر کر کے اپنے مشاہدات کے مطابق ان مسائل کی تہہ تک قارئین کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کا واسطہ عموماً ریاست کے اعلیٰ طبقے، Bureaucrat اور سیاستدانوں سے رہا۔وہ ان شاہی طبقوں کا غریب عوام کے تئیں ظالمانہ رویئوں سے واقف تھے۔انہیں اس بات کا احساس تھا کہ ریاست کا ایک مخصوص طبقہ غریب اور نادار عوام کا خون چوسنے میں آگے آگے ہیں۔جو عوام کا استحصال کر کے ان کے حقوق تلف کر رہے ہیں۔ان کے انشائیوں میں اس ظالم طبقے کی [illegible] کی نقاب کشی کی گئی ہے۔وہ طنزیہ انداز میں ظالم و جابر طبقے کے کرتوتوں اور کارناموں کی نقاب کشائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔شمیم احمد شمیم کے بےباک اور نڈر رویے سے متعلق جان محمد آزاد یوں لکھتے ہیں:

> ''آپ کے مشاہدات تجربات بصیرت وبصارت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔انسانی زندگی کے نشیب وفراز پر گہری نظر،معمولی سے معمولی واقعہ کو اپنی باریک بین نظروں کی گرفت میں لے کر کسی شخصیت کے اندرون تک رسائی حاصل کرنا،الفاظ کا موزوں ترین استعمال اور زندگی کی شگفتگی سے لبریز تحریر۔سبھی کچھ گویا آپ پر ختم ہے۔''۲۹

شمیم احمد شمیم کے انشائیوں میں ریاست جموں وکشمیر کے رہنماؤں اور برسر اقتدار لوگوں کی سازشوں،منصوبوں اور عوام کے تئیں ان کے جابرانہ سلوک کی آئینہ داری ہو جاتی ہے۔عموماً ان کے انشائیوں کے عنوانات منفرد اور جاذب ہوتے ہیں۔انہیں لفظیات اور موضوع کے انتخاب میں بھی کمال حاصل ہے۔جس چیز کو ایک مرتبہ دیکھ لیا اس پر قلم اٹھا کر کامیابی سے انشائیہ جیسے پیچیدہ صنف کے قالب میں ڈھال دیتے تھے۔انشائیہ کو پیچیدہ صنف ادب اس لیے کہہ رہی ہوں کیونکہ اس میں مختلف سطحیں اور روپ ہوتے ہیں: ظاہر باطن۔انشائیہ میں موضوع کی ڈوری کھینچی جاتی ہے،فکر سلجھتے نہیں ہے،ایک موضوع پر بحث کرنے لگتے ہیں تو اس میں باتوں کی تہیں اور پرتیں کھلتی جاتی ہیں۔ضروری،سنجیدہ،علم و حکمت اور حکایت وفلسفے کی باتیں تو کہیں غیر سنجیدہ اور تفریحی باتیں غرض مختلف قسم کی باتیں انشائیہ میں سمیٹی جاتی ہیں۔اب یہ انشائیہ نگار کی صلاحیت واندازِ بیان پر منحصر ہے کہ وہ کس پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔جہاں تک شمیم احمد شمیم کی

□ ت ہے انہوں نے سماج اور سماجی مسائل کے لیے اپنے ا□ ئیوں کو وقف کر□ ہے۔

شمیم احمد شمیم کا □ از تحر□ و بیان محض صحافیانہ نہیں ہے بلکہ اپنی تحر□ وں میں بے□ کانہ اور جارحانہ □ از اختیار کر کے انہوں نے اردو ا□ ئیہ نگاری میں ا□ نئی روح پھو□ دی ہے۔ اس دور کی سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی کرتے ہوئے جس □ کا آغاز انہوں نے کیا وہ ان کی تحر□ وں میں صاف □ ہے۔ جان محمد آزاد کے اس اقتباس سے یہ □ ت مز□ واضح ہو جاتی ہے:

> ''شمیم کا لہجہ نشتر کی طرح کاٹتا ہے۔ اُس کے لفظ کا□ ں کی طرح چبھتے ہیں۔ ان شوخ اور بے ساختہ تحر□ وں نے آئینہ کو قار□ کے وسیع حلقوں میں اعتماد اور اعتبار بخشا۔''[۳۰]

شمیم احمد شمیم نے اپنے ا□ ئیوں میں اپنی سوچ اور فکر کی□ لیدگیوں کو سمو□ ہے۔ انہوں نے اپنے اطراف و اکناف میں رو□ ہونے والے مسائل کا ا□ حساس اد□ اور ا□ □ ر□ بیں□ ظر کی حیثیت سے مشاہدہ کر کے اظہار کیا ہے۔ انہوں نے سماجی و سیاسی، معاشی و تہذ□ صورت حال کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کیا۔ وہ سماجی□ ائیوں اور □ ابیوں کی □ □ جا کر اسباب کا پتہ لگاتے ہیں اور ان□ ائیوں کی سفا کی کو واضح کر کے اس کی □ کنی کرتے ہوئے □ آتے ہیں۔ ان کے□ د□ سیا□ اور سیاسی رہنما ہی ان□ ابیوں کی اصل وجہ ہیں اور وہی ان مسائل کے حل کرنے والے بھی، بشرطیکہ وہ ا□ ان ہوں۔ کشمیر اور کشمیر□ کو ان کے ا□ ئیوں میں مر□ □ حاصل ہے۔ وادی کشمیر میں دو متضاد خیالات کے لوگ رہتے ہیں، اول رجعت پسند و قدامت□ □، دوم جدّت پسند اور □□ طرز □ گی کے خواہاں۔ ان دو□ یت اور طرز □ گی کے تصادم سے کئی مسائل درپیش آتے ہیں۔ شمیم احمد شمیم نے ا□ ا□ ئیہ ''تفریح کا مسئلہ'' میں اس ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے:

> ''تفریح کا یہ مسئلہ□ قی کا ا□ لازمی نہیں بلکہ ا□ سماجی ضرورت بھی ہے۔ جس طرح افراد گھروں کی □ رنگی سے گھبرا کر کوئی تفریح چاہتے ہیں اور تفریح□ کر اپنے ذہنی تناؤ میں کمی محسوس کرتے ہیں اور ا□ تفریح نہ ملی تو ہنگامہ آرائی سے یہی مقصد حاصل کرتے ہیں۔ گھر میں لڑائی بھڑائی کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح قومیں بھی حیات کی معمول سے تنگ آ کر تفریح چاہتی ہیں اور اپنے ذہنی تناؤ سے چھٹکارا حاصل ک□ چاہتی ہیں اور □ یہ نہ ملے تو ہاتھ□ وَں مارتی ہیں۔ ہنگامہ آرائی کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ یہ ا□ نفسیاتی حقیقت ہے اور

ان تمام چیزوں میں ہماری حکومت، سیاسی تنظیموں، ثقافتی اداروں اور تمدنی کارکنوں کو غور کرنا ہے۔ زندگی کی دوسرے اہم مسائل میں یہ فیصلہ ہمارا دامن پکڑ کر ہم سے عمل کا طالب ہے اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ ان چھوٹے مسائل کے حل کرنے سے بڑے بڑے الجھاؤں کی گرہیں بھی کھل جاتی ہیں۔'' ۳۱

شمیم احمد شمیم نے اپنے اطراف واکناف میں ہونے والے واقعات وحالات کو بھی اپنے افسانوں میں سمو لیا ہے۔ جس میں کشمیر کی سماجی ومعاشرتی زندگی کی بدحالی اور عوام کی مفلسی وزبوں حالی کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال افسانہ ''یہ چلتے پھرتے جہنم'' ہے۔ جس میں افسانہ نگار نے کشمیر کی پُرامن اور دلفریب فضا میں غریب اور بے کس عوام کی مجبور زندگی کی طرف اپنے قارئین کی توجہ مرکوز کی ہے:

''بس میں سفر کرنے سے ''کشمکش حیات'' کی ریہرسل ہو جاتی ہے اور ایک بار آپ اس جہنم کی چار دیواری میں داخل ہو گئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میونسپلٹی کی کوڑا کرکٹ والی گاڑی میں سوار ہیں۔ سیٹیں پھٹی ہوئی، شیشے ٹوٹے ہوئے، کھڑکیوں سے چٹخیاں غائب، فرش پر دنیا بھر کی غلاظت۔ یعنی ہر وہ چیز موجود ہے جو آپ کو اپنی زندگی سے متنفر کرنے میں مدد ومعاون ہوگی۔ القصہ اگر خدا کو معلوم ہو کہ ہماری سٹی بس سروس کے منتظمین نے اس سروس میں اذیتوں کے کتنے سامان میسر کر رکھے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ جہنم کو زیادہ عبرتناک بنانے کے لیے ان کی خدمات حاصل کرنے میں تامل نہ کرے گا!۔'' ۳۲

شمیم احمد شمیم کی شخصیت اور ان کی بصیرت وبصارت ان کے افسانوں میں نمایاں ہو جاتی ہے۔ وہ ایک مخلص اور انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ بغیر کسی تفریق مذہب وملت کے وہ انسانیت کو اولیت دیتے تھے۔ انسانیت کی فروغ کی تبلیغ اور وکالت کرتے رہے۔ ان کے افسانوں میں ان کی انسان دوستی وداخلیت کی عکاسی ہو جاتی ہے۔ مثال کے لیے افسانہ ''فتح کس کی'' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ اس جنگ میں نہ کشمیری پنڈت جیتے ہیں اور نہ مسلمان۔ اس میں انسانیت جیتی ہے۔ اس کی عقلیت، اس کا تدبر، اس کی دور اندیشی اور اس کا خلوص جیتا ہے۔ آگ لگتی تو ہندو اور مسلمان دونوں کے گھر جلتے، یہ بجھ گئی تو دونوں ہی کے گھر بچ گئے۔ رادھا کی عزت

بھی محفوظ ہوگئی اور فاطمہ کی عفت بھی۔اس لیے اس کسی کو پشیماں نہیں چاہئے۔ہم میں
سے کچھ دانوں نے ہمارے من امن میں آگ لگائی تھی۔ہم نے مل کر اسے بجھا یے۔
اس میں ہم کی فتح ہوئی ہے لیکن قسمتی سے پنڈتوں اور مسلمانوں میں صحیح لیڈر ش نہ
ہونے کی وجہ سے ساتی قسم کے کچھ مینڈک نمودار ہوگئے ہیں۔جن کا واحد مقصد اپنی
شخصیت کو من اور اپنی دکان چمکا ہے۔''۳۳

انہوں نے اپنے ا ئیوں میں طنز ومزاح کا بھی سہارا لیا ہے۔اپنی دل کی ت کو جس طر سے ا ئیوں
کے قا میں ڈھال کر پیش کیا ہے اس سے ان کی سیاسی یت واختلافات کا بھر پور ازہ ہوجا ہے۔ان کی
فطرت میں غیر معمولی رپن، ب کی اور صاف گوئی شامل تھی۔انہوں نے وکا کے پیشے میں منافع پ نے
سیا میں بھی طبع آزمائی کی، مختلف تجربہ کار سیاستدانوں کے حلقے میں رہے لیکن ان کی تجربہ کاری، محدود وسائل اور
غیر مستقل مزاجی کی وجہ سے سیا میں بھی کامیاب نہ ہوسکے۔اس لیے سیا اور سیاسی یت کی خامیوں کے
متلاشی آتے ہے۔ای مثال ذیل ہے:

''لیکن پچھلے ای دو ہفتوں میں اس بے میں کسی قدر کمی واقع ہوئی ہے، بلکہ میں ماسٹر
صا سے راض بھی ہوں کہ گائے کے بہت سے فا ے بتاتے ہوئے انھوں نے''
اصلی گائے'' سے واقف رکھا۔ابھی حال ہی میں مجھ یہ راز کھل ی کہ گائے کا سے
اہم فا ہ یہ ہے کہ اس کے م الکشن لڑا جا سکتا ہے۔پچھلے دنوں بھارتیہ جن سنگھ نے گائے
کے تئیں محبت، عقیدت اور سخاوت کا جو مظاہرہ کیا اس سے ی ت . ہوگئی ہے کہ گائے
میں انت ت جتوانے کی ی غیر معمولی صلاحیتیں ہیں۔ورنہ ہ رالکشن سے چند ماہ پہلے
جن سنگھیوں اور مہا بھارتیوں کو گائے کا عشق کیوں ستانے لگتا ہے۔''۳۴

جان محمد آزاد نے شمیم احمد شمیم کو قری سے دیکھا ہے اس لیے انہیں ان کے یت وتفکرات اور شخصیت کو
سمجھنے کا موقعہ ۔وہ یوں رقمطراز ہیں :

''نفسیات کی یہ تہہ درتہہ ہیں کھولنا اور قاری کے شعور لیدگیوں کی نئی رفعتوں پہنچا
آپ کے تنقیدی مضامین کا خاصا رہا ہے۔''۳۵

اختصار، جامعیت اور عدم تکمیل ایک اچھے انشائیہ کی اہم صفات ہیں۔ شیم احمد شمیم کے انشائیوں میں یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ ان کے اسلوب نگارش میں ندرت، صفائی اور روانی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جا بجا ظرافت کی چاشنی ملتی ہے۔ وہ فطری طور پر ظریف اور نکتہ چین ہیں۔ ان کے طرز نگارش و لہجہ میں جہاں مسکراہٹیں ہیں وہیں طنز کی اصلاحی نشتر بھی موجود ہے۔

پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ: پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ 1944ء میں حسن آباد رینا وری سری نگر میں پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے بی ایڈ مکمل ہوتے ہی کشمیر یونیورسٹی میں شعبہ اردو و کشمیری میں لیکچرر شپ کی نوکری مل گئی تدریسی کام کے دوران انہوں نے اعلیٰ تعلیم کا سفر بھی جاری رکھا۔ مرزا دبیر پر اپنا شہرۂ آفاق تحقیقی مقالہ ''مرزا دبیر حیات و کارنامے'' کے عنوان سے لکھ کر کشمیر یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی۔ یہ کتاب آج برصغیر کے کئی جامعات کے نصاب میں شامل ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں برسوں پڑھاتے رہے، لیکچرر شپ سے ترقی کر کے پروفیسر، صدر شعبہ اور ڈین کے عہدۂ جلیلہ فائض پر رہ کر سبکدوش ہوئے۔ وہ مختلف اداروں اور انجمنوں کے ساتھ منسلک ہیں۔ CIIL میسور اور ساہتیہ اکادمی کے لائف ٹائم ممبر ہیں۔ ان کی پچاس سے زائد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے بچپن سے ہی شروع ہوا ہے۔ بقول مصنف:

> ''باقاعدگی سے والد صاحب کے خطوط کا جواب دینا' اپنی والدہ کو پڑھ کے سنانا، والد صاحب کو گھر کی ضروریات کا احساس دلانا، وغیرہ یہ سب میرے خطوط میں ہوتا تھا۔ ہر بات بے تکلفی سے لکھ دیتا۔ اگر تکلف ہوتا تو صرف اپنی ذات کے ساتھ......اس بات سے تو انکار نہیں کہ بہر حال وہ خطوط بچپن کے تھے لیکن اس طرح خط لکھنا میرا ایک پسندیدہ شغل بن گیا۔''۳۶

وہ کشمیری اور اردو دونوں زبانوں کے ایک مایہ ناز ادیب ہیں۔ شاعری بھی کرتے ہیں۔ لیکن انشائیے کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک پختہ، سنجیدہ اور بذلہ سنج ادیب کی شخصیت کی جھلک ان کے کلام اور تحاریر میں نظر آتی ہے۔ وہ ایک خوش مزاج مخلص شخصیت کے مالک ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے قلم سے انشائیے

ایسے لکھے ہیں کہ ان میں طنز ہی نہیں آتا بلکہ لطافت ہی لطافت ہے، تلخی کہیں نہیں بلکہ شگفتگی اور ظرافت از اول تا آخر پائی جاتی ہے۔ جب ہم ان سے بات کرتے ہیں تب بھی وہ کسی اہم وسنجیدہ موضوع پر بات کرتے وقت بھی شگفتگی اور لہجے سے بات کرتے ہیں۔

جموں وکشمیر میں انشائیہ نگاری کو فروغ دینے میں پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ کا اہم رول ہے۔ انہوں نے ہی ریاست میں انشائیہ نگاری کو ایک نئی جہت دی۔ ان کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ ''غبار خیال'' 1973ء میں شائع ہوا۔ یہیں سے ان کی انشائیہ نگاری کا سلسلہ شروع ہوا جو ہنوز جاری ہے۔ 'غبار خیال' کے بعد یکے بعد دیگرے اردو اور کشمیری زبانوں میں کئی تخلیقات منظر عام پر آئیں۔ اب تک آٹھ انشائیوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں تین کشمیری انشائیے ''فکر تکر''، ''ہنہ پوش'' اور ''ایسے'' شامل ہیں۔ 'ایسے' پر انہیں ساہتیہ اکادمی کی جانب سے انعام سے نوازا گیا ہے۔ اردو انشائیوں میں ''غبار خیال'' کے بعد ''شیرین کے خطوط''، ''غبار کاروان''، ''کا ...''، ''گلدستہ'' اور ''سن تو سہی'' شائع ہوئے۔ ''غبار کارواں'' کو جموں وکشمیر کلچرل اکادمی اور یوپی اردو اکادمی نے انعامات سے نوازا۔ انشائیوں کے مجموعہ ''سن تو سہی'' کو اتر پردیش، آندھرا پردیش اور مغربی بنگال کی اردو اکادمیوں نے انعامات سے نوازا ہے۔

پروفیسر زماں آزردہ شاعری، افسانہ نگاری، انشائیہ نگاری، فکاہیہ تحریر، تحقیق وتنقید اور درس وتدریس میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ ان کی انشائیہ نگاری کے بارے میں مختلف ماہرین ادب اپنی آراء سے مصنف کی صلاحیت اور فن پر گفتگو کر کے داد تحسین پیش کر چکے ہیں۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن کا 'غبار خیال' کے بارے میں کہنا ہے:

> ''غبار خیال'' کے انشائیوں میں جذبات ہیں اور جذبوں کے آہنگ کا جس طرح اظہار ہوا ہے۔ ان سے زماں صاحب کے داخلی ہیجان اور ذہن کی لہروں پر تیز دوڑتی ہوئی چنگاریوں کی بے تابی، اُن کی منتشر کیفیتوں اور لفظوں کی صورتوں میں ان کی آزادی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ داخلی ہیجان، بے تاب چنگاریوں کا تیز اور ان چنگاریوں کا انتشار اور ان کی آزادی۔ اس آرٹ کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ محمد زمان کے انشائیوں کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان بنیادی خصوصیات سے واقف ہیں۔ محسوساتی اور طنزیہ انداز اختیار کر کے اپنی تخلیقات کو اور جاندار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی سوچ اور ان کی محنت اور

فرصت سے یہ آرٹ ان کا اپنا آرٹ بن سکتا ہے۔''[۳۷]

پروفیسر زماں آزردہ کا تعلق درس و تدریس سے ہے۔ تحقیق و تنقید جیسے سنجیدہ اور تفکر انگیز شعبے سے وابستہ رہنے کے باوجود بھی ان کا رجحان کب اور کس طرح انشائیہ جیسے ظریف و لطیف صنف ادب کی طرف مائل ہوا، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ سفر واقعتاً آزمائش اور دقت طلب رہا ہوگا۔ یہ ان کی برسوں کی محنت و ریاضت کا ہی نتیجہ اور ثمرہ ہے کہ آج وہ کشمیر کے یکتائے روزگار انشائیہ نگار ہیں۔ انہوں نے 1960ء کی دہائی سے انشائیہ لکھنا شروع کیا جو اب بھی مسلسل جاری ہے۔ ان کے بیشتر انشائیے ریڈیو کشمیر سرینگر سے نشر ہوتے تھے۔ جن سے ریڈیو کے سامعین نہ صرف لطف اندوز ہوتے تھے بلکہ ان کے اذہان و قلوب ان کے انشائیوں سے متاثر رہتے تھے۔ اس زمانے میں آج کی طرح سوشل میڈیا اور دوسرے ترقی وسائل موجود نہیں تھے۔ عوام الناس کے لیے دنیا سے جڑنے، خبر سننے اور تفریح طبع کے لیے صرف ریڈیو ہی دستیاب تھا۔ اس لیے ریڈیو پر نشر ہونے والے مضامین کو ہر خاص و عام گھر بیٹھے بیٹھے شوق سے سنتے تھے۔ ان کے انشائیوں کو نہ صرف ریاستی عوام بلکہ بیرون ریاست کے لوگ بھی بڑے شوق سے سنتے اور محظوظ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر اے۔ آر بیگ پروفیسر زماں آزردہ کے انشائیہ نگاری پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں :

> ''زماں آزردہ کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ خوشگوار موڈ میں اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اپنے خیالات کو نئے اور انوکھے انداز میں پیش کرتے ہیں تو نہ صرب ان کی فلسفیانہ سوچ اور خوش طبعی کے جوہر ہم پر عیاں ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے قاری کو افراد و اشیاء اور واقعات کو ایک نئے تناظر میں دکھا کر ایک لطیف و انبساطی کیفیت اور نئے تازہ احساس سے دوچار کرتے ہیں اور غور و فکر کا ایک نیا زاویہ بھی فراہم کرتے ہیں۔''[۳۸]

پروفیسر زماں آزردہ کی شخصیت میں بظاہر کم گوئی، سنجیدہ پن اور مستغرق الخیالی نظر آتی ہے۔ لیکن ان کی داخلی کائنات میں ایک ایسی شخصیت اور مزاج پوشیدہ ہے جس میں شوخی، بذلہ سنجی اور لطافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی اور غیر اہم چیزوں کو جس انداز میں پیش کرتے ہیں اس سے نہ صرف اس چیز یا اشیاء کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے بلکہ اس شے کی مختلف تہیں کھلتی جاتی ہے۔ انشائیہ غیر مرئی (Invisible) شئے کو آشکار بنا دیتا ہے اور اُس میں ایک نئی روح پھونک کر پیش کرنا انشائیہ کا لازمی اور اہم فن ہے۔ مصنف اس فن میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

انشائیہ ۔۔۔۔۔سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

''دل بظاہر خوں کا ایک لوتھڑا ہے۔ جسامت کے لحاظ سے یہ ایک بند مٹھی کے برابر ہے۔ دل سے انسان کی زندگی کا آغاز بھی ہوتا ہے۔ اور اسی پر اختتام بھی۔ ایک انسان کی ابتداء بھی یہی ہے اور انتہا بھی یہی۔ نباض عالم نے جو کچھ دنیا میں بنایا ہے۔ اس کے عکوس پر انسان میں بھی ملتے ہیں۔ ندیوں اور نالوں کا زور وشور سے بہنا وریدوں اور شریانوں میں پایا جاتا ہے۔ جسم سے باہر کی فوٹو گرافی کرنے میں بہر صورت آنکھیں پیش پیش ہیں۔ مختلف اُبھار پہاڑوں اور ٹیلوں سے مشابہ ہیں نروس سسٹم برقی اور نشریات سے میل کھاتا ہے۔ اور دل سمندر کا درجہ رکھتا ہے۔ جس میں ہر وقت خون کا خزانہ رہتا ہے۔ ایک طرف سے خون کا اخراج ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف سے خون اس میں داخل ہوتا رہتا ہے۔ جس طرح پانی ادھر اُدھر سے گشت لگا کر سمندر میں آتا ہے اسی طرح خون کا بھی ہوتا ہے۔''۳۹

صنف انشائیہ کی اپنی پہچان اور فنی لوازمات ہیں۔ جس سے اس صنف کی شناخت اور انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ یوں تو اصناف ادب کے مختلف بنیادی خصوصیات اور مزاج ہوتی ہیں۔ کہیں کہانی کی صورت میں، کہیں قصے کی صورت میں کہیں حقیقت بیانی تو کہیں قصہ خوانی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن انشائیہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں نہ کہانی ہوتی ہے اور نہ ہی انکشاف ذات وقصہ خوانی۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں بات سے بات نکلتی جاتی ہے بالکل اس طرح جس طرح دو دوست آپس میں محو گفتگو ہیں، دوران گفتگو مختلف موضوعات پر اہم اور غیر اہم تمام قسم کی باتیں ہوتی ہے۔ انشائیہ بالکل اسی طرح کی بات سے بات نکلنے والی صنف ادب ہے۔ یہی بے ربط و بے تسلسل اور الجھی ہوئی گتھی اس صنف کی خاص پہچان ہے، لیکن بنیادی شرط انداز بیان میں لطافت وظرافت اور شوخی بیان ہے جو پروفیسر زماں آزردہ کے انشائیوں میں اس کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔

ان کے انشائیوں کا موضوع متنوع و وسیع ہے۔ انہوں نے مختلف مسائل پر مختلف واقعات اور اشیا کو انشائیہ کے قالب میں ڈھالا ہے۔ عام فہم اور معمولی سے معمولی موضوع میں اپنے تخیل اور طرز تحریر کے ذریعہ سے روح پھونک دی ہے جس سے ان کے انشائیوں میں تازگی، شگفتگی ندرت اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ میاں بیوی کے ازدواجی رشتے، گھریلو مسائل، عورتوں کے مسائل ایسے ہیں جو بظاہر عام فہم ہے لیکن انھوں نے اس انداز سے ضبط تحریر میں لایا

ہے کہ اس میں انوکھا پن اور اچھوتا پن پایا جاتا ہے۔ ''تعلیم نسواں'' کے بارے میں ایک انشائیہ ہے۔ اس میں یوں لکھتے ہیں:

''اول تو یہ دیکھنا ہے کہ لڑکی کی زندگی کس سے وابستہ ہے۔ اور ایسے لوگوں کے ساتھ کس طرح گذاری جاسکتی ہے اس سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ لڑکی کی زندگی کی کامیابی کا دارومدار لڑکوں پر ہے۔ اگر وہ اسے صحیح درجہ نہیں دیتے۔ تو اس کی قیمت کچھ بھی نہیں رہتی۔ اس لیے لڑکی کی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ لڑکوں کو شیشے میں اتارنے میں کامیاب رہے۔ وہ کون سے طریقے ہیں اور کس طرح حاصل کی جاسکتی ہیں۔''

وادی کشمیر کی تاریخ اور سماجی و سیاسی مسائل پر یوں تو ہر صاحب فکر ادیب سنجیدگی سے غور کر کے اپنے انداز میں وجہ اور حل تلاش کرتے ہیں لیکن مقامی ادیبوں کے یہاں مسئلہ کشمیر کی نہ صرف زیادہ اہمیت پائی جاتی ہے بلکہ اس سے ابھرنے والے بیشتر مسائل پر پریشانیوں، عوام کی بے بسی، نوجوانوں کی شہادت، ماں بہنوں کی آبروریزی، بچوں کی یتیمی اور بے شمار مسائل ہیں۔ جنہیں مقامی ادیب قریب سے دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں۔ پروفیسر زماں آزردہ کا تعلق چونکہ وادی کشمیر سے ہے جہاں آئے روز جانے کیسے کیسے دل دہلا دینے والے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کے آئینہ میں مسئلہ کشمیر پر بے شمار انشائیے لکھے ہیں۔ جن میں عوام کے تئیں محبت و خلوص کے ساتھ ساتھ سیاسی رہنماؤں سے بے زاری اور شکوہ شکایت دیکھنے کو ملتی ہیں۔

انشائیہ کی بنیاد لطافت و شگفتگی پر ہے۔ اس کے علاوہ اگر طنز و مزاح کا چٹخارہ پن نہ ہو تو انشائیہ میں وہ خوبیاں نہیں ملتی جس سے انشائیہ اور مضمون کو الگ کر سکے۔ پروفیسر زماں آزردہ کے انشائیوں میں سماج کے مختلف طبقوں پر طنزیہ فقرے ملتے ہیں خاص طور سے نام نہاد سیاسی لیڈروں اور کارکنوں سے متعلق، سیاسیدانوں کے ڈپلومیٹک باتوں، جھوٹے وعدوں، عوام کے استحصال اور دکھوں کو انہوں نے کھل کر لکھا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''سیاسی لیڈروں کی یادداشت بہت تیز ہوتی ہیں۔ اس قوت پر انھیں پورا قابو ہوتا ہے۔ جب چاہیں اس کو بروے کار لاتے ہیں۔ البتہ غریب عوام اس قوت سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ وہ تو صرف پانچ سال کے عرصے میں ہی اپنے نمائندوں کو بھول بھی جاتے ہیں۔ بھلا ہو ان کا جو ہر پانچ سال کے بعد آ کر خوب یاد دلاتے ہیں کہ انھوں نے پانچ سال قبل ووٹ کس کو دیا

تھا۔۔۔انتخابات کے زمانے میں لیڈر ایک ایک ووٹ کو پہچان لیتے ہیں.....اس کے بعد ان کی یادداشت ایسی غائب ہو جاتی ہے جیسے سرمایہ حاصل کرنے کے بعد عقل۔میرا خیال ہے کہ لیڈر کی یادداشت ایک گاڑی ہوتی ہے جو پانچ سال تک گیراج میں رہنے کے بعد اچانک سڑکوں پر دوڑتی نظر آجاتی ہے......ایک سیاسی رہنما کا مجھے قصہ یاد ہے جن کی خدمت میں ہم ایک منتخب قائد کی قیادت میں وفد کی صورت میں گئے تھے......منتیں کر کر کے ہم نے ان کو اس حقیر وفد کی قیادت کے لیے راضی کیا تھا......وہاں پہنچ کر نصف دائرے کی شکل میں با ادب کھڑے ہو گئے اور ایک سرے پر ہمارے منتخب قائد دل ہی دل میں بڑے چاؤ سے ہونے والی گفتگو کا ریہرسل کرنے لگے۔ملاقات سے شرفیاب ہوئے تو رہنما نے دوسرے سرے سے ملنا شروع کیا۔ نام لے لے کر ہم سے مصافحہ کیا۔خیریت پوچھی۔میرا تو خیال ہے کہ کہیں سے جھانک رہے تھے اور کوئی ان کو ہمارے نام بتا رہا تھا۔۔۔ورنہ ہم سے کیا جان پہچان تھی۔۔۔اور آخر میں ہمارے قائد کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ قائد بیچارے تو اپنے اندر اس طرح سمیٹ کر رہ گئے کہ عمر بھر آپ سے باہر آنے کا نام نہ لیتے ...... میں نے ان کی خفت کم کرنے کے لئے بڑے اچھے الفاظ میں ان کا تعارف کرایا تو بولے اچھا ٹھیک ہے۔کہیں دیکھا ہے ان کو! یہ حال دیکھ کر ہم بغیر کام بتائے واپس چلے آئے کہ کہیں ہم کو پہچاننے سے بھی انکار نہ کر بیٹھیں۔یہی وجہ ہے کہ سیاسی لیڈر ہمیشہ گول سا جواب دیتے ہیں۔سوائے انتخابات کے زمانے کے۔‘‘[۱۴]

زماں آزردہ کے متعدد انشائیے، ازدواجی رشتے، گھریلو مسائل، میاں بیوی کے باہمی تعلقات، نوک جھونک کو حسین اور خوبصورت انداز میں پیش کر کے لکھے گئے ہیں۔قدرت کے نظام میں مرد عورت کے رشتے کو اہم بنایا گیا ہے۔اور ایک جاندار سماج کا تصور شادی اور مرد و زن کے تعلقات کے بغیر ممکن نہیں۔میاں بیوی کی شادی شدہ زندگی کو سب سے مقدس اور نازک محبوب رشتوں میں سے ایک مانا گیا ہے۔انشائیہ نگار نے اس رشتے میں آنے والے مسائل کی پیچیدگیوں کے علاوہ روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کو انشائیے کے روپ میں ابھارا ہے۔انشائیہ ’’گھر اور ادیب، روداد۔ایک خاندان کی‘‘،اور’’شامت اعمال۔میں نے شادی کی‘‘وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہے:

''آپ لاکھ اپنے کمالات کا ذکر گھر میں کیجئے رہیں گے آپ گھر میں وہی جو آپ گھر میں ہو تے ہیں۔ آپ کے کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک سادھو ان دھیان میں کمال رکھتے تھے۔ سب ان کے کمال سے متعارف تھے۔ ان کی مہان بیوی ان کو خاطر میں کیوں لاتیں۔ وہ ہمیشہ سادھو کا مذاق اڑاتی تھیں۔ ایک دن سادھو اپنا کمال دکھانے کی غرض سے اڑنے لگے اور اپنے گھر کی چھت کے اوپر سے بھی گزرے، اس دن جب گھر لوٹے تو بیوی نے کہا۔ ''آج تمھاری اصلیت سامنے آ گئی۔ تم کہتے تھے کہ مجھ سے بڑا سادھو کوئی ہے ہی نہیں۔ آج ہم نے ایک سادھو مہاراج کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا۔ بس سادھو ہو تو ایسا! تم تو صرف شیخیاں بگھارتے ہو'' سادھو دل میں خوش ہوئے۔ سیروں خون بڑھ گیا اور سوچنے لگے کہ آج قضیہ پاک ہو گیا۔ بیوی رام ہو گئی اب ہم گھر میں ہی سادھو ہوں گے اس لیے کہنے لگے۔

''وہ تو میں ہی تھا''۔

اس پر وہ بولیں ''اچھا! تو یہ تم ہی تھے۔ اس لئے تو ٹیڑھے ٹیڑھے اڑ رہے تھے۔''[۴۲]

پروفیسر موصوف کے انشائیوں میں ان کے تجربات و مشاہدات کا دائرہ پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں سماجی، سیاسی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی کوششوں و سرگرمیوں، ان کے عوامل اور ان گوشوں پر بھی روشنی ڈالی ہے جہاں ایک عام انسان کی ذہن اور سوچ کی رسائی نہیں ہوتی۔ انشائیہ ''باز آئے قرض لینے سے'' کے اقتباس کا یہ حصہ ملاحظہ کیجئے:

''پیروں اور چادر کی یہ کھینچا تانی آدمی کو حضرت قرض کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبوری دیتی ہے۔ ادھر قرض لے کر کھانے سے معدے میں وسعت، بدن میں اضافہ اور ہاتھ پاؤں میں تھل پیدا ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بعد میں انسان اپنے پاؤں سے حضرت قرض کے دروازے تک چلنے کا اور ہاتھوں سے یہ دروازہ کھٹکھٹانے کا کام لیتا ہے اور زبان پر میر کا یہ شعر رہتا ہے۔

جاتا نہ تھا جہاں مجھے بے بار رواں کیا صنف قوئی سے دست بہ دیوار رواں کیا[۴۳]

انہوں نے معاشرے میں پلنے والے تمام مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ سیاسی وسماجی ہوں یا معاشی ومعاشرتی، تمام گوشوں پر ان کا گہرا مشاہدہ اور ہے۔ وہ ایک ذمہ دار شہری ہونے کے ناطے ہر مسئلے کا حل تلاش کرتے رہتے ہیں۔ عورتوں اور ان کے ساتھ درپیش مسائل پر، ''شیرین کے خطوط'' کے عنوان سے پوری ایک کتاب مختص ہے۔ ''شیرین کے خطوط'' میں انہوں نے انی د کو دکیا ہے اس پوری کتاب میں انی آواز گونجتی ہے، عورت سے متعلق گھر مسائل، ان کی خواہشات، طرز زندگی، رسوم، تمام چیزوں کو انہوں نے شیرین اور سلمیٰ کے خطوط کے ذریعہ آشکار کیا ہے۔ ''سلمیٰ'' ایک بن بیاہی لڑکی ہے۔ جس کی عمر اب ڈھل رہی ہے۔ والد کے سایہ شفقت سے محروم، علیل ماں اور مزدور بھائی کے کاندھوں کی بوجھ پڑی لکھی بے روزگار، منا رشتے کی متلاشی جہیز کی استطا نہ ہونے کی وجہ سے اپنا گھر نہیں بسا سکتی۔ سلمیٰ اپنی سہیلی شیرین کو خطوط کے ذریعہ اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہوئی آتی ہے۔ حقیقت نگاری پر ان ا ئیوں میں مجبور عورتوں کی آہ وفغاں اور سسکیاں واضح محسوس ہوتی ہیں۔ عورتوں کو درپیش ایک ایک مسائل کو واضح کیا ہے۔ عام طور پر ہر سماج میں 'جہیز' کو لعنت سمجھتا ہے اس کے باوجود بھی لوگ اس لعنت کو سماجی روایت بنا رہے ہیں۔ اس انی کا طنزیہ طور پر دفاعی رخ طنز وظرافت کی عمدہ مثال ہے۔ اقتباس :

> ''سلمیٰ ویسے بھی مجھے تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں۔ تم نے جہیز کی رسم شروع کرنے والے کو کوسا۔ بھلا یہ کہاں کی ا ہے کہ ہم ان کو قصوروار ٹھہرا ۔ انہوں نے اپنی طرف سے اچھا کیا تھا۔ ا نی ذہن کوئی MATHMATICAL PROPOSITION تو ہے نہیں کہ ہرایک کا خیال ایک ہو اور پھر انہوں نے کسی بری نیت سے شروع نہیں کیا ہوگا۔ بھلا تم ہی بتاؤ، ایک لڑکی جسے ماں باپ نے ناز وں سے پالا ہو، جس کے لئے انہوں نے دن رات ایک کیے ہوں اور اپنی شفقت سے اس کو نازک مزاج بھی بنایا ہو۔ وہ دوسرے گھر میں چلی جائے، جہاں لوگ اجنبی ہوں گے۔ جہاں کے رسوم مختلف ہوں گے۔ ماحول ہوگا خیالات نئے ہوں گے اور صبح شام نئے ہوں گے۔۔۔۔۔۔۔ ایسے میں اگر اس لڑکی کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو اس کا سہارا کیا ہوگا کسی کے بچے نہیں ہوتے یا کسی کے ہوکر بھی مرجاتے ہیں۔ ایسی لڑکی کیا کرے گی۔ اس وقت اس کے سہارے کے لئے کچھ بھی نہ ہو تو یہ کہاں کا ا ف ہوگا۔ فرض کیجئے کوئی بیوہ ہوجائے تو اس کے لئے کیا سہارا ہے۔ مان لیجئے اس کے

میاں کی کوئی جائداد نہیں تو وہ کیا کرے۔ پھر تم ان کو کیوں کوستی ہے جنہوں نے جہیز کی رسم شروع کیا۔''۴۴

پروفیسر زماں آزردہ سادہ اور خوبصورت زبان میں روانی کے ساتھ انشائیوں میں برمحل و مواقع کشمیری اور اردو کے ضرب الامثال کا استعمال کرتے ہیں۔ اور محاورات اور تمثیلات کا بھی جا بجا سہارا لیتے ہیں۔ ان کی زبان میں شگفتگی اور شیرینی پائی جاتی ہے۔ انشائیہ کی مناسبت سے لطافت و ظرافت سے بھرپور ایسے الفاظ، جملے اور ایک چن لیتے ہیں جس سے قاری کے ذہن و قلب پر گہرے تاثرات مرتب ہوں۔ ان کے انشائیوں کے مطالعہ کے دوران قاری زیر لب مسکرانے کے ساتھ ساتھ قہقہہ لگانے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ پروفیسر زماں آزردہ شاعر بھی ہیں۔ وہ انشائیوں میں بہ ضرورت اردو کے مختلف شعراء کے کلام کے علاوہ خود اپنے اشعار کا بھی گاہ بگاہ استعمال کرتے ہیں۔ نمونے کے طور پر ان کے بعض قطعات ملاحظہ فرمائیے۔

تجھے دیکھ کر وعظ بھولے ہیں واعظ — زاہد سے چھوٹی وضع زاہدانہ

بنے ہیں راہب کہ جب میں آکر — ترنم سے چھیڑی غزل عاشقانہ

پروفیسر زماں آزردہ کے انشائیوں کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ اپنے دلکش انداز بیان، اسلوب کی تازہ کاری، ہلکے پھلکے موضوعات، انوکھے اور لطیف انداز بیان کی وجہ سے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کے انشائیے اپنے اطراف و اکناف کی موجودگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں درپیش واقعات و حالات پر انہوں نے ایک حساس ادیب کی طرح فلسفیانہ انداز سے سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں فلسفیانہ انداز بیان کے ذریعے معنی کی ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی اسلوب میں تازگی اور لطافت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ انشائیہ ''جوانی'' سے اقتباس کا ایک نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

> دنیا والوں کی سوچ بھی اس قدر الٹی ہے کہ وہ کسی چیز کی اہمیت اس وقت محسوس کرتے ہیں۔ جب وہ سامنے نہ ہو۔ جس وقت وہ چیز پاس رہ کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے تو یہ بے خبر پڑے رہتے ہیں۔ دراصل انسان کے حصے میں دو ہی چیزیں آتی ہیں یا تو امیدیں رکھنا یا پچھتانا۔''۴۵

ڈاکٹر منصور احمد منصور پروفیسر زماں آزردہ کی انشائیہ نگاری کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کچھ

اس طرح لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر آزردہ متضاد کیفیات، حالات اور واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ حقیقت کے دونوں ہی رخ سامنے آجاتے ہیں۔ حقیقتیں اپنے آپ میں تجزیے میں ٹھوس اور جامد ہوتی ہیں البتہ مشاہدہ کرنے والی نگاہیں رنگ برنگی ہوتی ہیں۔ افسانہ نگار اس رنگارنگی کو لفظوں میں قید کرتا ہے۔ اپنے افسانوں میں ان کا عکس پیش کرتا ہے۔ وہ حقیقت کو ٹھوس اور جامد صورت میں نہیں دیکھتا بلکہ ٹھوس اشیا اور حقائق پر افسانہ نگار کی نگاہ بار بار پھسلتی رہتی ہے۔ جو کہانی میں کہی جانی رہ گئی ہو وہ اسے گرفت میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک افسانہ نگار کا یہی طرۂ امتیاز ہے کہ وہ دیکھی بھالی، ڈھلی ڈھلائی، سجی سجائی چیزوں کے ان دیکھے، ان کہے اور ان چھوئے پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ آزردہ صاحب بھی زندگی اور اس کے مظاہر کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہیں۔'' ۴۶

الغرض پروفیسر زماں آزردہ کے افسانوں میں حقیقت پسندی اور صداقت پسندی کا احساس ملتا ہے۔ انہوں نے متنوع و متضاد موضوع پر گہرائی و گیرائی سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کے قلم کی نوک سے نکلے ہوئے ہر ایک جملے میں لطافت و ظرافت، بذلہ سنجی اور شائستگی پائی جاتی ہے، جس سے افسانوں کے معیار اور مقام کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اختصار اور غیر سالمیت افسانے کے فن کی جان ہے۔ ان کے افسانوں میں یہ دونوں خصوصیات بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔

ج: 1980ء سے حال

شفیع احمد انجینئر: شفیع احمد سری نگر سے بیس کلو میٹر دور کھریو قصبہ میں 28 مارچ 1957ء میں پیدا ہوئے۔ مقامی اسکولوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے سری نگر آئے اور ریجنل انجینئرنگ کالج سے سول انجینئرنگ کی ڈگری کامیابی کے ساتھ حاصل کی۔ اور انجینئرنگ کو ذریعہ معاش بنایا۔ تعلیم کی لگن تھی کہ صحافتی اسرار و رموز کی آگہی اور تجربے کے لیے سال 2000ء میں IGNOU سے جرنلزم اور ماس کمیونکیشن میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کی سند حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی سے ہی انہیں لکھنے کا شوق تھا۔ مقامی اخبارات کے لیے اردو میں مضامین اور افسانے لکھتے تھے۔ 2001ء میں افسانوں کا پہلا مجموعہ ''لو آج ہم صاحب کتاب ہو گئے!'' منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد انگریزی میں لکھنے کی طرف راغب ہوئے اور انگریزی اخبارات کے لیے مضامین تحریر کرتے رہے۔ اسی دوران ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے بھی ڈرامہ لکھتے رہے۔ 2012ء میں ان کا پہلا انگریزی ناول The Half Widow منظر عام پر آیا۔ اور 2014ء میں دوسرا انگریزی ناول Shadows Beyond the Ghost Town شائع کیا۔ سال 2020ء میں کشمیری افسانوں کے مجموعے کا انگریزی ترجمہ کتابی صورت میں The Etrenal Insight of Kashmir کے نام سے شریک مترجم کار کی حیثیت سے شائع کیا۔ ملک کے مختلف اخبارات میں آئے روز ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے افسانے اور مضامین نگینہ، شیرازہ اور دیگر اخبارات و رسائل میں مسلسل شائع ہوتے رہتے ہیں۔

''لو آج ہم بھی صاحب کتاب ہو گئے!'' شفیع احمد کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب اطہر پبلیکیشنز سرینگر سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں 19 افسانے شامل ہیں۔ شفیع احمد پیشے کی اعتبار سے انجینئر ہیں۔ ان کی ادب سے دلچسپی اور وابستگی، اردو ادب کے لیے خوش آئند مستقبل کا ضامن ہے کیونکہ بقول مصنف سیمنٹ اور سریے کے ساتھ تعلق رکھنے والے کسی شخص کا ادب سے کیسے رشتہ ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کی ورق گردانی شروع کرتے ہی آپ یہ جان کر اچھنبے سے دوچار ہونگے کہ سیمنٹ سریے سے واسطہ رکھنے والا شخص قلم اٹھانے میں وہ بھی اپنا حصہ ادا کر سکیں۔''[42]

اس مجموعے کے علاوہ شفیع احمد نے ریاست اور بیرون ریاست کے مختلف رسائل میں افسانے لکھ کر اپنی

لیاقت کا ثبوت دیتا ہے۔ شفیع احمد کے انشائیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر قدوس جاوید رقمطراز ہیں:

''شفیع احمد کے انشائیوں کے مجموعے ''لو آج ہم بھی صاحب کتاب ہو گئے!'' کا مسودہ سامنے آیا تو پہلے گھبراہٹ ہوئی کہ پتہ نہیں انشائیہ کے نام پر کس کس طرح کے تجربوں کو جھیلنا ہوگا۔ یہ گھبراہٹ یا اکتاہٹ اس لیے نہیں تھی کہ شفیع احمد پیشے سے انجینئر ہیں۔ شعر و ادب کی تخلیق پر اردو کے اساتذہ اور طلباء کی اجارہ داری نہیں بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اردو کے تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی ادب کے سرمایہ میں ان حضرات نے بھی گراں قدر اضافے کئے ہیں جن کا شعر و ادب سے کوئی پیشہ ورانہ تعلق نہیں رہا ہے۔ شفیع احمد کے انشائیوں کے حوالے سے میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں کشمیر میں اردو کی نثری اصناف کی موجودہ انجمادی صورت حال سے اچھی طرح آگاہ تھا.................. ظاہر ہے کہ اس پس منظر میں کسی نو آموز نثر نگار کی اولین ادبی کوشش تشویش ہی میں مبتلا کرتی۔ لیکن شفیع احمد کے انشائیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے میں بار بار حیرت اور مسرت کی کیفیتوں سے دوچار ہوا۔ شفیع احمد کے اکثر و بیشتر انشائیے واقعی عمدہ انشائیے ہیں اور ان کی اشاعت، کشمیر میں انشائیہ نگاری کی رفتار کو تیز کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔''[۴۸]

انشائیہ میں انشائیہ نگار کی تخلیقی اُپج، ذہنی اور ضمیر کا فطری بہاؤ، الفاظ کا معنی آفرین برتاؤ اور طبیعت کی شگفتگی وغیرہ مناظر و موضوع کی تہوں اور طرفوں کو اس طرح کھولتے ہیں اور نئی نئی سمت عطا کرتے رہتے ہیں کہ انشائیہ میں موضوع سے زیادہ اس کا صنفی کردار اہمیت حاصل کرتا ہے اور یہی اس کا تقاضہ ہے۔ ایک کامیاب انشائیے کے لیے غیر معمولی تخلیقیت، بار یک بینی، شگفتہ مزاجی، مشاہدے کی وسعت، الفاظ کے برتاؤ کا ملکہ اور اظہار بیان کی ہنرمندی وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی خوبی شفیع احمد کے انشائیوں کی پہچان ہے۔ جس میں داخلیت اور انفرادیت ابھرتی ہے۔ وہ عموماً اپنی ذات کے حوالے سے سامنے کی ننگی اور زمانے کی کج رفتاری کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے انشائیے ان کی ذات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کی چند عمدہ مثالیں پیش ہیں:

☆ ہمارے اسکول میں سب بچے نئی نئی گاڑیوں میں آتے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ پیدل آتا جاتا ہے اور دوستوں میں میری بے عزتی ہوتی ہے۔ اگر آپ فوراً گاڑی نہیں لائیں گے تو میں اسکول جانا بند کر دوں گا۔'' یہ صاحبزادے کی دھمکی تھی، جن کی اسکول جانے یا نہ جانے سے کوئی خاص فرق

شائع ہی ہوتا تھا۔ کیونکہ ہوم ورک تو مجھے ہی کرنا پڑتا تھا کہ میاں صاحب ادھر ٹی وی دیکھنے میں مشغول رہتے تھے۔

☆ چنانچہ کتاب شائع کروانے کے بعد اب حال یہ ہوگئی ہے کہ ہم جب گھر پہنچتے ہیں تو اپنی شائع شدہ کتاب کے بنڈل ہمیں بر آمدے، کچن کی الماریوں، ڈرائنگ روم کی ''شوالماری'' حتیٰ کہ بیڈروم میں بستر کے دائیں بائیں پڑے ہوئے ہمارا منہ چڑا رہے ہوتے ہیں اور میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر بہلانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں کہ لو آج ہم بھی صاحب کتاب ہوگئے۔

☆ بورڈ اور یونیورسٹی والوں نے مجھے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت تو دی لیکن پاس کرنے کے سلسلے میں سرٹیفکٹ ادا کرنے کے بارے میرے ساتھ ہمیشہ سوتیلا کرتے رہے۔ یوں ان اداروں کے ساتھ میرے پہلے میل جول سے لیکر آج تک حالات کشیدہ ہی رہے۔

شفیع احمد نے نہایت باریک بینی کے ساتھ اپنے اطراف واکناف کا جائزہ لیا ہے اور ایک سلجھے اور منجھے ہوئے ادیب کی طرح سلیقے سے سیاسی وسماجی اور معاشی صورت حال کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ انہیں سیاسی و سماجی اور معاشرتی برائیوں، معاشی بحران سے تکلیف ہوتی ہے لیکن اپنی دور اندیشی اور فنکاری سے ان مسائل کو سپرد قلم کر کے سلیقے سے ان کا حل بھی پیش کرتے ہیں:

''زندگی میں ہر انسان کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چاہے عیش وآرام سے زندگی گزارنے کی بات ہو یا جیسے تیسے زندگی کو گھسیٹنے کی سعی۔ اسکے لئے انسان کو کوئی کام میسر ہونا چاہئے۔ آجکل کہا جاتا ہے کہ جو شخص کچھ نہیں کرپاتا وہ کمپیوٹر سیکھنا شروع کرتا ہے۔ حالانکہ بہت پہلے سے ایک بات زبان زد ہر عام وخاص ہے کہ جو کچھ نہیں کرپاتا اُسمیں سیاسی لیڈر بننے کی صلاحیت عام ہوتی ہے۔ میری مندرجہ بالا خصوصیات سن کر آپ کو اندازہ نہیں ہوا کہ سیاسی لیڈر بننے کی صلاحیت مجھ میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ غرض یہ کہ ایسے تیسے اور جیسے ویسے کر کے میں سیاسی لیڈر بن ہی گیا۔''[۴۹]

ان کے انشائیوں کا موضوع ''زندگی'' ہے۔ انہوں نے زندگی کی کج روی، روایت وحقیقت، نشیب وفراز، سماجی نظام وقانون اور انسانی زندگی کی کائنات کے منتشر صداقتوں اور سچائیوں کو طنز ومزاح کے پیرائے اور حسین انداز

میں انشائیے کے قالب میں ڈھالا ہے۔ زندگی کے حقائق اور اپنے تجربات و مشاہدات کو انہوں نے نہ خشک اور فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے اور نہ ہی تکنیکی زبان کا استعمال کیا ہے بلکہ ہلکے پھلکے انداز میں شیریں اور سادہ زبان کا انتخاب کر کے بیان کیا ہے۔ ان کے انشائیوں میں قارئین کے لیے نہ صرف تفریح طبع کا سامان میّسر ہوتا ہے، بلکہ زندگی اور حیات کو سمجھنے کا طریق کار بھی یہاں ہوتا ہے۔ جس کا اندازہ ان ابواب کی ترتیب سے ہوتا ہے جو ترتیب کچھ اس طرح سے ہے کہ زندگی کے ابتدائی دنوں اور لڑکپن کے ایام سے شروع ہوتا ہے۔ جیسے ایک فرد کی زندگی، عمر کے مختلف مراحل سے ہو کر گزرتی ہے، لڑکپن کے بعد جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے، ذمہ داریاں بھی بڑھتی ہے اور اپنی گزراوقات کے لیے تگ و دو کرتا ہے، محنت و لگن سے کام کرتا ہے اور کسی پیشے سے منسلک ہو کر اپنی ضروریات زندگی کو حاصل کرنے کے لیے وقف کرتا ہے۔ دوسری طرف ذاتی زندگی بھی ہوتی ہے، جس کی اپنی ذمہ داریاں ہوتی ہے۔ ایک مقام ایسا ہوتا ہے کہ تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر برسوں کے کیے گئے کاموں سے فراغت پا کر ضعیفی میں قدم رکھتا ہے بالکل اسی انداز میں انہوں نے انشائیوں کو ترتیب دیا ہے۔

شفیع احمد کے انشائیوں میں عام فہم اور سنجیدہ دونوں قسم کے موضوعات ملتے ہیں۔ انہوں نے اطراف و اکناف کے تمام مسائل، سیاسی و سماجی اور معاشرتی مسائل اور تہذیبی زندگی کے تمام پہلوؤں کو انشائیے کا موضوع بنایا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں:

> ''شفیع احمد کے انشائیوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عموماً اپنی ذات کی حوالے سے سامنے کی زندگی اور زمانہ کی کج رفتاری کو دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں سوچ، فکر اور بہاو، شگفتگی بذلہ سنجی، طنز ملیح، مسرت خیزی اور بصیرت آموزی کے ساتھ اس طرح جاری رہتا ہے کہ قاری خود بھی لاشعوری طور پر اس بہار کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ شفیع احمد کے انشائیوں میں بیک وقت معاشرہ کے سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی نظام کے کھوکھلے پن کی تہوں کو جس سادگی اور سلیقے سے ادھیڑا گیا ہے اس کے تعمیری اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور دیکھا جائے تو ایک کامیاب انشائیہ نگار کا یہی اصلی منصب ہوتا ہے۔''۵۰؎

ان کے یہاں طنز و مزاح کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ انہوں نے طنز و مزاح کا نشانہ کسی فرد یا شے کو نہیں بنایا ہے۔ بلکہ اپنی ذات کو طنز و مزاح اور ہجو کا موضوع بنایا ہے۔ اپنی کمزوریوں، کمیوں اور مجبوریوں اور زندگی کی بنیادی ضروریات کے

لیے کرنے والے دوڑ دھوپ اور زندگی کی بنیادی ضروریات یعنی غذا، مکان اور کپڑا کی حصولیابی کے لیے کوشاں رہے اپنی مشینی زندگی کے تگ ودو کو مقصد بنایا ہے کہ ایک معیاری زندگی کے آسائش حاصل کر پائے۔ لیکن عمر بھر اس گردش میں رہنے کے باوجود کبھی تسکین نہیں مل پائی۔ انشائیہ ''میرا ریڈی میٹ سوٹ'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے :

''شام کو واپس لوٹنے والا ہی تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ بڑے زوروں کی بارش تھی کہ لوگ بھاگ بھاگ کر پناہ لے رہے تھے۔ میں ہی ایک تھا کہ سڑک پر چلتے جارہا تھا اپنی دھن میں مگن۔ بارش میرا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ چلتے چلتے مجھے ایسا لگا کہ میرے کپڑے سکڑتے جارہے ہیں۔ میری پتلون میری ٹانگوں کے پٹھے کسے جارہی ہے اور میرے کوٹ کی ڈھیلی چھاتی تنگ ہورہی ہے۔ دائیں جانب کی ribs باہر طرف سے چیرتی ہوئی نکل جائیں گی لیکن میں چلتا جارہا تھا۔ مجھے ٹانگیں اور بازو ہلانے میں زبردست تکلیف ہورہی تھی کہ اتنے میں میرے Ribs کے بدلے کوٹ کے بٹن ٹوٹ گئے اور میری چھاتی آرام محسوس کرنے لگی خدا خدا کر کے گھر پہنچا تو گھر والے بس دیکھتے ہی رہ گئے۔ میں کوٹ کے بدلے واسکٹ اور پتلون کے بدلے لنگوٹی پہنے ہوئے تھا......!''[۵۱]

شفیع احمد کے انشائیوں میں موجودہ دور کی صورت حال کے بارے میں بہت معلومات ملتی ہیں۔ آج بھی ترقی یافتہ دور میں انسان محنت و مشقت اور شعور سے کام لے کر آسودہ اور باوقار زندگی گزار سکتا ہے لیکن اپنی خواہشوں کو حاصل کرنے کے لیے بے شمار قربانیاں دینی پڑتی ہے۔ آج کے دور کے نوجوانوں کے لیے سب سے اہم مسئلہ ملازمت کا ہے۔ زندگی کے سالہا سال وقف کر کے تعلیم حاصل کرتا ہے لیکن اپنے معیار کی نوکری مشکل سے ہی ملتی ہے یا بالکل بھی نہیں ملتی۔ ملازمت کا وسیلہ محدود اور امیدوار متعدد۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بے روزگاری اور پستی ان کا نصیب بن جاتا ہے اور ایسے نوجوانوں کو ذہنی و نفسیاتی اور جذباتی اذیتوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

شفیع احمد نے اپنی زندگی میں گزرے واقعات کو انشائیوں کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اہم باتیں بتائی ہے جو قارئین کے لیے نہ صرف نصیحت آموز بلکہ مشعل راہ بھی ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں کوئی ٹھوس فلسفیانہ یا کوئی ٹھوس منطقی باتیں نہیں ہوتیں بلکہ روزمرہ زندگی کی باتیں ہوتی ہیں۔ جن کو وہ مزاحیہ انداز میں پیش کر کے دلچسپ اور دلفریب بناتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں سماجی المیہ کا درد واضح ہے۔ سماجی

خامیوں اور برائیوں کو لے کر وہ فکر مند رہتے ہیں۔ وہ سادہ انداز میں موجودہ سماجی برائیوں سے نوجوانوں کو خبردار کرتے ہیں۔ اقتباس:

> ''چونکہ مجھے معلوم ہے کہ سگریٹ پینے سے پھیپھڑے خراب ہونے کا خطرہ رہتا ہے اسلئے میں بھی چاہتا ہوں کہ سگریٹ پینے کی عادت چھوٹ جائے۔ اسی لئے . بہانہ سازی طبیعت کی بنا پر ایک بار میں ایک ڈاکٹر کے ہاں گیا تو کچھ گولیاں اور انجکشن تجویز کرنے کے بعد وہ بولے کہ ''بھئی سگریٹ ذرا کم پیا کرو'' ڈاکٹر اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے بولے۔ ''ویسے تو تمہیں سگریٹ نوشی چھوڑنی چاہیے۔ کیونکہ سیگریٹ نوشی تو کئی ایک بیماریوں کی جڑ ہے مثلاً کینسر۔'' ۵۲

مصنف سگریٹ کے برے اثرات سے واقف ہیں۔ اور اس عادت سے چھٹکارے کے لیے مختلف ٹوٹکے آزماتے ہیں اور ہر بار عزم کرتے ہیں کہ آئندہ سے نہیں لیکن ہر بار نتیجہ لا حاصل۔

شفیع احمد نے عام فہم اور سلیس زبان کا استعمال کیا ہے۔ وہ سادگی اور شائستگی کے ساتھ اپنی بات کو لطافت و ظرافت کے پیرائے میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے یہاں روانی اور شیرینی ملتی ہے۔ روزمرہ کے تلمیحات سے بھی کام لیتے ہیں اور طنز و مزاح کے ذائقے کا بھی خوب اندازہ ہے۔ جس سے ان کی انشائیہ نگاری میں دسترس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

کاچو اسفندیار خان: کاچو اسفندیار خان خطۂ لداخ کے واحد انشائیہ نگار ہیں۔ ان کا تعلق لداخ کے ضلع کرگل سے ہے۔ وہ 1952ء میں لداخ کے معروف اسکالر، ادیب اور بیوروکریٹ کاچو سکندر خان سکندر کے گھر یوقما کھر بو، شکر چکتن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ہائی اسکول تک کی تعلیم کرگل قصبہ سے حاصل کرلی اور مزید تعلیم کے لیے سرینگر چلے گئے۔ جہاں ایس پی کالج سے 1977ء میں ایم اے تک کی تعلیم مکمل کر کے اسی سال Kashmir Administrative Services (KAS) کے مسابقتی امتحان میں کامیابی حاصل کر کے ملازمت سے جڑ گئے۔ بعدازاں IAS کا امتحان بھی پاس کیا۔ اسی طرح وہ ریاست جموں و کشمیر کے مختلف اضلاع

میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ساتھ ہی اپنی ادبی دلچسپی اور ذوق وشوق سے مطالعہ اور تخلیقی کام کو بھی جاری رکھا۔ وہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ فریدونؔ تخلص کرتے ہیں۔ آج ان کے کئی اہم تراجم اور ادبی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہے۔ داستان کربلا (بلتی قصیدوں اور نوحوں کا مرتبہ مجموعہ، Ancient Wisdom (بلتی اور لداخی محاوروں کا ترجمہ)، دام خیال اور کریمن (شعری مجموعہ) ان کے اہم کارنامے ہیں۔ جو لداخ کے کسی شاعر کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ جن سے ان کے ادبی رجحان، تحریری ذوق، پیار اور صلاحیت ولیاقت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ ان کی کتابوں سے آج دنیا بھر کے اسکالر لداخ، لداخ کی تاریخ اور تہذیب وثقافت کے حوالے سے مستفید ہورہے ہیں۔

کاچو اسفندیار خان کا تعلق ایک ذی علم گھرانے سے ہے، جہاں علم وادب، تہذیب وتمدن اور پرانی روایت کی پاسداری جزوِ ایمان تصور کی جاتی ہے۔ اور محنت ولگن سے کام کرنے کی عادت بچپن سے ہی ڈالی جاتی ہے۔ ان کے بقول لداخ کی پرسکون وادی اور وہاں کا ماحول ان کی ادبی سرگرمیوں اور تخلیقات کا محرک بنی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''لداخ فلک بوس پہاڑوں کا مسکن ہے اسلئے فطرت کی بے پناہ وسعتیں مجھے انتہائی متاثر کرتی رہیں۔ دریائے سندھ کی گستاخ موجیں مجھے مشکل سے مشکل حالات میں بھی رواں دواں رہنے کا درس دیتی رہیں۔ یہاں کی بے پناہ وسعت اور فلک بوس پہاڑوں نے ایک ذہنی استقامت، ساتھ ساتھ نامساعد حالات میں بھی جینے کا حوصلہ دیا۔ یہاں کی بے شمار وادیوں نے مجھے ان میں چلتے وقت یہاں کے لوگ گیتوں اور لوک دھنوں کو پوری آواز کے ساتھ گانے اور گنگنانے کی پوری آزادی دی۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں شاعری کی لے اور صوتی آہنگ کو بھی اس کا ایک خوبصورت پہلو مانتا ہوں۔'' ۵۳

کاچو اسفندیار خان لداخ کے واحد افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے ریاست و بیرون ریاست کے مختلف رسائل وجرائد کی زینت بنتے رہے ہیں۔ رسالہ ''نگینہ انٹرنیشنل'' میں ان کے افسانے جیسے ''عبدل کی بس''، ''غم نہ داری بز بخر''، ''ایک ہماچاری ڈبے کی تلاش میں''، ''الیکشن'' اور ''گشتہ زلف چلم ہوں میں'' شائع ہو چکے ہیں۔ کاچو اسفندیار خان کو اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں پر مہارت حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں ان کے کثیر مطالعہ، تبحرِ علمی، شعور وفہم اور فارسی زبان وادب سے دلچسپی کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ افسانوں میں جابجا فارسی محاورے اور بیانات کا استعمال ہے اور معتدد عنوان فارسی زبان میں منتخب کئے گئے ہیں۔

ان کے انشائیوں میں فن انشائیہ نگاری کی بنیادی خصوصیات کے لیے جو بھی لوازمات اہم ہیں وہ پائے جاتے ہیں۔ انشائیہ کی بنیادی شناخت بات سے بات نکالنا ہے، جس طرح غزل میں مختلف موضوعات اور مضمون کو سمویا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح نثری ادب میں انشائیہ ایک ایسی صنف ہے۔ جس میں موضوع کی قید نہیں اور نہ ہی کوئی ساخت پائی جاتی ہے۔ بلکہ مختلف و منتشر خیالات اور باتوں کو یکجا کر کے تسلسل و روانی کے ساتھ دلچسپ انداز میں صفحہ قرطاس پر لانے کے ہی عمل کو انشائیہ کہا جاتا ہے تازگی، شائستگی اور اختصار اس کی بنیادی شناخت ہے۔ کاچو اسفندیار خان کو اس فن میں کمال حاصل ہے۔ وہ سماج کی اہم و غیر اہم تمام طرح کی باتوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ انشائیہ ''غم نہ داری بُز بخر'' کا یہ حصہ ان کی انشائیہ نگاری کے فن میں اعلیٰ صلاحیت کا غماز ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''اچھا خود اراب یہ بتاؤ کہ آپ کے پاپا کس دفتر میں کام کرتے ہے؟ انکل وہ محکمہ گالی میں کام کرتے ہے۔ واہ! کیا بات ہوئی ننھے میاں۔ میں نے تیس پینتیس سال نوکری کی ہے۔ لیکن محکمہ گالی تو کبھی نہیں سنا۔ ارے انکل میرے پاپا محکمہ بجلی میں کام کرتے ہیں پاپا کہتے ہیں کہ اگر بجلی چلی گئی تو لوگ کہتے ہیں کہ دلوں نے بجلی بند کردی۔ اور جب بجلی آجاتی ہے تو پھر کہتے ہیں حرام خوروں نے بجلی چھوڑ دی۔ اگر بجلی تیز آتی ہے تو بولتے ہیں کہ کم بختوں نے زیادہ بجلی چھوڑی اور سارے بلب فیوز ہوگئے۔ اگر وولٹیج کم ہو تو بولتے ہیں چوروں نے بجلی کہیں اور چھوڑ دی ہے۔ اس لیے پاپا کہتے ہیں کہ یہ سارا محکمہ ہی گالی گلوچ کا ہے۔ اچھا اب سمجھا۔ تو ممی کہاں کام کرتی ہیں؟ پاپا کہتے ہیں کہ ممی محکمہ بُنائی میں کام کرتی ہیں۔ اچھا وہ ہینڈلوم یا ہینڈی کرافٹ میں کام کرتی ہیں؟ نہیں انکل وہ ایک اسکول میں کام کرتی ہیں۔ چونکہ ساری استانیاں بنتی رہتی ہیں اس لیے پاپا نے اس کا نام محکمہ بُنائی رکھا ہے۔''[۵۴]

ان کے انشائیوں کے ذریعہ ان کے نظریات اور خیالات کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ وہ کائنات اور زندگی کی حقیقت کے بارے میں جاننے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ قرآن کے آئینہ میں کائنات کی حقیقت سمجھنے کی سعی کرتے ہیں۔ زندگی کی بار یک سے بار یک چیزوں پر غور و فکر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کے سفر میں حائل ہونے والی پریشانیوں اور مجبوریوں سے دلبرداشتہ ہوکر بیٹھ جانا نہیں بلکہ جہد مسلسل کرتے ہوئے مقصد حیات کو پانا ہے اور متاع آخرت کی فکر بھی لازمی ہے۔ وہ شریعت و اخلاقیات کے پاسدار ہیں۔ وہ ظرافت کے ساتھ لکھنے کا ہنر جانتے

ہیں۔ڈاکٹر اشرف آ□ری لکھتے ہیں:

''ان کے یہاں مضمون آفرینی اور وسعت معنوی بھی ہے اور نئے اور روایتی استعاروں کا استعمال بھی ہے کیفیات قلب کو شعری پیکر □ک□ انہیں خوب آ□ ہے، ایسا مطالعے اور مشاہدے کی وسعت وہ عمیق مطالعے سے ممکن □□ ہے۔روایتی لفظیات کے استعمال کے □ وجود بھی استعارتی جہتیں، جگر سوزی اور وسعت فکر، دعوت فکر دیتی ہے۔''۵۵

اسفن□ی رخان کو□زمت کے دوران جموں وکشمیر کے مختلف علاقوں میں رہنے کا موقعہ□ ۔□ی □ کے مختلف علاقوں کے عوام کے درمیان رہ کر مجبور و بے بس عوام کی ضرورتوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقعہ□اس لیے ان کے ا□ئیوں میں دیہاتی طرز ن□گی اور دہقانوں کی □ستی کی واضح جھلک ملتی ہیں۔انہوں نے اپنے اطراف کی ن□گی کا بغور مطالعہ کیا۔سیاسی وسماجی ن□گی کے مسائل، اقتصادی ومعاشرتی تنگ دستیوں کے راز جاننے اور ان کی حل کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ان کے ا□ئیے مختلف سماجی مسائل کی آئینہ داری کرتے ہیں۔نمونے کے لیے ان کے ا□ ا□ئیہ سے ا□ اقتباس پیش□مت ہے:

''ہماری□ی □ میں اب مذہبی مسائل□ی دہ کا□□ . □ نہیں ہوتے ہیں۔یہ فارمولا کثرت استعمال کی وجہ سے اپنا□ کھو چکا ہے اور ا□□ بانجھ عورت کی طرح Unproductive بن □ی ہے۔اب ان کے استعمال□ پ وٹ□ وں کے کانوں□ پ جوں□ نہیں رینگتی ہے۔اس لیے اب سیاسی□ رٹیوں نے دفعہ ,370 کشمیریوں کی عزت آ□ و (جو□ ی طرح □ چکی ہے)، پن بجلی گھروں کی واپسی (. □ کہ اپنے لوگ ا□ بھی بجلی گھر کو ٹھیک طر□ سے نہیں □ □ ہیں)، گاؤکشی کی حما□ میں ضیافتوں کا اہتمام، گولی کے□ لے بولی اور بولی کے □ لے گولی وغیرہ وغیرہ جیسے مہلک اور سریع الا□ انتخابی □ے اختراع کیے ہیں□ کہ وٹ□ وں کے □□ت کو آنگیختہ کر کے اپنا اُلو سیدھا کر سکیں۔اس کے علاوہ علاقائی عصبیت کو ہوا دے کر فساد کرائے جاتے ہیں اور . □ مارے جاتے ہیں تو اپنا پیرا پینٹر□ ل□ ل کر ان کے□پ س پہنچ جاتے ہیں اور لواحقین کے زخموں□ پ مرہم لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔''۵۶

ا□ئیہ نگار نے عام فہم□ت کو بھی□ زگی و□ رت کے ساتھ بیان کیا ہے۔جس سے اس شے کی جاذ□ی

واوصاف واضح اور عیاں ہو جاتی ہیں □ توں میں نئی پہلو اور سمت نکال کر اس میں خوبصورتی سے ر□ بھر دینے کا ہنر اسفن□ رخان کو خوب □ ہے۔ کا چو اسفن□ رخان کی شخصیت میں ظرافت و لطافت کوٹ کوٹ ک□ پ ئی جاتی ہے۔ وہ □ ی سے □ ی اور سنجید□ ت کو ہلکے پھلکے □ از میں تح□ کرتے ہیں۔ ا□ ئیہ ''ا □ □ ہمچاری □ ے کی تلاش میں'' سے یہ اقتباس □ حظہ فرما □ :

''اپنے گھر میں ہم بہت چہیتے تھے۔ آدھا درجن بہن بھائیوں کی موجودگی میں ہم اپنے والدین کی آنکھوں کا نور نہ سہی □ □ اغ مفلس کی طرح ٹمٹماتے ضرور تھے۔ کبھی کسی نے ہمارے کردار کو، ہماری اٹھن بیٹھن اور طور طر□ ں کو شک کی □ سے نہیں دیکھا تھا۔ سبھی یہی سوچتے تھے کہ بے چارہ کنوارا ضرور ہے لیکن کسی شُتر بے مہار کی طرح دوڑ کر کسی کو دبوچ □ اور منہ مارنے والا □ □ نہیں۔ ہمسایوں کی لڑکیاں ہمیں جمن بھائی کہہ کر پکارتی تھیں، اور ہم بھی اپنی □ رگی اور شرافت کا□ س و لحاظ رکھ کر ان کے ساتھ نہا□ ہی شر□ نہ□ از میں پیش آتے تھے۔ لیکن . □ ان ماہ جمالوں کے شہر میں پہنچا تو نہ جانے کیوں ہر کوئی مجھے ٹکر ٹکر کر اور شک و شبہ کی □ سے دیکھتا تھا۔ جیسے ہم اس دھرتی کی مخلوق نہیں بلکہ کسی آسمانی قوت سے سلسلہ کوہ قراقرم ہَ کے کرزم□ سے لا کر یہاں ٹپکا□ ے ہے۔ یہاں پہنچتے ہی ہم نے اپنا سر چھپانے کے لیے ا□ □ ے کی تلاش □ ے زور و شور اور شوق جنون عشق و مستی کے ساتھ شروع کر دی، کیو□ کئی دن ہوٹل میں □ ارنے کے بعد ہماری . □ کو اب حا . □ رفو بھی نہیں رہی تھی۔''۵۷

اسفن□ رخان کے د□ ا□ ئیوں میں ''کشتۂ زلفِ چلم ہوں میں''، ''غم نہ داری □ بخر''، ''عبدل کی □ سی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے ا□ ئیوں کے مطالعے سے ان کی داخلیت، ذات، □ ت، بصیرت و بصارت کا□ ازہ ہو جا□ ہے۔

مشتاق احمد کینی□: کشمیر کے ا□ سنجیدہ ذہن کے مالک اد□ مشتاق احمد کینی□ کا تعلق سری نگر سے ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم وادی کے اعلیٰ تعلیمی ادارہ بسکو سے ہوئی اور ایس پی کالج سرینگر سے بی ایس سی کی تعلیم مکمل کرنے کے

بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایل ایل بی کر کے وکالت کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ بعد ازاں درس و تدریس کے ساتھ جڑ گئے۔ اب وہ مختلف سماجی اور ثقافتی انجمنوں اور تنظیموں کے ساتھ منسلک ہیں۔ وہ یہ میں پرائیویٹ اسکول ایسوسی ایشن کے صدر کے طور پر کام کر رہے ہیں اس کے ساتھ اپنے ادبی سفر کو بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مختلف موضوعات پر اخبارات اور رسائل میں آئے روز لکھتے رہتے ہیں۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''غافل'' منظر عام پر آچکا ہے۔ ساتھ ساتھ انشائیے بھی لکھتے ہیں۔ انشائیے کی طرف وہ برسوں سے راغب ہیں۔ ان کے انشائیے اور مضامین کشمیر عظمیٰ، ہندسماچار اور روزنامہ نیول جیسے اخبارات کے علاوہ مختلف رسائل میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کے انشائیوں کا کوئی مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا ہے۔ ممکن ہے مصنف کی ذاتی مصروفیات حائل رہی ہوں۔ راقمہ جب تحقیق کے لیے مواد یکجا کرنے کے سلسلے میں سری نگر میں موصوف کے کورٹ روڈ پر واقع دفتر میں گئی تو انہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود تمام اخباروں کے تراشوں کو جن میں ان کے انشائیے شائع ہوئے تھے اور جو محفوظ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ راقمہ کو ان کی کاپیاں بہم پہنچائی۔ جس سے ان کے حسن اخلاق کو خلوص و ہمدردی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان انشائیوں کے عنوان کچھ اس طرح ہے۔ ''ہاوس ہسبنڈ''، ''گھر والی باہر والی''، ''نیوٹن کا سیب''، ''یہ دن تمہیں مبارک ہو''، ''عورت بلا دست ہے یا مرد؟''، ''بھیاجی''، ''جمورے دوڑ''، '' آؤ بھیک مانگیں''، ''نوکر''، ''پردہ فاش''، ''امن سیتو''، ''بھول'' اور ''کوا ہنس کی چال'' وغیرہ وغیرہ۔

ان کے انشائیے افسانوی انداز لیے ہوتے ہیں۔ جس سے ان میں ایک منفرد اور مختلف کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے انشائیوں میں سماجی مسائل کا المیہ اور اسکا رزمیہ ہے۔ اس سادگی اور شگفتگی کے ساتھ کہ ظرافت کا پہلو برقرار رہتا ہے۔ اور قاری رزمیہ م کے درمیان ایک نئے جہاں میں خود کو پاتا ہے۔ آئے دن کے کرفیو اور ہڑتال کشمیر میں اب کوئی نئی بات نہیں۔ دنوں و ہفتوں ہی پر موقوف نہیں بلکہ کبھی کبھی مہینوں مہینوں کرفیو سے عام زندگی متاثر رہتی ہے۔ انشائیہ ''ہاؤس ہسبنڈ'' میں ایسے ہی کارہ گھر میں مقید مردوں کی حالت زار کو بیان کیا گیا ہے۔ اقتباس دیکھئے :

> ''جب الفاظ گونگے ہو جاتے ہیں تو آنکھیں بولنے لگتی ہیں۔ یہی ہم نے اپنی بیگم میں بھی محسوس کیا کہ ان کے الفاظ بھی گونگے ہو گئے اور اب آنکھیں زبان کا کام کرنے کے درپے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور ہمیں کچھ سمجھانے کی کوشش میں ہیں۔ چونکہ ہم حالات کے سبب بے کار ہو گئے تھے اس لیے ہم نے بیگم (بےغم) کی آنکھوں کے پیغام کو ڈی کوڈ کرنے کی ٹھان لی دو

شروع کر دی۔ یعنی آج سے بیس پچیس سال پہلے کی اور اب کی آنکھوں آنکھوں کی تو ں
میں ہم ای واضح فرق محسوس کر رہے ہیں۔ کہاں وہ ن محبت میں ں کی
سرسراہٹ اور اب تحکمانہ اور عامرانہ از۔ ہمیں سمجھنے میں تھوڑا وقت تو لگا ہم یہ جان گئے
کہ حالات میں سدھار نہ ہوا اور ہم گھر ہر جا کر اپنے کام دھندے پھر سے نہ
لگ جا ہمیں ای نئے عہدے کام ہوگا۔ حالات میں بگاڑ اور بند سے قبل
ای وکیل، مدرس اور ای سماجی کارکن کے فرائض ا م دینے میں ہم پوری تن دہی سے کام
کرتے رہے لیکن اب یہ نئی ذمہ داری ''ہاؤس ہسبنڈ'' ہم ا راو ب میں ڑ گئے۔
ای تو کام اور دوسرا نئے عہدے ہمیں کام اپنی بیگم کے نگرانی ہوگا۔''۵۸

ن کھوکھر: خطۂ پیر پنچال ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں سے اغ حسن حسرت، راما سا،
کرشن چندر، ٹھاکور پونچھی تپال سنگھ ب، ڈاکٹر وجے دیو سنگھ، بلراج بخشی جیسے اردو ادب کے کئی روشن و درخشان
ستارے ع ہوئے۔ ن کھوکھر کا تعلق بھی اسی خطۂ علم و ادب سے ہے۔ ن کھوکھر افسانے کے علاوہ طنز و مزاح اور
صنف ا ئیہ میں بھی اپنا جوہر دکھا رہی ہیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے منظر عام آ چکے ہیں۔ ان کے ا یئے
اور بیرون کے رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حیدر د سے شائع ہونے والا طنز و
مزاح اور ادب لطیف مختص ماہنامہ ہ ''شگوفہ'' میں ان کے مضامین اور ا یے لخصوص شائع ہوتے رہتے
ہیں۔ جس سے ان کے ا ئیوں کی اہمیت کا ازہ ہو جا ہے۔

مصنفہ چو جموں و کشمیر خصوصاً کو نی علاقوں کی انی آواز بن چکی ہے۔ ان کی تحر یں دور دراز،
دیہی علاقوں کے غری و مفلس عوام، پسما ہ اور پچھڑے علاقوں میں رہنے والے عوامی گی کی جمانی کرتی ہوئی
آتی ہے۔ خصوصاً ان علاقوں کی عورتوں کی کے ان پہاڑی علاقوں میں آج بھی رانہ م رائج ہے، یہاں
عورتوں کے حقوق کو از کیا جا ہے۔ گھر مسائل، امور خانہ داری، بچوں کی ورش اور گھر ہستی ہی ان کی
گی محدود ہے۔ مصنفہ نے ان ا ئیوں کے ذریعے ایسے موضوعات کی تہیں کھولی ہیں جس کے ذریعے سے انہوں
نے نہ صرف اپنے اطراف و اکناف کے انی مسائل بلکہ قومی سطح اٹھ کر اس طبقہ کے مسائل کو اجا کیا ہے۔

Triple Talaq یعنی طلاق ثلاثہ کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''یہ ہم لوگ ایسے بہو کی عزت کرنا سیکھ جائیں تو طلاق اور طلاق ثلاثہ جیسے بیتیں کبھی نہ کو ہی نہ ملیں۔ ہم یوں ہی دوسروں کو الزام دیتے رہتے ہیں۔ اپنے گھر کو تو سنبھالتے نہیں ہیں۔ اپنی بہو کی خواہشوں کا احترام بھی نہیں کرتے ہیں۔ اور جب غیر ہماری بہو، بیویوں کے مسئلے بنانے لگتے ہیں، تب ہم انہیں برا بھلا کہتے ہیں۔ اور اندرونی معاملات میں دخل اندازی کا الزام دیتے ہیں۔''۵۹

مصنفہ نے سماج میں مستورات کے ساتھ درپیش واقعات کے ساتھ سماجی رسوم ورواج، شادی بیاہ جیسے رشتوں میں پیش آنے والے واقعات کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک مثال دیکھئے:

''بہو تو ایک خوبصورت لفظ ہے۔ اور ایک خوبصورت رشتے کا نام ہے۔ جی ہاں! آپ کا کہنا بجا۔ یقیناً بہو ایک خوبصورت نام ہے۔ ڈھیر ساری خوشیوں، ڈھول دھماکوں اور شہنائی کی مدھر آوازوں کے ساتھ، خوبصورت لباس میں ملبوس اور گہنوں سے لدی بہو نام کی اس ہستی کا جب گھر میں اضافہ ہوتا ہے، تو سارے گھر کی خوشی دوگنی ہوتی ہے۔ اس خوبصورت ہستی کو ایک نظر دیکھنے کا سب کو اشتیاق ہوتا ہے کہ کب پردہ اٹھے اور وہ اس کی ایک جھلک دیکھیں۔ یہ حق سب سے پہلے ساس ماں کو پہنچتا ہے۔ انہیں ہی تو بہو کو ڈولی سے بصد احترام باہر نکالنا ہوتا ہے۔ وہ بہو کی بلائیں لیتی ہیں۔ نظر اتارتی ہیں۔ اور دھیرے دھیرے قدموں سے لے جا کر پھولوں کی سیج پر بٹھاتی ہیں۔ خوشی کے لڈو پھوٹ رہے ہوتے ہیں۔ کہ اپنی بہو کو سو میں سے چن کر لائی ہیں۔ پڑوسنیں دیکھتی رہ جائیں گی۔ میرے انتخاب کی داد دیں گی وغیرہ وغیرہ۔ خوشی کے عالم میں وہ سوچوں ہی سوچوں میں بہت دور نکل جاتی ہیں۔ اور ان کی یہ سوچیں بہت بجا ہوتی ہیں۔۔۔۔۔! یقیناً ہر سماج اور ہر معاشرے میں بہو کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔''۶۰

ان کے افسانوں پر افسانے کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ کہانی پن کا احساس ہوتا ہے یعنی ان کے افسانوں کا کینوس وسیع ہے اور موضوعات میں بھی تنوع پایا جاتا ہے ساتھ ہی جزئیات نگاری میں فنکارانہ مہارت حاصل ہے۔

ہمارے سماج میں لوگ کسی نہ کسی صورت میں اکثر جی حضوری کرتے ہیں۔ دفاتر ہوں، گھر ہوں، بازار ہوں، محفل، ایوان ہوں یا عدالت اس کے بغیر مقصد کی حصولیابی ممکن نہیں۔ انشائیہ ''چمچے'' میں اس بات کو لطافت کے ساتھ انشائیہ کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

> ''دیکھا جائے تو چمچہ نوازی اور چمچہ گیری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ گھریلو ہستی سے لے کر بین الاقوامی سطح تک چمچہ نوازی اور چمچہ گیری، دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر یہ چیزیں کچھ زیادہ واضح انداز میں کارفرما نظر آتی ہیں بین الاقوامی سطح پر کوئی چمچہ نوازی کر رہا ہے تو کوئی چمچہ گیری۔ کچھ مالک عتاب سے بچنے کے لئے تو بعض اپنی شان میں اضافہ کے لئے چمچہ گیری کر رہے ہیں۔ جو چمچہ گیری نہیں کرتا ہے، وہ مات بھی کھاتا ہے اور مار بھی۔ اور نیست و نابود ہو کر رہ جاتا ہے۔''[۱۶]

من جملہ زاہدہ کھوکھر کے انشائیے اردو کے صنف انشائیے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عورتوں کے درمیان رہ کر محاورے، فقرے اور کہاوتوں سے وہ خوب آشنا ہیں۔ زبان و بیان میں کمال حاصل ہے، اردو کے ساتھ ساتھ پہاڑی اور پنجابی کا امتزاج انکی تحریر کو ایک نرالا اور انوکھا حسن بخشتا ہے جس سے زبان کی شیرینی اور بڑھ جاتی ہے۔ چونکہ زاہدہ کھوکھر جموں و کشمیر کی واحد خاتون انشائیہ نگار ہے، اس لیے بھی ان کی ادبی کارناموں اور کاوشوں کو ادبی تاریخ میں اہمیت حاصل ہے۔

متذکرہ بالا انشائیوں کے جائزے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دیگر اصناف ادب کی طرح ہی جموں و کشمیر میں 'صنف انشائیہ نگاری' اپنے جوبن پر ہے۔ اور اس کا مستقبل درخشاں ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱) ا□ ئیہ کے□ وخال، ون□ آغا، نئی آواز جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء، ص:۵۸

(۲) ایضاً، ص:۹

(۳) صنف ا□ ئیہ اور ا□ ییئے، سید محمد □ ڈاکٹر، نسیم □ ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنو، ۱۹۷۳ء، ص:۲۸

(۴) ا□ ئیہ، آدم شیخ ڈاکٹر، مطبع را□س امپوریم □ ائیو□ لمیٹڈ بمبئی، ۱۹۶۵ء، ص:۱۶

(۵) ایضاً، ص:۲۴

(۶) کشمیر کے دوادی□ دو بھائی، عبدالقادر سروری□ وفیسر، مجلس تحقیقاتِ اردو، حیدر□ دکن، ۱۹۶۵ء، ص:۱۱۳

(۷) ایضاً، ص:۱۱۴

(۸) ایضاً، ص:۱۱۴۔۱۱۵

(۹) کشمیر میں اردو، دوسرا حصہ، عبدالقادر سروری□ وفیسر، کلچرل اکیڈمی، سرینگر ۱۹۸۲، ص:۳۰۶

(۱۰) ایضاً، ص:۴۸۲

(۱۱) ایضاً، ص:۴۴۴

(۱۲) ایضاً، ص:۴۴۵

(۱۳) ایضاً، ص:۴۱

(۱۴) ایضاً، ص:۴۴۹

(۱۵) ایضاً۔ص:۴۵۰

(۱۶) ایضاِ، ص:۴۵۵

(۱۷) مضامین□ اغ حسن حسرت، □ اغ حسن حسرت، ص:۲۹

(۱۸) ایضاً، ص:۴۱

(۱۹) کشمیر میں اردو، عبدالقادر سروری□ وفیسر، دوسرا حصہ، ص:۳۲۵

(۲۰) ایضاً، ص:۳۹۴

(۲۱) ایضاً، ص:۳۹۹

(۲۲) کشمیر میں اردو، عبدالقادر سروری، تیسرا حصہ، ص:۲۷۶

(۲۳) ایضاً، ص:۲۸۳

(۲۴) ایضاً، ص:۲۸۴

(۲۵) ایضاً، ص:۲۸۴

(۲۶) ایضاً، ص:۳۰۶

(۲۷) ایضاً،ص:۳۰۶

(۲۸) کشمیر میں اردو، دوسرا حصہ،ص:۴۰۸

(۲۹) جموں و کشمیر کے اردو مصنفین ، جان محمد آزاد، کلچرل اکیڈمی ،سری نگر، ۲۰۰۴ء،ص:۱۳۲

(۳۰) رسالہ شیرازہ،□ی □ میں صحافت کا پچاس سال، جان محمد آزاد، کلچرل اکیڈمی ،سری نگر،ص:۲۷

(۳۱) آئینہ□ ،شمارہ تین،مرتبہ قرۃ العین □ زلہ،سرینگر،۲۰۰۹ء،س:۱۷

(۳۲) ایضاً،۱۰۲ (۳۳) ایضاً،ص:۱۳۱

(۳۴) ایضاً،ص:۳۲۷

(۳۵) جموں و کشمیر کے اردو مصنفین ،ص:۱۳۲

(۳۶) شیرین کے خطوط،محمد زماں آزرد□پ وفیسر،مرزا □ □ ،حسن□ ب دسری نگر،۱۹۷۴،س:۳-۴

(۳۷) غبار خیال،زماں آزرد□پ وفیسر،مرزا □ □ ،حسن□ ب دسری نگر،۱۹۷۳ء،ص:۶

(۳۸) جموں و کشمیر میں اردو ادب،اے۔آر۔ بیگ ڈاکٹر،میزان □ شرز،سری نگر،۲۰۱۸ء،ص:۱۱۴

(۳۹) غبار خیال،آزردہ،ص:۵۰-۵۱

(۴۰) ایضاً،ص:۲۷ (۴۱) ایضاً،ص:۱۶

(۴۲) غبار کاروان،زماں آزرد□پ وفیسر،مرزا □ □ حسن□ ب دسری نگر،۱۹۷۸ء،ص:۲۷

(۴۳) ایضاً،ص:۵۹

(۴۴) شیریں کے خطوط،زماں آزرد□پ وفیسر،۱۹۴۷ء،ص:۲۵-۲۳

(۴۵) غبار کارواں،ص:۹۱

(۴۶) موج قلم،منصور احمد منصور ڈاکٹر،میزان □ شرز،سری نگر،۲۰۱۱ء،ص:۶۱

(۴۷) لو ہم بھی آج صا □ کتاب ہوئے، شفیع احمد انجینئر،میزان پبلیشرز،سرینگر،۲۰۰۱،ص:۱۳

(۴۸) ایضاً،ص:۸ (۴۹) ایضاً،ص:۴۰

(۵۰) ایضاً،ص:۱۰ (۵۱) ایضاً،ص:۸۱

(۵۲) ایضاً، ص:۶۹

(۵۳) دام خیال، کاچو اسفندیار خان، کاچو □ □ ، کرگل، ص:۸

(۵۴) نگینہ انٹرنیشنل، سری نگر، شمارہ چار، ۲۰۱۵ء، ص:۲۶۴۔۲۶۵

(۵۵) دام خیال، ص:۱۴

(۵۶) نگینہ، ص:۱۴۰

(۵۷) نگینہ، شمارہ ۳، ص:۸۸

(۵۸) کشمیر اعظمی

(۵۹) ماہنامہ شگوفہ، حیدرآباد، ستمبر ۲۰۱۹ء، ص:۴۳

(۶۰) ایضاً، ص:۴۳

(۶۱) ایضاً، اپریل ۲۰۱۷، ص:۴۹

بنیادی ماخذ

نمبر شمار	مصنف	کتاب	طابع/ناشر	سال اشاعت
1	ابوالاشرف صدیقی	مہمات حیات	جے کے آفسیٹ، دہلی	2001
2	آغا جانی کشمیری	سحر ہونے تک	[illegible]، دہلی	1962
3	بیگم ظفر	میرے شب و روز	دہلی	1973
4	پرتپال سنگھ بیتاب	میرے حصے کی دھوپ	تحریر ادب پبلیکیشنز، بنارس	2020
5	پنڈت پریم ناتھ بزاز	کشمیر کا گاندھی	کشمیر پبلشنگ کمپنی، سرینگر	1934
6	[illegible] خورشید	بانہال کے اس پار	کشمیر پبلشرز، میرپور	1988
7	جگن ناتھ آزاد، پروفیسر	کولمبس کے دیس میں	جامعہ لمیٹڈ، دہلی	1987
8	جگن ناتھ آزاد، پروفیسر	پشکن کے دیس میں	جامعہ لمیٹڈ، دہلی	1986
9	جگن ناتھ آزاد، پروفیسر	جنوبی ہند میں دو دن	کتاب گھر، دہلی	1951
10	جگن ناتھ آزاد، پروفیسر	آنکھیں ترستیاں ہیں	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	1981
11	جگن ناتھ آزاد، پروفیسر	میرے گذشتہ روز و شب	جامعہ لمیٹڈ، دہلی	1965
12	چراغ حسن حسرت، مولانا	دو ڈاکٹر		
13	چراغ حسن حسرت، مولانا	مردم دیدہ		
14	چودھری غلام عباس	کشمکش	کشمیر بک فاؤنڈیشن	2017
15	حامدی کشمیری، پروفیسر	انجمن آرزو	ادارۂ ادب، سری نگر	1988
16	حامدی کشمیری، پروفیسر	رہگزر در رہگزر	سی ٹی کمپیو[illegible]، سری نگر	2013
17	دیپک بدکی	لوح حیات	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2018
18	ڈی، ڈی ٹھاکر	یادوں کے چراغ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2006

19	ساحل مقبول	□ن وجود (ای□ صحافی کی سر□ ش□)	میزان پبلیشرز، سرینگر	2009
20	شفیع احمد، انجینئر	لو ہم بھی آج صا□ کتاب ہوگئے	میزان پبلیشرز، سرینگر	2001
21	شہاب عنای□ ملک □وفیسر	□یدوں کے لمس	میزان پبلیشرز، سرینگر	2012
22	شہناز قادری، ڈاکٹر	اسفار شہاب	قاسمی کتب خانہ، جموں	2020
23	شیخ محمد عبداللہ	آتش چنار	علی محمد اینڈ□، سرینگر	1986
24	عبدالرشید ہانجوڑہ	چنار کے سائے میں	میزان پبلیشرز، سرینگر	2016
25	صنم□ بو	عبدالغنی شیخ	جمال□نٹنگ□یس، دہلی	1981
26	عبدالمجید سالک	مضامین □اغ حسن حسرت		1956
27	غلام نبی خیال	کاروان خیال	کشمیر را□س کا□نس، سری نگر	1998
28	قدرت اللہ شہاب	ماں جی		
29	قدرت اللہ شہاب	شہاب□ مہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	2014
30	قرۃ العین	آئینہ□	□زلہ سرینگر	2009
31	قرۃ العین	آئینہ□	□زلہ، سرینگر	2008
32	کاچو اسفند□یر خان	دام خیال	کاچو□ □، کرگل	
33	کاچو سکندر خان سکندر	افکار □یشان ۔ □یدوں کے دوش□	کاچو□ □، کرگل	2001
34	کشمیری لال ذاکر	یہ صبح □ہ رہے گی	سما□□کاش، نئی دہلی	1997
35	کشمیری لال ذاکر	□یران تیز گام	ایجوکیشنل □ ہاؤس	2006
36	کشمیری لال ذاکر	درد آشنا چہرے	موڈرن □ ہاؤس، دہلی	1998
37	کشمیری لال ذاکر	اپنی ہواؤں کی خوشبو	نئی آواز، جامعہ نگر دہلی	1989

38	لالہ ملک راج صراف	ا□ □ ابھی □ ہ ہے	راج محل پبلیشرز،جموں	1982
39	لالہ ملک راج صراف	شیر ڈ□ لالہ ہنس راج	راج محل پبلیشرز،جموں	1967
40	محمد الدین فوق،منشی	سف□ مہ کشمیر	کشمیری □ ین،لاہور	1907
41	محمد الدین فوق،منشی	س□ □ فوق		
42	محمد الیاس مضمر	سف□ مہ حج	میزان پبلیشرز،سرینگر	2020
43	محمد امین □ رابی	مشاہیر کشمیر	کلچرل اکیڈمی،سرینگر	1992
44	محمود محمد آزاد	سردار محمد خان کر□ی	کوٹلی،میر پور	
45	محمود ہاشمی	کشمیر اُداس ہے	قومی کتب خانہ۔راولپنڈی	1950
46	مرزا محمد زماں آزردہ □ وفیسر	غبار خیال	مرزا □ □ ،سرینگر	1973
47	مرزا محمد زماں آزردہ □ وفیسر	شیرین کے خطوط	مرزا □ □ ،سرینگر	1974
48	مرزا محمد زماں آزردہ □ وفیسر	غبار کاروان	مرزا □ □ ،سرینگر	1984
49	مصرہ مریم	حامدی کشمیری حیات و شاعری	کمپیو□ سٹی۔سرینگر	2001
50	□ سنگداس □ گس	انیسویں صدی کے ای□ عظیم جنزل: زورآور سنگھ	اخبار چان□ پ□ یس،جموں	1964
51	نیلوف□ زنحوی،ڈاکٹر	شہر ہائے نور	قادری □ □ ،سرینگر	2010

□ نوی ما□

نمبر شمار	مصنف	□ م کتاب	طابع/□ شر	سال اشا□
52	ابوالاعجاز حفیظ صدیقی	کشف تنقیدی اصطلاحات	مقتدرہ قومی □ ن،اسلام آ□ د	1958

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	سال
53	آدم شیخ، ڈاکٹر	ا□ ئیہ	امپوریئم□ ائیو□ لمیٹڈ، بمبئی	1965
54	آر۔آر کھجوریہ، ڈاکٹر، اے ۔این بھادرواج	جموں وکشمیر کے گو□	گلشن پبلشرز، سری نگر	1981
55	امان اللہ خان	جہد مسلسل	ایس۔ایس۔کمپ□ ،راولپنڈی	1992
56	امیر کبیر سید علی ہمدانی	سیدہ اشرف، مظفر	شیخ عثمان اینڈ□ ،سرینگر	2014
57	امین بنجارا	□ رِ آتش	مونومینٹل پبلیشرز، نئی دہلی	1998
58	انور سد□ ،ڈاکٹر	اردو ادب میں سفر□ مہ	مغربی□ کستان اردو اکیڈمی، لاہور	1987
59	اے۔ار بیگ۔ڈاکٹر	جموں وکشمیر میں اردو۔سقوط ہند سے قبل اور اس کے بعد	میزان پبلشر، سرینگر	2018
60	ایس مظفر الدین، ڈاکٹر	اردو کے شہرہ آفاق خودنو□ : ای□ تجز□ تی مطالعہ	سرمدی □ □ ،چنئی	2005
61	□ ج□ یمی، ڈاکٹر	جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو□	رچنا □ شرز، جموں	1992
62	□ ج□ یمی، ڈاکٹر	کشمیر کے مضامین	د□ □ □ ،سرینگر	1989
63	□ یگیڈر گھنسار سنگھ جموال ، مترجم خان علی□ □ چہ	گلگت ۱۹۴۷ء سے پہلے	سٹوڈ□ □ کمپنی، راولپنڈی	1986
64	□ راچند	□ ریخ ہند۔آزادی کے بعد	□ قی اردو بیورو، نئی دہلی	
65	تبسم کا□ ی	□ ریخ اردو ادب	ایجوکیشنل □ ہاوس، دہلی	2007
66	ثناءاللہ□	کشمیر 1947 سے 1977ء □	علی محمد اینڈ□ ،سری نگر	1980
67	جان محمد آزاد	جموں وکشمیر کے اردو مصنفین	کلچرل اکیڈمی، سری نگر	2004
68	جگ موہن	□ فیلے شعلے اور وادی کشمیر	سیما□ □ کاش، نئی دہلی	1993

69	جمال آر□ می	اردو میں افسانوی ادب	ایجوکیشنل □ ہاوس، نئی دہلی	1984
70	جگن□ تھ آزاد□ وفیسر	اقبال اور کشمیر	علی محمد اینڈ□، سری نگر	1977
71	جمیل جالبی، ڈاکٹر	□ ریخ اردو ادب	ایجوکیشنل □ ہاوس، نئی دہلی	1977
72	جمیل جالبی، ڈاکٹر	نئی تنقید	رائل □ کمپنی، کراچی	1985
73	جمیل زبیری	موسموں کا عکس	بختیار اکیڈی، کراچی	1984
74	جی۔ایم۔میر	جموں وکشمیر کی جغرافیائی □	رائل □ کمپنی، راولپنڈی	2011
75	□ اغ حسن حسرت	ارطغرل	□ ج کمپنی لمٹیڈ، لاہور	
76	چودھری محمد یوسف	کاروان یوسف	العمر□ نٹر، اسلام□ د	
77	حامدی کشمیری□ وفیسر	جموں وکشمیر میں اردو ادب	شیخ عثمان اینڈ□، سرینگر	2010
78	حامدی کشمیری□ وفیسر	معاصر تنقید ا□ نئے تناظر میں	شیخ عثمان اینڈ□، سرینگر	1992
79	حبیب کیفوی	کشمیر میں اردو جلد اول۔متحدہ جموں وکشمیر کی ادبی، سماجی اور سیاسی□ ریخ مرت□ ابن حبیب	میزان پبلشرز، سرینگر	2017
80	حبیب کیفوی	کشمیر میں اردو جلد دوم مرت□ ابن حبیب	میزان پبلشرز، سرینگر	2017
81	خالد محمود	اردو سفر□ موں کا تنقیدی مطالعہ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	2011
82	خاور جمیل	نئی تنقید	رائل □ کمپنی، کراچی	1985
83	خواجہ اکرم الدین□ وفیسر	اردو سفر□ موں میں ہندوستانی تہذی□ وثقافت کی عکاسی	قومی کو□ □ ائے فروغ اردو□ ن، نئی دہلی	2013
84	دیپک□ کی	جموں وکشمیر کا عصری ادب، مضامین وتبصرے	میزان پبلشر، سرینگر	2019
85	رشید حسن خان	ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ	ایجوکیشنل □ ہاوس، علی□ ھ	1978

86	رقیہ□ نو	لداخ میں اردو		2014
87	زاہد چودھری	مسئلہ کشمیر کا آغاز	ادارۂ مطالعہ□ ریخ، لاہور	2012
88	سارہ بتول	عبدالرشید راہگیر لداخی بحیثیت فکشن نگار	غیر مطبوعہ	
89	سجاد احمد خان، ڈاکٹر	اردو میں رپو□ ژ نگاری کا تنقیدی تجزیہ	عرشیہ□ □ ، دہلی	2019
90	سردار محمد□ اہیم خان	متاع ن□ گی	کلاسک، لاہور	1947
91	سلمیٰ اعوان	یہ میرا بلتستان	سنگ میل □ یشنز، لاہور	1988
92	سلیم شہزاد	فرہنگ ادبیات	قومی کو□ □ ائے فروغ اردو□ ن ، نئی دہلی	2018
93	سلیم□ □ ی	میں نے کشمیر جلتے دیکھا	□ پبلشرز، لاہور	1991
94	سید ابوظفر□ وی	مختصر□ ریخ ہند	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم□ ڑھ	2013
95	سید علی شاہ گیلانی	روداد قفس	جے کے □ ہاؤس۔سرینگر	2012
96	سید محمد □ ۔ڈاکٹر	صنف ا□ ئیہ اور ا□ ئیے	نسیم □ ڈپو، لکھنو	1973
97	سید محمود آزاد	□ ریخ پونچھ	ادارۂ معارف، کشمیر	1975
98	سیدہ جعفری	□ ریخ اردو ادب		2002
99	شاہ رئیس خان۔ احمد حسن دانی۔ڈاکٹر	□ ریخ گلگت	قائد اعظم یونیورسٹی۔اسلام آ□ د	1987
100	شبلی نعمانی	سفر□ مہ روم و مصر و شام	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم□ ڑھ	1911
101	شبنم قیوم	یہ کس کا لہو ہے یہ کون مرا ہے؟	کاشانہ ادب، سرینگر	
102	شفیع الدین	□ ریخ سلاطین کشمیر	ہلال□ یس	
103	شفیع انجم	اردو افسانہ	پورپ اکادمی، اسلام آ□ د	2008

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	سال
104	شہاب عنای□ ملک پ□ وفیسر	جموں و کشمیر میں اردو □ ن ،ماضی، حال اور مستقبل	قاسمی کتب خانہ، جموں	2014
105	شہاب عنای□ ملک پ□ وفیسر	عصری ادب تفکرات	میزان پبلیشرز، سرینگر	2012
106	شہاب عنای□ ملک پ□ وفیسر	مضامین شہاب	میزان پبلیشرز، سرینگر	2010
107	شہاب عنای□ ملک پ□ وفیسر	وادیٔ چناپ میں اردو □ ن و ادب	قاسمی کتب خانہ، جموں	2017
108	شہناز انجم	شمالی ہند میں غیر افسانوی □ 1800ء سے 1857ء □	فائن آرٹ ایجنسی، دہلی	2007
109	صل□ آفاقی	□ ریخ کشمیر اسلامی عہد میں	سنگ میل □ □ ،لاہور	1984
110	صل□ آفاقی	عکس	ادبیات مظفر□ د	1980
111	صل□ ہ سعید، ڈاکٹر	اردو ادب میں خاکہ نگاری	مکتبہ شعر و حکمت، حید□ د	1987
112	صوفی غلام محی الدین	کشمیر ی□ کمیونٹری	صن□ □ شرز، سرینگر	1978
113	صوفی غلام محی الدین	جموں و کشمیر میں اردو صحافت	□ ئمنر □ □ ،سری نگر	1973
114	طلعت گل	اردو میں رپو□ ژ نگاری	شبانہ □ □ ،دہلی	1992
115	عاشق کا□ ی	□ ریخ تحر ی□ اسلامی جموں و کشمیر	ادارۂ معارف، کشمیر	1989
116	عبادت □ □ ی، ڈاکٹر	افسانہ اور افسانہ کی تنقید	ادارۂ ادب تنقید، لاہور	1968
117	عبدالمجید سالک	مضامین □ اغ حسن حسرت		
118	عبدالرحمٰن، کو□ وی	□ جمہ (داستان حیات، سید میر قاسم	ادارۂ ادبیات، دہلی	1985
119	عبدالعز□	اردو میں رپو□ ژ نگاری	مکتبہ شاہراہ، ارد□ زار، دہلی	1977
120	عبدالغنی شیخ	لداخ کی□ ریخ کے اہم گوشے	اپل□ بکس، نئی دہلی	2017

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	سال
121	عبدالغنی،شیخ	لداخ تہذیب وثقافت	کر □ ہاوس،پبلشرز،جموں	2002
122	عبدالغنی،شیخ	لداخ محققوں اور سیاحوں کی □ میں	اردو ب ریویو،□ □ ،نئی دہلی	2009
123	عبدالقادرسروری پ وفیسر	کشمیر میں اردو،حصہ اول ، دوم اورسوم	کلچرل اکیڈمی،سرینگر	1984
124	عبدالقادرسروری پ وفیسر	کشمیر کےدواد ب دو بھائی	مجلس تحقیقات اردو،حیدرآب د دکن	1975
125	عبدالقیوم	لداخ پ ا طاَ انہ□	□ طلا ببری،لیہہ لداخ	2008
126	عطیہ ر□ ،ڈاکٹر	اردو میں غیر افسانوی □ مابعد آزادی	ایم۔آر□ □ ،نئی دہلی	2008
127	غلام حسن سہروردی	□ ریخ گلستان	وری ً گ پبلیشرز،میرپور	1992
128	غلام حسن اظہر،ڈاکٹر	چودھری غلام عباس شخصیت اور کا□ مے	میاں مجلس،بھمبر	
129	فرمان فتح پوری،ڈاکٹر	اردو فکشن کی مختصر □ ریخ	بیکن بکس،لاہور	
130	فرمان فتح پوری،ڈاکٹر	اردو□ کا فنی ارتقا	الاوقار□ □ ،لاہور	2003
131	فیصل حسین،ملک	کشمیراورڈا□ ہ راج	ملحقہ□ □ ،پشاور	1989
132	فوزیہ اسلم،ڈاکٹر	اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجرب ت	پورپ اکادمی،اسلام آب د	2007
133	فیض احمد فیض	میزان	مغربی بنگال اردو اکادمی،کلکتہ	1982
134	قاضی□ رالحسن	نگارستان کشمیر	ب□پ یس،نئی دہلی	1934
135	قدسیہ قریشی	اردو سفر□ مے انیسویں صدی میں	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،دہلی	1987
136	قرۃ العین	آئینہ□	□ زلہ،سرینگر	2009

#	مصنف	کتاب	ناشر	سال
137	قمر□	اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب	کتابی د□، دہلی	2004
138	کاچوسکندرخان سکندر	قدیم لداخ	کاچوپبلیشرز، کرگل	1987
139	کرن سنگھ، ڈاکٹر	ولی عہد	میزان پبلیشرز، سری نگر	2005
140	کشمیری لال ذاکر	□ کشمیر جل رہا تھا	حالی □ ہاوس، دہلی	1984
141	کلہن پنڈت	راج□ نگی	□ی□ گ پبلشرز، سرینگر	
142	کمال احمد صدیقی	کشمیر: ای□ منظ□ مہ	پینگوئن بکس، نئی دہلی	2008
143	گوپی چن□ ر□ □ پروفیسر	اردو افسانہ روای□ اور مسائل	سنگ میل □ □، لاہور	1968
144	مجید بیدار، □ پروفیسر	اردو کی شعری و□ی اصناف، تحقیق وتنقید		
145	محمد ادریس، حافظ	دختر کشمیر	مظفر□ د	1994
146	محمد اقبال، لون	نورشاہ، فکر وفن	میزان پبلیشرز، سرنگر	2017
147	محمد الدین فوق، منشی	□ ریخ □ شاہ	ظفر□ اد□ □ ان کتب	1944
148	محمد الدین فوق، منشی	□ ریخ اقوام کشمیر	گلشن پبلشرز، سرینگر	1996
149	محمد الدین فوق، منشی	□ ریخ اقوام پونچھ	□ی□ گ پبلشرز، میر پور	1991
150	محمد امین، پنڈت	مختص□ ریخ کشمیر	گلشن پبلشرز، سرینگر	1982
151	محمد امین، پنڈت	لداخ کی کہانی	□ شاہ پبلشرز، سرینگر	1970
152	محمد امین، □ رابی	مشاہیر کشمیر	کلچرل اکیڈمی، سرینگر	1992
153	محمد مجیب	جا□ □ ریخ ہند	□ قی اردو بیورو، نئی دہلی	1984
154	محمد حسن، حسرت	بلتستان، تہذی□ وثقافت	سکردو □ ڈپو، □ زار، اسکردو	2007
155	محمد حسن، حسرت	□ ریخ ادبیات بلتستان	سکردو □ ڈپو، □ زار، اسکردو	1992
156	محمد عبداللہ، قریشی	□ ان کبیر، □ ان صغیر	آئینہ ادب، لاہور	1971
157	محمد عمر نور الہی	□ □ سا□	قومی ا□ ٹیوٹ، نئی دہلی	1991

نمبر	مصنف	کتاب	ناشر	سال
158	محمد منظور عالم	جگن تھ آزاد، فکروفن	محروم میموریل لٹری سوسائٹی، نئی دہلی	1999
159	محمد یوسف، حسین آبادی	بلتستان پا ای	اسکردو بلتستان	1984
160	محمد اجمل زی، ڈاکٹر	تصانیف فوق	سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور	1990
161	محمد اجمل زی، ڈاکٹر	فوق الکشمیر		
162	محمود آزاد	ریخ کشمیر	ادارۂ معارف، کشمیر	
163	خورشید	ر مشاہدات و واقعات، کے ایچ خورشید کی یاداشتوں سے ماخوذ	یپ کستان ، لاہور	2009
164	مرزا حامد، بیگ	اردو سفر ے کی مختصر ریخ	اور پبلشرز، لاہور	1999
165	مستنصر حسین رڑ	نگپ.	سنگ میل ، لاہور	1991
166	ممتاز شیرین	معیار	ادارہ، لاہور	1963
167	منصور احمد منصور، ڈاکٹر	موج قلم	میزان پبلیشرز، سرینگر	2011
168	منظر عباس ی وفیسر	اسلوبیاتی مطالعے	ایجوکیشنل ہاوس	1989
169	منظور عالم	قراقرم، ہندوکش	احمد ہاوس، گلگت	1985
170	مولا ج الدین احمد مدنی	علامہ انور شاہ کشمیری اور ان کی علمی مات	شعبۂ نشر واشا ، دارالعلوم آمینیہ	1991
171	مولوی حشمت اللہ، الحاج	ریخ جموں، کشمیر، ولداخ، بلتستان، پورگ، گلگت، جموں مظفرآباد	جے کے ہاوس، ئ روڈ،	1937
172	مولوی حشمت اللہ، الحاج	ریخ جموں	جے کے ہاوس، ئ روڈ، جموں	1998
173	مولوی حشمت اللہ، الحاج	ریخ جموں ونواحات	جے کے ہاوس، ئ روڈ، جموں	1998

174	مولوی حشمت اللہ، الحاج	مختصر تاریخ جموں وکشمیر	جے کے بک ہاؤس، ریزیڈنسی روڈ، جموں	1963
175	مولوی سمیع اللہ	مسافران لندن، مرتبہ، اصغر عباس	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	2012
176	مولوی فیروز الدین	فیروز اللغات	یسین بکڈپو، دہلی	
177	نثار احمد فاروقی	دید و دریافت	آزاد کتاب گھر، کلاں محلّہ، دہلی	1946
178	ہرگوپال کول خستہ، پنڈت	تواریخ/گلدستہ کشمیر	آریہ پریس، جموں	1883
179	وزیر آغا	ادب اور جنس کا مسئلہ	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	1987
180	وزیر آغا	انشائیہ کے خدوخال	نئی آواز، جامعہ نگر، نئی دہلی	1991
181	یوسف خان کمبل پوش	عجائبات فرنگ، مرتبہ، تحسین فراقی	مکہ بک ہاؤس، علی گڑھ	1938
182	یوسف شفیق	آئینۂ کشمیر	عرش پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ	2012

انگریزی کتب

S.No	Author	Book	Publisher	Year
183	A.K Francke	A History of Ladakh	Gulshan Publisher ,Srinagar	1907
184	A.K Francke	Ladakh mysterious land	City Book Centre, Srinagar	2003

185	A.K Francke	A History of Western Tibet ; One of the Unknown Empires	S.W Partidge & Co. London	1907
186	Alexender Cunninghum	Ladakh	Gulshan Publisher , Srinagar	1997
187	Arunadhati Roy	The Ministry of Utmost Happiness	Penguin India, New Delhi	2017
188	Basharat Peer	Curfewed Night	Penguin India, Gurgaon	2009
189	C . L . Dutta	Ladakh & Himalayan Politics, 1819-1948	Munshi Ram Manohar Lal, Publisher,New Delhi	1973
190	B.K Featherstone, Captain	Unexplored Pass: A Narrative of a thousand mile journey to the Karakoram Himalaya	Hutchison & Co. Ltd. London	1890
191	Cecil Earle Tyndale Biscoe	Kashmir: In Sunlight & Shades	Mittal Publications, New Delhi	1925
192	D.D.Sharma	Tribal Languages-I	Mittal Publications, New Delhi	2003

193	L .Petech, Dr.	A Study on the Chronicles of Ladakh	Culcutta	1919
194	F.M.Hussain	British Policy towards Kashmir	Light & Life Publication, New Delhi	1973
195	Filippo De Flippi	Himalayan Karakoram Eastern Turkistan	Edward Arnold, London	1932
196	Frederic Drew	Jammu & Kashmir Territories	Capital Publisher House, New Delhi	1997
197	Ghulam Mohiuddin Sofi	A History of Kashmir (Kashmir under the Dogras)		1973
198	Ghulam Rasool Galwan	The Servant of Sahibs	Cambridge Press, London	1923
199	Gypsy Davy & Lady Ba	The Himalayan Letters	Book Faith India	1994
200	Janet Rizvi	Ladakh : Crossroad of High Asia	Oxford University Press, London	1996
201	Jaswant Singh	Jinnah : India Pakistan Independence	Rupa Co. New Delhi	2009
202	K.L.Kalla	The Literary Heritage of Kashmir	Mittal Publications, New Delhi	1985

203	K M Parnikkar	The Founding of Kashmir State : Biography of Maharaja Gulab Singh	George Allen & Unwin Ltd., London	1930
204	Major J Biddulph	Tribes of the Hindoo Koosh	Govt. Press, Calcutta	1880
205	Mohammad Ishaq Khan	History of Srinagar	Amir Publication, Srinagar	1978
206	Monisha Ahmad & John Bray	Recent Research on Ladakh	International Association for Ladakh Studies, Leh	2009
207	Nawang Tsering Shaqspo	Ladakh Language & Literature	Centre for Research on Ladakh Leh	1985
208	Nawang Tsering Shaqspo	A Cultural History of Ladakh	Centre for Research on Ladakh Leh	2019
209	P.N Pushp	Glimpses of Kashmir, Jammu ,Ladakh	Gyan Publication, Delhi	2000
210	P Parimoo	Kashmir at Crossroads: Teh Search of Destiny		2010

211	Pervaiz Dewan	Jzmmu, Kashmir & Ladakh	Manas Publication, New Delhi	2004
212	Pran Kishore	Radio Kashmir: My days in Broadcasting	Chinar Publisher	2018
213	Prem Nath Bazaz	The Hostory of Struggle for Freedom in Kashmir	Kashmir Publishing House, New Delhi	1954
214	R C F Schomberg	Unknown Karakoram	Martin Ltd., London	1936
215	S Kumar Mahajan	Debacle in Kashmir		1973
216	Shridhar Koul & H N Koul	Ladakh Through the Ages: Towards A New Identity		1992
217	Sven Hedin	Trans Himalaya		1907
218	Tashi Rabgias	The History of Maryul Ladakh	Jayyed Press, Delhi	2018
219	Teg Bahadur Kapur	Ladakh the Wonderland	Mittal Publications, New Delhi	1987

رسائل وجرائد

نمبر شمار	جریدہ/رسالہ	مقام اشاعت	تاریخ/سنہ اشاعت
220	[illegible]	شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر	2006
221	تحریرِ ادب	بنارس	2013
222	تحریرِ ادب	بنارس	جنوری تا مارچ 2020
223	روزنامہ اڑان	جموں	
224	روزنامہ الصفا	سرینگر	
225	روزنامہ آفتاب	سرینگر	
226	روزنامہ تسکین	جموں	
227	روزنامہ تعمیل ارشاد	سرینگر	
228	روزنامہ کشمیر عظمیٰ	سرینگر	
229	روزنامہ منصف	حیدرآباد	
230	روزنامہ ہند سماچار	جالندھر	
231	سہ ماہی ادب وثقافت	مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	
232	سہ ماہی اردو ریسرچ جرنل (آنلائن)		
233	سہ ماہی عالمی ادبستان	مئو ناتھ بھنجن، اتر پردیش	
234	سہ ماہی عالمی میراث	پونے مہاراشٹر	دسمبر 2019 تا جنوری 2020
235	سہ ماہی عالمی میراث	پونے مہاراشٹر	2017
236	سہ ماہی عالمی میراث	پونے مہاراشٹر	ستمبر تا دسمبر 2020
237	شاعر	بمبئی	اکتوبر 2005

238	ششماہی تسلسل	شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں	جنوری تا ستمبر 2014
239	شگوفہ	حیدرآباد، دکن	
240	شیرازہ	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر	1998
241	شیرازہ	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر	
242	شیرازہ	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر	
243	شیرازہ	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر	
244	کشمیری میگزین	لاہور	1907
245	ماہنامہ پاسبان	چنڈی گڑھ	فروری 1989
246	ماہنامہ ادب لطیف	لاہور	اکتوبر 1947
247	ماہنامہ اردو آنگن	ممبئی	
248	ماہنامہ اردو دنیا	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	
249	ماہنامہ خواتین دنیا	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	مارچ 2022
250	ماہنامہ تعمیر	محکمہ اطلاعات جموں وکشمیر، سرینگر	
251	ماہنامہ سب رس	ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد	
252	مخزن	لاہور	1901
253	مخزن	لاہور	1906
254	معیار (تنقید)	نیا ادارہ لاہور	1963
255	نقوش	لاہور	1955
256	نقوش (آپ بیتی نمبر)	لاہور	1955

257	□ش شخصیات نمبر	لاہور	
258	□ش کشمیر	مقبول اکیڈمی لاہور	1993
259	نگینہ انٹرنیشنل	سرینگر	
260	ہفت روزہ عوامی دور	جموں	1978
261	ہمارا ادب	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر	2018
262	ہمارا ادب (شخصیت نمبر)	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر	1987

Websites & Search Engines

S.No	Websites
263	www.academia.edu
264	www.archive.org
265	www.brill.com/urds
266	www.eap.bl.uk
267	www.facebook.com
268	www.google.com
269	www.hamariweb.com
270	www.jstor.org
271	www.kutubistan.blogspot.com
272	www.lib.uchicago.edu
273	www.nationalarchive.nic.in
274	www.punjund.com

275 www.shoudhganga.inflibnet.ac.in

276 www.rekhta.org

277 www.urdulinks.com/urj

278 www.wikipedia.org

279 www.yahoo.com

باب ششم: جموں و کشمیر میں سفرنامہ نگاری

الف: ابتدا سے 1960ء

ب: 1960ء سے 1980ء

ج: 1980ء سے حال

الف: ابتدا سے 1960ء

سفرنامہ وہ بیانیہ صنف ادب ہے جسے مسافر سفر کے دوران یا منزل پر پہنچ کر اپنے تجربات و مشاہدات کی مدد سے تحریر کا جامہ پہناتا ہے اور اپنی گزری ہوئی کیفیات سے دوسروں کو واقف کرواتا ہے۔ وہ اس تحریر میں اپنے سفر کے اغراض و مقاصد، روداد و واقعات، تاثرات اور راہ میں درپیش تحیّر، استعجاب اور اضطراب کو اس طرح قلمبند کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے پوری تصویر آ جاتی ہے بلکہ اس مقام سے متعلق تمام معلومات مع ضروری تفاصیل سے قارئین کے علم و آگاہی میں اضافہ کر دیتا ہے۔ سفرنامہ عربی لفظ ''سفر'' سے مشتق ہے۔ جس کے معنی مسافت طے کرنے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرنے کے ہیں۔ انسانی زندگی کو ہی سفر کا دوسرا نام دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ معلوم کرنا مشکل امر ہے کہ آخر انسان نے سفر کب سے اور کیوں شروع کیا؟ البتہ یہ بات طے ہے کہ اس زمین پر انسان کے وجود اور حضرت آدمؑ کی جنت سے بے دخلی سے ہی سفر حیات کی شروعات ہوتی ہے جو ہنوز جاری ہے۔ انسان روزمرہ کی زندگی میں اپنی ضروریاتِ زندگی یا تفریحِ طبع کے لیے حرکت و عمل کرتا ہے زندگی میں اگر یہ امر نہ ہو تو زندگی یک رنگی اور جامد بن جاتی ہے۔ گھر کی چاردیواری میں مقید اور جامد زندگی موت کی علامت ہوتی ہے۔ اور یہی حرکت و عمل سفر کا موجب بنتا ہے۔

سفرنامہ دراصل ایک باشعور سیاح کے ان تجربات و مشاہدات اور رودادِ قلبی کا نچوڑ ہوتا ہے۔ جو اس نے دوران سفر محسوس کیا ہو اور وہ حوادث جو اس پر گزرے ہوں جسے وہ دورانِ سفر یا اختتام سفر پر قلمبند کرے۔ یعنی سفرنامے کے لیے ''سفر'' بنیادی شرط ہے۔ یہ نہیں کہ کوئی اپنے مطالعہ کی بنیاد پر کوئی سفرنامہ لکھ ڈالے۔ ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> ''سفرنامے کا شمار اردو زبان کی بیانیہ اصناف میں ہوتا ہے۔ سفرنامہ چونکہ چشم دید واقعات پر لکھا جاتا ہے اس لیے سفر اس کی اساسی شرط ہے بادی النظر میں سفر کے ساتھ انجانے دیسوں کی سیر، نئی فضاؤں سے واقفیت اور انوکھے مناظر کے مشاہدے کا تصور وابستہ ہے۔
> اس لیے سفر میں تحیر کا عنصر فطری طور پر شامل ہوتا ہے۔''[1]

کیونکہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ سفرنامہ کے لیے سفر لازمی ہے۔ سفرنامہ لکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سفرنامہ نگار کا مشاہدہ و تجربہ وسیع ہو اور تخیل بھی قوی ہو یعنی وہ صاحب بصیرت و بصارت ہوں۔ ان صلاحیتوں کے بغیر سفرنامہ

ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ سفرنامہ نگار دورانِ سفر جن جن مقامات کا سفر کرتا ہے اور جن جن اشیاء پر اس کی نگاہ جائے، ان تمام شے کو اپنے قلم کے ذریعہ سفرنامہ میں رقم کریں تو ایک کامیاب سفرنامہ وجود میں آتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر قدسیہ قریشی لکھتی ہیں:

> ''سفر سے تجربہ وسیع ہوتا ہے، دوسرے لوگوں کو دیکھ کر اپنی اچھائیوں اور برائیوں پر نظر پڑتی ہے اور زندگی کے نئے راستے معلوم ہوتے ہیں۔ احباب کی تعداد بڑھتی ہے، علماء و صلحا کی صحبتوں اور رؤساء و اکابر کی ملاقاتوں سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا ہے، زمانے کے نشیب و فراز کو دیکھ کر طبیعت میں بیداری اور ہوشیاری اور دل میں خود اعتمادی، واولوالعزمی، قوت ارادی اور آزاد خیالی پیدا ہوتی ہے۔۔ ایک سیّاح مختلف اقوام کے رسم و رواج، طرز معاشرت، تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن اور ان کے سیاسی و انتظامی امور سے واقف ہو کر اپنے وطن واپس آتا ہے اور ان تمام باتوں سے استفادے کی کوشش کرتا ہے۔''[۲]

کامیاب سفرنامہ لکھے جانے کا بہت کچھ انحصار مسافر یا سیّاح کی مزاجی کیفیت اور اس کے تجربات پر ہوتا ہے۔ عازم سفر کے لیے یہ دلاسا ہوتا ہے کہ باہر نکلو تو مسافر نواز بہترے ملیں گے، ہزاروں شجر سایہ دار راہ میں منتظر ملیں گے۔ بعض سفر کسی ضروری کام یا کسی ضروری مقصد کے لیے ہوتے ہیں اور کچھ لذت صحرا نوردی کے لیے جہاں گرد اس جہاں گشت بن جاتے ہیں تو کچھ مقامات مقدسات کی زیارت کے لیے جستجو کرتے ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب اور سماج سفر کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے وسیلہ ظفر قرار دیتے ہیں۔ اسلام میں سفر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوجاتا ہے کہ مسافر کو نماز میں بھی رعایت حاصل ہے۔ قرآن کریم میں بھی '' سیروافی الرض'' کا حکم ہے۔ دوران سفر انسان پر حیرت و استعجاب کے نئے نئے دروازے کھلتے جاتے ہیں۔ انسان ہر لمحہ رواں دواں زندگی میں ایک جگہ ٹھہرنا پسند کرے۔'' ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا'' کے مصداق نئی دنیاؤں کی تلاش، اس کی سرشت میں شامل ہے، حرکت زندگی کا ثبوت ہے اور آگے بڑھنے کا شوق پیدا کرتی ہے۔ بقول انور سدید:

> ''انسان کی سفر پسندی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ فطری طور پر تنوّع پسند ہے وہ جس ماحول میں سانس لیتا ہے، کچھ عرصے کے بعد اس کی یکسانیت سے اکتا جاتا ہے۔ کسی دوسرے مقام پر عارضی مکانی اسے نہ صرف تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتی ہے بلکہ اس سے زندگی کی

طویل یکسانیت اور بوریت بھی ختم ہو جاتی ہے اور انسان جب سفر سے واپس آتا ہے تو تازہ و
نئے طرزِ حیات میں دوبارہ شریک ہونے کے لیے اپنے آپ کو تازہ دم بھی محسوس کرنے لگتا ہے۔
سفر کی نوعیت جیسی بھی ہو مسرت اور لطافت کی ایک مخصوص کیفیت اس کے ساتھ ہمیشہ وابستہ
رہتی ہے اور بعض اوقات یہی کیفیت انسان کو دیکھے ہوئے راستوں کو دوبارہ دیکھنے پر بھی
آمادہ کرتی ہے۔''[3]

سیاح نئی منزل نئے مقامات اور نئی دنیا دیکھ کر نہ صرف وہاں کی ظاہری چیزوں سے متاثر ہوتا ہے بلکہ وہاں کی اندرونی و داخلی کیفیات سے بھی آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس جگہ کی آب و ہوا، مناظر قدرت، صنعت و حرفت، تاریخ و معاشرت، تہذیب و تمدن، ادب و ثقافت، زبان اور طرز زندگی کو جاننے کا شوق ہر سیّاح و سفرنامہ نگار میں موجود رہتا ہے۔ اور وہاں کی تمام چیزوں سے متاثر ہو کر وہ اپنی اصل دنیا کی طرف لوٹ آتا ہے اور اپنے آپ میں اور اپنی ذات میں کچھ تبدیلی لانے، اپنے آپ کو بدلنے اور اس نئے مقام اور ماحول کی مطابقت میں خود کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسانی زندگی کا دوسرا نام ہی سفر ہے کیونکہ انسان آئے دن نئی خواہشات اور نئے مقصدِ حیات کے لیے کوشاں رہتا ہے تاکہ اپنی روزمرہ زندگی میں بہتر سے بہتر وسائل اور اسباب و آسائش میّسر ہوں ترقی کی نئی راہیں کھلیں، کامیابی کی نئی منزل ملیں۔ بقول شاعر

منزل سے آگے بڑھ کر منزل تلاش کر
مل جائے تجھ کو دریا تو سمندر تلاش کر

انور سدید لکھتے ہیں:

''سفر کا سب سے قیمتی عنصر اس کی حرکت ہے۔ اور زندگی چونکہ خود مسلسل ایک حرکت ہے اس
لیے سفر بھی زندگی کا ہی استعارہ ہے۔''[4]

ہر شخص کے رجحانات، احساسات، دلچسپیاں اور مزاج و فطرت دوسروں سے مختلف ہوتی ہیں۔ ہر کسی کا کسی بھی منظر کو دیکھنے کا زاویہ اور اس کے تاثرات بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ مثلاً کئی سفرنامہ نگار مختلف ادوار میں ایک ہی شہر یا مقام کی سیر کرتے ہیں لیکن اس شہر یا مقام میں سیر کرنے کے لیے جگہ کا انتخاب وہ اپنی اپنی پسند اور دلچسپی کے مطابق ہی کرتے ہیں اور مختلف مناظر کو اپنے اپنے ذوق کے ہی مطابق لکھتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کے بارے میں، سیاسی و سماجی

صورت حال میں دلچسپ چیزوں کو اپنے سفرنامہ میں انتخاب کرنے کا سلیقہ بھی ہر ایک کا نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے مختلف مزاج و خیالات اور تاثرات اور رنگا رنگی کے باعث اس صنف میں قاری کی دلچسپی بڑھتی ہے۔ ہر معاشرے میں خوبیاں و خامیاں ہوتی ہیں اور مسئلے مسائل بھی۔ ضروری نہیں کہ سفر میں پھولوں کی وادی ہی ملے۔ کہیں سہولیات میسر ہوتی ہیں تو کہیں پر تکالیف اور سختیوں کو جھیلنا پڑتا ہے۔ انہی مختلف واقعات، حادثات، تجربات اور حالات کو جب ایک سفرنامہ نگار اپنے مشاہدات کی روشنی میں قلمبند کرتا ہے تو ایک کامیاب سفرنامہ وجود میں آتا ہے۔ یوں اگر خالی اپنے سفر کے روداد قلمبند کریں تو وہ رپورتاژ کے زمرے میں آتا ہے۔ سفرنامے کا فن، اسلوب اور تکنیک کو سمجھ کر لکھنے سے کامیاب اور جاندار سفرنامہ وجود میں آئے گا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''سفر کا بیان مونہہ بسورنے اور نالہ و فریاد کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تخلیقی سفرناموں کی شگفتہ بیانی 'راضی بہ رضا ہونے کی علامت ہے۔ فطری سیّاح اپنے منتخب کردہ صعوبت سفر کے مآل پر راضی بہ رضا ہی ہوتا ہے۔ سو طے پایا کہ اس لیے شگفتہ اور سبک انداز تحریر مناسب ہے لیکن نہ اتنا کہ پھکڑ بازی کی حدوں کو چھونے لگے۔''۵

سفرنامہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں مصنف کے تاثرات اور قوت مشاہدات سب سے زیادہ کارفرما ہوتے ہیں۔ سفرنامہ چونکہ واحد متکلم طرز تحریر ہوتی ہے اس لیے فطری طور پر اس میں ''آپ بیتی'' کا انداز در آتا ہے۔ دلچسپی کا عنصر بڑھ جاتا ہے اور سفرنامہ نگار ہی ہیرو یا مرکزی کردار نظر آنے لگتا ہے۔ سفرنامے کی کامیابی میں اس کے اسلوب اور تکنیک کو بھی اہمیت حاصل ہے اس لیے سفرنامہ نگار اپنی یادداشت اور واقعات کو کیسے محفوظ رکھتا ہے یہ بھی اہم ہے۔ بقول انور سدید:

''سفرنامہ، سفر کے تاثرات حالات اور کوائف پر مشتمل ہوتا ہے۔ فنی طور پر سفرنامہ وہ بیانیہ ہے جو سفرنامہ نگار سفر کے دوران یا اختتام سفر پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر اوقات قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔ اس صنف ادب کا تمام تر مواد موجود منظر کے روبرو پیش ہوتا ہے لیکن واضح رہے کہ سفرنامہ نگار صرف خارجی ماحول کا مشاہدہ نہیں کرتا بلکہ اپنے بیانیہ کو مدلل اور ہمہ گیر بنانے کے لیے بہت سی دوسری جزئیات کو بھی سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ سفرنامہ نگار کی آنکھ جتنی زیادہ ریز بین ہوگی جزئیات اتنی ہی تفصیل سے اس کے مشاہدے میں آئیں

گی۔"۶

سفرنامے میں واقعہ نگاری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دراصل ایک کامیاب سفرنامہ واقعات کی ایک سلسلہ وار کڑی ہوتی ہے۔ ہم سفرنامہ نگار کی آنکھ اور قلم کے ذریعہ دنیا جہان کی سیر ہی نہیں کرتے بلکہ وہاں پیش آنے والے حالات و واقعات کے بھی چشم دید گواہ بھی بن جاتے ہیں۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ دیس بدیس لیے پھرتا ہے اور ہم گھر بیٹھے ہی مختلف دیس بدیس کے مقامات کی سیر کر آتے ہیں۔ سفرنامہ نگار جن جن مقامات سے گزرتا ہے نہ صرف وہاں پیش آنے والے واقعات مشاہدات و تجربات سے متعلق معلومات فراہم کرتا چلا جاتا ہے بلکہ ان مقامات کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات پر بھی اظہار خیال کرتا چلا جاتا ہے۔ مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

> "روایتی سفرنامہ ہمیں مقامات سفر سے متعارف کراتا ہے اور غیر روایتی سفرنامہ کیفیتِ سفر سے۔ مقاماتِ سفر کی تفصیل لکھنے والا زماں و مکاں کا اسیر ہوتا ہے۔ جبکہ کیفیاتِ سفر قلمبند کرنے والا زماں و مکاں سے ہٹ کر بھی سوچتا ہے اور یہی چیز اس کے سفرنامے کو معلومات کا گنجینہ بننے سے بچاتی ہے اور اس کا رشتہ ادب سے قائم کرتی ہے۔"۷

سفرنامہ نگار کا سفر کرنے کے ادارے کے پسِ پشت مختلف اغراض و مقاصد ہوتے ہیں اور انہی اغراض و مقاصد کے تحت رختِ سفر باندھتا ہے اور دورانِ سفر اپنے ساتھ درپیش تمام حالات و کوائف کو لکھتا ہے۔ سفر اختیار کرنا چونکہ ایک مشکل عمل ہے۔ راہ میں بے شمار پریشانیوں، صعوبتوں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج کے دور میں سفر کرنے کے لیے سائنسی ایجادات و ترقی سے بہت سی سہولیتیں میسّر آئی ہیں۔ ہوائی جہاز سے لے کر شہروں میں گھومنے کے لیے ٹیکسی وغیرہ بہ آسانی مل جاتی ہے۔ جو اپنے ہاتھ کے موبائل فون کے ذریعہ کچھ ہی منٹوں میں دستیاب رہتی ہے۔ گوگل میپ کے ذریعے سے کسی بھی مقام کے خد و خال اور سمتوں کا تعین کرنا اور گوگل ٹرانسلیٹر کے ذریعہ مختلف زبان کے جملے سے موجودہ دور کے سیاح کے لیے بہت سی آسانیاں مہیا ہیں۔ علاوہ ازیں قیام و طعام کی سہولیات اور عمدہ اور جستہ معلومات ہمیشہ دستیاب ہوتی ہیں۔ لیکن گئے دنوں میں سیّاح کے لیے سفر کرنا پُر خطر راستوں، دریاؤں صحراؤں میدانوں اور پہاڑوں کو سر کرنا اور راستے میں زادِ راہ کی قلت، انجان جگہوں پر اجنبی لوگوں سے ملنے، زبان سے نا آشنائی اور رابطہ نہ کر پانا بھی مشکل کام بنتا تھا۔ یہ تمام چیزیں ایک مسافر کے لیے صبر آزما کام ہوتا تھا۔ سیاح اپنے گھر سے عین جوانی میں نکلتا تو ادھیڑ عمر میں واپس پہنچتا تھا لیکن اپنے ساتھ معلومات، تجربات، مشاہدات اور تاثرات کا

ایک لازوال زینہ لے آتا تھا۔ کیونکہ انہیں جس مقام پر جانا ہوتا تھا مقامی لوگوں کے ساتھ رہ کر ان کو سمجھنے اور مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ایسے سیّاحوں کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

سفر انسان کی جبلت میں شامل ہے اور زندگی کا ایک لازمی جز ہے۔جس کے ذریعہ وہ قدیم وجدید تہذیب و تمدن اور احوال وکوائف سے متعارف ہوتا ہے۔فطری طور پر انسان تنوع پسند طبیعت کا مالک ہے زندگی کی یکسانیت سے گھبرا کر نئے حالات وواقعات سے روشناس ہونے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی اس کوشش کی تکمیل میں وہ مختلف مقامات کی مسافت طے کرتا ہے۔کبھی انسان کی ضرورت،اس کی خواہشات اور جستجو اسے نقل مکانی کرنے پر اکساتی ہے تو کبھی تقاضع وقت وحالات کے تحت وہ ایک نئی دنیا کی تلاش میں قدم آگے بڑھاتا ہے۔غرض کبھی مجبوری،کبھی ضرورت اور کبھی شوق کے تحت وہ جہانِ دنیا کے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔اس لیے سفر کو کبھی ''وسیلۂ ظفر'' کہا گیا ہے تو کبھی ''سقر'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا رواج عموماً ہر زمانے میں رہا ہے۔معاشرے کا ہر فرد مختلف ضرورت کے تحت نئے نئے جہانوں کی سیر کرتا ہے لیکن سفر اختیار کرنے والا ہر شخص سفرنامہ نگار نہیں ہوتا کیونکہ فطری طور پر عادات وخصائل کی تفریق کے باعث بعض افراد خشک مزاج اور صرف اپنی ذات تک محدود رہنے والے ہوتے ہیں انہیں باہر کی دنیا کے معلومات میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی نہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو دوسرے تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔لیکن بعض اشخاص ایسے بھی ہیں جنہیں باقی لوگوں خصوصاً قارئین کو اپنے سفر میں شریک کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور تمام تر واقعات اور روداد سفر کو تحریر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ایسے ہی سفرنامہ نگار اپنے گرد وپیش کی داخلی وخارجی دنیا کا بغور مطالعہ کر کے مواد اکھٹا کرتا ہے اور اپنے تاثرات، تجربات اور مشاہدات سفرنامہ کی صورت میں تحریر کرتے ہیں۔انور سدید لکھتے ہیں:

> ''سفر آدمی کی جبلت میں داخل ہے۔مسافر کے لیے دنیا عجائب خانہ ہے جسے دیکھنے کے لیے وہ بچے کی طرح مچلتا ہے۔نئی سرزمین، نئے آدمی، نئی طرزِ بودوباش، نئے رسم ورواج دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ان سے ذہن میں کشادگی آتی اور تجربہ حاصل ہوتا ہے۔''[8]

سفرنامہ کب اور کیسے وجود میں آیا؟ یہ سوال ہر دور میں اٹھایا جاتا رہا ہے۔محققین اور ناقدین اپنے اپنے طور پر مفروضے اور رائے دیتے ہیں۔البتہ اس زمین پر انسان کی آمد ہی ''سفر'' ہے۔ابتدا ہی سے جب انسان جنگلوں ،بیابانوں اور صحراؤں میں زندگی گزارتے تھے۔تب سے وہ نئی جگہ دیکھ کر وہاں کی آب و ہوا،موسم،مناظر قدرت،

حیوانات و نباتات اور سحر انگیز مقامات اور نئی نئی چیزوں کو دیکھ کر استعجاب واضطراب میں مبتلا ہوتا تھا اور سفر سے واپسی پر وہ اپنی سفری داستان کو اپنے عزیز و اقارب کو سنانا شروع کرتا تھا۔ یہیں سے سفرنامے کا آغاز ہوا ہے۔ محققین یونانی مورخ ہیروڈوٹس (HERODOTUS) کو دنیا کا اولین سفرنامہ نگار قرار دیتے ہیں۔ بقول خالد محمود:

> ''سفرنامے کی تحریری ابتدا کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے......خیال کیا جاتا ہے کہ سفر مکمل کر کے اپنے گھروں کو واپس آنے والے مسافر دوستوں اور عزیزوں کے سامنے سفر کی روداد بیان کرتے، بعد میں اسی روداد نے تحریری سفرنامے کی شکل اختیار کر لی......
> یورپی محققین یونانی سیاح ہیروڈٹس HERODOTUS کو سب سے پہلا سفرنامہ نگار مانتے ہیں۔''[9]

چندر گپت موریہ کے عہد سلطنت میں یونانی سفیر میگستھنیز کو ہندوستان میں آنے والا پہلا بیرونی سیاح اور سفرنامہ نگار قرار دیا جاتا ہے۔ انہوں نے کئی برس تک ہندوستان میں رہ کر اپنے وطن کو لوٹ جانے کے بعد ہندوستان کی حالات کو اپنی کتاب Indica میں تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ حالانکہ یہ کتاب اب موجود نہیں ہے لیکن مورخین نے کئی شواہد کی بنا پر اسے سفر ہندوستان کی داستان تسلیم کیا ہے۔ یوں تو ہندوستان زمانہ قدیم سے علم و ادب، تہذیب و تمدن اور مختلف مذاہب کے مقامات مقدسات اور دینی مراکز کا گہوارہ رہا ہے۔ ساتھ ہی یہاں کے قدرتی مناظر، مختلف جغرافیائی اور معاشرتی تنوع اور قدرتی وسائل کی وجہ سے ملحقہ دیسوں میں تجارت کی دلچسپی بھی رہی ہے۔ بودھ مذہب کے ماننے والے اپنے مقامات مقدسات کے درشن و زیارت کے لیے ہمسایہ ملکوں سے آتے تھے۔ ایسے ہی ایک کارواں میں فاہیان اور ہیون سانگ چین سے دشوار گذار راستے طے کر کے پہاڑی سلسلوں کو عبور کرتے ہوئے ہندوستان آئے تھے۔ جنہوں نے اپنے سفرناموں سے چین میں ہندوستان اور ہندوستانی ہندوؤں کو واقف کرایا۔ ہندوستان زمانہ قدیم سے سیاحوں کا مرکز نگاہ رہا ہے۔ یہاں مذہبی پیشوا تبلیغ کے لیے آتے تھے تو مہم جو، مورخ، اور حملہ آور غرض ہر زمانے میں یہاں آنے والے سیاحوں نے اپنے سیر و تفریح کی داستان کو محفوظ کیا اور ہندوستان کی حیرت انگیز سرزمین کی خوبصورتی سے محظوظ ہو کر سفرنامے لکھ کر منظر عام پر لائے ہیں۔

فرانسیسی، یونانی، عجمی، یورپی، عربی اور فارس کے سفیروں، سیاحوں اور مذہبی اسکالروں کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے مختلف مقامات کی سیاحت کر کے اپنے مشاہدات و تجربات کو ضبط تحریر میں لا کر شاہکار سفرنامے قلمبند کیے

ہیں۔ان میں بطا کی اولین سفرنامہ نگار خاتون مارجری کیمپ جوصوفیانہ مسلک کی پابند تھی انہوں نے تیرہویں صدی میں یروشلم کا سفر کر کے اپنے سفرنامے میں محفوظ کیا۔ابوالحسن مسعودی مورمورخ ، ماہر جغرافیہ ہندوستان آئے اور اپنا شاہکار سفرنامہ لکھ ڈالا۔ایسے سفرنامہ نگاروں میں ابوالسحاق ابراہیم اصطخری ،محمد البوب القاسم ،احمد بن فصلان محمد ابوالقاسم بن جوقل ،حکیم ناصر بلخی ، ابوریحان البیرونی ، ابن جبیر لیسی ، ابن بطوطہ(عجائب الاسفار کے مصنف) مارکو پولو،موسیوتھیونو، واسکوڈا گاما لائی ،منوچی قباد بیگ ، میر محمد حسین لندنی ،شیخ اعتصام الدین،مرزاابوطالب اصفہانی وغیرہ کے نام تاریخ میں اہم ہیں۔جن کے روداد سفر سے متاثر ہوکر اور معلومات حاصل کر کے ان کے بعد کی پیڑی کو سفر کرنے اور سفرنامہ تحریر کرنے کے لیے راہیں ہموار ہوئیں۔ چہ درج بالا سفرنامہ نگاروں کا تعلق ہندوستان سے نہیں ہے اور نہ ہی اردو زبان سے ان کی تحریروں سے متاثر ہوکر اہلیان اردو نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔اُس سمت میں اپنے راہیں متعین کی ہیں اور اردو سفرنامہ نگاری کو مستحکم بنایا ہے۔

سفرناموں کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد . ہم اردو سفرناموں کی طرف رخ کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان سے بیرون ملک جانے والے لوگوں میں وہ کون لوگ تھے جنہوں نے سفرنامے لکھ کر اہل ہند کو بیرونی دنیا سے متعارف کرانے کا نیک کام انجام دیا ؟ اور کس نے اردو سفرناموں کے لیے راہ ہموار کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے؟ تو فارسی اور عربی کے قدیم سفرنامہ نگاروں کا تذکرہ کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔جن کے سفرناموں کے تراجم سے اردو میں سفرنامہ لکھنے کی روایت در آئی اور اردو دان طبقے نے سفرنامے کا فن ، اسلوب اور تکنیک اختیار کیا اور بہترین سفرنامے لکھ کر اردو ادب میں سفرنامے کی بنیاد ڈالی۔

اردو سفرنامہ نگاروں کی تاریخ وارتقا اور روایت کو جاننے کے لیے بعض ابتدائی سفرناموں کا سرسری جائزہ ضروری ہے۔اردو کا پہلا سفرنامہ نگار یوسف خان کمبل پوش ہیں۔جنہوں نے 1836ء میں اپنے وطن حیدرآباد سے لندن کا سفر طے کیا۔وطن لوٹنے کے بعد 1847ء میں اپنا سفرنامہ ''تاریخ یوسفی''1836ء''المعروف عجائبات فرنگ'' لکھی۔ یہ بیانیہ سفرنامہ ان کے یورپ میں قیام کے دنوں کی داستان ہے۔اس سفرنامہ کے مطالعے سے یوسف خان کمبل پوش ایک مست قسم کے بے باک،صاف گو،حسن پرست مخلص اور شرافت کے پیکر انسان نظر آتے ہیں۔مصنف نے دوران سفر پیش آئے حوادث اور حالات جوان پر بیتے ان کو من وعن بیان کیا ہے۔نہ اپنی ذلتوں کو چھپایا ہے اور

نہ ہی مبالغہ آمیز رنگ دے کر اپنے اوصاف بیان کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی حسن پرستی اور عاشق مزاج کو بھی بے باکانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس سفر نامے میں کمبل پوش نے تمام واقعات و کوائف کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ ان کی قوت مشاہدہ اور بصیرت و بصارت کا کمال ہے کہ انہوں نے یورپ کے گوشے گوشے، شہروں شہروں، گاؤں گاؤں، گلیوں کوچوں، بازاروں، ساحلوں، محفلوں، تفریح گاہوں اور تماشا گاہوں، شاہی محلات، شاہی باغات، اسکولوں، سفارت خانے، پاگل خانوں، کلیساؤں، قبرستانوں اور لذت خط عیش و مستی کے رنگین شاموں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اپنے ساتھ دیارِ غیر میں پیش آنے والے حادثات کو بہت ہی معصومیت سے لکھا ہے کہ مطالعہ کرتے وقت قہقہہ لگائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نمونے کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''اُس مکان کی شکست و ریخت کے لیے مزدور لگے تھے۔ میں یہ حال دیکھ کر باہر نکلا تو پانی برسنے لگا۔ سارے کپڑے تر ہوگئے۔ تب دوڑتے گھر چلے۔ راہ میں دو بیٹیاں ایک خوبصورت دوسری کریہہ الہیئت ملیں۔ میرے وضع خلاف اس شہر کے دیکھ کر ٹک ٹک کہتی، تماشا دیکھتی پیچھے دوڑی آتیں۔ اکبارگی پاؤں پھسلا دونوں لڑکھڑا کر گریں۔ میں نے قریب جا کر زنِ جمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ بدشکل کو ویسے ہی چھوڑا۔ وہ بڑی محنت سے اٹھ کر اپنی بولی میں کچھ کہنے لگی۔ میں اس کی زبان سے مجھ کو آگہی نہ تھی۔ آخر اس نے ایک دھکا دیا مجھ کو زمین پر گرایا۔ دوسری عورت خوبصورت جس کو میں نے اٹھایا تھا میری طرف ہو کر اس سے مقابلہ کیا۔ میں جان بچائی غنیمت سمجھا۔ وہاں سے بھاگا۔ لڑکے کیچڑ بھرے کپڑے اور بیگانہ وضع دیکھ کر تالیاں دیتے پیچھے میرے دوڑتے آتے۔ بنیر اندابی بھاگتے بھاگتے سرا میں پہنچا۔ میرا حال دیکھ کر سب ہمراہی ہنسنے لگے۔ میں سخت نادم و شرمندہ ہوا۔''[۱]

''عجائباتِ فرنگ'' میں یوسف خان کمبل پوش کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ وہ کسی بھی چیز سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ اپنے جذبات و کیفیات کو چھپا کر نہیں رکھ پاتے۔ کسی بھی واقعہ کا منفی و مثبت پہلو ان پر بہت جلد اثر انداز ہونے لگتا ہے۔ خوشی کے موقع پر حد درجہ مسرت و شادمانی طاری ہونے لگتی ہے اور کسی غمناک واقعہ پر ان کا حساس دل لحظہ بھر میں مغموم ہو جاتا ہے۔

اس سفر نامے میں مصنف کے مذہبی عقائد اور افکار و نظریات سے آگہی ملتی ہے۔ سفر نامے میں انہوں نے

اپنے مسلمان، ہندوستان تک اور سلیمانی مذہب کے ماننے والی بات کا انکشاف کیا ہے۔ ان کی آزادروی اور درویشانہ صفت انہیں اسلامی طرز معاشرت یا کسی دوسرے مروجہ مذہب سے مستقل طور پر وابستہ نہیں رہنے دیتی۔ دیو و آفات، دین و مذہب، ایمان وعقیدہ کے بارے میں روایات سامنے آتے ہیں۔ انہوں نے مذہبی رہنماؤں، پنڈتوں اور پادریوں کی ظاہری دینداری، زرپسندی، حوس پرستی، اور مذہب کے نام پر لوگوں کو ورغلانے اور دھوکہ دینے پر سخت طنز کیا ہے۔ مختلف محاورات، عبارات وتمثیلات اور طنز ومزاح سے سے بھرے اس فارسی و دکنی اردو کے سفرنامے کو اردو کا اولین سفرنامہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

مسافران لندن" (1869ء): سرسید احمد خان ہندوستانی اقوام کی تنزلی اور حالی سے افسردہ تھے اور عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ سرسید مغربی ممالک اور وہاں کے طرز معاشرت اور علمی وتعلیمی نظام سے بے حد متاثر تھے۔ اس لیے وہ اپنے ہم وطنوں کو بھی علم و ہنر، فہم وشعور، سلیقہ وادراک سے آراستہ کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ اور ہندوستانیوں کو اس ڈگر پر لانے میں ہمیشہ کاشاں رہتے۔ ساتھ ہی مغرب ومشرق کے مابین تفرقات اور غلط فہمیوں کو دور کرنے اور ایک دوسرے کو قریب لانے کی کوشش کرتے رہے۔ اپنے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے انہوں نے لندن کا سفر اختیار کیا۔ انگریزوں کی عمدہ تعلیم و تربیت سے روشناس ہوکر اپنی قوم کو اس سے فیضیاب کرنا ان کا واحد مقصد اور نصب العین تھا اور سرولیم کی تصنیف ''لائف آف محمد'' میں تحریر شدہ آپ ﷺ کی سیرت وشخصیت مبارک کی غلط فہمیوں کو دور کر کے جوابی کتاب لکھنے کی غرض سے یورپ کا سفر اختیار کیا اور اپنے اس سفر کی روداد کو ''مسافران لندن'' کے نام سے سفرنامے کی شکل دی۔ ''مسافران لندن'' ایک علمی سفرنامہ ہے۔ سرسید نے لندن کی دانشگاہوں، لائبریریوں، تعلیمی نظام، درس و تدریس کے طریقۂ کار، تہذیب و روثقافت، معاشرت، حکومتی انتظامیہ اور ریوینو کا بغور مشاہدہ کیا۔ اکثر و بیشتر مقامات انہیں حیرت زدہ کرتے تھے۔ مختلف تجربات ومشاہدات سے دوچار بھی ہوئے۔ سفرنامہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ مصنف وہاں کی ترقی کو دیکھ کر اپنے ملک کی پچھڑے ہوئے عوام کی خستہ حالی و پستی کا سوچ کر فکرمند ہوتے ہیں۔

مسافران لندن" (1880) مولوی سمیع اللہ خان: ان کا شمار سرسید تحریک کے اہم ارکان میں ہوتا ہے۔ سرسید کی علی گڑھ تحریک کو فروغ دینے اور تہذیبی منصوبوں کو علمی جامع پہنانے میں وہ پیش پیش رہے۔ انہوں نے

اپنی علمی فضیلت اور ذہانت سے علی گڑھ تحریک کے اغراض و مقاصد کو کامیاب بنانے میں حتی الامکان کوشش کی۔ سرسید کے لندن کے سفر کے بعد مولوی سمیع اللہ کو بھی یورپ کے سفر کا شوق پیدا ہوا۔ اور یورپ کا سفر کرا یک سفرنامہ تخلیق کیا۔ انہیں ولایت کے حالات اور ترقی کا راز جاننے کی تجسس پیدا ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرے دل میں ایک مدت سے دو سفروں کا شوق تھا۔ ایک عرب کا سفر دوسرا یورپ کے سفر کیا۔ عرب کے سفر کا زیادہ تعلق مذہبی حالات سے ہے اور یورپ کے سفر کو ان کی بھلائی، ملکی ترقی وقومی، اخلاق و معاشرتی خیالات کی ترقی ہے۔''[۱۱]

سیر ایران (1886) محمد حسین آزاد: محمد حسین آزاد نے سفر ایران و روس کو سیر ایران کے عنوان سے لکھا ہے۔ انہوں نے علمی و ادبی تحقیقات کی غرض سے 1885ء میں ایران و روس کا سفر اختیار کیا اور ہر لمحہ اس کام میں مصروف رہے۔ یہ کتاب اس روداد سفر پر مشتمل مولانا کے بکھری یادداشتوں اور لیکچرز کے نوٹس کو ان کی وفات کے بعد آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد نے ''سیر ایران'' کے عنوان سے مرتب کیا۔ سفرنامے سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

'' 23 ستمبر 1985، 12 ذوالحجہ 1302ء یوم سہ شنبہ چھے بجے شام کو لاہور سے آتش فشاں اژدہے پر سوار ہو کر فرش خاک کو لپیٹا۔ دو دن اور رات میں کراچی جا پہنچا۔ وہاں نہنگ دخانی پر بیٹھ کر سطح آب کو طے کیا اور دسویں دن بوشہر جا پہنچا۔ جہاز میں دوران سفر اوہام کی طرح اندیشہ تھا کہ صفراوی مزاج ہوں۔ شکر ہے کہ معلوم بھی نہ ہوا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ شوق سفر اور سواری جہاز کے ذوق سے دل ایسا لبریز تھا کہ کہ۔ جب جہاز چند میل نکل گیا۔ تب یاد آیا کہ خلل ہائے مذکورہ کا اثر مجھ پر ہے یا نہیں؟ اس پر خیال کیا تو کچھ بھی نہ تھا۔''[۱۲]

سفرنامہ روم مصر و شام (1884ء) مولانا شبلی نعمانی: مولانا شبلی نعمانی کا یہ سفرنامہ خالصتاً علمی ہے، شبلی نے 1882ء میں علیگڑھ سے قسطنطنیہ کے سفر کا آغاز کیا۔ اسی سفر میں انہوں نے سرزمین حجاز کی بھی سیر کی۔ مختلف کتب خانوں، مدارس، درس گاہوں زیارتوں اور دانش گاہوں کی زیارت کے ساتھ ساتھ علماء و فضلاء سے بھی ملاقاتیں کیں۔ اسلامی تاریخ، تفسیر قرآن، احادیث، تاریخ حجاز، خلفاء اور سلطنت عثمانیہ کے عروج اور خلافت عثمانیہ کے کارکردگیوں کی

داستان رقم کی ہے۔شبلی ہ ی مغربی علوم سائنس کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیم وافکار کو بھی اپنانے کے حامی تھے۔ان کا خیال تھا کہ ا ن کو سکون وخوشگوار گی اور اصل خوشی اسلام کے دائرے میں رہ کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ان تمام توں کے حوالے سے شبلی قوم میں احساس تفا و بیداری کا بہ پیدا کر چاہتے تھے۔انہی خواہشات نے مولا شبلی کے دل میں بلاد اسلامیہ کے سفر کا شوق پیدا کیا۔مولا شبلی کا اصل مقصد اسلامی ممالک کے مختلف ر ،تہذ ، معاشرتی ،اور خصوصاً تعلیمی حالات وتحر ت کا مطالعہ کر اور اسی طرح ہندوستان میں تعلیمی معیار میں قی لانے کا تھا رتیخ اسلام سے مکمل واقفیت ر کتب رسائی ،منا مواد و حوالے کی حصولیابی کے لیے انہوں نے ان اسلامی ممالک کا سفر کیا۔مولا اپنے سفر کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''جس زمانے میں مجھ کو ہیروز آف اسلام کا خیال پیدا ہوا اسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر ر سرمایہ موجود ہے وہ اس مقصد کے لیے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا یہی خیال تھا جس نے اول روز اس سفر کی تحر دل میں پیدا کی۔''[۱۳]

انیسویں صدی کے آو اور بیسویں صدی کے اوائل متعدد لوگوں نے رون ملک و بیرون ملک سفر کر کے حالات سفر کو سف مے کا جامع پہنا تھا۔جن میں قومی و بین الاقوامی تہذ وتمدن ، م حکومت ،طرز معاشرت ،بود ش اور طرز گی سے متعلق بیش بہا ا دگار چھوڑے ہیں۔اردو ادب میں سف مے کی روا کو زرخیز بنانے میں جن اولین مصنفین نے کارہائے ں ا م دیں اور جن کے سف مے ہر دور میں علمی ومعلوماتی . ہوتے رہے ہیں ان میں چند اہم م ذیل ہے۔

سیر پنجاب	از مہاراجہ کشن شاد	1887ء
انگلینڈ اور	لالہ تھ	1897ء
سیر بین مرقع چین	حافظ مولوی عبدالمجید خان	مطبوعہ حیدر دکن
بلاد اسلامیہ	حافظ عبدالرحمان امرتسری	1898ء
سف مہ بغداد	مولوی محبوب عالم	1908ء
خوفناک د	علی سبزواری	1901ء

ریاست جموں و کشمیر میں سفرنامے کی روایت

ریاست جموں و کشمیر میں اردو کی اصناف کی ابتدا ہی سفرنامے سے ہوتی ہے۔ مہتہ شیر سنگھ کا ''سفرنامہ بخارا'' پہلا ادبی نمونہ ہے جو سفرنامے کی صورت میں لکھا گیا تھا۔ دیگر اصناف ادب کے مقابلے میں ابتدائی دنوں میں یہاں پر اس صنف نے اپنی راہیں ہموار کر لی تھیں۔ چونکہ سفرنامہ کسی فرد کی سفری روداد یا داستان پر مشتمل ہے اس کے لیے سفر کرنا لازمی ہے اور سفر کرنے کے لیے کسی بھی علاقے کی سیاسی و سماجی صورت حال کا بہتر ہونا بھی لازمی ہے۔ تبھی کوئی شخص پر سکون ہو کر سیر و سیاحت کر سکتا اور اپنے تاثرات و معلومات کو قلم بند کر سکتا ہے۔ دوسری بات اس شخص کے پاس مالی و جسمانی قوت ہو کہ وہ سفر اختیار کر سکے۔ جموں و کشمیر میں ڈوگرہ دور حکومت میں بے شک ریاستی عوام پر پابندیاں عائد تھیں۔ لوگ غلامی کی زندگی جی رہے تھے لیکن بیرون ریاست میں مقیم ریاست کے باشندوں اور ڈوگرہ سرکار میں اعلیٰ منصب پر فائز لوگوں پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ یہ لوگ ریاست سے باہر سیر و تفریح کرتے تھے اور اپنے مشاہدات اور تجربات کو قلمبند کرتے تھے۔ ایسے حالات میں جموں و کشمیر کے چند باذوق افراد نے سفرنامے لکھے ہیں۔ جن کو ریاست جموں و کشمیر کے ابتدائی دنوں کے ادبی دائرے میں وسعت لانے کا شرف حاصل ہے۔ ریاست جموں و کشمیر میں فنِ سفرنامہ نگاری کی روایت اور ارتقا کو دیگر غیر افسانوی اصنافِ ادب کی روایت اور ارتقا کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو ایک مسرت آمیز بات یہ سامنے آتی ہے کہ جموں و کشمیر میں اردو کے غیر افسانوی ادب میں سب سے زیادہ سفرنامے ہی وجود میں آئے ہیں۔ حالانکہ اس پوری ایک صدی میں ہندوستان کی سیاسی و سماجی حالت ناگفتہ بہ رہی ہے۔ ''جموں و کشمیر سب سے زیادہ متاثر رہا ہے۔ اس کے باوجود ریاست کے ادیب خارجی انتشار اور داخلی حالات کو مخالف سمجھتے ہوئے اور ڈٹ کے اس کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے ادبی سفر پر گامزن رہے اور اس طرح ہندوستان کی دیگر ریاستوں بلکہ بیرونِ ہندوستان کا بھی سفر کرتے ہوئے کئی خوبصورت سفرنامے منصہ شہود پر لائے۔ تاریخ کے حوالے سے ہم ان سفرناموں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے، زمانی اعتبار سے ان پر بحث کریں گے۔ ابتدا سے 1960ء، 1960ء سے 1980ء اور 1980ء کے بعد۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو نثر کے ابتدائی نمونے مہتہ شیر سنگھ کے ''سفرنامہ بخارا'' میں ملتے ہیں۔ جو ایک سرکاری وفد کی روداد اور کوائف پر مندرج رپورٹ تھی۔ اس طرح ریاست میں

□ی ادب کی ابتدا سفرنامے سے ہوئی۔ اس کے کچھ دہائیوں کے بعد مختلف ادیبوں اور صحافیوں نے اس کی آبیاری کی اور سفرنامے کی باضابطہ بنیاد ڈالی گئی۔ ان میں سالگ رام سالک، منشی محمد الدین فوق وغیرہ کے نام قابل ذکر ہے۔ اس دور کے سفرناموں کی تفصیلات اس طرح سے ہیں۔

"سفرنامہ بخارا" از مہتہ شیر سنگھ (1867): 1867ء میں ڈوگرہ سرکار کے ایک وفد نے مہتہ شیر سنگھ کی قیادت میں بعض سرکاری کام کے سلسلے میں وسط ایشیا کا دورہ کیا۔ اس وفد نے یارقند کے راستے ترکستان سے ہوتا ہوا سمرقند، بخارا، کاشغر اور□ان کا سفر کیا اور اور واپسی میں تبّت لداخ کا راستہ اختیار کیا۔ ممکن ہے کہ اس وفد نے شاہراہ ریشم سے سفر کیا ہو۔ مہتہ شیر سنگھ نے اس تمام سفر کی روداد بمع مختلف علاقوں کے حالات و کوائف پر مبنی ایک رپورٹ مہاراجہ کو پیش کیا۔ جو "سفرنامہ بخارا" کے نام سے موسوم ہے۔ یہیں سے ریاست میں □ی ادب کی ابتدا ہوئی۔ اگرچہ یہ ایک مکمل سفرنامہ نہیں ہے۔ □ یہ مسلمہ اور تصدیق شدہ ہے کہ ریاست میں اردو □ی ادب کی ابتدا اسی سے ہی ہوتی ہے۔ عبدلقادر سروری لکھتے ہیں:

> "رنبیر سنگھ کو ریاست کی تجارت کو فروغ دینے کا بہت خیال تھا، اس لیے انہوں نے مہتہ شیر سنگھ کو ریاست کے پڑوسی ملکوں اور مقامات کا سفر اختیار کرنے اور مقامات اور راستوں کی کیفیت مرتب کرنے پر مامور کیا تھا۔ اس کی اتباع میں مہتہ شیر سنگھ نے 1867ء میں کابل، بلخ، بخارا وغیرہ کا سفر کیا اور منزلوں کی تفصیل اور ایک منزل سے دوسری منزل تک کے فاصلے، راستے کی کیفیت، مقامات اور شہروں کے حالات پر مشتمل یہ رپورٹ تیار کی تھی، جو سفرنامہ کے نام سے موسوم ہے۔"[۱۴]

مہتہ شیر سنگھ جن جن مقامات پر گئے، وہاں کے حکمرانوں، حالیہ فرمانروا اور مقامی حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ کل 172 مقامات کی تفصیلات اس سفرنامہ میں درج ہیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مقامات کا ذکر سرسری طور پر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس سفرنامے میں طرز تحریر اور اس کا اسلوب بیان فارسی زبان سے متاثر □ آتا ہے تاہم یہ ریاست جموں و کشمیر میں اولین اردو سفرنامے کی حیثیت رکھتا ہے اور اہم د□ری دستاویزات میں شمار ہوتا ہے اور نیز ادبی اہمیت کا

بھی حامل ہے۔اس سفر نامے کی قدر و قیمت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ جب ہم اردو سفرنامے کی ادبی تاریخ اور ابتدائی دور کا مطالعہ کرتے ہیں۔ چونکہ اردو کا پہلا سفرنامہ "تاریخ یوسفی المعروف عجائبات فرنگ" 1846ء میں شائع ہوا جو فارسی سفرنامہ کے انداز میں لکھا گیا ہے۔اس کے بعد اردو میں سفرنامہ کے لیے راہیں متعین ہو چکی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے مختلف صاحب ذوق افراد نے اپنے روداد سفر کو ضبط تحریر میں لا کر اردو ادب میں صنف سفرنامے کے دامن کو وسعت بخشی۔اسی ابتدائی دور کے سفرناموں میں ریاست سے تعلق رکھنے والے مہتہ شیر سنگھ کا سفرنامہ "سفرنامہ بخارا" بھی شامل ہے۔ یقیناً یہ سفرنامہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو خصوصاً سفرنامہ کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی ہوگی۔ جس روشنی میں ریاست کے صاحب ذوق ادیبوں نے سفرنامہ لکھنے کا آغاز کیا۔ ریاست کے مختلف ادوار میں ساز حالات اور زبوں حالی میں بھی اس صنف ادب میں تخلیق منظر عام پر آتے رہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ دیباچہ میں مصنف اپنے بارے میں اور اس سفر کی تحریر کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "واضح ہو کہ نمک پروردۂ قدیمی حضور انور سری مہاراجہ صاحب بہادر فیاض زماں والی جموں و کشمیر سکنہ خاص رامپور کا مہتہ شیر سنگھ نام قوم کا برہمن اور بنظرِ نمک خوری و بخواہش آب و دانہ مقررہ بہ روانگی واسطے کرنے دریافت حالِ تجارت، ملک شاہ اوس و امیر خوقند و امیر بخارا شریف کے خاص شہر سری نگر سے یعنی پایہ تخت حضور پرنور بہ برکت لطف الٰہی روانہ ہوا۔ چنانچہ یہ نیازمند بتاریخ ١٦ ساون ١٩٢٣ بکرمی جیتی مکان مذکورہ سے بعد حصول قدمبوسی حضور انور طراہِ مظفرآباد دو ہزارہ و اٹک پشاور و کابل و بلخ و بخارہ شریف و سمرقند و طاش قند و خوقند لطیف و کاشغار و یارقند و لداکھ وغیرہ گردش کر کے بعدِ مدت شش ماہ بتاریخ ١٢ ماہ کاتک ١٩٢٤ قدمبوسی پایہ تخت کشمیر جنت نظیر کا ہوا۔"[15]

"تحفۂ سالک" از پنڈت سالگ رام سالک (1929- 1887ء): پنڈت سالگ رام سالک سرینگر کے متوطن تھے لیکن تمام عمر کشمیر سے باہر پٹیالہ اور ڈوگرہ سرکار کے دربار میں کام کرتے رہے۔ تعلیم یافتہ روشن خیال تھے اس لیے جموں و کشمیر ان کا اصل موضوع کلام رہا ہے۔ وہ ایک کثیر الکتاب مصنف تھے۔ رسالہ "کشمیر" کے

عنوان سے ایک رسالہ بھی لہ سے اپنے بھائی پنڈت ہرگوپال کول خستہ کے ساتھ نکالتے رہے لیکن سیاسی حالات کے
پیش نظر رسالہ بند کرنا پڑا۔ "تحفۂ سالک" ان کا سفر نامہ ہے۔ یہ کتاب ابتدائی دور میں تحریر عمل میں آنے والا ایک اہم
سفر نامہ ہے۔ "تحفۂ سالک" میں دوسرے ممالک کی تواریخ اور جغرافیہ کا سہارا لے کر وہاں کی معاشرتی و تہذیبی صورت
حال کو دکھایا گیا ہے۔ بقول مصنف ان کی یہ کتاب "تواریخ کی تواریخ اور سفر نامہ کا سفر نامہ" ہے۔ اس کتاب کے لکھنے
کے مقصد کے بارے میں انہوں نے دیباچہ میں یوں بیان کیا ہے:

> "ہندو، مسلمان، عیسائی جو کہ میرے ملکی بھائی ہیں' ان کو بخوبی روشن ہوجائے کہ پہلے
> ہندوستان ایک کیسی تھی۔ یہ فتنہ ولایت تھی۔ اور اب کیسی شائستہ ہوگئی ہے......اور خاص
> مراد میری یہ ہے کہ کسی طرح سے اہل ہند اپنی غفلت سے واقف ہوکر بلاتعصب مذہبی کے
> باہم دگر اپنے ملکی فوائد کو سوچیں اور ایسے اصول قائم کریں کہ جس سے قوم اور ملک کا بھلا
> ہو۔"[16]

سالک نے جن جن ممالک کا سفر کیا، ان ممالک کی معاشرتی و تہذیبی صورت حال، اپنے سفر کی روداد اور
کوائف و حالات کا تذکرہ نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ ایک مفید کتاب ہے۔ قرین قیاس ہے ابتدائی دنوں
میں جب جموں و کشمیر کے لوگ بیرون ملک کا سفر کرنے لگے تھے ان کے لیے یہ ایک معلوماتی کتاب ثابت ہوئی ہوگی۔
پروفیسر عبدالقادر سروری نے اس کتاب کو جموں و کشمیر کے ابتدائی دنوں کا سفر نامہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "تحفۂ سالک" ان کا بہت اہم کارنامہ تو نہیں ہے تاہم یہ ایک مفید مقصد کو قصے کے پیرائے
> میں ادا کرنے کی وجہ سے اس میں ایک ندرت اور دلبستگی کی خصوصیت پیدا ہوگئی ہے۔ اصل
> میں یہ "تحفہ" جو انہوں نے اپنے ملکی بھائیوں کو پیش کرنا چاہا ہے نذیر احمد کی "مراۃ العروس"
> یا پنڈت ہرگوپال خستہ کے "گلزارِ فوائد" کے انداز کا ہے۔ اس "تحفہ" کے ذریعہ وہ اہل ہند و
> کشمیر کو گھر بیٹھے وہ سارے عالم کی سیر کرانا اور مختلف ملکوں کی تہذیبوں اور کارناموں سے
> واقف کرانا چاہتے تھے۔"[17]

سالک کا یہ تجربہ جس مقصد و وجوہات کے لیے کیا ہو وہ اپنی جگہ۔ لیکن یہ جموں و کشمیر کے ابتدائی دنوں کا سفر نامہ
ضرور ہے۔ اس لیے اس کی اہمیت مسلم ہے۔ سلیس اردو میں محاورات و تمثیلات کو شامل کر کے لکھنے کا انداز بھی الا

ہے۔اس سفرنامے کے فن، تکنیک، اصول وقوائد کے بارے میں ڈاکٹر تاج پیمی یوں لکھتے ہیں:

''تحفۂ سالک' ایک سفرنامہ ہے جس میں قصے کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے۔''۱۸؎

مذکورہ اقتباس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس سفرنامے میں تکنیک، اصول وقاعد اور زبان و بیان کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔

''سفرنامہ کشمیر''(1907) از منشی محمد الدین فوق: منشی محمد الدین فوق کا شمار سرزمین کشمیر کے ان مایہ ناز ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی تمام عمر بیرون ریاست میں رہ کر اپنے آپ اور اپنے قلم کو کشمیر اور کشمیریوں کے دلوں کی دھڑکنوں، سسکیوں، اور جموں وکشمیر میں رونما ہونے والے حالات وواقعات سے بیرون ریاست کے لوگوں کو واقف کرانے میں صرف کیا۔اور ریاستی عوام کی دبی ہوئی آواز اور پیغام کو تمام ہندوستانیوں کو سنایا۔منشی محمد الدین فوق کا تعلق ضلع ... رہ مولہ کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ان کے خاندان کے اکثر افراد پٹواری کے پیشے سے منسلک تھے۔اس لیے فوق کو بھی اپنے والد اور چچا کے ہمراہ مختلف اضلاع میں رہ کر پٹواری کی تعلیم حاصل کرنی پڑی۔لیکن انہیں زبان وادب اور صحافت سے دلچسپی تھی۔اس لیے بہت جلد اس میدان میں قدم رکھا اور بطور ایک کثیر التصانیف ادیب کے انہیں بہت شہرت ملی۔ادب، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، سماجیات، معاشرت ہر میدان میں انہوں نے کارنامے چھوڑے ہیں۔

''سفرنامہ کشمیر'' کا شمار فوق کی اہم تصانیف میں ہوتا ہے۔جو مصنف کے کشمیر اور کشمیریوں کے حوالے سے ذاتی تجربات و مشاہدات پر مبنی ہے۔منشی محمد الدین فوق لاہور سے 'ایک رسالہ 'کشمیری میگزین'' نکالا کرتے تھے جس میں ریاست جموں و کشمیر کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی صورت حال کی ترجمانی ہوتی تھی۔یہ میگزین جموں وکشمیر کے اندر رہنے والے مسائل، مہاراجہ کا اپنے رعایا کے تئیں ناروا سلوک اور اس کے تمام سیاہ کاریوں، ظلم وستم کی کہانی کو باہر کی دنیا کے لوگوں تک پہنچاتا تھا۔چونکہ ریاست میں آزادی اظہار رائے عامہ پر پابندی تھی اس لیے فوق لاہور سے ریاستی عوام کی صدا بلند کرتے تھے۔وہ ایک وسیع المطالعہ صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک متحرک انسان بھی تھے اور سیر وتفریح کے شوقین بھی۔ہندوستان کے دیگر بڑے شہروں کی سیر کر چکے تھے۔بنگال، راجستھان، بھوپال، لکھنو اور دہلی کی سیر کر کے

وہاں کے لوگوں کو قری□ سے دیکھا، مشاہدہ کیا اور ان کے مسائل اور حالات □ لکھا۔ ان کی ا□ دلچسپ سف□ □ بھی ہے جس میں فوق نے اپنے را□ ن اور راجکوٹ کے سفر کو بھی بیان کیا ہے۔ وہاں کے راجاؤں کے ظلم وستم سہنے والے بے بس و مجبور عوام کی بھوک افلاس وغر.□ کو بیان کیا ہے۔ دسمبر 1907ء میں انہوں نے اپنے وطن کشمیر کا سفر اختیار کیا۔ اس مدت میں وہ اپنے □ ین کے بعض شمارے نہیں نکال□ ئے۔ اس لیے سفر سے واپس لوٹنے کے بعد اپنے سفر کی روداد کو اپنے □ ین میں شائع کر□ جسے قار□ نے بہت پسند کیا اور اس طرح یہ شہرۂ آفاق سف□ مہ منصۂ شہو□ □۔ اپنے سف□ مہ لکھنے کی وجوہات کے □ رے میں وہ لکھتے ہیں:

''اکثر اصحاب کا سال□ اری اکت□ ،نومبر اور دسمبر کو ختم ہو چکا ہے۔□ وی پی اس لیے روانہ نہیں کئے گئے۔ کہ رسالہ تین مہینے کی غیر حاضری کے بعد جا□ ہے۔ کہیں وی پی□ گوارنہ گذریں□ ہم بعض دردمندان قوم ایسے بھی ہیں جنہوں نے رسالہ کی اس غیر حاضری میں نہ صرف خود ہی قیمت ارسال کی بلکہ دو □ واحباب سے قیمت بھی بھجوائی۔ اب چو□ اکثر حضرات کا سال جنوری سے شروع □ ہے۔ اور پچھلے تین مہینوں کے رسالوں کی بجائے ''سف□ مہ کشمیر'' ان کو پہنچ جائے گا۔''19

فوق کشمیری ہونے کی وجہ سے اپنی وجیہہ صورت، دلچسپ شخصیت، عادات واطوار، □ ولہجہ، رہن سہن، ذہا□ وفطا□ اور قابلیت ولیاقت کی وجہ سے پنجاب کے ادبی حلقوں میں ہمیشہ□ یں رہے۔ وہ بیرون□ □ میں رہ کر□ رون□ □ کے تمام مسائل خواہ وہ سیاسی ہو□ سماجی، معاشرتی ہو□ اقتصادی، تہذ□ ہو□ ثقافتی غرض ہر پہلو□ نگاہ ر□ تھے۔ کشمیر سے دور رہ کر بھی ان کا دل و دماغ کشمیر کے ساتھ ہی وابستہ رہتا تھا اور ان مسائل کا حل تلاشتے رہتے تھے۔ وہ اپنے قلم کے ذریعہ□ ستی عوام کو حوصلہ دیتے رہے اور ان کی رہنمائی بھی کرتے رہے۔ ا□ روشن مستقبل کا خواب، تمام مسائل سے□ ت کا راستہ، آزادی کا خواب، ان □ کا حل صرف عوام میں شعور، بیداری، □ بہ □ الوطنی اور تعلیم حاصل کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ جموں و کشمیر کے غلام عوام کے تئیں ان کی والہانہ محبت کو□ د کرتے ہوئے ان کے ا□ عز□ دو □ عبداللہ قریشی لکھتے ہیں:

''فوق صا□ عملی سیا□ میں عموماً حصہ نہیں □ تھے۔ لیکن قومی معا□ ت کے سلسلے میں ان کا احساس بہت گہرا تھا۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو مسلمانوں کی زبوں حالی سے ہمیشہ□ یشان

> رہتے تھے۔ بالخصوص کشمیری مسلمانوں کی پستی اور ڈوگرہ شاہی غلامی ان کے لئے سوہان روح کا باعث تھی۔ وہ نسلاً کشمیری تھے۔ اس لیے بھی انہیں کشمیر سے والہانہ عشق تھا۔ انہوں نے ساری عمر کشمیر اور کشمیریوں کی خدمت کی۔ کشمیری تعلیم میں کورے، اخلاق میں پست اور تہذیب و تمدن میں دنیا کے لوگوں میں بہت پیچھے تھے۔ فوق صاحب نے انہیں تعلیم کا شوق دلایا۔ ان کو دنیا کی ترقیوں سے آگاہ کیا۔ ان کی سوئی ہوئی طاقتوں کو جگایا۔ اور ان کو ترقی یافتہ قوموں کے برابر کھڑا کرنے میں اپنی زندگی وقف کر دی۔''[20]

''سفرنامہ کشمیر'' کا شمار جموں و کشمیر کے ابتدائی دنوں کے اہم سفرناموں میں ہوتا ہے۔ اس سفرنامے میں کشمیر کے قدرتی حسن، حسین و دلکش وادیوں، دلفریب مناظر، اونچے اونچے چیل و دیودار کے گھنے جنگلوں کے بیچ سبز چادر کی طرح بچھے مرغزاروں، آبشاروں اور بہتی ندیوں کے ساتھ ساتھ یہاں پہنچنے کے لیے آمد و رفت کے مخدوش وسائل پر خطر اور دشوار گزار راستوں کے مشکلات اور کٹھنائیوں کو بھی دیکھایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈوگرہ شاہی حکمران کا کشمیری عوام کے ساتھ عامیانہ اور ناروا سلوک و استحصال کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ کتاب بیک وقت ہر طبقے کے قاری کے لیے موزوں اور معلوماتی کتاب ثابت ہوئی۔ کئی سارے سنجیدہ قاری نے اس سفرنامے پر تبصرہ لکھا ہے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی جنہوں نے فوق پر کام کیا ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ سفرنامہ صرف ایک سیاح کے مشاہدات نہیں بلکہ فوق۔ جب سفر پر نکلتا تو تاریخ کو جاننے والا شخص بھی ان کا ہم سفر بن جاتا ہے۔ ایک دردمند آرٹسٹ بھی ان کے اندر جاگ رہا ہوتا ہے۔ ان کی نگاہیں نہ صرف منظروں میں سمیٹ جاتیں بلکہ پس منظر کا سراغ لگانے کی بھی مکمل کوشش کرتے۔''[21]

اس سفرنامے کے مطالعہ سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ فوق نہ صرف گرد و نواح کے ماحول پر نظر رکھتے ہیں بلکہ اس کے پسِ پشت تاریخ کے اوراق بھی الٹتے نظر آتے ہیں۔ سفر کرتے وقت درپیش واقعات کی کہانی اور روایات کو سمیٹ کر پیش کیا ہے۔ انہوں نے راستے میں اپنے ساتھ گزرنے والے واقعات کے ساتھ ساتھ اپنے ہم سفروں، راستے میں آنے والی بستیوں کے رہائشیوں اور سواریوں تک کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کو کشمیریوں کی سیاسی و سماجی صورت حال میں خصوصی دلچسپی تھی جس کا مظاہرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ راولپنڈی سے سرینگر تک کی مسافت تقریباً آٹھ

دنوں کا تھا۔ راستے میں مختلف پڑاؤ پڑتے تھے، چونگیاں تھیں، جہاں سے سرکاری شاہی کا ے بھاری ٹیکس محصول کرتے تھے۔ بسا اوقات ہر کام کرنے والے کشمیری مزدور سال کے آٹھ مہینہ مزدوری کر کے گھر لوٹتے تھے لیکن راستے میں چنگیوں پر وصولی اور ٹیکس کی ادائیگی کے بعد وہ اپنے گھر خالی ہاتھ پہنچتے تھے۔ ایک چونگی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علے الصباح ڈاکٹری معائنہ کے بعد چنگی خانہ میں پہنچے۔ یہاں اسباب کی خوب دیکھ بھال ہوتی ہے رقندی اور لداخی اسباب پر مہریں لگائی دی گئیں۔ میرا اسباب بھی دیکھا۔ یہاں تھا ہی کیا۔ کچھ پرانے اور کچھ دھلے ہوئے کپڑے۔ کچھ کشمیری یٖن کی کاپیاں اور کچھ اشتہارات۔ ایک چھوٹے سے بنڈل میں دو سو مطبوعہ کارڈ۔ کوئی قابل محصول چیز نہ ملی۔ تو پٹائے۔ آنہ کارڈوں پر ایک پیسہ محصول لگایا کہ آن تو بنی رہے۔ میں نے بھی اس خیال سے کہ نہ لگ جائے کوئی حجّت نہ کی۔ یہاں یہ اظلم ہے کہ ذاتی استعمال کے نئے سلے ہوئے کپڑوں کو بھی بغیر محصول کے نہیں چھوڑتے۔ ایک شخص کی حا قابل ذکر ہے۔ وہ خود اس کی بیوی اور چار بچے ایک سالم یکہ میں تھے۔ راہ میں چو رش وغیرہ کا خطرہ تھا۔ انہوں نے اس خیال سے کہ کپڑے اب ہو جائینگے۔ نئے کپڑے تو گٹھڑیوں میں بند رکھے اور پرانے پہن لیے محصول والوں نے ایک کپڑا بھی بغیر محصول کے نہ رہنے دیا۔ یہاں کی ان کی ذاتی جوتیاں اور اس کی عورت کا دوپٹہ اور کرتہ اور اس کے بچوں کے سلے ہوئے پر چات بھی نہ بچ سکے۔ محصول چھ سات آنے کے قریب دینا پڑا۔ تو بچارے نے افسوس کے لہجے میں کہا کہ یہ میلے ہوجاتے تو بلا سے۔ یہ چھے سات آنے تو نہ دینے پڑتے اب ہونے کی صورت میں ایک آنہ کے صابن سے گھر ہی میں صاف ہو تھے۔''[۲۲]

فوق نے اس سفرنامے میں ان لوگوں کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے ان مشکل گفتہ بہ حالات میں بھی علم حاصل کی۔ جنہوں نے مدارس میں تعلیم حاصل کر کے نام کمایا۔ ان میں طاہر غنی، فائق، مرزا طا کلیم، خواجہ محمد اعظم شامل ہیں۔ جنہوں نے وادی میں علم کی شمع کو منور کرنے کی کوشش کی۔ فوق کو کشمیر کے اولیاء کرام سے عقیدت و محبت

تھی لیکن پیر پرستی اور تعویز گنڈے کے عمل کے قائل نہ تھے۔ سیاسی وسماجی حالات پر ڈالتے ہوئے فوق لکھتے ہیں کہ کشمیری بحیثیت قوم نیک دل اور سیدھے سادھے لوگ ہیں لیکن بعض مفاد پرست لوگوں نے ان کی عادتوں کو بگاڑ دیا ہے۔ ان لوگوں نے فرقہ پرستی کے آڑ میں عوام کے درمیان فرق وعداوت پیدا کر دی ہے۔ زمانہ گذشتہ میں کشمیر میں تعلیم کے حال کا ذکر کرتے کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''کشمیری شعراء نے مادری زبان (کشمیری) کے علاوہ عربی اور فارسی کے سمندر سے وہ دُر آب دار نکالے ہیں جن کو قدر دان ہاتھوں میں گوہر نایاب سے کم نہیں سمجھا، شعراء میں محسن فانی، غنی، خواجہ حسن شعری شائق، مرزا جعفری، فانی یقین، مرزا طاہر کلیم، مرزا مقبل، کبیری، محوی، فدا، وغیرہ اور مورخوں میں خواجہ محمد اعظم، میر حیدر، مرزا اکمل الدین بیگ، شیخ محمد مراد، احمد، میر سعد اللہ شاہ آبادی، خواجہ امیر الدین، پھکلیوال، حیدر ملک، حسن شاہ وغیرہ نے وہ نام پیدا کیے ہے جو علمی دنیا میں آفتاب جہاں تاب کی طرح روشن ہے۔ طبقہ علماء وفضلاء میں مولانا میز واعظ مولوی غلام رسول صاحب اور چند ایک اور بزرگوں کے خاندان ان کی شہرت کشمیر سے پنجاب، پنجاب سے ہندوستان تک اپنا اثر رکھتی ہے۔ فقراء واولیاء اور مشائق کے گروہ میں بھی اس قوم کا نام آسمانِ تصوف وعلم وعمل میں شمس النہار کی طرح کمال پر تھا۔'' ۲۳

فوق نے اپنے سفر کی روانگی سے واپس لوٹنے تک کے تمام واقعات کو اختصار سے تفصیلاً لکھا ہے۔ دوران سفر پیش آنے والے روداد، سڑکوں کی صورت حال، چونگیوں کے محصولی عمل، مسافروں کے ساتھ آنے والے مسائل، گھوڑا، تانگے اور ٹٹو کی سواریوں کا ذکر غرض ہر ایک گوشہ پر روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ یہ کوہستانی علاقہ ہے اکثر پہاڑی دروں، چٹانوں، دریاؤں اور جھیلوں کو عبور کر کے سفر کرنا پڑتا ہے اور ستم ظریفی دیکھئے کہ راستے موسموں کے رحم وکرم پر ہیں۔ اگر موسم خوشگوار رہا تو سفر کر سکتا ہے ورنہ مسافر کئی روز تک راستے میں پھنسا رہتا ہے۔ ان تمام دشوار گذار راستوں پر سفر کے تجربات کو مصنف یوں بیان کرتے ہیں:

''دیکھا کہ دو دو فٹ کیچڑ سڑک پر جمع ہے اور تیس فٹ اونچے ایک پہاڑی کونہ سے جو پُل کے عین سر پر ہے پانی اس زور سے بہہ رہا ہے کہ اس کی آوازیں دور دور جاتی تھی۔ یہ پانی نہایت گندا، میلا اور سرخ رنگ کا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس پہاڑ کے اوپر ایک کچا پہاڑ ہے اس کا

کوئی کوہ بارش کے بغیر [illegible] پڑا ہے جو پگھل پگھل کر پانی کو ''خونی'' بنا رہا ہے۔''۲۴

''سفر نامہ کشمیر'' میں کشمیر کے شہر خاص سرینگر اور اس کے قرب و جوار میں متصل علاقوں کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ ایک مورخ تھے اس لیے انھوں نے تاریخی مقامات اور تاریخی اہمیت کے حامل جگہوں کی جب سیر کرتے ہیں تو ان کی تاریخی واقعات اور معلومات کو تحریر کرتے جاتے ہیں۔ ان مقدس مقامات کا جن پر اہلیانِ کشمیر عقیدت کے ساتھ حاضری دیتے ہیں اور روحانی سکون تلاش کرتے ہیں۔ مصنف بھی ان جگہوں کی زیارت کرتے ہیں اور ساتھ ہی تمام خوبصورت مقامات جہاں لوگ سیر و تفریح کرنے آتے ہیں۔ جیسے شاہی باغات، جھیل ڈل، [illegible] ون کے پہاڑ اور مقدس زیارتوں اور مساجد کی صورت حال بیان کرتے ہیں۔ ان مقامات کی موجودہ صورت حال اور زبوں حالی دیکھ کر وہ افسردہ ہو جاتے ہیں۔ جب مصنف کشمیر کے دیہی علاقوں کی سیر کرتے ہیں۔ تو دیہاتیوں کی طرز زندگی اور حالات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اپنے مشاہدات کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''دیہاتی زندگی کیا پیاری اور سادی اور فرح بخش زندگی ہے۔ مکانات ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر تھے اور نہ صرف فاصلہ کے لحاظ سے بلکہ طرز تعمیر سے بھی ایک بنگلہ کی طرح تھے۔ چھوٹی عمر کی اکثر لڑکیاں شانوں پر بال بکھیرے اور لڑکے سروں پر چھوٹی سی ٹوپی پہنے مال مویشی چرا رہے تھے۔ ان چھوٹے چھوٹے بچوں کی اگر کسی پنجابی یا ہندوستانی گھر میں تعلیم و تربیت وغیرہ ہو۔ تو حسن سیرت و صورت میں لاجواب نکلیں۔''۲۵

جموں و کشمیر صدیوں سے بیرون دنیا کے سیاحوں کے لیے مرکز نگاہ رہا ہے۔ یہاں زمانہ قدیم سے لوگ سیر و تفریح کے لیے آتے تھے۔ فوق کے زمانہ میں ہندوستان انگریزوں کا غلام تھا۔ اس لیے ہندوستانی اپنے انگریز مالکوں کی خدمات کے لیے ان کے ہمراہ کشمیر آتے تھے۔ انگریز زندگی کا لطف اٹھاتے تھے اور یہ غلام بہ سر بہ مُو ان کی خدمات میں حاضر رہتے۔ فوق نے کئی جگہ انگریزوں کے تئیں کڑواہٹ اور مقامی لوگوں کے تئیں افسوس کا اظہار کیا ہے۔ دوران سفر پیش آئے والے ایک دلچسپ واقع کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک میم صاحبہ بھی ایک صاحب بہادر کے ساتھ تھیں۔ صاحب نے بہت زور لگایا کہ کسی طرح ''میم صاحب'' دیسی مزدور کی پیٹھ پر سوار ہو جائیں اور [illegible] کا خیال نہ کریں۔ لیکن میم نے باوجود اس کے اصرار کے دیسی کو اس قابل بھی نہ سمجھا کہ اسے

□ □ داری کا جانور ہی بنالے۔آ□ صا □ بہادر کے کہنے سے مزدوروں نے جلدی جلدی
کیچڑ ہٹا□ شروع کیا۔اورمیم۔صا □ کے ہاتھ میں ہاتھ دئے بیم ورجا کی حا □ میں
گذرنے لگی ۔□اس کی کمر سوسو بل کھا رہی تھی اور چہرے□ ہوائیاں اڑ رہی تھیں دو اور
صا □ آئے۔''۲۶؎

اس سفر□ مے میں ا□ اہم پیغام مظلوم عوام کو بیدار کرنے ،اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھانے□ م نہاد آقاؤں
□ دشاہوں اور انگر□ وں کی غلامی سے□ ت کے لیے بغاوت وسرکشی کی ہدا□ ملتی ہے۔جوقوم اپنے حقوق ،آزادی
اور ملک کے لیے آواز نہیں اٹھاتے وہ کبھی سر اٹھا کے نہیں جی □ ۔انہوں نے راستے میں دکھائی دینے والے مناظر سے
بہت کچھ نتیجہ ا□ کیا۔وہ پورے راستے انگر□ وں اور شاہی کا□ وں کے ہاتھوں ستائے ہوئے عوام کے درد کو محسوس
کرتے □ آتے ہیں۔جو اپنے ہی وطن میں سر اُٹھا کے جینے اور آواز اٹھانے کی آزادی سے محروم ہیں۔جنہیں اپنے ہی
وطن میں د□ کا سفر کرنے کے لیے بھی محصول ادا کرنی □ تی ہے جبکہ انگر□ یہاں آکر سیر وتفریح اور شکار کر کے لطف
اٹھاتے ہیں۔ا□ واقعہ کی طرف اشارے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ا□ انگر□ لڑکا جس کی عمر بمشکل ۲۲ سال ہوگی بندوق اٹھائے معمولی لباس پہنے□ ؤں
میں دیسی جوتی□ اماں□ اماں پہاڑ کی طرف منہ اٹھائے □ جارہا تھا۔اس کے ساتھ
قریباً پندرہ قلی تھے۔جو اس کا اسباب خیمہ ،صندوق ،کپڑوں کے بکس ،بندوق ،سامان
خوراک ، اور بستر وغیرہ اٹھائے ہوئے تھے ۔انگر□ وں کی یہ جفاکشی اور تفریحی
دلچسپیاں دیکھ کر بے اختیار احسنت ومرحبا کہنا□ □ ہے ۔□حقیقت یہ ہے کہ یہ □
دو □ اور بےفکری کے چونچلے ہے۔''۲۷؎

وادی کشمیر'' . □ بےنظیر'' روئے زمین□ □ انے ا□ ایسا خطہ تخلیق کیا ہے جس کے ہر گوشے ،اطراف و
اکناف میں حسین ودلفر□ وشاداب منظر ہے۔قدرت نے اپنی بے مثل مصوری اور تمام ہنر□ ا□ ی کو ا□ زمین□
ا□ جگہ لاکر رکھ□ ہے تو وہ وادی کشمیر ہے۔یہاں کے قدرتی مناظر و دلکش وادیوں کے ساتھ ساتھ لوگ بھی بہت حسین
وجمیل ہوتے ہیں۔یہاں کے لوگوں کی حسن وخوبصورتی کو دیکھ کر□ ہر سے آنے والے انہیں جمالِ یوسف اور حسنِ زلیخہ
سے تشبیہ دیتے ہیں ۔سفر□ مہ نگار وادی کے مناظر اور کشمیریوں کے پیکر جمال سے متا□ ہی نہیں بلکہ رشک کرتے □

آتے ہیں۔انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو بڑی خوبصورتی سے اس انداز میں پیش کیا ہے گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہو۔وادی کشمیر کی دلفریبی و خوبصورتی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کشمیریوں کی سادہ زندگی میں ایک عجیب عالم دیکھا۔کشتیوں کی سیر کا بھی لطف اٹھایا۔بلند پہاڑوں اور مقامات سے دریا ،شہراور برف کے سین کو دیکھا۔اور یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد حقیقت یہ ہے کہ کچھ بھی نہ دیکھا۔۔۔۔کشمیر کی سرزمین میں خدا نے ایک عجیب خاصیت رکھی ہے۔کہ اس کی آب ہوا میں دل پژمردہ خود بخود کھل جاتا ہے۔اور اگر دل میں درد ہو اور طبع میں کچھ موزونیت ہو تو کچھ نہ کچھ ٹوٹی پھوٹی زبان بھی کرتا ہے۔''۲۸

وادی کشمیر زمانہ قدیم سے علم و ادب ،تہذیب و ثقافت ،فن و ہنر کا گہوارہ رہا ہے۔یہ قوم اپنی سریع الذہنی اور فطانت سے دنیائے فن و ادب میں اپنا نام پیدا کرتے رہے ہیں۔یہ صوفیوں اور رشیوں کی سرزمین ہے۔جہاں سے کئی ایسے عالم و فاضل نکلے ہیں جنہوں نے علوم و فنون کی آبیاری کی۔جس زمانے میں کشمیر مختلف حاکموں اور بادشاہوں کا غلام تھا تو بہت سے شاعر و شاعرات اس گھٹن زدہ ماحول میں اپنے درد کو شاعری کے ذریعہ عام کرتے تھے۔ان کے کلام میں وادی کے ہر ہر گوشے سے محبت ،عوام کی کسمپرسی اور ان کے درد کی واضح جھلک دیکھنے کو ملتی ہیں۔ان میں مردوں کے شانہ بہ شانہ خواتین کے کارنامے بھی نمایاں ہیں۔جن کے کلام آج بھی زبان زد ہر خاص و عام ہوتے ہیں۔کشمیر کی اس علمی وادبی تاریخ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اُس زمانے میں جب کشمیر میں علم و فضل کے دریا بہہ رہے تھے اور کشمیری جوہروں کے قدردان دنیا میں موجود تھے۔نہ صرف مردوں ہی کی کثیر تعداد صاحب علم تھی بلکہ اکثر عورتیں بھی زیور علم سے آراستہ تھیں۔اور موجودہ زمانے میں جبکہ کشمیر میں تعلیم کا قحط الرجال ہے یہ بات غالباً تعجبات اور ممکنات سے سمجھی جائے گی۔اور ہے بھی سچ۔کیونکہ یہاں کے مردوں کی موجود جہالت و بے علمی باور کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیتی۔کہ یہاں بھی کبھی مرد تو مرد، عورتیں بھی صاحب علم و فضل ہو گذری ہیں۔خدا بھلا کریں مورخین کا جو کاغذی پردوں میں ان بوسیدہ ہڈیوں کو چھپا گئے ہیں۔''۲۹

فوق ایک کثیر التصانیف اور وسیع المطالعہ انسان تھے۔وہ بیک وقت ایک صحافی ،مورخ ،جغرافیہ نویس ،شاعر و

ادیب تھے۔شاید یہی وجہ ہے کہ جن مقامات کا انہوں نے ذاتی طور پر سفر نہیں کیا اپنے مطالعہ اور مشاہدات کی بنیاد پر ان مقامات اور علاقوں کا بھی بہترین نقشہ ابھارا ہے اور ان خطوں کی تصویر کشی کچھ اس ہنرمندی سے کی ہے کہ جو بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔اس سفرنامے میں ایک باب'' کچھ ساتھیوں کی کیفیت'' کے عنوان سے شامل ہے۔جس میں اپنے کچھ ساتھیوں کے احوال سفر کو بیان کیا ہے جنہوں نے پنجاب سے براستہ کشمیر لداخ،تبّت اور یارقند جسے(Uyghur کہتے ہیں اور کستان یا ترکستان کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔دور حاضر میں چین نے اپنے سرحد میں اس علاقے کو قبضہ کر رکھا ہے۔) کا بغرض تجارت سفر کیا۔فوق نے ان کے احوال سفر کو ان کے تجربات کی روشنی میں لکھا ہے۔وہ ان کے سفر حالات پر خطر راستوں کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی قوم کی بد حالی اور خوابِ غفلت کی کیفیت پر افسوس کرتا ہوا آتا ہے۔ان مسافروں کے زبانی احوال سفر کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

'' مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان ساتھیوں کی کیفیت بھی مختصر سی بیان کر دی جائے۔جو قریباً دو سو میل یعنی سرینگر تک میرے ہمسفر رہے۔ان میں سات ہندو اور ایک مسلمان تھا۔یہ سب لوگ یارقند اور لداخ میں تجارت کرتے تھے۔مسلمان جو یارقند کا رہنے والا تھا ان کا ملازم تھا۔کچھ مال (کپڑا وغیرہ)وغیرہ ان کے ہمراہ تھا اور بہت سا مال جس کی مالیت قریباً دو لاکھ کے تھی۔یہ لوگ اپنے روانگی سے پہلے ہی بمقام سرینگر حاجیوں کے سرائے میں اپنے ایجنٹ کے پاس بھیج چکے تھے۔یہ سب لوگ ہوشیار پور کے رہنے والے تھے۔ان کا سرکردہ لالہ سُکھ رام داس تھا جو پندرہ سولہ سال سے یارقند میں تجارت کر رہا ہے۔کچھ آدمی لداخ رہ جائیں گے۔ اور کچھ یارقند جائیں گے۔سری نگر سے لداخ پندرہ دن کا نہایت سنگلاخ اور دشوار گذار رستہ ہے۔لداخ سے بار داری کے ٹٹو بدل لیے جاتے ہیں کیونکہ لداخ سے یارقند کا راستہ اور بھی دشوار گذار بلکہ خطرناک ہے۔اور وہاں لداخی ٹٹو کام دے سکتے ہیں۔لداخ سے یارقند ۳۵ دن کا رستہ ہے۔چاروں طرف پہاڑ ہی پہاڑ ہے وہ بھی برفوں سے لدے ہوئے۔سبزہ کا نام ونشان نہیں۔چند منزلیں طے کرنے پر آبادی بھی کہیں نہیں آتی۔کئی دن تک انسانی صورت کے دیکھنے کو آدمی ترس جاتا ہے۔سردی کا وہ زور کہ شملہ و کشمیر اس کے آگے پہنچ ہے۔اس پر لکڑی کا کہیں نام تک نہیں پانی کی یہ حالت ہے کہ نہ کہیں باؤلی ہے نہ

چشمہ ہے نہ کنواں ہے نالے ہیں وہ بھی کہیں کہیں۔اور ان میں بھی فوں کا پانی۔اور
ایسا سرد کہ ہاتھ رکھ دو تو ہاتھ نہیں اور پاؤں رکھو تو پاؤں نہیں۔جہاں کہیں دن ختم ہوتا ہے
پانی آتا ہے۔یہ ہوشیار پوری قافلہ اپنا چھولداری لگاتا ہے اور اس میں سمٹ جاتا
ہے۔لوئیاں، نمدے، لحاف، پوستین غرض تمام سامان ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ایک لالٹین
اور تیل کی دو تین بوتلیں بھی ساتھ رکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔مسلمانو! کچھ معلوم ہے کہ تجارت
تگنا منافع اور سود دینے اور بعد میں گھر کی قرقیاں کرانے والے کون ہیں۔آہ! جگر
پھٹ جاتا ہے۔ اس کے جواب میں مسلمان کا نام سنائی دیتا ہے۔اور سینہ جل اٹھتا ہے۔
اس بد نصیب قوم کی یہ دردناک حالت دیکھی جاتی ہے۔زمانہ شناس (ہندو) قوم کو دیکھو
۔اس نے کن مصیبتوں اور تکلیفوں سے یہ مہینوں کا سفر وطن سے کالے کوسوں دور طے کر کے
دولت حاصل کی ہے۔مسلمان کچھ ایسے خواب غفلت میں ہیں کہ دن جاتے ہیں کام
ہی نہیں پڑھے۔''۳۰

فوق نے اہل کشمیر کے سماجی و معاشی مشکلات کے علاوہ راستوں کے خراب ہونے اور پلوں کی مخدوش حالت
کی بھی نشان دہی کی ہے۔فوق سفر نامہ لکھتے ہوئے ارد گرد کے ماحول اور مناظر پر گہری نظر رکھتے ہیں اس لیے وہ سفر کی
روداد مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔''سری نگر کے قابل دید مقامات'' کے عنوان سے انہوں نے ایک الگ باب
میں کشمیر کے جغرافیائی اور قدرتی حسن کو بیان کیا ہے۔انہوں نے ''تعلیم مسلمانان کشمیر'' کے عنوان سے کشمیری
مسلمانوں کی سماجی، معاشی اور تعلیمی زبوں حالی کا مقابلہ راجپوتانہ اور وسط ہند کے مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی صورت
حال سے کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان علاقوں میں مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی حالت نہایت خستہ اور ناگوں دیکھی۔
کشمیری مسلمانوں کی حالت زار ان سے بھی بدتر تھی۔وہ لکھتے ہیں:

''راجپوتانہ، وسط ہند، ممالکِ متحدہ کا اکثر مرتبہ سفر کیا ہے وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت
نہایت ردی دیکھی۔اور چونکہ یہ لازمی ہے کہ جس قوم یا جس ملک میں تعلیم کسمپرسی کی حالت
میں ہو وہاں کی مالی اور اخلاقی حالت بھی قابل رحم ہو۔اس لیے نہ ان لوگوں میں جن کے
مذہب میں نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں کے لیے بھی علم جیسی نعمت کا پڑھنا اور حاصل کرنا

ضروری ہے۔کوئی سلیقہ دیکھا نہ ہنر۔□ت کرنے کی تمیز۔نہ ان کے□ن□کوئی کپڑا□
□ی۔جوان کے افلاس کا بین ثبوت تھا۔خیال تھا کہ ان سے□ھ کر اور کس ملک میں مسلمانوں
کی حا□ □ی دہ در□ک ہوسکتی ہے□کشمیر کے مسلمانوں نے یہ خیال□طل کر□ی۔اور ان کی
تعلیمی حا□□ سے بھی□نکلی۔''۳۱

الغرض یہ سف□مہ ا□ عمدہ اور بہترین سف□مہ ہے۔سف□مہ نگار نے اپنے ہی وطن کا سفر کر کے □رون
□ی □ کے تمام گوشوں میں پوشیدہ حقائق،عوام کے مسائل،سیاسی و معاشرتی صورت حال کو بیرون□ی □□ پہنچا□ی
۔یہ علم و آ گہی،بصیرت و بصارت□□ر□ حقائق کو واضح کرنے اور□دہ راز کو افشا کرنے والا ا□ معلوماتی سف□مہ
ہے۔□ چہ یہ مصنف کا ذاتی سفر تھا لیکن انہوں نے اپنے وطن کو دو طرح کی شخصیات کی آنکھوں سے دیکھا۔ا□ سیاح
کی□ سے اور ا□ مقامی□شندے کی□ سے۔ا□ وہ مناظر سے لطف□وز ہو□ ہے تو اس حسین وادی کے پس□دہ
چھپے دکھوں،مٹی میں دفن غموں اور غلامی کے طوق میں بندھے عوام کے درد و کرب کو بھی محسوس کر□ ہے۔

''آئینہ کشمیر□ی ''خطّۂ بے نظیر کشمیر'' (1906ء)از صا□ بہادر پیرزادہ محمد حسین عارف□:

'آئینہ کشمیر□ی 'خطّۂ بے نظیر کشمیر' □ی □ جموں و کشمیر میں لکھا□ی ا□ قدیم□ین سف□مہ ہے۔جو خان بہادر
پیرزادہ محمد حسین عارف□ کے کشمیر کے دورے کی سفر کی روداد ہے۔پیرزادہ محمد حسین عارف نے لاہور سے تعلیم□ئی تھی اور
عدا□ کے جج بن گئے۔حکومت کی طرف سے خان بہادر اور سی۔آئی کے اعزازات سے بھی نوازے گئے۔ان کی
منصفانہ اور عادلانہ صلا□ی کے پیش□ مہاراجہ کشمیر نے ان کی□ مات مستعار لی۔1906ء میں وہ بحیثیت چیف
جسٹس کشمیر وارد ہوئے۔کشمیر میں قیام کے دوران انہوں نے 'راولپنڈی سے کشمیر□ کے اپنے سفر کی روداد کو 'آئینہ کشمیر'
کے□م سے اپنی معر□الآرا□ میں پیش کیا۔جو اس وقت کے اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔یہ□ 165 اشعار□مشتمل
تھی۔منظور الحق صدیقی (ایم۔اے) کے مطابق اس کا مکمل نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبر□ی میں ہے۔□بعض
مصلحت کی بنا□ پیرزادہ نے اس□ کو کچھ حصوں کے تحذیف کے ساتھ رسالہ ''مخزن'' کے اکتو□ 1906ء کے
شمارے میں ''خطہ بے نظیر کشمیر'' کے عنوان سے د□رہ شائع کر□ی۔اس کی ادبی اہمیت او□ھ جاتی ہے. □ ہم اس□ کو

ادبی رتیخ خصوصاً جموں وکشمیر کے ادبی ریخ کی تناظر میں دیکھتے ہیں ۔ میں لکھا یہ اپنی نوعیت کا پہلا منظوم سفر مہ ہے ۔ اس میں پیرزادہ عارف نے کشمیر کی خوبصورتی ،عوام کی سماجی وثقافتی گی کے ساتھ ان کی معاشی زبوں حالی کو بھی میں پیش کیا ہے ۔ کا آغاز وادی کشمیر کے قدرتی مناظر کی تصکشی سے ہے ۔ پیرزادہ عارف وادی کی خوبصورتی اور اسکے روں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

یہ سچ کہتے ہیں جس نے کا فضا دیکھا
تو گیا اس نے جہاں میں گلشن دیکھا
کرکوئی کیا تعریف اس کی ھ کے عُرفی سے
کہ جس نے یں کباب مرغ کو ہوا دیکھا ۳۲

پھر عارف اپنی سیر کشمیر کی ینہ تمنا کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں جسے مہاراجہ کی نی سے کشمیر کی دورے کی صورت میں میسر ہ۔

سنا کہ تھا کانوں سے ہمیشہ اس کی تعریفیں
عنا سے مہاراجہ کی اب آنکھوں سے آ دیکھا

پیرزادہ اب سفر کا حال بیان کرتے ہی جو انہوں نے عموماً نگ کیا ۔ جموں وکشمی چہ ابتدا سے ہی مرجع خلائق رہی ہے اس کے وجود ڈ ہ حکمرانوں کا یہ رویہ عجیب تھا کہ انہوں نے راستوں اور شاہراہوں کی محافظت اور دیکھ ریکھ کا کچھ خاص انتظام نہیں کر رکھا تھا ۔ جسکی وجہ سے راستے ہموار ، شکستہ ، مخدوش اور خطر بنے ہوئے تھے ۔ جا بجا نگے اور سوا ں حا ت سے دو چار ہوتی رہیں ۔ عارف اس حا سے کافی دلبرداشتہ دکھائی دیتے ہیں ۔ راستے کی ہولنا کیوں کا کرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

کرونگا ذکر میں ہ نہ کچھ رستہ کی کلفت کا
بغیر از رنج تن کس نے خوشی کے در کو وا دیکھا
کبھی دیکھا کہ آسماں سے تیں کہ ہے
کبھی پتال کی جا اسے جا ہوا دیکھا
نہ پوچھو میری کیا حا تھی اُس دم دل کی دھڑکن سے

اَ□ٹ □ کوئی ٹ□ٹ ہوا کھڈ میں□ڑا دیکھا ۳۳؎

□ . □ کشمیر کی قدرتی حسن کو دیکھتے ہیں تو عارف یکلخت ان تمام صعوبتوں اور مشکلوں کو بھول جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں:

□ □ خوف وو □ □ کو معاً ہی بھول جا□ ہے
کہیں□ ہ□ پانی□ سیماب سا دیکھا ۳۴؎

د□ ئے جہلم کے کنارے چلتے ہوئے د□ ؤں، پہاڑوں اور وادیوں میں اس کی روانی اور میدانوں میں اس کی □ اماں □ اماں چال کو بہت خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں :

□ لتے رُوپ جہلم کو بہت دیکھا سڑک□ سے
کہیں□ لاب سا چوڑا کہیں اک رجہا دیکھا
کبھی اس کے دہن میں جھاگ دیکھے مثل مستوں کے
کبھی چلتا ہوا خاموش مثل□ رسا دیکھا ''۳۵؎

پہاڑوں کے □ ں کے□ ر□ ھاؤ، وضع قطع اور بسط ونشیط کا□ کرہ اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ گ□ یہ وہ تمام مناظر اور سلسلے آنکھوں کے سامنے آ□ اں ہوجاتے ہیں:

پہاڑوں کا عجب عالم نئی حا □ ہر اک کی تھی
کوئی □ ٹ ہوا، بیٹھا کوئی، کوئی کھڑا دیکھا
کوئی ع□ ن مادرزاد□ گوں کی طرح□ لکل
جٹا دھاری کوئی پتوں سے از س□ پا دیکھا
کسی کے تن پہ تھی سبزہ وسیہ مخمل کی□ ساتی
کوئی سر□ پ□ □ ف کی چٹی ردا دیکھا
بہا□ تھا کوئی اشک□ امت خوف خالق سے
کسی کو مثل شیطان عجب سے سرور ہوا دیکھا''۳۶؎

پھر راستے کی آسائش، ڈاک بنگلوں اور ان میں د□ ب اشیاء خورد ونوش کا ذکر کرتے ہوئے ''آب جاء'' کا

مخصوص تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ وہی نون چائے ہے جسے بھر میں شوق سے نوش کرتے ہیں:

علاوہ ایک معمولی سرائے کی جو ہوتی ہے
ہر ایک منزل پہ طیار ایک محل خوش دیکھا
مہیّا ڈاک بنگلوں میں ہر ایک سامان رہتا ہے
ادھر طیّار دیکھی ف اُدھر م آبِ چا دیکھا ۳۷

ایک اور جگہ پر اسی ’آبِ چاء‘ کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے۔

میسر ہو نہ کھانے کو تو کچھ پر واہ نہیں ان کو
ش وشہری کو فدائے آبِ چاء دیکھا ۳۸

پرانے زمانے سے ہی وادی کشمیر کے سڑکوں پر خصوصاً شاہراہ بارہمولہ سے اننت ناگ تک دورویہ سفیدے کے درخت ایستادہ ہیں جس سے شاہراہ پر شکوہ اور دلفریب لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وردی سپاہی دو رویہ مارچ کر رہے ہوں۔ اس خوبصورت منظر کی فت سے کوئی نہیں نکل سکتا۔ مسافر اس رے کی خوبصورتی اور طلسم میں کھو جاتا ہے۔ یہ رہ عارف کو بھی اپنی فت میں ہے۔ جس سے متاثر ہو کر وہ پکار اٹھتے ہیں:

ہوا کشمیر میں داخل تو بارہ مولہ میں میں نے
سفیداروں کی پلٹن کو سرِ رہ پر جما دیکھا
ہرے کوٹ اور پتلو سفید ان کی یہ وردی تھی
تھے کوئی اُن میں نہ چھوٹا اور بڑا دیکھا
منظر کا کیا دل پر ہوا کچھ کہہ نہیں سکتا
سماں میری نہ آنکھوں نے پہلے یہ تھا دیکھا ۳۹

رون شہر کی خوبصورتی، ہری بھری اور پری محل کا تذکرہ کرتے ہوئے جہلم کے گھاٹوں پر جمع دوشیزاؤں کی خوبصورتی، رون شہر کے پلوں (کدل)، اور دریاؤں میں رواں ہاؤس بوٹوں کے ساتھ ساتھ درگاہوں اور رتوں اور تیرتھ استھانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان قدرتی مناظر اور دلفریب رے کے مجبور و لاچار عوام کی بے کسی و زبوں حالی کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کی حالتِ کسمپرسی اور غربت اور خون گی پر بھی تبصرہ کیا ہے۔

ایک سرکاری ملازم کا اس طرح کسی مطلق العنان حکومت کے تئیں اتنا کہنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ عارف کا دلیر اور بے باک دل اس میں جھجکا نہیں اور ساتھ ہی اس کا حل بھی پیش کیا ہے کہ اگر تعلیم سے روشناس کیا جائے تو اس کا علاج ممکن ہے:

ہری پربت کی چوٹی پہ ہیں قلعہ اکبر کا
ذرا نیچے محل دارا شکوہ کے پیر کا دیکھا
میان شہر میں بہتا بہت کو اور گھاٹوں پہ
[illegible] عصمت کا ہر جا جم گھٹا دیکھا
نئی وضع کے پل دیکھے کہ دل کہتے تھے ہیں جنکو
ہوس بوٹوں سے دریا کے کناروں کو سجا دیکھا
کلس اگر تھے جی اور شاہ ہمداں کے نہیں تھے یہ
محافظ دو فرشتوں کو کھڑا زیرِ سماع دیکھا
پرستان کا تماشہ دیکھنے کو شہر کے اوپر
اک اونچی جائے پہ تخت سلیماں کو بچھا دیکھا
ہے حسن زنانہ میں مشہور عالم یہاں کے باشندے
لباس ان کا میں نے بہت ہی [illegible] دیکھا
اگرچہ ہر جگہ افلاس کا غلبہ ہے خطہ میں
مسلمانوں کا لیکن حال بالکل ہی جدا دیکھا
نہ ان میں علم و دولت نہ عزت اور حکومت ہے
تجارت کے اصولوں سے انہیں نا آشنا دیکھا
علاج اس ذلت و افلاس کا پوچھو اگر مجھ سے
تو چلنا نسخہ اس کے واسطے تعلیم کا دیکھا[36]

وادی کے لوگوں کی خوش اخلاقی اور سیاسی اور مذہبی یکجہتی کا مشاہدہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہراک جانب ہے ایک تیرتھ، ہرایک جا زیارت ہے
بہت خوش اعتقادی بہت ہی میں نے دیکھا ۴۱

طرز تعمیر اور عمارتوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے جامع مسجد کا تذکرہ کچھ اس طرح سے کرتے ہیں کہ مسجد کی شان اور طرز تعمیر کی اس سے عمدہ الفاظ میں بیان مشکل ہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مسجد کے در و دیوار کی شکستہ حالی سے ملال دکھائی دیتا ہے:

بہت سی مسجدیں دیکھی تھیں ہر طرز عمارت کی
یہاں کی مسجدِ جامع کا نقشہ ہی جُدا دیکھا
کلس اس کا طلائی خوبصورت اور بلند ایسا
اٹھا کر آنکھ دیکھا تو پگڑی کو گرا دیکھا
ستون لکڑی کے اس کے بیس گز ہیں بلند ہی میں
سیہ پتھر کا حوض اس میں نہایت خوب دیکھا
نہیں سایہ کسی مسجد میں ہوگا اتنا دنیا میں
اس پہ بھی صحن اس کا نہایت ہی کھلا دیکھا
ہے اس عجوبہ دہر کی یہ حالت کہ اب میں نے
شکستہ ہر جگہ لکڑی کو چونے کو گرا دیکھا
بجائے صحن کے سبزہ کے ڈنٹھل ہے گھاس اس میں
بجائے لالہ و گل خار و خس کا بستر ا دیکھا ۴۲

خانقاہ معلیٰ کی نرالی طرز تعمیر اور خطاطی اور نقاشی کے عجیب اور منفرد نمونے ان کو کافی متاثر کرتے ہیں:

عجب لکڑی پہ نقاشی ہے نادر شاہ ہمدان کے
لکھیں جابجا حرفوں میں وہاں نام دیکھا ۴۳

نادر روں شہر مساجد، خانقاہوں، تیرتھ استھانوں اور دلکش عمارات کے سیر کے بعد پیرزادہ عارف مغل باغوں کے سیر کو جاتے ہیں۔ جھیل ڈل کے کنارے کوہ زبرون کی آغوش میں شالیمار اور نشاط باغ کی خوبصورتی اور طرز

تعمیر کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

گئے ۔ ب سیر کو اک دن میں شالا مار کی جانب
تماشا قدرتِ حق کا وہاں میں نے دیکھا
ستوں دیکھے سیہ پتھر کے ہیرے سے چمکتی ہیں
اُچھلتا حوض میں چاندنی کا پانی جا بجا دیکھا
جہانگیر اور اسکی جانِ جاں نور جہاں کو بھی
تخیل کی نگاہ سے اب بھی وہاں پھرتا ہوا دیکھا
درخت ان کے لگائے آج ان کے تابع ہیں
چناروں کو کھڑا جس جا کیا تھا وہاں کھڑا دیکھا
شکستہ حوض انہیں روتے ہیں فوارہ آنکھوں سے
چناروں کے ہرا پتہ کو مشغول دعا دیکھا
طرفہ طائفت منزل سے آتا ہے ڈل ایسا
سمندر کو کرا میں کسی نے جا دیکھا۴۴؎

ط سے پیرزادہ عارف فیلی پہاڑوں کے دامن جھیل ڈل کا رہ کرتے ہوئے جھیل میں رقصاں و رواں ہاؤس بوٹوں، تیرتے ں (Floating Garden) کا رہ کرتے ہوئے (جس کو اپنی گی کا پہلا مشاہدہ سمجھتے ہیں) نسیم غ اور درگاہ حضرت بل کا رہ کہا ہے۔ وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہوا چناروں سے ڈھکا ہوا نسیم غ، سامنے جھیل ڈل کے کنارے چناروں کے آغوش میں مرمریں درگاہ حضرت بل کا روح ور منظر، ان روں سے وہ کافی متاثر ہوتے ہیں اور جس کی تعریف میں وہ رطب اللسان د ہیں۔

پڑھا تھا یہ کہ گھر اور کھیت ہیں غیر منقولہ
گھر اور ں کو یہاں چلتا ہوا دیکھا
مسافر بھول جاتا ہے سبھی ا نکار د کو
کنول کے کھیت کو اس نے اس ڈل میں کھلا دیکھا

اَ□ او □□ کر کے کہیں دیکھا جوا□پ کو

یخ دائم سے ہرمکھ کی پہاڑوں کو ڈھکا دیکھا

نسیم□آ□یٖ وہاں سے اور اس کے□پ س حضرتبل

چناروں کا□پ ادلکش کناروں□پ جما دیکھا ۴۵؎

ان قدرتی حسن کے □روں کے بعد پیرزادہ□ٹ شاہ (زین العا□ین) غ□نی، فا□نی، قدسی اور کلیم کے مزاروں□پ حاضری دیتے ہیں۔

کلیم و فا□نی و قدسی□غ□نی کی بھی□ ی رت کی

شکستہ حال زین العا□ین کا مقبرہ دیکھا ۴۶؎

وادی کشمیر کی سیر گلمرگ کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی ہے۔ عارف بہ اہتمام خاص گلمرگ کے سفر کا حال سناتے ہوئے مغربی سیاحوں کا گلمرگ کی تعریف و توصیف کا ذکر کرتے ہیں۔

نہیں د□ میں کوئی صحت گہ کوئی گلمرگ سے بہتر

ہرا ی□ چپّہ زمیں کا لالہ و گل سے بھرا دیکھا

یہ رنگارنگ□ پھولوں کی □ آئی وہاں کثرت

ہر اک میدان ہر اک ٹیلہ پہ ای□ قالین بچھا دیکھا

سنا ہے میں نے اک سیّاح یورپ کو بھی یہ کہتے

مقام اس نے نہ د□ بھر میں ایسا خو□ دیکھا ۴۷؎

عوام کی زبوں حالی اور معاشی و سماجی استحصال کا در□پ دہ اظہار کیا۔ چو□ وہ سرکاری جج تھے اس لیے سرکار کی وکا□ مہاراجہ اور اس کی حکومت کی مدح سرائی کرتے ہوئے □ آتے ہیں۔

□ د□ی محلات شہی سر بفلک دیکھے

□ی اور دھرم میں ان کے پتی کو د□ی دیکھا

فقیروں کا ہے وہ داس اور خالق کا تپشائی

غریبوں کا ہے ان د□ رعیّت کا پتا دیکھا

نہ دوسرا ایسا کوئی عا وزاہد
فلک نے مشعلِ خورشید لیکر جا بجا دیکھا
نہیں شا کی کسی ک اسکی عہدودو میں
ہر شخص کو اس کے لئے دعا ہوا دیکھا
سبق اس سے شی یں عجز وخاکساری میں
سنا تھا جس قدر عارف یہاں آ کر سوا دیکھا[۴۸]

الغرض پیرزادہ عارف نے اپنے سفر کی روداد کو منظوم کیا اور اسطرح میں لکھا ہوا پہلا منظوم سف مہ معرض وجود میں آیا۔

''جنوبی ہند میں دو ہفتے'' (1951) از وفیسر جگن تھ آزاد: ''جنوبی ہند میں دو ہفتے'' وفیسر جگن تھ آزاد کا ای اہم ای اور خالص علمی وادبی سف مہ ہے۔ 1950ء میں اردو ایسوسیشین گور آرٹس کالج مدراس کی جا سے وفیسر موصوف کو ای مشاعرہ اور ادبی نشست کے لیے مدعو کیا تھا۔ چو انہیں جنوبی ہند کے سفر کا شوق تھا اس لیے انہوں نے اس دعوت مہ کو قبول کیا۔ اسی شوق سفر نے انہیں جنوبی ہند جانے اور واپس گھر آ کر ای سف مہ لکھنے کی تحری دی جو 1951ء میں دہلی سے شائع ہو کر منظر عام آیا۔ کتاب کی ابتدا اپنے محبوب شاعر علامہ اقبال کے اس شعر سے ہوتی ہے۔

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

عام طور یہ خیال کیا جا ہے کہ جنوبی ہند کے مدراس میں اردو ن اور اردو شاعری کون سمجھے گا؟ وہاں اردو سے کیا تعلق؟ وہاں اردو جاننے والے کتنے ہی لوگ ہوں گے؟ مل ڈو والوں کے لیے اردو اجنبی ن ہو گی؟۔ لیکن اس سف مے سے یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ اگ چہ شروع میں انہیں مشاعرے میں شر سے معذرت کرنے کا خیال آیا لیکن منتظمین کے اصرار انہیں جا ڑا۔ سفر اختیار کرنے سے قبل اپنے ای دو اور اردو کے ماہر لسا ت عبدالقادر سروری سے بھی خط وکتا کے ذریعے مشورہ طلب کیا۔ جس سروری صا کی طرف سے تسلی بخش جواب

ملنے پر انہوں نے رختِ سفر باندھا۔

اس سفرنامے کے مطالعہ سے مصنف کے افکار و خیالات کی عکاسی ہو جاتی ہے۔ جگن ناتھ آزاد تقسیم ہند کے بعد مغربی ہند یعنی پاکستان سے ہندوستان کی طرف رخ کرنے والے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وطن عزیز ادبی محفلوں اور عزیز و اقارب کو اس طرف چھوڑ کے آ گئے اور یہاں اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے خود وقف کیا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب اردو کو کسی مخصوص طبقے سے جوڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ آزاد نے اردو اور اقبال کو اس سازش کا حصہ نہیں بننے دیا۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> ''کیا اردو زبان اور اردو ادب ہندوستان کے تہذیب و تمدن کا جز نہیں ہے۔ کیا پھول اسی گلستاں کی خاک سے اور اسی کی آب و ہوا میں پیدا نہیں ہوا؟ کیا یہ ہندوستان کی مشترکہ قومیت کا ایک زندہ ثبوت نہیں ہے؟ کیا اس پودے کو ہندو اور مسلمانوں نے مل کر اپنے خون و جگر سے نہیں سینچا؟ کیا اردو کے ختم ہونے سے ہندوستان کی تمدنی خوبصورتی میں کہیں کمی واقع نہیں ہو جائے گی؟ کیا یہ اس وقت بھی ہندوستان کے متعدد صوبوں کی عام بول چال کی زبان نہیں ہے؟ اگر پاکستان نے اردو کو اپنی سرکاری زبان تسلیم کر لیا ہے تو کیا ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس زبان کی مخالفت کریں؟ جس ملک کی یہ زبان ہے کیا اس پر اس کی بقا اور ارتقا کے لیے کوئی فرض لازم نہیں آتا؟ جب اردو پاکستان کی کسی صوبے کی بول چال کی زبان نہیں تو اس کی حفاظت اور اس کی ترقی کا فرض کس ملک پر عائد ہوتا ہے۔''[۴۹]

بذریعہ ریل دو دنوں کے سفر سے وہ دہلی سے حیدرآباد پہنچے۔ اتنے لمبے سفر میں انہیں ہندوستان کے مختلف علاقوں کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ٹرین میں ان کی ملاقات ایک وسیع المطالعہ شخص سے ہوتی ہے۔ جس کے ساتھ گفتگو مصنف کے لیے نہ صرف وقت گذاری میں معاون ہوتی ہے بلکہ مصنف کی جانکاری میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے ساتھ دو دن کے سفر کی روداد اور بحث و مباحثوں کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ ہندوستان کے مختلف مسائل، آزادی، تقسیم ہند، غلامی، جمہوریت، سیاست کے علاوہ نیپال کی سیاسی و معاشرتی مسائل پر بھی بات ہوتی ہے۔ اس لیے اس ہمسفر سے مزید بات کرنے کی اشتیاق بڑھتی گئی۔ مصنف نے اپنے دو ہفتے کے قیام میں دو ہزار سالہ تاریخ و تمدن پر بھی بات کی۔ جس سے اس سفرنامے کی علمی اور ادبی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ پروفیسر موصوف علمی و ادبی شخصیت کے مالک

تھے۔اس لیے مصنف کے تاثرات وتجربات علمی ومعلوماتی ہوتے ہیں۔حیدرآباد میں قیام کے دوران پروفیسر سروری نے ان سے جامعہ عثمانیہ میں تقریر کرنے کی فرمائش کی جس کوانہوں نے قبول کیااور''ہندوستان میں اردو کا مستقبل'' کے عنوان سے اپنامقالہ پڑھا۔یقیناً یہ ایک پرمغز مقالہ رہاہوگا۔جامعہ کے کتب خانے میں موجود علمی ذخائر کو دیکھ کرانہیں جوخوشی وطمانیت محسوس ہوئی اس کاتذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہاں سے فارغ ہوئے توپروفیسر شاہد یونیورسٹی لائبریری دکھانے لے گئے۔جناب مسعود حیدرانی لائبریرین سے ملاقات ہوئی۔آپ جناب غلام یزدانی ناظم آثار قدیمہ کے فرزند ہیں۔میں جناب غلام یزدانی کے نام سے آشنا تھا۔اگرچہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی لہٰذا مسعودصاحب سے مل کرخاص مسرت حاصل ہوئی۔آپ نے لائبریری کے ایک ایک الماری اورایک ایک شیلف دکھایا۔قلمی مسودے اس لائبریری میں بڑی بھاری تعداد میں موجود ہیں۔انھیں تفصیل سے دیکھنے کے لیے کئی دن چاہئیں۔اور ہمارے پاس تو چندلمحات تھے۔کیا کیادیکھتے۔تمنا ہی دل میں لے کرواپس آگئے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہرخواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے ''۵۰؎

''جنوبی ہند میں دوہفتے''میں مصنف نے شہرحیدرآباد کے قدیم تاریخی مقامات اورقدرتی مناظر کی تصویرکشی اس خوبی سے کی ہے کہ آنکھوں کے سامنے شہر کی تصویر ابھرتی ہے۔شہرحیدرآباد صدیوں سے دکن کا دارالحکومت رہا ہے۔یہاں صدیوں سے عوام امن وسکون سے زندگی گذارتے آئے ہیں۔اقتصادی،معاشرتی،سماجی اورتہذیبی اعتبار سے یہ ایک ترقی یافتہ شہر ہے۔مصنف جب اس تاریخی شہر کے چندمقامات کی سیر کرتے ہیں تو ساتھ میں ان جگہوں کی اجمالی حالات اورتاریخی اہمیت کوبھی بیان کرتے ہیں۔گولکنڈہ قلعہ کی سیر کے بعد اپنے تاثرات کو کچھ اس طرح قلمبند کرتے ہیں:

''گولکنڈہ......یہ کسی شہر کا نام نہیں۔یہ کوئی مقام نہیں بلکہ روئے زمین پر بکھری ہوئی داستانِ عبرت کا نام ہے۔گولکنڈہ محض کھنڈروں کی دنیا نہیں بلکہ تاریخ ہند کا ایک ایسا باب ہے جسے ہر دور کے سیّاح،مورّخ،شاعرادیب اورفنکار پڑھتے جائیں گے اوراس پر آنسوؤں کے موتی

نچھاور کرتے جائیں گے۔''۵۱؎

ہندوستان میں مغلیہ دور سلطنت کو زوال آیا، مختلف ریاستوں کے نوابوں اور بادشاہوں، راجاؤں کو یکے بعد دیگرے انگریزوں نے ختم کرنے کی ایسی چالیں چلیں کہ سرزمین ہندوستان میں ایک بھی طاقت ور بادشاہ نہ بچا۔ انگریزوں نے چند موقع پرست ہندوستانیوں کی مدد سے اس وسیع ملک پر دوسوسال تک حکومت کی۔ ان تاریخی واقعات کا تذکرہ علامہ اقبال نے اپنے دورہ حیدرآباد کے موقع پر لکھی ہوئی نظم ''گورستان شاہی'' میں بارہا کیا ہے۔ مصنف کو جگہ جگہ حیدرآباد میں سفر کے دوران وہ یاد آتی ہے۔ اور پوری نظم کو سفرنامے میں گاہے بہ گاہے پیش کیا ہے۔

جنوبی ہند کے ٹمل ناڈو کی ریاست کے بارے میں اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں مقامی زبان یعنی تمل ہی بولی جاتی ہوگی اور انگریزی کا چلن ہوگا۔ لیکن اس سفرنامہ کے مطالعہ سے یہ مفروضہ غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ جس کانفرنس اور مشاعرے میں جگن ناتھ آزاد شرکت کی غرض سے گئے تھے۔ وہ ایک کامیاب مشاعرہ تھا۔ جس کے متعلق انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے جو اردو کے مستقبل کے لیے ایک خوش آئند بات تھی کہ ایک ایسی ریاست جہاں اردو سے کوئی لسانی رشتہ نہیں ہے نہ ہی اردو وہاں کی مادری زبان ہے اس کے باوجود بھی یہاں محبانِ اردو موجود ہیں جو لوگ اردو کے چراغ کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔ اس یادگار مشاعرے کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ مشاعرہ شمالی ہند کے اچھے اور کامیاب مشاعروں سے کسی حیثیت میں کم نہیں تھا۔ صدر کے شگفتہ فقرے مشاعرے میں جان ڈال رہے تھے۔ آپ کا سنجیدہ اور کبھی کبھی مزاحیہ انداز بیان مشاعرے میں ایک خاص کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ شعرا باری باری اپنا کلام سنا رہے تھے۔ حاظرین موقع اور محل کے مطابق داد دے رہے تھے۔ اخبارات کے رپوٹر رپورٹیں لینے میں محو تھے۔ اور فوٹوگرافر تصاویر لینے میں۔ یہ پُرلطف محفل صبح کے ڈیڑھ بجے تک جاری رہی اور اس کی کامیابی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ جب تک صدر نے مشاعرے کو ختم کردینے کا اعلان نہ کیا حاظرین اپنی اپنی جگہ پر جمے رہے اور کوئی شخص مشاعرہ کو چھوڑ کر نہ گیا۔ منتظمین اس کامیابی پر پھولے نہ سماتے تھے اور ان کی یہ مسرت اور خوشی بالکل مناسب اور موزوں تھی۔''۵۲؎

پروفیسر جگن ناتھ آزاد مدراس سے واپسی پر کرنول میں عثمانیہ کالج کے منتظمین کی دعوت پر وہاں پہنچے۔ کالج میں

ان سے ایک مشاعرہ اور توضیحی لکچر دینے کی خواہش کی گئی۔ موصوف نے اپنے پسندیدہ موضوع یعنی ''علامہ اقبال کی شاعری'' پر مقالہ پیش کیا۔ کالج کے شعبۂ اردو کے اہلکار انہیں مشاعرے کے بعد شہر کرنول کے بعض تاریخی اور تفریحی مقامات کی سیر کروانے لے گئے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''دوسری صبح کو ڈاکٹر صاحب کرنول کے بعض تاریخی مقامات دکھانے کے لیے لے گئے۔ کالج کے قریب ہی ایک گنبد ہے جس میں سلاطینِ کرنول آرام فرما رہے ہیں۔ ان قبروں میں فقط غلام رسول خان کی قبر موجود نہیں۔ ان کے اجداد یہاں پہلو بہ پہلو سو رہے ہیں۔ غلام رسول خان کرنول کے آخری نواب تھے اور راقم کے دل میں ان کا وہی مقام ہے جو حیدر علی، ٹیپو سلطان یا فرنویس یا جھانسی کی رانی کا ہے۔ ۱۸۳۸ء میں غلام رسول خان نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی ایک اسکیم بنائی۔ اس اسکیم کے تحت کرنول میں ایک زمین دوز اسلحہ خانہ اور بارود خانہ قائم کیا گیا لیکن وقت سے پہلے یہ راز فاش ہو گیا۔ غلام رسول خان گرفتار ہو گئے اور ریاست کو انگریزی علمداری میں شامل کر لیا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بعد میں غلام رسول خان رہا ہو کر تریچنا پلی چلے گئے جہاں اپنے ہی ایک سپاہی کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ وہاں ان کی قبر آج بھی موجود ہے۔''[۵۳]

اس مختصر سے سفرنامہ میں ہمیں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے خیالات، بصیرت و بصارت اور مشاہدات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے محض دو ہفتے کی روداد سفر میں جنوبی ہند کے احوال و کیفیات، یہاں کی تاریخ، تہذیب و ثقافت، زبان و ادب، بودو باش اور رہن سہن، اقتصادی و زرعی صورت حال اور طرز زندگی کو بھی بیان کیا ہے۔ مصنف چونکہ مغربی پنجاب موجودہ پاکستان سے ہجرت کر کے آئے تھے اس لیے ان کے لیے جنوبی ہند بالکل اجنبی تھا۔ یہاں کی تہذیب و تمدن ان کے لیے نئی تھی۔ یہاں تک کہ دکنی اردو بھی۔ لیکن یہاں صرف دو ہفتے کے قیام میں انہیں ان کے میزبانوں، طلبہ و طلبات، منتظمین نے ایسی محبت، عزت دی کی واپسی پر انہیں بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے کہ برسوں کی دوستی چھوڑ کے جا رہے ہیں۔ یہ ایک خالص علمی سفرنامہ ہے اس لیے لکھنے کا انداز اور فن بھی منفرد ہے۔ یہ ایک معلوماتی، علمی اور سبق آموز سفرنامہ ہے۔

الغرض ریاست جموں و کشمیر میں ابتداء سے 1960ء تک کے عرصے میں سفرنامے کی ارتقاء پر تحقیق

کرتے ہیں تو یہ□ بات سامنے آتی ہے کہ اس نصف صدی سے زائد□ عرصے میں درج□ بالا سفرن□ اموں کے علاوہ ابھی□ تک
اردو میں کوئی اور سفرن□ امہ□ بازی□ افت نہیں ہو□ پا□یا ہے۔ جموں وکشمیر کی ادبی□ تاریخ□ پر جن جن محققوں نے کام کیا ہے اور جن کا
شمار□ یہ □ سے ہی نہیں بلکہ بیرون□ یہ □ سے بھی ہیں کسی اور سفرن□ امے کی□□ نشان□ دہی نہیں کی۔ انہی سفرن□ اموں□ تک□ ہی
راقمہ کی رسائی□ ہو پائی ہے۔ یہ ایک□ مسلمہ حقیقت ہے کہ جتنے بھی سفرن□ امے جواب□ تک□ ہم□ تک□ پہنچے ہیں وہ کئی اعتبار سے
اہمیت کے حامل ہیں۔ موضوع، مشاہدات، تجر□بات، زمانہ، زب□ان وبیان، معلومات غرض تمام اعتبار سے یہ سفرن□ امے
□□یب ومنفرد ہیں۔ اور□ یہ □ کی ادبی، سماجی، تہذ□ اور لسانی□ تاریخ کو سمجھنے میں سنگ میل کی حیثیت ر□کھتے ہیں۔

ب: 1960ء سے 1980ء

''مڈل ایسٹ کا سفر'' از آغا جانی کشمیری: 1960ء کی دہائی میں ایک دلچسپ سفرنامہ ''مڈل ایسٹ کا سفر'' کے عنوان سے آغا جانی کشمیری کا ملتا ہے۔ جو 1964ء میں شائع شدہ ان کی خودنوشت ''سحر ہونے تک'' میں شامل ہے۔ یہ سفرنامہ 1950ء میں ان کے مشرقِ وسطیٰ کے سفر کی روداد ہے۔ آغا جانی کشمیری ہندی فلمی دنیا کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں، جنہوں نے ہندی فلموں کے لیے بہت ساری بہترین کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ ایک ڈرامہ نویس، کہانی کار اور شاعر تھے اردو سے محبت تھی۔ ان کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی۔ لیکن ان کے خاندان کا تعلق کشمیر سے تھا۔ تجارت کے سلسلے میں ان کے دادا لکھنؤ آئے اور یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ آغا جانی لکھنؤ سے تعلیم پانے کے بعد بمبئی چلے گئے جہاں فلمی دنیا کے لیے شاہکار کہانیاں لکھتے رہے۔ انہیں اردو زبان پر اس قدر دسترس حاصل تھی کہ ان کی لکھی ہوئی کہانیوں کے مکالمے اچھوتے اور گانے مقبول ہوتے تھے۔ اپنی خودنوشت کو انہوں نے اپنے ایک دوست کے ذریعے دہلی سے شائع کرانے کے لیے بھیجا تھا لیکن دوست کی کاہلی اور لاپرواہی کی وجہ سے کتاب شائع نہ ہوسکی پھر ایک عرصے کے بعد ۱۹۶۰ء کے ابتدائی دہائی میں اسے منصۂ شہود پر لایا۔ اپنے روداد سفر سے متعلق وہ لکھتے ہیں:

> ''مڈل ایسٹ کا سفرنامہ میں نے کچھ سفر میں اور شاہ فاروق کے آخری دور میں لکھا تھا۔ عراق کے نوجوان بادشاہ بھی اس زمانے میں زندہ تھے۔ اور ایک بزرگ رہنما کی موجودگی میں ''نجف زیارت'' کو آئے تھے۔ آج وہ زمانہ خواب وخیال ہو چکا ہے۔''[۵۴]

آغا جانی کشمیری کے دادا میر احمد شاہ کشمیر میں گلمرگ کے ایک گاؤں ''احمد پورہ'' سے لکھنؤ آئے تھے اور یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ سید واجد حسین رضوی (آغا جانی کشمیری) نے یہیں آنکھ کھولی اور علم و ادب کی سرزمین لکھنؤ میں جوان ہوئے۔ شعروادب چونکہ گھر کا ماحول کا حصہ تھا تو وہ اس نعمت سے محروم نہیں رہے۔ لڑکپن سے جستہ جستہ اشعار اور واہ جملے کہنے لگے۔ استادِ وقت آرزو لکھنوی کی مربیانہ تعلیم نے ان کی صلاحیتوں کو نکھارا اور اپنے وقت کے بہترین شاعروں میں شمار ہونے لگے اور بعد میں بمبئی میں فلموں کے لیے لکھنے لگے۔ ان کی خودنوشت ''سحر ہونے تک'' ۱۹۶۴ء میں منظرِ عام پر آئی۔ جس میں انہوں نے بہت سے اسفار کا ذکر کیا ہے۔ 'کلکتہ سے رنگوں تک کا سفر'، 'رنگوں سے کلکتہ اور بمبئی تک'' کے سفر کا مختصر حال بیان کیا گیا ہے۔ جس حصے میں ''مڈل ایسٹ کا سفرنامہ'' پیش کیا گیا ہے وہ اپنی مثال

آپ ہے پروفیسر احتشام حسین کتاب کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرا خیال ہے اس کتاب میں بہت سے لوگوں کو شاید اس سے زیادہ دلچسپی مشرق وسطیٰ کے سفرنامے سے ہوگی کیونکہ یہ سیاحت اور عقیدت دونوں پہلوؤں سے دلکشی رکھتا ہے۔ اس سفر کے بعض حصے بڑی خوبصورتی سے اس فضا کی مصوری کرتے ہیں جن سے آغا صاحب کو گذرنے کا موقع ملا۔''۵۵

سفرنامے میں منظرکشی اس خوبصورتی سے کی گئی ہے گویا ہم خود اس سفر کے حصے ہوں اور اپنی آنکھوں سے اس سارے مناظر سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ مصنف خشک سے خشک حالات کو بھی دلچسپ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ مزاح ایسا کہ بے ساختہ ہنسی چھوٹ جائے اور انداز ایسا کہ ایک ایک فقرہ دل میں اتر جائے۔ اپنے دونوں بچوں اور بیوی کے ساتھ شروع ہونے والے اس سفر کی شروعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہم لوگ واسنا (VASNA) جہاز سے ۲۰ مارچ ۱۹۵۰ء کو روانہ ہوئے۔ ارادہ تھا کہ پہلے نجف، کربلا، کاظمین، سامرّہ کی زیارت کر کے اور پھر سیریا، لبنان ہوتے ہوئے یورپ جائیں گے۔ پچھلے ... ختم ہو چکے ہونگے۔ از سرِ نو ... ہوں کا مزا لیں گے۔ جس کا لطف بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے مجھے دس ماہ سگریٹ چھوڑنے کے بعد آج پھر سے پینے میں آرہا ہے۔''۵۶

آغا جانی کسی بھی بات کو پس پردہ کہنے کے عادی نہیں۔ انہیں جو کچھ کہنا ہو کھل کے کہہ دیتے ہیں۔ ہنسنا ہنسانا ہو، شکوہ شکایت ہو یا اظہارِ غم والم، ہر احساس و جذبہ کا اظہار کھل کے اور ... کرتے ہیں۔ Partition کا درد اور دوستوں سے بچھڑنے کے دکھ کو وہ زندگی بھر بھول نہیں پائے اور جب سفر میں ان کا جہاز کراچی سے ہوتے ہوئے گذرتا ہے جہاں وہ اپنے بچھڑے دوستوں اور شناسوں سے ملاقات کرتے ہیں اور جب ان سے بچھڑنے لگتے ہیں تو یہ غمِ مفارقت ایک بار پھر تازہ ہو جاتا ہے:

> '' اُس رات مجھ کو جہاز پر کسی طرح کی نیند نہ آئی۔ سارا وقت ایک ہی خیال دل میں چکر کاٹتا رہا۔ بار بار کوشش کی پھر بھی خیال نہ جاسکا۔ چار سال کے واقعات رہ رہ دماغ میں چکر لگا رہے تھے کہ کیوں لوگ الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تھوڑے عرصے کے لیے بھی مل جل کر نہیں رہ سکتے۔ اس کے بعد کون کس سے ملتا ہے۔ کہاں کی صحبتیں، کہاں کی دوستی،

کہاں کا مذہب، کہاں کی شا□، دم بھر کی صحبت کو غنیمت جانئے۔ پھر تو □ ا□ دوسرے
سے بچھڑ ہی جاتے ہیں۔ جتنی چاہے کوشش کر لیں □ بیکار۔''۵۷

مصنف نے مختلف واقعات کا ذکر کیا ہے۔ اور □ رتوں اور مقاماتِ مقدسہ□ ہوئے اپنے تجر□ت اور مشاہدات کو□ی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اور ساتھ ہی ان مقدس مقامات اور □ رتوں□ خدّام کی د□ درازیوں کا خصوصی□ کرہ کیا ہے۔ ان کی چیرہ دستیوں کا□ کرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب تھوڑا سا نجف اور کربلا کے خدّام کے سلسلے میں بھی سن لیجئے۔ یہ قر□ قر□ □ کے □ سیّد ہیں۔ آل رسولؐ۔ اور بقول ان کے زمانے بھر کے سیّد اولاد ابن عم ہیں □ یہ علی و فاطمہ دونوں طرف سے سیّد ہیں۔ اور واقعی حرکتیں بھی . □ دلوانے کی جیسی ہیں۔ چین سے آپ کو ا□ منٹ روضے کے قر□ کھڑا نہیں رہنے دیں گے۔'' نواب صا□ اس کو بوسہ دو۔ سید صا□ یہ ضریح ہے اسے چومو۔ حضور سرکار یہاں تمام شہداء ہیں۔ اسے بوسہ دو۔ کیا کر رہے ہو۔ ہم کو کچھ نہیں دو گے؟ یہ کم ہے اور دو۔ یہ کیا ہوا؟ سید صا□ اور دو۔ اور نکالو جہنم میں جاؤ گے۔ اور □ ذرا سے بھی آپ□م ہوئے تو . □ میں جو کچھ ہے □ □ دستی نکال لیں گے۔''۵۸

مذکور□ لا اقتباس سے ان مقدس مقامات کی تص□ ابھر کر سامنے آتی ہے۔ خدّام کے وہ حرکتیں جو ز□ ین کے لیے□ یشانی کا□ □ □ ہیں۔ یہ حال د□ کے بیشتر مقاماتِ مقدسہ کا ہے۔ درگاہوں، □ رتوں اور مقدس مقامات □ □ رگوں و صوفیوں کے درگاہوں□ ان کے متولیین اور □ ام ز□ ین کی راہ میں حائل رہتے ہیں۔

جن جن جگہوں سے وہ□ رتے ہیں وہاں کے ماحول، آب و ہوا، لوگوں کے رہن سہن اور عادات و اطوار، کا بہترین نقشہ کھینچتے ہیں۔ ا□ اور خاص اور منفر□ت ان کے سف□ مے میں جو دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ ہے ان کا مشاہدۂ تفاوت: یعنی امراء و خواص اور غر□ □ دار عوام کے رہن سہن میں تفاوت اور ان کے مابین موازنہ۔ جس سے کسی بھی معاشرے کو سمجھنے میں □ی مدد ملتی ہے۔

آغا کو□ ن و بیان□ قدرت کاملہ حاصل ہے۔ تبھی ہو□ت کے لیے مختلف حالات کے موافق مختلف الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ جس سے □ ن کی خوبصورتی میں اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ آغا کی □ ن کی سلا□ اور □ از بیان کے

متعلق راجندر سنگھ بیدی لکھتے ہیں:

''سلا □ تو خیر اہل □ ن کی امتیازی شان ہے۔لیکن جس □ ت کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی وہ آغا صا □ کی قوت اظہار تھی جس میں وہ لکھنو کی گذشتہ تہذ □ کے کردار اور ان کے رگِ گل ایسے □ زک احساسات کو اس سادگی اور بے تکلفی سے لے آتے تھے جیسے وہ سامنے کی □ ت ہو۔''۵۹

اس کے علاوہ جس چیز نے اس سفر □ مے کے حسن میں اضافہ کیا ہے وہ ہے استاد شعراء اور خود مصنف کے □ محل او □ جستہ اشعار۔جس سے یہ سفر □ مہ ا □ ادبی شاہکار بن □ ہے۔

□ نہال کے اس □ ر''از بیگم □ خورشید: ''□ نہال کے اس □ ر'' دختر کشمیر □ خورشید کا سفر □ مہ ہے۔ اپنے وطن (کشمیر) سے بچھڑنے کے بیس سال بعد پھر ا □ □ رانہیں کشمیر کی محبت واپس کھینچ لاتی ہے۔اپنے اسی سفر کی روداد □ مشتمل انہوں نے یہ سفر □ مہ لکھا۔جس میں وہ حالیہ کشمیر کا موازنہ اس کشمیر سے کرتی □ آتی ہیں جہاں وہ پلی □ ڑھی تھیں □ خورشید کی پیدائش سرینگر کے ا □ متمول گھرانے میں ہوئی تھی۔یہاں تعلیم □ □ ۔شادی کے بعد وہ اپنے شوہر (خورشید احمد خورشید) کے ساتھ مظفر □ د بس گئیں۔پھر تقسیم کا سا □ پیش □ جس نے انہیں اپنے وطن سے دور کر □ ۔ان کے شوہر قائد اعظم محمد علی جناح کے □ سنل سیکریٹری تھے۔اس لیے بیگم □ خورشید کو بھی ہائی □ وفائل سٹیٹس مل □ اور فاطمہ جناح کے ساتھ رہنے کا موقعہ □ ۔فاطمہ جناح کی سوانح حیات بھی انہوں نے ہی لکھی ہے۔اس سفر □ مے میں ''تحر □ آزادی کشمیر، اہل کشمیر کی غر □ ، جغرافیائی حسن اور اس خطے کے حوالے سے اپنی □ دوں کو بیان کیا ہے۔اس سفر □ مے کو □ نچ ابواب میں تقسیم کیا □ ہے۔

۱۔ہائے کیا چیز غر □ الوطنی ہوتی ہے	۲□ راٹ □ نے دیکھا
۳۔سفر □ مہ کشمیر	۴۔سفرِ بھارت

۵۔تجر □ ت ومشاہدات

□ خورشید نے بچپن اور جوانی سرینگر اور جموں میں □ اری۔جہاں ان کے والد راجہ پونچھ کے ذاتی معالج

تھے۔ اور خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ 'نیا نہال کے اس پار' میں شاہ خورشید نے نصف صدی پہلے گزری زندگی کی یادوں کے پرتوں سے تہیں کھولی ہیں۔ ان کو قدم قدم پر اپنی یادیں اور گزرے ہوئے لمحے گھیر لیتے ہیں۔ اقتباس دیکھیے:

''چالیس منٹ کی پرواز تھی۔ لیجیے کشمیر کی وسیع وعریض وادی کی وسعتیں نظر آرہی تھیں۔ سفید بادلوں کے ٹکڑوں میں جہاز تیز دھوپ میں اڑ رہا تھا۔ ندی کے نالے، آبشار اور دریا سفید دھارے کی طرح لگ رہے تھے۔ حد نظر تک سبزہ تھا اور میری آنکھیں دھندلا رہی تھیں اور بیتے برس یوں ماضی میں بہہ گئے تھے۔ مجھے ان کا احساس کچھ ایسے ہو رہا تھا کہ گزرے سالوں کے ساتھ وابستہ بہت سی یادیں آ گئی تھیں۔ کتنی ہی خوشیاں جو گزر گئی تھیں اور غم جو گزر جانے کے باوجود اپنے نقش چھوڑ گئے تھے۔'' ۶۰

شاہ خورشید کا بچپن کشمیر میں گزرا تھا اس لیے وادی کے خوبصورت مناظر ان کو اپنی طرف کھینچتے ہیں لیکن قدم قدم پر انہیں تبدیلیوں کا احساس بھی ہوتا ہے:

''واپسی پر چار چناری کے پاس ٹھہرے دور سے ڈل میں خشکی کا یہ قطعہ جس کے چاروں کونوں پر چنار کے درخت لگے ہوئے ہیں پانی میں بڑا خوبصورت لگتا ہے۔ ڈل کے ایک گھاٹ سے جو چار چناری کے بالکل سامنے ہیں شکارے سے وہاں جاتے ہیں۔ ڈل ویسے پہلے سے بہت چھوٹی ہوگئی ہے۔ اکثر جگہوں پر اس کا پانی بڑا گدلا معلوم ہوتا ہے۔ آج کل تو کنول بھی نہیں کھلتے جس سے پانی کی وسعتیں بہت خوبصورت ہو جاتی ہے۔'' ۶۱

شاہ خورشید نے کشمیر کے خوب رنگ مناظر کو بیان تو کیا ہے لیکن یہ مناظر ان کو لہو رنگ نظر آتے ہیں۔ وادی کی صحت بخش فضا میں بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی جس نے اس کے حسن کو گہنا دیا تھا۔ مصنفہ کو اپنے وطن سے بہت وابستگی ہے لیکن دو جھیلوں اور پھولوں کی اس خوبصورت وادی سے جہاں ان کا بچپن گزارا تھا، جلد ہی باہر نکلنا چاہتی ہیں:

''ان گزرے ایام کی محبت تھی، ایک خواہش تھی ایک آرزو تھی اس لیے مادر وطن کے اس حصے میں جانے کے لیے بہت تگ و دو کی پھر کامیابی ملی اور ہمیں چودہ روز کا ویزا ہمیں کشمیر جانے کے لیے مل گیا۔ وہاں جا کر وہ ویزا تین ماہ کے لیے حکومت کشمیر نے بڑھا دیا لیکن میں وہاں

> یہ دہ دن رہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہاں کے حالات دیکھ کر مجھے بہت مایوس ہوئی۔ اندازہ تو کچھ تھا لیکن اتنا نہیں تھا، مجھے یوں لگا کہ یہاں سب کچھ سا ٹھہر گیا ہے۔ ٹھہر گیا ہے۔ دنیا کی حسین ترین وادی کی حسین گھاٹیوں پر ایک نہ ختم ہونے والی یاس ہے۔ مایوسی ہے۔ بہتے ندی نالوں میں وہ پہلے والا حسن نہیں۔ خوش رو پھولوں میں مہک نہیں، نیل گوں جھیلوں میں وہ گہرائی نہیں۔ حسن ہے لیکن پھیکا ہے، سوگوار ہے۔ شاید یہ ان حالات کا ردعمل ہے جو کشمیر کی خوبصورت وادی پر رونما ہوئے ہیں۔"[۶۲]

بیگم شمیم خورشید کشمیر کے عوام کی آپسی یکجہتی اور ہم آہنگی اور باہمی شیر و شکر والی اس مشترکہ تہذیب کی یاد کرتے ہوئے جس کے زیر سایہ انہوں نے پرورش پائی تھی، اس طرف زور دیتی ہوئی لکھتی ہیں کشمیر ہمیشہ سے ہی مختلف مذاہب و ملل اور اقوام کا مرکز و محور رہا ہے جس وجہ سے یہاں کی تہذیب میں بین الملل ہم آہنگی اور یکجہتی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

> "سری نگر کے قریب پرانے آثار موجود ہیں بدھ مت کے زمانے کا ایک شکستہ مندر بھی ہے۔ اس کے ارد گرد بکھری ہوئی اینٹیں زمانے کی بے ثباتی کا احساس دلاتی ہیں۔ مہاراجہ اشوک اور پھر مہاراجہ کنشک نے کشمیر میں بدھ مت پھیلایا۔ یہ صوبہ ان کی مملکت میں شامل تھا یہاں بدھ مت کی اشاعت کے لیے بدھ مت کے علمبرداروں نے بہت کچھ کیا۔ راجہ کنشک نے تو سرینگر میں بدھ کانفرنس بھی بلائی تھی جس میں سارے شمالی ہندوستان سے زائرین شریک تھے۔"[۶۳]

ڈاکٹر نہال کے اس ۔۔۔ میں جموں و کشمیر کی صدیوں پرانی تہذیب و تمدن، تاریخ، علم و ادب، عوامی زندگی، کشمیر کے منفرد آرٹ، کشمیری کڑھائی، کشمیری شال، قالین، نقش نگاری، صنعت کاری کے ہنر، تانبے اور کانسی سے بنائے جانے والے خاص سماوار اور نون چائے اور مختلف پکوان کی خصوصیات کے بارے میں خوب لکھا ہے۔ اس سفرنامہ کے حوالے سے ڈاکٹر ۔۔۔ ت امین اپنے مضمون "وادی کشمیر کا تہذیبی اور ۔۔۔ منظر نامہ۔ "شمیم خورشید کی ۔۔۔ سے" میں یوں لکھتی ہیں:

> "شمیم خورشید صاحبہ چونکہ خود ایک کشمیری ہیں اور کشمیر کی تہذیب و ثقافت سے ان کا گہرا اور

بی تی لگاؤ، کشمیر کی ر ، سیاسی اور سماجی حالات کو سمجھنے میں بے حد معاون . ہے
اور کشمیریوں کے لیے ان کا فکرمند فطری معلوم ہے۔''۶۴

الغرض نہال کے اس ر'' اپنے موضوع اور سفر کے خارجی مواد کے اعتبار سے ا کامیاب سف مہ ہے۔ جس میں کشمیر کے موضوع کے مختلف جہات کو بیان کیا ہے۔

سف مہ عراق (1979): غلام نبی خیال: یہ سف مہ کشمیر کے ا صحافی وادی غلام نبی خیال کے عراق کے سفر کی روداد ہے۔ انہوں نے جولائی 1979 ء میں محکمہ اطلاعات کی طرف سے ہندوستانی صحافیوں کے ا وفد کے رکن کی حیثیت سے عراق کا سفر کیا۔ اس وفد نے 15 جولائی کو دہلی سے سفر شروع کیا اور تقریباً دو ہفتے میں عراق کے ے شہروں کا دورہ کیا۔ یہ سف مہ مصنف کی اپنی ادارت میں شائع ہونے والے رو مہ ''اقبال'' میں ۴۴ قسطوں میں شائع ہوا۔ لیکن کتابی صورت میں منظر عام نہ آسکی۔ اس سف مے کا خلاصہ ان کی دوسری کتاب ''کاروانِ خیال'' میں شامل ہے۔ عراق پہنچ کر مقدس مقامات حاضری دئے بغیر کون لوٹ سکتا ہے۔ انہوں نے بھی ان رات حاضری دی۔ غلام نبی خیال عراق پہنچ کر سے پہلے اپنے کام سے فارغ ہو کر مقاماتِ مقدسات حاضری دینے ہیں۔ وہ دین اسلام کے عظیم الشان رخ کے ات کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ پیغمبروں اور اولیاء کی سرزمین سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''میں بھی ا رت کو چل ا بل۔ بغداد اور نجف کی رت۔ الف لیلہ کے اوراق میں پوشیدہ ت و حقائق کی تلاش۔ میدان کربلا کی ہوئی مٹی رگاہِ ا ی میں سجدہ ہونے کی آرزو۔ حضرت علی مرتضیٰؓ۔ حضرت حسینؓ اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی درگاہوں د ئے عرب کے اتحاد اور اسلام کی سربلندی کے لئے د عا ہونے کی تمنا اور عراق کے انقلابی معماروں کے موں سے آگاہی حاصل کرنے کا شوق۔ اور میں بھی ا رت کو چل ا۔''۶۵

اس کے ساتھ . کربلا پہنچتے ہیں تو کربلا کے شہداء کی عظیم نیوں کی د سے ہی وہ تی ہو جاتے ہیں۔ وہ کربلا کے میدان کے ا ا گوشے کو دیکھنا چاہتے ہیں، یہاں کی ہوا سے خود کو معطر چاہتے ہیں۔ اس ارضِ

مقدس کے خاک کو اپنے جسم□ ملنا چاہتے ہیں اور روضہ کو تھام کر اسے چومتے ہوئے وہیں بیٹھنا چاہتے ہیں۔ میدان کربلا میں رو□ ہونے والے اس دلدوز واقعے کو□ د کرتے ہوئے عجیب قسم کے □ت سے و□ رتے ہیں۔ بقول مصنف میدان کربلا میں□ رے ہوئے□م کو□ مے میں تحر□ کرنے سے وہ معذور ہیں۔ لاشعوری طور□ □ریخ اسلام کے زریں دور کے واقعات ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں:

> ''تصورات کا دھارا دجلہ وفرات کی انتھک روانی کے ساتھ بہتا□ اور د□ئے عرب کی زریں □ریخ اسلام کے روشن ابواب نگاہوں کے سامنے وا ہوتے گئے۔ اللہ اور رسول ﷺ کے بندوں نے یہیں□ اپنی آواز کو بغداد، کوفا، کربلا، نجف کی گلی کوچوں میں اس ایمان افروزی اور صداقت شعاری کے ساتھ بلند کیا تھا کہ عراق کے ہر شہر اور قصبے میں موجود قدیم مسا□ کے□ راور مقدس روضوں اور خا□ ہوں کے خاموش□ بلند□ لا مینار آج بھی□ن حال اس صدائے حق کا پیغام د□ کو دے رہے ہیں۔''۲۶؎

وہ عراق کے□ ر□ شہر بغداد جو صدیوں سے دشمنوں اور بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھوں کئی مرتبہ تہس □ □ رہا اور ہر مرتبہ□ د بھی ہوا۔ اس شہر کے گوشے گوشے نے ان حملہ آوروں اور فا□ اور سلطنتوں کی تہذ□ دیکھا اور آج بھی یہاں کی مسا□، مینار یں، عمارتیں□ زار، اور منظر تہذیبوں کے□ د□ د کی داستان سنا رہی ہیں۔ عراق کا دارالحکومت شہر بغداد کی خوبصورتی، قدیم تہذ□ وثقافت□ ریخ، علم وادب، فنون لطیفہ اور صوفی ازم کا مر□ رہا ہے۔ □ چہ سکندر اعظم، چنگیز خان، امیر تیمور جیسے حکمرانوں نے اس شہر کی ا□ سے ا□ بجا دی۔ منگولوں نے یہاں کی عورتوں، بچوں اور□ رگوں□ □ بھی رحم نہ کیا۔ منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی شان وشو□، حسن □ا □، اور جاہ و حشمت کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد بغدا□ مصا□ اور ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹتے ہی رہے اور دارالاسلام کے درودیوا□ اُس□ امنی، بے اطمینانی، بے ثباتی اور افراتفری کی □ ونی اور سیاہ رات کے سائے صدیوں کے طویل عرصے□ چھائی رہی۔ کہتے ہیں . □ بغداد اور بصرہ کے کتب خانوں کو منگولوں نے جلا کر د□ میں پھنک□ تو مہینوں□ د□ کا □نی کالا رہا۔ ہر دور میں استبدادی قوتوں نے اس شہر کو کچلنے کی کوشش کی۔ لیکن آج بھی اس شہر کا آب□ ب□ قرار ہے اور اسی شان کے ساتھ□ ریخ کے ظلم وجبر کی گواہی دے رہا ہے۔ وہ اپنے مشاہدات وتجر□ت کی □ □ اس شہر کی صورت حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

''بغداد میں انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل تک شہری زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی جس کے خد وخال الف لیلہ کی کہانیوں میں نظر آتے ہیں۔شہر کے تنگ و تاریک گلی کوچے لالٹینوں کی مدھم روشنی کے سہارے دکھائی دیتے تھے۔لوگ مشرقی طرز کے پرانے اور بوسیدہ مکانات میں رہائش پذیر تھے۔سقے اپنے مشکیزوں میں دریائے دجلہ سے پانی بھر بھر کر گھر گھر دے آتے تھے اور آمد ورفت کا سلسلہ گھوڑوں سے کھینچی جانے والی قدیم ساخت کی گاڑیوں پر منحصر تھا۔بغداد کے شہری بھی اپنی ثقافت پر قانع تھے اور ایک نئی زندگی کا تصور ان کے لئے خواب وخیال کی حیثیت رکھتا تھا۔''۶۷؎

عراق کی قدیم روایات اور تہذیب وتمدن بے شک وقت کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب سے مغلوب ہوتی جا رہی ہے۔مغربی تہذیب کا انقلاب یہاں بھی آ چکا ہے۔لوگ پرانی تہذیب وتمدن کو چھوڑ کر مغربی رنگ میں رنگ رہے ہیں۔البتہ شہر کی گلی کوچوں اور بازاروں سے اس پرانی تہذیب اور تمدن کے نشانات آج بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔شاہراہ ابریشم اس شہر سے ہو کر گزرتی تھی تمام مغرب ومشرق کے کارروان اور تاجر یہاں آ کر رکتے تھے۔یہاں پر انہوں نے ایک عمارت دیکھی جس کی تعمیر اس وقت کے گورنر امیر الدین نے ۱۳۵۳ء میں کرائی تھی جسے بعد میں کاروان سرائے بنا دیا گیا تھا۔یہ عمارت اب بھی اسی شان کے ساتھ محفوظ ہے۔اس کا ایک حصے میں ریستوران ہے اور دوسرا حصہ نمائش کے لیے مخصوص ہے۔وہاں پرانے اور کلاسیکی طرز کے ساز وسامان سے آراستہ عمارت دیکھ کر مصنف کو خوشی ہوتی ہے کیونکہ اس کا فن تعمیر، نقش نگاری، اور لکڑی کا کام کشمیر کے عمارتوں سے ملتا جلتا تھا۔اس سفرنامے میں عراق سے باہر اطراف کے ممالک خصوصاً خلیجی ممالک میں کام کاج کرنے والوں کی مجبوریوں، محنت کشوں کے حالات اور طرز زندگی کے بارے میں جابجا لکھا ہے۔

غلام نبی خیال نے جہاں عراق کی صدیوں پرانی تاریخ، تہذیب وتمدن، طرز زندگی، مقدس مقامات، مساجد، مینارات، بازاروں، وہاں فروخت ہونے والے اشیا کے بارے میں لکھا ہے ساتھ ہی مناظر قدرت، وہاں کے دریاؤں، میدانوں کے بارے میں تفصیلات دی ہیں۔

بات کو سمیٹتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مصنف نے ایک صحافی کی نظر سے عراق کو بہت قریب سے دیکھا، وہاں کی سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی کو جاننے، سمجھنے اور دیکھنے کی کوشش کی ہے۔جس کا اندازہ اس

سفرنامہ کے مطالعے سے ہوتا ہے۔

ج : 1980ء سے حال

جموں وکشمیر میں 1980ء سے حال جتنے بھی سفر نامے منظر پر آئے ہیں۔خواہ وہ کتابی صورت میں شائع منظر عام پر آئے ہوں یا اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئے ہوں تمام کوحتی المقدور یکجا کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ 1980ء کے بعد سفر نامے کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔حالانکہ جموں وکشمیر کی سیاسی وسماجی صورت حال مستحکم نہیں رہی ہے اس کے باوجود ذوق افراد بیرون ریاست اور بیرون ملک سفر کر کے اپنے تجربات کو صفحہ قرطاس پر لاتے رہے ہیں ۔ان سفر ناموں مختلف تکنیک ،فن واسلوب کا التزام کیا گیا ہے ۔سفر نامے کی تاریخ ، روایت اور موجودہ صورتِ حال پر تحقیق کر کے سیر حاصل بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔جموں وکشمیر میں سفر نامے کی سنگ بنیاد سالگ رام سالک اور فوق جیسے ادیبوں نے ڈالی۔ڈوگرہ دور حکومت میں ریاست میں مخدوش تعلیمی صورتِ حال اور آزادی اظہار رائے اور پریس پر پابندی کی وجہ سے یہاں کے صاحب ثروت اور با ذوق افراد ملک کے مختلف گوشوں میں جا کے اپنی تشنگی علم کو سیراب کرتے تھے اور مختلف اخبارات اور رسائل وجرائد میں مضامین لکھ کر اپنے سوئے ہوئے قوم کو جگانے کی کوشش کرتے۔ظالم حکمرانوں کو ان کا آئینہ دکھانے کی کوشش کرتے تھے۔یہ وہ دور تھا جب عالمی سطح پر ہر طرف انقلاب رونما ہور ہے تھے۔قدیم شاہی اور شخصی طرز حکومت، روبہ زوال پر تھی۔ایسے وقت میں جموں وکشمیر کے روشن خیال افراد کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔ریاست کے عوام کو سیر وتفریح اور سیاحت پر جانے اور سیاحت کے لیے بھی حکومتِ وقت کا سندِ اجازت نامہ ضروری تھا۔ایسے حالات میں سفر کہاں ممکن تھا۔آزادی کے بعد بھی ہندوستان کی سیاسی ردعمل جموں وکشمیر کے لیے خوشگوار نہ تھی۔مختلف قسم کی پابندیاں بھی عائد رہیں ۔یہی وجوہات ہیں کہ اس پورے نصف صدی سے زائد عرصے میں ریاست میں سفر ناموں کی تعداد گنتی کے چند ہی ہیں۔لیکن یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ 1980ء کے بعد جموں وکشمیر میں سفر ناموں کی تعداد کافی ہے۔ موجودہ دور کی سہولیتیں، اور لوگوں کے اقتصادی حالات میں بہتری اور دنیا کے سب سے بڑے جمہوری نظام کا حصہ ہونے کے باعث یہ سب ممکن ہوا ہے۔اس دور کے سفر ناموں میں ملک راج صراف ، اوم پرکاش صراف ،پروفیسر جگن ناتھ آزاد،پروفیسر حامدی کاشمیری،ثناء اللہ بٹ ،کشمیری لال ذاکر، ڈاکٹر نذیر آزاد ،ریاض جیسے ادیبوں کے سفر نامے مثالی سفر نامے ہیں ۔ان کی تفصیلات اس طرح ہے۔

''ا ابھی نہ ہ ہے'' (1982ء): ملک راج صراف: جموں وکشمیر کے ب ے صحافت، ڈ ایکشیلسر، رتن، اور اخبار رنبیر کے م اعلیٰ لالہ ملک راج صراف کا سف م پ کستان ہے۔ مصنف ذاتی طور پ اپنے بچھڑے ہوئے عز وں سے ملنے پ کستان کے دورے پ نکلے تھے۔ عز وا قارب اور دوستوں کی ب ائی سے مجبور ہوکر وہ تن تنہا پ کستان کے سفر کے لیے عمر کے اُس دور میں تیار ہوئے جس دور میں لوگ چلنے پھرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور گوشہ نشینی اختیار کرتے ہیں لیکن مصنف نے 1979ء میں ہمسایہ ملک کا سفر اختیار کیا۔ انہوں نے اس سفر کے تمام حالات وکوائف کو قلمبند کیا۔ بعض وجوہات کے ب شائع کرنے میں خیر ہوئی اور 1982ء میں کتابی صورت میں منظر عام پ آئی۔ اس کتاب میں ہند پ ک کے م امی سیا دان، شخصیات، اور قلمکاروں کے آراء اور مصنف کی شخصیات کے حوالے سے ت کو بھی شامل کیا ہے۔ جو کتاب کی ای منفرد پہچان بن گئی ہے جس سے اس سف مے کی خوبی، اہمیت اور افاد کا ازہ ہوجا ہے۔ ملک راج صراف جموں وکشمیر کے وہ واحد صحافی ہیں جنہیں میں ہی نہیں بلکہ، قومی و بین الاقوامی سطح پ بھی پ ائی حاصل ہے۔ وہ تمام مذاہب کے ماننے والوں، مختلف طبقوں او ہوں کے لوگوں سے یکساں محبت، خلوص اور اخوّت کا سلوک کرتے تھے۔ ان کی شخصیت ا ، محبت اور اخلاص کا مر تھی۔

''ا ابھی نہ ہ ہے'' میں ا ، محبت ی م رفتہ، اور بیشتر اوقات تلخ ماضی ک ی ذکر کے اس کی عکاسی کرتے ہوئے مصنف موجودہ دور کا مشاہدہ بھی کرتے آتے ہیں۔ ماضی کی تلخیوں، رعنائیوں کا نقشہ بھی یہاں سامنے آ ہے۔ کتاب میں مختلف لوگوں کی آراء شامل ہیں۔ جن سے ملک راج صراف کی ذات وشخصیت اور مزاج کا ازہ ہوجا ہے۔ آیینہ رشید فیصل آ ب پ کستان کے رہنے والی مصنفہ ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

> '' میں نے امریکہ کے سیا مے کی رنگینیاں پ ڑھیں۔ انگلستان کے سف مے میں یخ بستہ راتوں کا کر پ ڑھا۔ بغداد کی گلیوں کو دیکھا، جہاں الف لیلہ کی کہا ں پ وان پ ڑھیں، مصر کے قہوہ خانوں کے ب رے میں پ ڑھا 'میری پ کستان ا'' میں محبت کے پُرخلوص تحفے، عقیدت کے رانے اور خوشی کے انے پ ئے۔ ایسی روداد نہ کہیں پ ڑھی نہ سنی

تھی۔"۶۸

اس سفرنامے میں ان لوگوں کا بھی تذکرہ ہے جن کا تعلق صوبہ جموں سے تھا اور ہجرت کر کے پاکستان کے مختلف شہروں میں مقیم ہوئے۔ان کی اولاد یعنی نئی نسل کے لوگ، جو تقسیم کے بعد پاکستان میں پیدا ہوئے اور یہیں پلے بڑھے لیکن ان کے دلوں میں بھی جموں کے لیے محبت اور احترام دیکھنے کو ملتا ہے۔ جب صراف اکیلے واگہ بارڈر عبور کر کے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہیں جہاں وہ تقسیم ہند سے قبل تعلیم کے سلسلے میں اور ملازمت کے دوران رہے تھے۔ جہاں ان کے خاندان کے لوگ اور رشتہ دار بھی رہتے تھے۔لیکن تقسیم نے انہیں ان سب کو ترک کر کے ہندوستان کی طرف آنے پر مجبور کیا تھا۔اب تیس سال بعد وہ پھر ایک مرتبہ تن تنہا اس سرزمین میں داخل ہوئے تھے۔ جہاں اب ان کے کوئی رشتہ دار قریب نہیں رہتے۔ان کا خیال تھا کہ کسی ہوٹل میں قیام کیا جائے۔لیکن ان کا ارادہ اس وقت غلط ثابت ہوتا ہے۔ جب لاہور میں ان کی آمد کا سن کر جموں و کشمیر کے مہاجرین اپنے اس مہمان سے ملنے آتے ہیں۔اور ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ مصنف کا قیام ان کے گھر پر رہے۔ یہ ان غریب الوطن لوگوں کا اپنے وطن اور وطن کے لوگوں کے تئیں محبت و جذبات کی دلیل ہے۔لوگ ان سے ایسی محبت اور عقیدت سے ملتے تھے جیسے وہ کسی مقدس مقام پر حاضری دے کر آئے ہوں۔ جموں اور ہندوستان ان مہاجروں کے لیے کسی مقدس مقام سے کم نہیں ہے۔ان لوگوں کے جذبات کو محسوس کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> "وائس چانسلر کے بھیجے ہوئے خاص آدمی میرے واقف کار نکلے ہم دیکھتے ہی ایک دوسرے سے لپٹ ہو گئے۔ نہ وہ مجھے چھوڑنا چاہتے تھے نہ ہی میں ان کو۔ چنانچہ ہم چند لمحے اس طرح گلوگیر رہے۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو اُبھر آئے۔ یہ تھے مسٹر کلیم اختر جن کا خاندان محلّہ جنڈکا تیاں جموں میں رہتا تھا آپ کے والد بزرگوار کا نام منشی غلام علی تھا۔ جو ۱۹۴۷ سے پہلے ریونیو سیکریٹریٹ میں سپرنٹنڈنٹ تھے اور ایک اچھے سخن ور اور سوشل ورکر بھی تھے۔مسٹر کلیم اختر خود ایک قابل اہل قلم ہیں۔ان کے ساتھ ایک اور جموں نواسی شیخ عبدالرحمان فلم ڈائریکٹر اور ان کے دو دوست رفیق مجھے لینے آئے تھے۔"۶۹

مصنف اس بات سے حیران تھا ہے کہ پاکستان میں مقیم جموں و کشمیر کے مہاجر کس طرح بلا تفریق مذہب و ذات کے اپنے وطن کے آنے والے بزرگ کی عزت و محبت کرتے ہیں۔ بقول مصنف ان کا تعلق اس نسل سے ہے جو

کہیں نہ کہیں جموں میں ہونے والے تقسیم کے سا□ کے ذمہ دار ہیں۔لیکن جموں کے نواسی اُس تلخ ماضی کو بھلا کر اپنے ہم وطن کی آمد پر پھولے نہیں سماتے۔ان کی مہمان نوازی کرنے اور خدمت کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے ہیں۔تقسیم کے سا□ نے اس ملک کے دو ٹکڑے کیے۔دونوں ملکوں کی سیاستدانوں نے اسے ایک حل نہ ہونے والا سیاسی مسئلہ بنا کر رکھا ہے۔لیکن عوام ایک دوسرے سے محبت اور ہمدردی رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ□تیں، کدورتیں اور تفرقات بھلا کر پھر سے ایک ہو جا□۔

ہندوپاک کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب سے دونوں طرف کے عوام رچے ہوئے ہیں۔یہی محبت واخوت اب بھی ویسی ہی ہے۔کچھ شر پسند عناصر و سیاستدان اپنے مفادات کے حصول کی خاطر شور وشر پیدا کرتے ہیں اور اس کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑکنے لگتی ہیں۔اسی سیاست نے عوام کے بیچ دوریاں اور خلیج حائل کر رکھی ہے۔سفرنامہ نگار کو پاکستان میں محبت، خلوص، امن اور ہمدردی سے لبریز عوام ملتے ہیں۔ان کی محبت کی ترجمانی وہ اس طرح کرتے ہیں:

> ''قار□ کرام خود ہی اندازہ لگا□ کہ مجھے اس سے بہتر ماحول اور کہاں میسّر ہوسکتا تھا۔کیا میں یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ اپنے دورۂ پاکستان کے دوران کہیں بھی ایک لمحہ کے لیے بھی مجھے محسوس نہ ہوا کہ میں کسی غیر ملک یا اجنبی مقام پر آیا ہوں۔'' ۴۰؎

مزید لکھتے ہیں:

> ''دوسرے ملکوں اور غیر ملکوں کو جانے دیجئے۔اگر اپنے ہمسایہ جس کو ہماری تہذیب ماں جایا کے طور سمجھتی ہے کو بھی بے جا طور پر تنگ کیا جائے تو وہ بھی آپ سے بدلہ لینے پر مجبور ہو جائے گا۔ہمسائیگی کی اسی□ یئے کی عملی صورت کو میں بین الاقوامی سطح پر ہندوستان اور پاکستان کے مابین بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔اور مجھے خوشی اور اطمنان ہے کہ میرا یہ تجربہ بڑی حد تک کامیاب رہا ہے۔دونوں ملکوں کے آنکھوں دیکھے حالات کی روشنی میں میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستانی عوام اور پاکستانی عوام میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔'' ۴۱؎

سفرنامہ نگار پاکستان میں قیام کے دوران جدھر جاتے تھے انہیں وہاں جموں کے بہت سی (مہاجر) ملتے ادیب و شاعر۔اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے سفر کرنے کے مقصد میں کامیاب ہوئے جموں سے بچھڑے دوست و

احباب ان سے ملنے آتے تھے۔ان کے ساتھ چائے کی نشست ہوتی تھی جہاں جموں وکشمیر کا ذکر ہوتا تھا۔وہاں کے لوگ بہت اشتیاق سے جموں کے بارے میں مصنف سے پوچھتے تھے۔ایک ایک چیز کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ گلیوں کوچوں بازاروں کو یاد کرتے ہوئے بہت مغموم ہو جاتے تھے۔ان میں کچھ لوگ صاحب قلم بھی تھے جو اپنی یادوں کو شعر وشاعری کے ذریعہ پیش کرتے تھے۔ان ملاقاتیوں میں مختلف قسم کے کہنہ مشق ادیب ،شاعر،ادیب ،صحافی، ماہر تعلیم اور دانشور شامل ہوتے تھے۔اس لیے جموں وکشمیر کی سیاسی وسماجی صورت حال پر بھی بات ہوتی تھی۔دونوں ملکوں کے بارے میں آمدورفت کے طریقوں کو آسان بنانے کی خواہش کا ذکر کرتے تھے۔وہ لوگ تقسیم کے سانحے کو یاد کرتے ہوئے مصنف کو اپنے حصے کی داستان سناتے تھے۔جو انسانی دل وروح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ان لوگوں کی دلدوز داستان،مصنف کے لیے قابل برداشت نہیں ہوتی ہیں۔اگرچہ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ اس کے باوجود بھی وہ مہاجر اپنے آپ کو وقت کے دھارے پر چھوڑ کر آگے نکل چکے ہیں۔زمانے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی مستحکم کر چکے ہیں لیکن دل کے کسی گوشے میں اپنے وطن کی یادیں اب بھی بسی ہوئی ہیں۔ایک مہاجر کی روداد کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''مطلب پرستی کے اس ماحول میں اور فریب کے اس زمانہ میں . جب دل گھٹن سی محسوس کرتا ہے تو تصورات یکدم پلٹ کھاتے ہیں۔۔۔۔۔جموں کی صاف شفاف اور چمکدار پتھروں والی گلیاں اونچی نیچی ڈھلوانوں پر صاف ستھرے مکان، پُر کیف فضا، سہانے موسم۔ایک طرف قلعہ باہو کے سرسبز پہاڑیوں کے دلفریب نظارے دریائے توی کا شفاف اور میٹھا پانی، مچھلیوں کے پورے جھنڈ کی اٹکھیلیاں، چمکیلی ریت اور رنگ برنگ گول مول پتھروں کی وادیاں۔ پن چکیوں والے گھراٹ پار لے جانے والا مچھوا، رنبیر باغ کا شاداب جزیرہ، پیر قادر شاہ اور میر میٹھے کی ڈھکیاں۔جوگی دروازہ کی ڈھلوان اور اکبر اسلامیہ ہائی اسکول کی ٹاور، اور ۱۴۰ اپوڑیوں کے اڑے، فلک بوس مندروں کے سنہری کلس فضا میں گونجتی ہوئی آذان کی دلکش صدا، دوسری طرف دریائے چناب کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کی نہر اور اس کی گھاس کے گداز کنارے،۔۔۔۔۔۔۔گلی گلی میں بکنے والے موتیئے کے ہاروں سے بھینی بھینی خوشبو کی یاد ایک کیف سا طاری کر دیتی ہے۔''۲۷

سفرنامہ نگار نے لاہور، فیصل آباد، سیالکوٹ اور لائل پور وغیرہ شہروں قصبوں کے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ لاہور کی گلیوں، کوچوں، بازاروں، کالجوں میں گئے۔ اس شہر سے انہیں اُنسیت تھی کیونکہ انہوں نے تعلیم لاہور سے ہی حاصل کی تھی۔ ان مقامات پر جا کر وہاں تبدیلیاں دیکھ کر مسرت تو ہوتی ہے لیکن [illegible]تی بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ ذہن کے نہاں خانوں میں ماضی کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کتابیں وغیرہ خریدنے سے پہلے میں نے لاہور میں واقعہ ہندوؤں اور سکھوں کے چند مذہبی مقامات کو بھی دیکھنا چاہا۔ سیتلا مندر کے آس پاس نئی دکانیں کھل گئی ہیں۔ اور مندر میں جانے کا راستہ چھوٹا سا رہ گیا ہے۔ اسی طرح جس طرح ہندوستان میں بعض مقامات پر مسجدوں و دیگر مذہبی مقامات کی صورت میں ہوا ہے۔ البتہ لاہور قلعہ کے نزدیک واقع مشہور سکھ گوردوارہ کی حالت کافی اطمینان بخش ہے۔ ننکانہ صاحب کی حفاظت اور دیکھ بھال کے انتظامات تو بہت اچھے بیان کئے جاتے ہیں۔''۳۷

اس سفرنامہ کے مطالعہ سے سفرنامہ نگار کے گہرے مشاہدے، وسیع نظری، علم و آگاہی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ تمام عمر میدان صحافت سے منسلک رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے تجربات کے آئینہ میں ہند پاک کے عوام کے یکساں مسائل پریشانیوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''فیصل آباد اور لاہور کے مابین ٹرین میں آتے جاتے دونوں پاکستانی دیہات کے کچھ جھلک میرے دیکھنے میں آئے۔ ریل سے سفر کرنے والے دیہاتی مسافروں سے بھی بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ دیہاتی علاقہ اور دیہاتیوں کے رہن سہن میں کچھ زیادہ ترقی دیکھنے میں نہیں آئی۔ نہ ہی میں نے ان دیہاتوں اور ہندوستانی دیہاتوں میں کوئی خاص فرق دیکھا۔ ہاں ہندوستانی دیہاتوں میں اب قدرے سیاسی بیداری کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن پاکستانی دیہاتیوں سے بات چیت کرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ سیاسی طور پر ہندوستانی بھائیوں سے کافی پیچھے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پاکستانی عوام اب تک ایک پائیدار جمہوری نظام حکومت سے فائدہ مستفید نہ ہو سکے۔ سیاستدان ان کی ترقی کی جانب وہ توجہ نہ سکے سکے جس کے دیہاتی مستحق تھے۔ اور خود

سیاستدان آپسی لڑائی جھگڑوں میں ہی اُلجھے رہے۔''۴۷

سفرنامہ نگار نے جموں کے مہاجروں جو پاکستان کے مختلف شہروں میں مقیم تھے ان کی حالتِ زار کو بیان کیا ہے۔ جو عموماً سیالکوٹ کے تنگ و تاریک گلیوں اور گنجان محلوں میں زندگی کے ایام گزار رہے تھے۔ حالانکہ ان میں سے بیشتر لوگ جموں کے صاحبِ ثروت اور صاحبِ حیثیت لوگ تھے۔ مصنف نے ان سب کی عمومی داستان بیان کی ہے۔

ملک راج صراف کی شخصیت میں اخلاص، نرم دلی، محبت، اور اعلیٰ ظرفی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ پاکستان پہنچتے ہیں تو نہ صرف جموں وکشمیر کے مہاجر بلکہ پاکستان کے بھی صحافی اور ادیب انہیں اپنے ملک میں آنے پر خوش آمدید کہتے ہیں اور مختلف اخبارات میں آمد کا پیغام اور انٹرویو شائع کرواتے ہیں۔ بحیثیت صحافی، اس میدان میں ان کا نصف صدی سے زیادہ عرصے کا تجربہ تھا۔ وہ اُس زمانے سے جب ریاست میں ڈوگرہ حکومت تخت نشین تھے، پھر آزادی اور تقسیم، اور ریاست جموں وکشمیر کا ہندوستان کے ساتھ الحاق، یہ تمام واقعات انہوں نے صحافی کے طور پر تمام زاویے سے دیکھا تھا۔ تمام سچائی اور حقائق سے واقف تھے۔ سیاسی مسائل اور سماجی صورت حال پر گہری نظر تھی۔ اپنے ان تمام تجربات ومشاہدات کو بھی اس سفرنامے میں موقع محل کی مناسبت سے بیان کیا ہے۔

الغرض یہ سفرنامہ ایک اخبار نویس، صحافی، ادیب اور ایک انسان دوست شخصیت کی روداد سفر پر مشتمل ہے۔ اس لیے واقعات، حالات وحوادثات میں گزرے لمحوں کے ساتھ سیاسی وسماجی حالات کو بھی بیان کیا ہے۔

''پاکستان میں دو دن'' (1982): اوم پرکاش صراف: سفرنامہ ''پاکستان میں دو دن'' اوم پرکاش صراف کے پاکستان کے سفر کی روداد ہے۔ جو انہوں نے 1960ء میں کیا تھا۔ جسے ان کے والد ملک راج صراف نے کتابی صورت میں اپنے سفرنامے کے ساتھ شائع کردیا۔ اوم پرکاش صراف ساری زندگی صحافت کے پیشے سے منسلک رہے۔ انہیں ریاست اور بیرون ریاست کی سیاسی اور اعلیٰ سطح کے اکثر پروگراموں کی کوریج کے لیے بلایا جاتا تھا۔ جموں وکشمیر کے ہر سیاسی، سماجی پروگراموں، پریس کانفرنس، ملاقاتوں اور تقریبوں اور عوام سے ملاقاتوں یہاں تک کی الکیشن کمشن تک کی مجلسوں میں انہیں خصوصی دعوت دی جاتی تھی کیونکہ وہ جموں وکشمیر کے سب سے زیادہ سرکلیٹ ہونے والے انگریزی روزنامہ Daily Excelsior کے مدیر تھے۔ یہ بھی اسی نوعیت کا ایک سفر تھا۔ جولائی

1960ء میں ہند پاک مذاکرات کے غرض سے پاکستان میں ایک کانفرنس میں شمولیت کے لیے اُس وقت کے وزیر اعظم (اس وقت جموں وکشمیر کو خود مختار ریاست کی حیثیت حاصل تھی) شیخ محمد عبداللہ کی دعوت پر صراف بھی پاکستان گئے۔

اس سفرنامہ کے مطالعہ سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ پنڈت جواہر لعل نہرو چاہتے تھے کہ ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر دونوں ممالک امن و مصالحت کا راستہ اپنا کر اور دوستی کا ہاتھ بڑھا کر ان تمام نقصانات سے بچا جائے جو دونوں ممالک کی ترقی کی راہوں میں روکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ پنڈت نہرو ایک خوش آئند مستقبل کا خواب دیکھتے ہوئے دونوں ملکوں کے مابین امن و دوستی کی پاسداری کے خواہاں تھے۔ وہ سرحد پر چلنے والے مسائل کو ختم کرنا چاہتے تھے، خصوصاً مسئلہ کشمیر کا کوئی حتمی حل نکالنا چاہتے تھے۔ چونکہ وہ خود بیمار تھے اسی لیے اسی نیک نیت اور امید کے ساتھ انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کو اپنا نمائندہ بنا کر صدر ایوب سے ملاقات کے لیے روانہ کیا۔

دہلی سے لاہور تک کا سفر ان کے لیے متاثر کن ہونے کے ساتھ ساتھ کافی دلچسپ رہا۔ دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان انہیں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آیا۔ عوام دونوں طرف کے غریب، محنت کش، مخلص، شریف اور سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ جب وہ لاہور پہنچتے ہیں اور ایئر پورٹ سے ہوٹل تک کے راستے میں کھیت کھلیان، چھوٹی چھوٹی دکانوں اور عام اور سادہ لوگوں کو دیکھتے ہیں تو وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کس چیز نے ان کے بیچ حدِ فاصل قائم کر رکھی ہیں۔ پاکستان میں قدم رکھنے کے بعد اپنے تاثرات کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''پاکستانی گھاس میں پاکستانی کسان اور پاکستانی مویشی اور پھر ایک کچی سڑک پر دو پاکستانی
> ننگے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے۔ بالکل ویسا ہی نقشہ تھا جیسا کسی بھی ہندوستانی
> علاقے میں نظر آتا ہے۔''۵ے

انہیں پاکستان میں صرف دو دن قیام کرنا ہوا اس لیے مقامی لوگوں سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، البتہ جن لوگوں سے اس مختصر سے قیام میں ملاقات ہوئی، ان کے رہن سہن، تہذیب و اخلاق اور مہمان نوازی نے سفرنامہ نگار کے دل و دماغ پر گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا۔ ان کے نزدیک پاکستان سے مراد ایک ایسی ''اسلامی ریاست'' تھی جہاں اقلیتوں کے ساتھ تفریق، ظلم وستم اور نفرت کا ماحول ہو جیسا کہ ہندوستانی اخبارات وخبروں میں بتایا جاتا ہے لیکن مصنف کا یہ دورہ ان تمام روایات اور خبروں کی یکسر نفی کرتا ہے۔ لوگوں سے ملاقات اور گفتگو سے کہیں نہیں لگتا کہ وہ کسی دیارِ غیر میں

ہیں۔عوام کی مہمان نوازی اور دیدہ دلی سے ان کی محبت اور خلوص کا ثبوت ملتا ہے۔ جو دونوں ممالک کے باہمی تعلقات کا ضامن ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> ''صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس نوع کی علیٰحدگی سے خوش نہیں ہیں، میں حیران تھا کہ جہاں حبیب اللہ □زی اور حبیب الرحمان ایسی ہستیاں موجود ہوں وہاں بھارت اور پاکستان نہرو اور ایوب کی رہنمائی میں ایک دوسرے کے زیادہ سے زیادہ قریب لانے میں کون سا امر مانع ہو سکتا ہے؟''٦ے

اسی اثنا میں پنڈت نہرو کی وفات ہوگئی جس کی وجہ سے میٹنگ منسوخ کرنی پڑی اور جس کام اور مقصد کے لیے یہ وفد پاکستان گیا تھا وہ انجام نہیں دے پائے۔ البتہ وفد کے اراکین اپنے ساتھ محبت، خلوص، ہم آہنگی اور امن دوستی کی یادوں کے گلدستے لے کر لوٹ آئے۔

راولپنڈی سے مظفرآباد کے سفر میں مصنف پاکستان کی سیاسی اور قومی نقطہ اور نئی دی منشور کا قر□ مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ ایک المیہ سے کم نہیں کہ تقسیم ہند کے پورے سترہ سال بعد بھی پاکستان سیاسی طور پر کوئی مستحکم سسٹم آ□ تیار نہیں کر پایا ہے۔ تمام صوبائی علاقوں کو مرکز کے ساتھ ضم کرنا ایک مجبوری عمل □ آتا ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر سفرنامہ نگار کو فوری طور پر اپنی ریاست کی پچھلی سترہ سالہ سیاسی صورت حال کا خیال آتا ہے۔

صاف و سلیس اور عام فہم انداز میں لکھا گیا مختصر سفرنامہ ہند و پاک کی دوستی، دونوں طرف کے عوام کی ''محبت اور امن و آشتی کے پیغام کی کتاب ہے۔''

پشکن کے دیس میں (1986ء): پروفیسر جگن ناتھ آزاد: یہ سفرنامہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے روس (USSR) کے سفر کی روداد ہے جو 1986ء میں منظر عام پر آیا۔ پروفیسر آزاد کو روس کے لینن رائیٹر یو□ نے لینن کے یوم پیدائش کے موقعے پر منائے جانے والے قومی تہوار پر مدعو کیا تھا۔ روس میں انہیں دارالحکومت ماسکو کے علاوہ بھی کئی شہروں اور ریاستوں میں جانے کا موقعہ □۔ ایک شاعر، ادیب، فنکار اور اسکالر اور انقلاب پسند کی □ سے انہوں نے روس کو دیکھا۔ یہ تمام تفصیلات اس کتاب میں ملتی ہیں۔ یہ سفرنامہ 23 ابواب پر مشتمل ہے۔ مصنف نے جن جن

مقامات اور شہروں کا دورہ کیا ان کو الگ الگ ابواب میں لکھا ہے۔ جیسے لینن میوزیم میں چند لمحے لستائی کے گھر میں، کریملن اور لینن کا مقبرہ، ر کوروانگی، لیٹی کی ای جھلک، ر یونیورسٹی میں، لینن اٹ ای طاَ انہ، دوشنبہ کی ای جھلک، سووی را زیو جکستان، وغیرہ۔ کتاب اس وقت کے روس میں ہندوستان کے سفیر رکمار گجرال کے م منسوب ہے۔ جو روس و ہندوستان کے تعلقات کو مز خوشگوار بنانے میں ہمیشہ محور رہتے تھے۔ ہندوستان سے بے شمار لوگ روس مکانی کر کے آئے ہوئے تھے بہت سے طلباء تعلیم کے سلسلے میں یہاں موجود تھے۔ روس میں ہندوستانی تہذی وثقافت کی جھلک دیکھ کر انہیں مسرت ہوتی ہے۔ کئی یونیورسٹیوں میں اردو اور ہندی کے اسٹیٹ قائم تھے۔ جہاں روسی طلبہ ہندوستانی ن وادب اور تہذی وثقافت کو پڑھتے اور سمجھتے تھے۔ مصنف اپنے اکیس دن کے سفر میں بے شمار اموں میں شر اور مختلف جگہوں کے سفر اور دورے کے دوران نوٹس تیار کرتے رہے تھے۔ جسے بعد میں سفر مے کی صورت میں تشکیل۔ یہ اردو ادب میں روس کی سیاسی، سماجی، اقتصادی، جغرافیائی ر، تہذ وتمدنی حالات، ن وادب کے علاوہ روس میں ہندوستان اور ہندوستانوں کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ای بہترین کتاب ہے۔ یہ سفر مہ روس میں علمی وثقافتی مرا اور مقامات کے سفر کی روداد ہے۔ دہلی کے لم ہوائی اڈے سے سفر شروع ہے ماسکو (روس) سفر کے دوران جہاز میں گذرنے والی کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ بقول مصنف ان کا خواب تھا کہ وہ گی میں کبھی اس سرزمین کا دورہ کرے جہاں لینن جیسے لیڈر پیدا ہوئے ہیں۔ جس کی تحری نے عالم میں سرمایہ دارانہ م کا تختہ ہی ا تھا۔ ایسے قابل شخصیت کے وطن دیکھنے کی تمنا تھی اور یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا تھا۔ اپنے ت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''روس اور اس کا دارالحکومت ماسکو میرے لیے ہمیشہ سے ای خواب کی طرح رہے تھے۔ روس کے متعلق میں نے جتنا کچھ پڑھا تھا اس سے میرے علم میں اضافہ ہوا ہی تھا حیرت میں کہیں دہ اضافہ ہوا تھا۔ نپولین ایسے ی سپہ سالار کا روس پر حملہ اور روسی فوجیوں کے ہاتھوں اس کی عبرت ک شکست۔ ہٹلر کا روس پر پڑھائی اور نپولین سے بھی دہ ذ آمیز ئی د میں اشترا کی م حکومت کی د میں پہلی رتجربہ۔ یہ میرے اس خواب کے مختلف پہلو تھے جو میں اکثر دیکھا کر تھا۔ آ اس خواب کی تعبیر کا وقت آ اور طیارے کے کپتان نے اعلان کیا کہ ہم غزنی سے ر چکے ہیں اور تھوڑی میں روس کی

سرحد میں داخل ہونے والے ہیں تو میں نے اپنی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے □ کہ کہیں یہ بھی
کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں لیکن یہ خواب نہیں تھا حقیقت تھی۔ طیارے کی پلاسٹک سے
بند کھڑکی سے میں نے نیچے جھانکا۔ پہاڑوں کا ا□ لامتناہی سلسلہ حد نگاہ □ پھیلا ہوا □
□ ۔ یہ افغا□ ن کی سرزمین تھی۔ تھوڑی □ میں پتا □ کہ ہم روس کی سرزمین □ پرواز کر رہے
ہیں۔ اس وقت بھی □ کے سامنے پہاڑوں کا ا□ لامتناہی سلسلہ تھا۔ ویسے ہی پہاڑ تھے
ویسے ہی زمین تھی۔ دونوں علاقوں میں کوئی حدِ فاصل □ نہ آئی۔ یہاں اقبال کا یہ شعر ضرو□ د
آ□ ۔

جہاں راز □ آب و گل آفر□ م
تو□ ان□□ ر وز□ آفر□ ی

سو□ را□ زیو□ کے مہمان کی حیثیت سے اس یو□ کے آرام و آسائش کی تمام سہولیتیں میسر تھیں۔ روس
میں جتنے دن مقیم رہے سرکاری مہمان کی حیثیت سے اعلیٰ سہولیت، ہوٹل، گاڑی او□ جمان□ کی سہولیات میسر رہیں۔
روس میں قیام کے دوران اردو سے دلچسپی ر □ والے اور □ مت کرنے والوں سے □ قات ہوئی۔ ہر کوئی مصنف کو
اپنے اداروں میں تقریبات میں خطاب کے لیے مدعو کرتے۔ □ یو میں نشر کرنے کے لیے ان کا انٹرویو لیا □ ۔ ان کی
□ قات روس کے کچھ ایسی شخصیات سے بھی ہوئی جنھیں ہندوستان کی قدیم تہذ□ وثقافت□ ریخ وسماج، مذاہب اور
□ ن و بیان سے نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ ان موضوعات □ اس قدر تحقیقی کام کر رہے تھے۔ ایسے ہی ا□ □ قات کا
□ کرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہاں □ وفیسر ز□ اف سے □ قات ہوئی جو اردو، ہندی، فارسی، سنسکرت، انگر□ ی اور
□ ی خوب جا □ ہیں۔ انھوں نے □ کہ غیر ملکی □ نوں میں سے اردو ان کی محبوب □ ین
□ ن ہے۔ انھوں نے اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کی ہے اور ان کے تھیسس کا عنوان تھا''
انیسویں صدی کے شروع میں اردو □ 'میر امن کی □ غ و بہار'' کا انھوں نے روسی میں
□ جمہ کیا ہے جس کے دو□ □ چھپ چکے ہیں ۔۔۔۔۔۔۔'' اٹھارھویں صدی کے

ابتدائی دور کی ہندوستانی '' ان کی روسی میں ای تصنیف ہے۔ ای اور کتاب
LANGUAGES OF REFERENCE BOOK ON THE
INDIA, PAKISTAN , CEYLONE AND NEPAL پنچ س کی
لگا ر،محنت سے انھوں نے ہندوروسی ڈکشنری مرت کی جو دو ضخیم جلدوں میں 1974ء میں
چپ ۔''۸ے

روس کے کچھ علاقے خصوصاً لیٹی کے لوگ قدیم مذہب کے عقائ ر والے اپنے مذہب کو ہندو دھرم کے
ڑوں سے جوڑتے ہیں۔اس لیے مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے لیے سنسکرت پ لی اور ہندی ن میں لکھی ہوئی کتابیں
اور دیو مالائی واساطیری قصے کہانیوں کا مطالعہ کر کے اپنی مادری ن میں منتقل کر رہے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''اس نے لیٹی کی ریخ رھویں صدی شروع کی . لیٹی مختلف قبیلوں سے دتھا اور اس سے پہلے کے دو روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ قبائلی دور سے پہلے لیٹی کا ہندوستان کے ساتھ ای روحانی اور مذہبی تعلق رہا ہے۔ ہندوستانی دھرم یعنی ک دھرم (ک دھرم کا لفظ خود سیگما نے استعمال کیا) سے لیٹی صرف مت ہی نہیں تھا بلکہ یہاں اس دھرم کا پوری طرح عمل دخل تھا۔ یہاں کے دی ک دھرم کے ہی دی تھے ان کے مثیل تھے۔کسی perkons دیوی کا ذکر کرتے ہوئے سگما نے کہ یہ وہی دیوی ہے جسے ک میں را کہا ہے۔اس طرح سے متعدد دیوی دی وں کے م سے گن سنائے۔لکشمی دیوی اور لکشمی تہوار کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہ یہ تیوہار لیگوا تیوہار کے م سے بھی لیٹوا میں منای جا ہے۔یہ تیوہار ہر سال ہم اپنی قی،خوش حالی اور مسرت کے لیے۲۳جون کو مناتے ہیں۔شام کو ہم آگ جلاتے ہیں۔ یہ آگ ہون ہی کی ای صورت ہے اور یہ صبح جلتی رہتی ہے۔اس دن ہم اپنے قومی لباس پہنتے ہیں،ہلکی شراب پی ہیں، یہ وہی ہے جسے میں سوم رس کہا ہے۔''۹ے

بقول مصنف روس کے اشترا کی لوگ جن کے رے میں ی ت مشہور ہے کہ وہ لوگ ا،آسمانی قوت اور
مذہب سے ہو چکے ہیں۔ان میں مذہب سے محبت وعقیدت دیکھ کر وہ خود اپنی ذات سے ان کو مماثل کرتے ہیں اور

یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اگرچہ وہ ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے ہندو ہیں البتہ مطالعہ ان کا اسلام کا زیادہ ہے۔ یہ بات مطالعہ اقبالیات ہی کی دین ہے۔

اس سفرنامے کی نوعیت علمی، ادبی اور ثقافتی ہے اس لیے ابتدا سے اختتام تک علم و ادب، تہذیب و ثقافت اور سماجی زندگی کے پہلوؤں کی تفصیلات ملتی ہیں۔ سفرنامہ نگار کی قوتِ مشاہدہ، تجربات اور تبحرِ علمی کا ہی نتیجہ ہے کہ ہر ایک محفل و نشست جن میں انہوں نے شرکت کی اور ہر ایک ،مقامات جہاں جہاں انہوں نے سیر کی، کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ روس میں اکثر لوگ ہندوستان، ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی موسیقی کے دلدادہ ہیں۔ اس لیے مختلف یونیورسٹیاں اور ادارے ہندوروس تعلقات کو مزید مستحکم بنانے میں کوشاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال درج ذیل ہے:

> ''میں پروفیسر ڈی زا اور الیگزینڈر کی ہمراہی میں ہوٹل واپس آیا اور پروفیسر وکٹر زنے مجھے اُس کام سے آشنا کیا جو یونیورسٹی کی سطح پر لیٹویا میں ہندوستانی ادب کے بارے میں ہو رہا ہے۔ یہ تصور کا ایک اور روشن پہلو تھا جو میری نگاہوں سے اس وقت تک پوشیدہ تھا۔ پروفیسر وکٹر زنے بتایا کہ لیٹویا میں یونی ورسٹی کی سطح پر اور یونیورسٹیوں سے باہر ہندوستانی ادب سے متعلق جو کام ہوا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔
>
> کرشیا منیز: انھوں نے لیٹویا کے لوک گیت جمع کیے تھے۔ (شاید ہمارے دیوندر ستیارتھی کی طرح) ان گیتوں میں اس امر کے اشارے ملتے ہیں کہ آریہ ہندوستان میں لیٹویا سے گئے، ان گیتوں کو جمع کرنے کے علاوہ بھی انھوں نے ۱۸۵۶ء کے موضوع پر خاصا لکھا تھا۔
>
> آندریز پمپرس: یہ اپنی ایپک کے لیے مشہور ہے۔ اس کی ایپک میں ہندوستان ذکر ملتا ہے۔
>
> جان رائنس: مشہور عوامی شاعر جن کی ایک سو تیرھویں سالگرہ کا ذکر میں اس سے قبل کر چکا ہوں۔ یہ سنسکرت اور ہندو دھرم سے صرف متاثر ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے رگ وید کے معتدد حصوں کا لیٹوین میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔''[80]

مصنف ماسکو سے لیٹویا اپنے مترجم کے ساتھ جاتے ہیں۔ جہاں سوویت رائٹرز یونین کے ریجنل برانچ کی جانب سے انہیں مشہور ادیب جان رائنس کی سالگرہ کے موقع پر مدعو کیا گیا تھا۔ روس کے تمام مشہور ادیب، شاعر اور فن کاران کے استقبال کے لیے حاضر تھے۔ اس پروگرام میں انہوں نے اپنی ایک نظم سنائی جس کا مترجم روسی میں اس کا ترجمہ کیا

جاتا تھا۔لوگ ان کو انہماک سے سنتے رہے اور داد دیتے رہے۔جس سے مصنف کو روسی عوام کا علم وادب اور شاعری کے تئیں لگاؤ کا اندازہ ہوجاتا ہے۔اپنے تجربات کا اظہار کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''میں جب تقریر کر کے اپنی جگہ پر آیا تو سامنے کے ہجوم میں سے دو بچے، ایک لڑکی ایک لڑکا، پھولوں سے لدی دو ڈالیاں لے کے میرے پاس آئے اور انھوں نے وہ مجھے دے دیں۔ بچے خود پھولوں کی طرح تھے اور جب انھوں نے مجھے پھول پیش کیے تو میرا دل مسرت سے لبریز ہوگیا۔ میں نے ان کو پیار کیا اور وہ پھول یانس رائنس کے مجسمے پر چڑھا دیے۔ بچے بہت خوش ہوئے۔اس کے بعد متعدد بچوں نے اپنے اپنے پھول لے کے مجھے دیے اور وہ تمام پھول میں نے یانس رائنس کے مجسمے پر چڑھائے۔اس کے بعد میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب لڑکوں، لڑکیوں، مردوں اور عورتوں کا ایک ہجوم ہاتھوں میں قلم لیے یانس رائنس کے مجموعہ کلام کا پہلا ورق نکال کے میرے سامنے آگیا۔سگمانے بتایا کہ یہ لوگ آپ کے آٹوگراف لینا چاہتے ہیں۔''۸۱

سفرنامہ نگار روس کے دیگر تاریخی وعوامی تفریحی مقامات اور عجائب خانوں کا دورہ کرتے ہیں۔انہیں روس کے لوگوں کو اپنی تاریخ وسماج اور تہذیب سے عشق ولگاؤ دیکھ کر حیرت کے ساتھ ساتھ مسرت ہوتی ہے۔اپنے وطن سے محبت کا ثبوت ہے کہ جنگ آزادی کے مجاہدین کی قبروں پر آج بھی زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔لوگ پھول لے کر آتے ہیں۔اس سفرنامے میں روس کی تاریخ، حکومتوں کے عروج وزوال، زار جیسے طاقتور حکمرانوں کے تختہ پلٹ جانے، اشتراکی نظام کی بنیاد وارتقاء اور دیگر تاریخی واقعات کو بیان کیا ہے۔سفرنامہ نگار ایک عجائب خانے کا نظارہ کر کے اپنے مشاہدات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' سب سے پہلے ہم ونٹر پلیس میں پہنچے۔یہ پیٹر اعظم کا محل تھا جو اب لینن گراڈ کے ہرمیٹج عجائب گھر کا ایک حصہ ہے۔یہ عجائب گھر لینن گراڈ کا سب سے بڑا عجائب گھر ہے اور دنیا کے سب سے بڑے پانچ عجائب گھروں میں ایک ہے۔اس میں طویل وعریض کمروں کی تعداد دو ہزار ہے اور نمائش کی چیزوں کی تعداد پانچ کروڑ۔عجائب گھروں کے گارڈوں کا کہنا ہے کہ ہر شے کو آپ صرف آدھے منٹ کے لیے دیکھیں اور ساتھ گھنٹے روزانہ دیکھتے رہیں، ہفتے اور اتوار

سمیت تو تمام اشیا کو دیکھنے کے لیے نو برس کی مدت درکار ہے۔ اب آپ اندازہ کرلیں کہ میں نے ایک گھنٹے میں کیا دیکھا ہوگا۔ ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکا۔ تصویریں، مجسمے اور مصنوعات نہ جانے کہاں سے کہاں تک سجی ہوئی رکھی ہیں۔ پکاسو، وان گاگ اور مائیکل انجو کے نتائج موقلم دیکھے۔ مائیکل انجلو کا بنایا ہوا مجسمہ بھی۔ میں ... متعدد کمروں میں چلتے چلتے تھک گیا تو میں نے اولگا سے کہا کہ اب مجھے اس عجائب گھر کے اس حصے میں لے چلو جو زار روس کا ڈرائنگ روم تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ کمرہ کیا تھا، ایک عبرت کا مرقع تھا، اولگا نے بتایا کہ ... لینن کی فوجیوں نے سینٹ پیٹرس برگ کو گھیرے میں لیا تو زار کی حکومت اسی کمرے۔ ڈائنگ حال۔ میں منتقل ہوگئی اور اس کمرے میں اس حکومت کے تمام ارکان کو گرفتار کیا گیا۔ اس وقت رات کے دو بج چکے تھے۔ گرفتاری دو بج کر دس منٹ پر عمل میں آئی اور ڈائنگ حال کے دیوار پر آویزاں کلاک عین اسی وقت بند کر دیا گیا۔ اس وقت وہی کلاک میرے سامنے تھا اور اس وقت دو بج کے دس منٹ کا وقت تھا۔ اس کلاک پر یہ وقت ہمیشہ کے لیے ٹھہر چکا ہے اور پیٹرس برگ کے زوال اور عوامی طاقتوں کی فتح کی داستان سنا رہا ہے۔''۸۲؎

سفرنامہ نگار ماسکو سے ہزاروں میل دور تاجکستان کے دارالحکومت دوشنبہ میں سویت رائٹرز یونین کی دعوت پر پہنچتے ہیں۔ موصوف کی خاطر خواہ مہمان نوازی کی جاتی ہے۔ کھلے دل سے ان کا استقبال ہوتا ہے۔ تاجکستان کے ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور صحافیوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ تاجکستانی زبان فارسی ہوتی ہے۔ اس لیے موصوف کو بھی اپنے تقاریر و گفتگو فارسی میں کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ وہ تاجکستان کے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ وہاں کے ادیبوں و فنکاروں کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں کے لیے حکومت اخراجات برداشت کرتی ہیں اس لیے یہاں زبان و ادب تیزی سے فروغ پا رہی ہے۔ تاجکستان میں اردو زبان بولنے اور سمجھنے والے بہت ملے۔ خاص کر وہاں ہندی فلمی نغموں کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ تاجک شاعر کی زبانی اردو شاعری سن کر سفرنامہ نگار اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندوستانی ادیبوں سے بات پھر ... کا رخ پھر بیدل کی شاعری کی طرف ہو گیا اور آقائے امین جان شکوہی نے جنھیں بیدل کے بہت سارے اشعار یاد تھے بیدل کا ایک شعر پڑھا

نہ گانی در جگر خارا ہ ودیہ سوزن ا ہ

ہ ہ قی ا ہ در پیراہن ما سوزن ا ہ

میں نے بیدل کا قریب قریب اسی موضوع کا یہ شعر پڑھا

نہ گی دہ ونم افتاد بیدل چارہ نیست

شاہ زیستن شاہ زیستن

ابھی میں نے پہلا مصرعہ ہی پڑھا تھا کہ تمام حاضرین مجلس نے دوسرا مصرعہ پڑھ دیا۔''۸۳؎

وہ جکستان کے لوگوں کی مہمان نوازی اور خوش دلی سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔انہوں نے وہاں کی تہذیب وتمدن، زبان وادب اور ثقافت کا کم وقت میں گہرا مشاہدہ کیا ہے۔انہیں وہاں کی تہذیب میں ہندوستانی رنگ کئی مقام پر نظر آتا ہے۔روس کے اس میں جو دور دراز علاقہ اور لینڈ لوک ہے کہا جاتا ہے وہاں ہندوستانی تہذیب کے اثرات ان کے لیے ایک غیر یقینی اور حیران کرنے والی بات تھی:

> ''ہم سیر کے خیال سے دس پندرہ میل اور آگے نکل گئے۔کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں راستے میں آئے۔تمام عورتوں کو شلوار قمیض میں ملبوس دیکھا بعض نے سروں پر دوپٹے بھی اوڑھ رکھے تھے۔''قمیص اور شلوار'' میں ملبوس عورتیں اکا دکا میں دوشنبہ میں بھی نظر آئی تھیں۔اور پتہ یہ چلا قمیص، شلوار اور دوپٹہ ہی جکستان کی عورتوں کا قومی لباس ہے۔اسکرٹ صرف شہروں تک محدود ہے۔دیہات میں عورتیں قمیص شلوار ہی پہنتی ہیں دوپٹے کا رواج بھی عام ہے۔ اور اس اعتبار سے یہاں کی عورتیں پنجاب اور کشمیر کی عورتوں کی طرح نظر آتی ہیں۔''۸۴؎

اس سفرنامے میں USSR کی تاریخ، سماج، معاشرہ، تہذیب وتمدن، سیاسی وسماجی روایات، متحدہ سوویت کا سیاسی نظام، مختلف ریاستوں کی طرز معاشرت کی جھلک ملتی ہیں۔سوویت یونین جیسے وسیع وعریض ملک کے مختلف متحدہ حکومتوں کے معاشرتی نظام کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے۔یہاں کے جغرافیائی اور ارضی خصوصیات وکیفیات اور مناظر قدرت کی بھی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے۔سوویت یونین کے برف سے ڈھکی پہاڑوں اور چوٹیوں، میدانوں، مرغزاروں، چراگاہوں، کھیت کھلیانوں اور جکستان کے پھل وثمر سے لدے باغات اور باغوں کی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔

من جملہ اس سفرنامے میں روس کے مناظر قدرت، دریاؤں، آب و ہوا سے لے کر سپر مارکیٹ اور کمرشل مراکز، اور دور دیہات کے پاس سے شہروں کے سپر مارکیٹ میں آنے والی سبزیوں، ریلوے اسٹیشن، یونیورسٹیوں، ادبی تنظیموں اور ثقافتی اداروں غرض ہر شے کے بارے میں مصنف نے جو کچھ دیکھا ہے اسے بیان کیا ہے۔ فن و تکنیک اور زبان و بیان میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا اپنا ایک منفرد اسلوب و انداز ہے جو اس سفرنامے میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ نہ صرف ایک معلوماتی سفرنامہ ہے بلکہ روس اور وسط ایشیا سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لیے ایک معلوماتی دستاویز ہے۔

کولمبس کے دیس میں (1987ء) پروفیسر جگن ناتھ آزاد: ''کولمبس کے دیس میں'' پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا سفرنامہ امریکہ و کینیڈا ہے۔ یہ سفرنامہ بھی پروفیسر موصوف کے دیگر سفرناموں کی طرح علمی و ادبی نوعیت کا سفرنامہ ہے۔ انہیں 1979ء میں ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی شکاگو کی جانب سے ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے دعوت نامہ موصول ہوا۔ یہ ان کا علم و ادب سے لگاؤ ہی تھا کہ اس پیرانہ عمری میں بھی سات سمندر پار مغرب کے سفر کے لیے آمادہ ہوئے۔ تقریباً ایک ماہ کی مدت تک وہ امریکہ، کنیڈا اور لندن میں مقیم رہے۔ اس دوران وہ اپنے متعدد دوستوں کے ہاں مہمان بن کر رہے۔ وہ ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی کے وائس چانسلر وسیع اللہ جو کہ مصنف کے دوست اور قدردان تھے، کی دعوت پر شکاگو گئے تھے۔ اس سفرنامے کے مطالعہ سے ایک اہم پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ مغربی ممالک میں مشرقی علوم اور اردو کے قدردان بھی جابجا موجود تھے اور اردو کے باقاعدہ کورسس پڑھائے جاتے تھے۔ شعر و شاعری کے قدردان بھی موجود تھے جو شعر و ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دوران قیام مختلف مشاعروں اور محفلوں کا انعقاد کیا جاتا رہا اور میزبان اور مندوبین پروفیسر جگن ناتھ آزاد جیسے عالم و فاضل سے، جنھوں نے اردو کو مذہب سے نہیں بلکہ تہذیب و تمدن سے آہنگ کیا، زیادہ سے زیادہ مستفیض ہونا چاہتے تھے۔

شکاگو میں جو چیز انہیں سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ وہاں کی یونیورسٹیاں ہیں۔ شکاگو میں ہندوپاک کے کئی علمی و ادبی شخصیات سے ملاقات ہوتی ہیں۔ جن کے ذخیرۂ علم و ادب اور ذاتی لائبریریوں میں کتابوں کو دیکھ کر انہیں حد درجہ مسرت ہوتی ہے۔ انہیں یہ جان کر از حد خوشی ہوتی ہے کہ مشرقی علماء و فضلاء سے مغربی طلبہ بھی فیضیاب ہو رہے

ہیں۔ایسٹ ویسٹ یونیورسٹی کا پورا نقشہ، وہاں کے نظام تعلیم، انتظامی امور و مسائل، معیار تعلیم، شعبہ جات اور اسٹیڈیم وغیرہ دیکھ کر انہیں بہت خوشی ہوتی ہے۔

اس سفرنامے میں ایک اچھوتی بات پائی جاتی ہے وہ ہے محبت اور اخلاص۔ سرحد، حد فاصل، جنگ، تقسیم، ظلم و ستم، خوف و ہراس اور نفرت سے بلند اور پاکیزہ شئے محبت اور انسانیت کی ہوتی ہے۔ سفرنامہ نگار کا تعلق اُس نسل سے ہے جس نے تقسیم ہند کے کربناک اور خون آلود ماحول میں سانس لی تھی۔ اس دور میں نفرت و خوف کا کہرام مچا ہوا تھا لیکن مصنف کی انسان دوستی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے کہ وہ ہر قوم و ملک کے لوگوں کو عزت دیتے ہیں۔ اور ہر قوم و مذہب کے لوگ دل سے ان کی عزت اور قدر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں تقریباً ایک ماہ تک ان کا قیام رہا اور قیام و طعام کا سارا انتظام پاکستان کے لوگ ہی کرتے رہے۔ اور جہاں جہاں وہ جاتے علمی اور ادبی محفل سرگرم رہتی :

> ''رات کا کھانا ڈاکٹر خورشید ملک کے یہاں تھا۔ اور مجھے اب انہی کے یہاں منتقل ہونا تھا۔ چنانچہ میں اپنے ساز و سامان سمیت اسد حسین اور دوسرے دوستوں کے ہمراہ یہاں پہنچا۔ ڈاکٹر خورشید ملک کی پُر تکلف دعوت کے بعد ایک محفل شعر منعقد ہوئی جس میں میں نے اپنا کلام سنایا۔ نہ جانے کس سلسلے میں لاہور اور کراچی کے احباب کا ذکر چھڑ گیا اور پھر بات پہنچی تیری جوانی تک، پطرس بخاری، عبدالمجید سالک، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حکیم فقیر، خوشی محمد، آغا حشر کاشمیری اور علامہ اقبال کی باتیں جان محفل بن گئیں اور میں دیر تک اس ماحول میں گم رہا جو میرے لیے دیدہ بھی تھا اور شنیدہ بھی۔''۸۵

یہ بات سفرنامہ نگار اپنے اور برصغیر کے لوگوں کے لیے قابل فخر سمجھتے ہیں کہ مغرب میں بھی مشرقی علوم کے قدر دان موجود ہیں۔ جو ہندوستانی تہذیب و تاریخ اور فن و ادب کے مطالعے میں سرگرداں ہیں۔ لوگ مشاعروں اور ادبی نشستوں میں بڑھ چڑھ کر شرکت کرتے ہیں۔ یہ ایک خوشگوار مشاہدہ تھا کہ ہندوستان و پاکستان سے جو لوگ مغرب منتقل ہوئے ہیں وہ اپنے جڑوں سے وابستہ ہیں۔ مشرقی تہذیب و تمدنی اور علمی و ادبی تنظیمیں بنائی گئی ہیں جو کافی متحرک ہیں۔ اس تجربہ سے سفرنامہ نگار کافی متاثر ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مہر رضوی نے کہا کہ آج شام کو میں آپ سے WONX ریڈیو پر انٹرویو لے رہی ہوں۔ اس سلسلے میں چاہا تھوڑی سی بات آپ سے کرلوں۔ اسی بات چیت میں ان کے ساتھ انٹرویو

کے موضوع کا تعین ہو۔ کہنے لگیں کہ ہم ہندوستانی اور پاکستانی اس وقت امریکہ میں تمدن
کے ایک عجیب وغریب پہلو سے دوچار ہیں۔ ہندوستانی پاکستانی تہذیب کا امریکی تہذیب
کے ساتھ ربط ضبط آج کل کی نسل میں موجود ہے یہ کل کی نسل میں شاید نہ رہ سکے گی۔ میں نے
کہا یہ بہت ہی اہم موضوع ہے اور اس پر ٹی وی کے انٹرویو میں کھل کے بات ہونی چاہیے۔ تو
اس صورت میں ہندوستانی پاکستانی اپنے تشخص کی پہچان کیسے کرسکیں گے۔ تشخص کو قرار
رکھنے کے لیے اپنی تہذیب کی جڑوں کو سلامت رکھنا ضروری ہے۔ ان جڑوں کی آبیاری
ضروری ہے ورنہ جڑیں سوکھ جائیں گے اور اس صورت میں پودے شجر کے تشخص کی شناخت
کی بات بے معنی ہوگی۔'' ۸۶

اس سفرنامے میں شکاگو، واشنگٹن، نیویارک، کنیڈا، لندن جیسے شہروں میں منعقد ہونے والے مشاعروں اور ادبی نشستوں کے بارے میں تفصیلات درج ہیں۔ ساتھ ہی ان ترقی یافتہ شہروں کے عوام، وہاں کے دریاؤں، جھیلوں، سرسبز میدانوں کے سکیچ کے ساتھ سائنس وٹکنالوجی اور ترقی یافتہ شہروں کے ایجادات وسہولیتوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایک اقتباس دیکھئے:

''اس میوزیم میں ایک اور عجیب وغریب چیز دیکھی اور یہ اپولو ۸ کا وہ کیپسول تھا جو چاند سے
ہوکے زمین پر واپس آیا تھا۔ یہ سفر واقعہ ۲۱ دسمبر ۱۹۶۸ء سے ۷ ستمبر ۱۹۶۸ء تک کی مدت
میں رونما ہوا تھا۔ یہ نیل آرم اسٹرانگ اور اس کے ساتھی چاند پر پہنچ کر وہاں سے علم کا
خزانہ اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ چاند پر جانے والی بگھی کا وہ اصل نمونہ بھی دیکھا جس میں
نیل آرم اسٹرانگ اور اس کے ساتھیوں نے چاند پر جانے کی تاریخ حاصل کی تھی اور وہ
اسپیس سوٹ بھی دیکھے جو پہن کر یہ لوگ چاند پر گئے تھے۔'' ۸۷

مصنف کے دوسرے سفرناموں کی طرح اس سفرنامے کی نوعیت بھی علمی وادبی ہے اس لیے تعلیمی اداروں، کتب خانوں اور دوسرے ادبی مراکز کے بارے میں جابجا لکھا ہے۔ انہیں شکاگو یونیورسٹی میں چند لمحے رہنے کا موقعہ ملتا ہے۔ ایک ادیب کے اس لمحے کا مشاہدہ دیکھئے کہ کس طرح یونیورسٹی کے ماحول کا نقشہ ابھارا ہے:

''شکاگو کے آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں راجستھانی آرٹ کے متعدد نمونے دیکھے۔ جے پور کا

آرٹ اس میں بہت نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی میواڑ کا فن تصویر بھی موجود تھا۔ رامائن کی تصویریں خاصی دلکش تھیں۔"۸۸

الغرض اس سفرنامے میں پروفیسر موصوف نے فن سفرنامہ کے تمام لوازمات کو ملحوظ رکھ کر اپنے روداد سفر کے نوٹس کو جو وہ روزانہ لکھتے تھے ترتیب دیا ہے کہ گھر سے رخت سفر باندھنے سے واپس دہلی پہنچنے تک کے سفر کو داستانوی انداز میں پیش کیا ہے۔ زبان و بیان پر قدرت، صنعتوں اور مثالوں کا استعمال تو ان کا ہنر ہے۔ جو ان کی تحریروں میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ علمی و ادبی سفرنامہ جموں و کشمیر کے ادبی ذخیرے میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

"انجمن آرزو" پروفیسر حامدی کشمیری: یہ سفرنامہ پروفیسر حامدی کشمیری کا سفرنامہ پاکستان ہے۔ 1986ء میں حکومت ہند کی وزارت تعلیم اور ترقی اردو بیورو کی جانب سے پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کے ساتھ ایک میٹنگ کے لیے ایک اعلیٰ سطحی وفد نے پاکستان کا دورہ کیا۔ وہ بھی اس وفد کے رکن تھے۔ یہ تقریباً ایک ہفتے کا سفر تھا۔ اس سفر کی روداد پر بنی یہ سفرنامہ 1988ء میں کتابی صورت میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس سفر میں ان کی اہلیہ مصرہ مریم بھی ساتھ تھیں اور وفد کے دیگر اراکین میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، کنور مہندر سنگھ، مسعود حسن اور فہمیدہ ریاض وغیرہ تھے۔ سفرنامے کا آغاز دہلی سے ہوتا ہے جہاں پاکستان کے لیے ویزا حاصل کرنے میں آنے والی دشواریوں، کاغذات کی جانچ پڑتال اور پاکستان ایمبیسی میں پیش آنے والے مسائل وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ مزید ایمبیسی کے کارندوں کی لاپرواہی، تساہل اور بیجا مداخلت کے بجائے ملک کے نمائندہ ادیبوں کو جنہیں ہائی پروٹوکال حاصل ہے۔ پیش آنے والی مشکلات اور رکاوٹوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس سارے صبر آزما مراحل سے گذر کر دہلی سے بذریعہ جہاز وہ کراچی پہنچتے ہیں۔ کراچی ایئر پورٹ پر جس انداز میں پاکستان میں ان کے میزبان ان کا استقبال کرتے ہیں اور جس تپاک سے ادیب ایک دوسرے سے ملتے ہیں اس منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وی، آئی، پی لاونج میں داخل ہوتے ہی میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کا، جن میں خواتین قلمکار بھی شامل تھیں ایک بڑا مجمع ہمارے استقبال کے لیے جمع تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کراچی کے سارے سرکردہ قلمکار

> ئے پورٹ پر جمع ہو چکے ہیں اور ادیبوں کے علاوہ ہندوستانی سفارت خانے کے قونصلر اور د
> اہلکار بھی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کر رہے تھے ۔ بیدی صاحب نے وفد کے اراکین کا
> تعارف کرایا میں جمیل جالبی کے علاوہ جمیل الدین عالی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور محسن بھوپالی
> سے گلے ملے ۔ بیدی صاحب کے علاوہ ونر صاحب اور جگن ناتھ آزاد سے یوں مل
> رہے تھے جیسے آشنا آشنا سے ملتا ہے۔''۸۹؎

چونکہ پروفیسر حامدی کاشمیری ایک مدرّس، شاعر، ادیب، نقاد کے علاوہ ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ ان کا افسانوی اور شاعرانہ انداز سفرنامے میں جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں ۔ انہوں نے اس سفر کے تمام واقعات اور نکتوں کو سلیقہ مندی سے افسانوی انداز میں سمویا ہے۔ دوران سفر پیش آنے والے واقعات اور مناظر اور ان محفلوں اور نشستوں کی جزئیات نگاری بھی ماہرانہ انداز میں کی ہے ۔ مندوبین اور انتظامیہ کی طرف سے استقبال اور میزبان ملک کے ادیبوں سے ملاقات کے ایک ایک واقع کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ ان کی جزئیات نگاری اور منظر نگاری کا انداز ہے کہ کس طرح وہ عام سی آنے والی چیزوں میں بھی جان پھونک دیتا ہے۔ اپنے کمرے کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انتہائی خوبصورت اور آراستہ پیراستہ کمرہ' مریم نے سامان کا جائزہ لے کر اٹیچی کھول دی۔
> میں ایزی چیئر پر بیٹھ کر ستانے لگا اور کمرے کی آرائش اور خوبصورتی کو دیکھنے لگا۔ فرش پر نرم
> وگداز قالین' بیڈوں پر قیمتی پھولدار بیڈ کور' سرہانے ٹیلی فون' ٹی وی' ریڈیو' اے سی' بیڈ سائیڈ لیمپ'
> ایک طرف خوبصورت شیڈ میں قدم آدم لیمپ، ڈرائنگ ٹیبل پر ٹوکری میں تازہ
> پھل' سیب' امرود' انگور' کیلے، تازے اور چکوسامنے، فائل کور میں دستیاب تھا۔''۹۰؎

یہ سفرنامہ دراصل علمی وادبی نوعیت کا سفرنامہ ہے اس لیے عموماً اس میں علم وادب، شعروشاعری، تحقیق وتنقید، صحافت اور دونوں ملکوں کے مابین علمی وادبی رواج اور تعلقات کے بارے میں تفصیل ملتی ہے۔ ان کے سفر کا مقصد ہی یہی تھا کہ ہند و پاک کے درمیان علمی وادبی تعلقات مستحکم ہوں ۔ دونوں ملکوں میں یکساں نصاب تشکیل دینے، ایک دوسرے کے نظام تعلیم کا مشاہدہ کرنے، دونوں ممالک کے ماہرین تعلیم، دانشور اور ادیبوں کی تخلیقات کو سامنے لانے اور ایک ادبی اور علمی مفاہمت اور امن وآشتی اور دیگر مسائل پر گفت وشنید کرنے کی غرض سے اس وفد نے یہ سفر اختیار کیا

تھا۔اس وفد میں ہندوستان کے خصوصاً اردو کے ادیب ودانشوروں نے شرکت کی تھی۔وفد کے صدر کے بیان کا حوالہ دیتے ہوئے اس وفد کے دورۂ پاکستان کے اغراض ومقاصد کو یوں بیان کرتے ہیں:

''ہم جب بھی پاکستان آئے ہیں تو ہمارا اول وآخر مقصود یہ ہوتا ہے کہ ہم ایسی فضا پیدا کریں۔ جس سے دونوں ملکوں کے عوام بالعموم اور اہلِ قلم بالخصوص ایک دوسرے کے اور قریب آسکیں۔انہوں نے کہا کہ ہمیں بہت خوشی ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان ہماری میزبانی کے فرائض انجام دے رہی ہے۔بیدی صاحب نے کہا کہ دونوں ملکوں کے درمیان ادیبوں اور شاعروں کے دوروں سے نہ صرف تعلقات کو بہتر بنانے میں بلکہ اردو ادب کو فروغ دینے میں بھی مدد ملے گی۔''[۹۱]

اس وفد کے اعزاز میں درجنوں تقریبات منعقد ہوتے ہیں،مشاعرے اور محفلیں جمتی ہیں۔ان کی موجودگی میں ہندوپاک کے پچاس ہزار سے زائد کتابوں کی رسم اجرائی رونمائی ہوتی ہے۔کمیٹی کی اہمیت اور ہندوپاک کی تہذیبی وتمدنی تعلقات اور سفارتی رشتے کی نشاندہی کا اندازہ صدر پاکستان کے الفاظ سے ہوجاتا ہے۔دیکھئے:

'' بھارتی ادیبوں کی پذیرائی کرنے پر انھوں نے دلی مسرت کا اظہار کیا۔انہوں نے کہا'' ادب تہذیبوں کی سفیر ہوتی ہے۔اس لیے ہم مہمانوں کی آمد کو سفارتی تعلق کی ایک کڑی سمجھتے ہیں۔بھارتی ادیبوں کا یہ دورہ تہذیبی دیرپا تعلق کا دورہ ہونے کی اہم علامت ہے۔''[۹۲]

اس سفرنامے میں رودادِ سفر کو ملاقاتوں،سیمناروں،مشاعروں،میٹنگوں،ادبی نشستوں تک محدود نہ رکھتے ہوئے اُن تمام واقعات کو سمیٹا ہے جو دوران سفر درپیش آئے ہوں۔اُن مقامات کی تصویر کشی کرتے ہیں جہاں وہ گئے۔ انہوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ صرف دو ہفتوں کا سفر تھا۔سرکاری وفد کے لیے پروگرام کا انتظام اور شیڈول بھی ایک منظّم اور منصوبہ بندی کے تحت ہوا ہے۔کسی کو ذاتی طور پر کہیں گھومنے کی اجازت نہیں ہوتی۔اس لیے دوران سفر جن جن مقامات پر گئے وہاں سرکاری رضامندی کے ساتھ اور سکیورٹی کے ساتھ جانا پڑتا تھا۔جہاں جہاں گئے،جن جن چیزوں کو دیکھا ان پر طائرانہ نظر جاتی ہے۔یہ ان کے گہرے مشاہدے کا نتیجہ ہے کہ موہنجوڈارو جیسے تاریخی رقدیمہ کو دیکھ کر اپنے تاثرات ومحسوسات کو تاریخ کی روشنی میں واضح کرتے ہوئے اس کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔اقتباس دیکھئے:

''پانچ ہزار سال قبل کے تہذیب و معاشرت۔ یہ کھنڈرات کراچی سے ۳۵۰ میل کی مسافت پر وادی سندھ میں واقع ہیں اور قدیم ترین انسانی بستی کے آثار ہیں' ہم اس قدیم ترین شہر کو حد درجہ اشتیاق سے دیکھتے رہے۔ گائیڈ سمجھاتا رہا۔ عمارتیں، دیواروں، عبادت گاہوں اور گلی کو دیکھ کر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شاہی خاندان کا علاقہ ہوگا۔ محلات کے بیچوں بیچ سڑکیں بنی ہیں۔ دیواریں پکی اینٹوں کی ہیں اور مکانوں اور رہائش گاہوں کا ایک طویل سلسلہ ہے سڑکوں اور کوچوں کے ساتھ اینٹوں کی بنی ہوئی نالیاں ہیں۔ عمارت کے بیچوں بیچ ایک بڑا اسا تالاب ہے جو غالباً مذہبی رسوم کی ادئیگی کا کام آتا تھا محلقہ مکانوں میں پیشوا یا افسر اعلیٰ رہتے ہوں گے۔ ایک کا عکس ہال ہے سارا علاقہ اونچے ٹیلوں پر آباد ہے۔ مکانات یک منزلہ بھی ہیں اور دو منزلہ بھی۔ مکانوں کے ساتھ غسلخانہ اور ڈرینج سسٹم بھی ہے پانی کے لیے کنویں استعمال ہوتے تھے چنانچہ کھدائی سے ۴۰۰ کنویں نکلے ہیں۔ موجودہ صدی میں جان مارشل نے ۱۹۲۲ میں اس شہر کو دریافت کیا ہے۔'' ۹۳

''انجمن آرزو'' میں آنکھوں دیکھے مشاہدات و تجربات کو سمند کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق قلمبند کیا گیا ہے۔ ٹکسیلا کے قدیم شہر کو دیکھ کر اس زمانے کی تاریخ، سماج اور تہذیب کو بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''ٹیکسلا آدھ گھنٹے میں پہنچ گئے۔ میوزیم کو دیکھا۔ اس کی کھدائی سے نکلا ہوا ساز و سامان شیوکیسوں میں محفوظ ہے۔ مورتیوں کی تعداد خاصی ہے۔ زیادہ تعداد گوتم بدھ کی مورتیوں کی ہے۔ ان کے علاوہ سونے چاندی کے زیورات' کانچ اور ہاتھی دانت کی چوڑیاں' نگینے والی انگوٹھیاں، سرمہ کی سلائیاں، مونگا اور فیروزہ تانبے اور مٹی کے ظروف، ملبوسات، سامانِ حرب وغیرہ۔'' ۹۴

انجمن آرزو میں سفرنامہ نگار کی تنقیدی نظریہ اور ادبی زاویہ نگاہ کا اندازہ واضح ہوجاتا ہے۔ ان کی شاعری، تنقیدی اور افسانہ نگاری تینوں میدان میں ان کی بہترین اور وجودیت پائی جاتی ہے۔ انہیں اکتشافی تنقید کا موجد قرار دیا گیا ہے۔ وہ ادب پارے اور فنکار کو بدلتے وقت کے تقاضوں کے ساتھ ادبی روایت کو بھی قائم رکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ دور حاضر میں انسان اپنی روایتی قدروں کو حاصل کرنے میں خود کو نفسیاتی الجھنوں میں گرفتار پاتا ہے۔

روایت سے رابطہ ہی آگے کی راہیں متعین کرتا ہے۔یعنی دورِ حاضر کے تیز رفتار ترقی پذیر دور میں انسان اپنے آپ کو اس زمانے کے ساتھ چلنے کی کے لیے روایت کی شمع لے کر ہی راہنمائی حاصل کرسکتی ہے۔سفر کے دوران جتنے بھی سیمنار ہوئے ان کا موضوع گفتگو اکتشافی تنقید رہا۔

سفرنامہ نگار نے اپنے دو ہفتے کے سفر کے ایک ایک واقعہ، ہر شے، جگہ، ملاقات و مکالمات کو بیان کیا ہے۔ پاکستان میں ان کے میزبان کے علاوہ بہت سے ادیب، فنکار اور قلمکار اور کشمیری افراد ان سے ملاقات کے لیے آتے تھے۔ان کا انٹرویو لیا گیا۔اس وفد سے صدرِ پاکستان نے خصوصی ملاقات کی۔اور دونوں ملکوں میں امن اور خیر سگالی کو یقین بنانے کی اپیل کی۔

ہندوستان کی طرف سے ملک کے اردو کے بہت بڑے ادیب ودانشور کے گروہ کو پاکستان بھیجا گیا تھا۔'وفد' کا مقصد دونوں ملکوں کی تہذیب وتمدن اور نظامِ تعلیم کی صورت حال کو دیکھ کر اسے معیاری، اعلیٰ اور موجودہ دور کے ساتھ جوڑنے کا تھا اور دونوں ملکوں کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانا تھا۔سفرنامے کے مطالعہ سے اندازہ ہوجاتا کہ کس قسم کی آرام و آسائش میسّر تھی لیکن افسوس کی بات تو یہ تھی کہ کروڑوں روپئے خرچ کر کے وفد بھیجنے کے بعد بھی اس طرف کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا۔

حامدی کاشمیری اس مختصر سے سفر میں جناح کے مزار پر جاتے ہیں۔جو فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔جس کو دیکھ کر حامدی کاشمیری متاثر ہوجاتے ہیں۔حامدی کاشمیری پاکستان کے دورے پر جائیں اور مزار اقبال کی زیارت نہ کریں۔ایسا کیسے ہوسکتا تھا کاشمیری ادیب ہونے کی حیثیت سے وہ اس عظیم شاعر سے وہ والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔علامہ اقبالؒ بذات خود کشمیری النسل تھے۔اس سے اہلِ کشمیر کو اُن سے خاص اُنسیت اور لگاؤ ہے۔ظاہر ہے اس وقت میں اُس عظیم شاعر کو خراج عقیدت ادا کرتے وقت جذبات کا ایک سمندر امنڈآنا لازمی تھا۔اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے وہ یوں لکھتے ہیں:

> ''ہم نے شاہی مسجد لاہور، ہیرا منڈی، مینار پاکستان اور وہ جلسہ گاہ دیکھی جہاں ابوالکلام آزاد، نہرو، اور جناح عظیم اجتماعات سے خطاب کر چکے ہیں۔فلسفہ قلعہ لاہور کے بعد مزار اقبال پر پہنچے۔مزار کی زیارت کرتے ہوئے میں بہت جذباتی ہوگیا۔آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔ ہم نے فاتحہ خوانی کی۔ یہ سوچ کر میرا دل احساس فخر سے جھوم اٹھا کر یہاں برصغیر کا عظیم

دانشور، عالم، مفکر اور شاعر مدفون ہے جو کشمیر کا فرزند ہے اور کشمیر النسل ہونے پر نازکرتا ہے۔''۹۵

من جملہ یہ ایک بہترین سفرنامہ ہے۔اگرچہ یہ اپنے اغراض و مقاصد میں ایک خاص کام سفر کی روداد ہے۔البتہ سفرنامہ نگار کے مشاہدات و تجربات، فن سفرنامہ نگاری، اسلوب و تکنیک اور زبان و بیان کے علاوہ علمی اور ادبی اعتبار سے ایک بہترین سفرنامہ ہے۔

یہ صبح ضرور آئے گی (1997): کشمیری لال ذاکر: اردو اور ہندی کے مایہ ناز ادیب کشمیری لال ذاکر جموں و کشمیر کے ادبی حلقوں میں ایک اہم اور معتبر نام ہے جنہوں نے جموں و کشمیر کی سرزمین، یہاں کی مٹی اور عوام کو ہمیشہ اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کا یہ سفرنامہ ''یہ صبح ضرور آئے گی'' بقول ان کے ''مادر وطن پاکستان'' کے دورہ پر مشتمل ہے۔افسانوی انداز اور اپنے اعلے طرز میں تحریر کردہ یہ ایک علمی و ادبی نوعیت کا سفرنامہ ہے۔انہوں نے ۵ نومبر ۱۹۸۸ء کو دو ہفتوں کے لیے پاکستان کا سفر کیا تھا۔اس سفر کی تحریک ان کے ایک دوست راجندر ملہوترا، جو ایک ادب نواز ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے، نے دی تھی۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد انہوں نے اپنے سفری روداد کو قلمبند کیا جو ان کے دوست راجندر ائن کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ ''آج کل'' میں فروری ۱۹۸۹ء سے ستمبر ۱۹۹۰ء میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔بعض مصروفیات کی وجہ سے اسے کتابی صورت میں شائع کرانے میں تاخیر ہوئی۔ آخر 1997ء میں کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔کشمیری لال ذاکر کا تعلق اگرچہ ضلع بیگا، گجرات (موجودہ پاکستان) سے تھا، چونکہ ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں برسوں جموں و کشمیر میں مقیم رہے تو کشمیری لال ذاکر کی بھی پرورش، تعلیم و تربیت یہیں پر ہوئی۔ایس پی ہائی سکینڈری سکول سے اعلیٰ ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد پرنس آف ویلس کالج (موجودہ گورنمنٹ گاندھی میموریل سائنس کالج) جموں سے بی اے کی تعلیم حاصل کر لی۔اور ان کے ادبی سفر کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی۔

مصنف کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں سے ایک بار ملیں۔آبائی گھر کو اور اس کی دہلیز کو ایک مرتبہ دیکھیں۔بقول ان کے ''جس ماں کی کوکھ میں اس نے جنم لیا (یعنی پاکستان) اس ماں کا ایک بار پھر سے

درشن ہوجائے''۔ان کے دوست اور ادب نواز راجندر ملہوترا کی وساطت سے مصنف کی یہ خواہش پوری ہوتی ہے۔ملہوترا اچھے کاروباری آدمی ہونے کے ساتھ وجود ادبی ذوق رکھتے تھے۔اور ہر سال اپنے محلہ میں ایک مشاعرہ منعقد کرتے تھے اس لیے پاکستان میں ان کے بے شمار ادیب، شاعر اور دوستوں سے گہرے مراسم اور تعلقات تھے۔لہٰذا چار دوستوں کا یہ قافلہ ''شان پنجاب'' (ریل) کے ذریعے واگہ سے ہوتے ہوئے لاہور داخل ہوتے ہیں۔ ملہوترا کی کوشش ہوتی ہے کہ ذاکر کا سفر خوشگوار رہے جس میں وہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔اور پاکستان میں قیام وطعام کا سارا انتظام اپنے ذمہ لیتے ہیں۔پاکستان میں داخل ہوتے ہی مصنف کو اپنے بچھڑے ہوئے مادرِ وطن کی مانوس مٹی کی خوشبو سے جہاں ایک روحانی سکون ملتا ہے وہاں ماضی کی تلخ اور کربناک یادوں سے ایک بار پھر تقسیم وطن کے المیے کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔انگریزوں کی سازش سے جو ملک کی صدیوں پرانی گنگا جمنی تہذیب میں رخنہ پڑا۔ معصوم اور ناسمجھ عوام اس سازش کا کیسے شکار ہوئے اور کیسے تقسیم وطن کا المیہ پیش آیا۔وہ اپنے اس دکھ اور درد کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ جو تقسیم کا اتنا بڑا المیہ ہوا تھا۔اس کا بیج یہی تو تھا جس نے جو کہہ دیا دوسروں نے سچ مان لیا۔تجزیہ کرنے والا کون تھا؟ کوئی بھی نہیں! سب بہکاوے میں آنے کو تیار تھے۔ایک بار جو بہکاوں کا عمل شروع ہوا تو اس کا کہیں انت نہیں تھا۔بات بڑھتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ رات کی رات میں صدیوں کے پڑوسی مرنے مارنے کو تیار ہوگئے۔دیکھا دیکھی دونوں ملکوں میں ایک سا ہی ردعمل ہوا۔گھر خالی ہوگئے۔آنگن اُجڑ گئے۔چھتیں ویران ہوگئیں۔کھیت جل گئے۔کنویں سوکھ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک پورا ملک تلوار کی دھار سے بٹ گیا۔ایک پوری قوم دو حصوں میں بٹ گئی۔
>
> ایک حصہ سرحد کی ایک طرف تھا
>
> اور دوسرا حصہ سرحد کی دوسری طرف!
>
> ایک بہت بڑی دراڑ پڑ گئی تھی۔۔۔یہ منظر میں نے بھی تو دیکھا تھا۔''۹۶

کشمیری لال ذاکر نے تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی طرف رخ کیا، جموں وکشمیر کو اپنا گھر اور مسکن بنایا۔وقت کے ساتھ ساتھ حالات سنبھلتے گئے اور لوگ اپنے اپنے کاروان زندگی کے شاہراہ پر گامزن ہوگئے۔تقسیم ملک کے المیہ

نے ذہن وروح کو ایسا درد وکرب سے مفلوج کر دیا جو کبھی مندمل نہ ہو سکا۔ انہیں پنجاب سرکار کے اعلیٰ عہدے پر ملازمت مل گئی تھی۔ زندگی آرام وسکون سے چل رہی تھی۔ لیکن دل کے نہاں خانوں میں اپنے جائے پیدائش کی یادیں ہمیشہ تازہ رہیں۔ گجرات، لاہور اور سندھ کی یادیں اور بچھڑے عزیزوں سے ایک بار پھر سے ملنے کی خواہش ان کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔ اپنے دورۂ پاکستان کی خوشی ومسرت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے ایک بار پاکستان ضرور جانا چاہئے کیونکہ میرے بہت سے عزیز دوست رفیق اور ساتھی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ دل تو میرا بہت چاہتا تھا کہ میں پاکستان جاؤں اور ان جگہوں کو پھر دیکھوں جن سے میری جذباتی وابستگیاں تھی۔ اور ان دوستوں سے ملوں جن کے ساتھ ساتھ میں نے لکھنا شروع کیا تھا، اس وقت کے ادبی رسالوں میں جن سے اس وقت میرے اس وقت کے دوست اور میں وابستہ تھے ہمایوں، ادب لطیف، ادبی دنیا، نیرنگ خیال، سویرا قسم کے رسالے شامل تھے، اوراق فنون، نیا دور، نقش، افکار، یہ بعد میں شروع ہوئے تھے۔ جب میں لاہور چھوڑ چکا تھا کچھ رسالے بند ہو گئے تھے۔ کچھ باقاعدگی سے شائع ہو رہے تھے۔ میرے دوست اور میں ان رسالوں میں بھی لکھتے رہے تھے اور بعض میں اب بھی لکھ رہے ہیں۔ اس لیے دوستی کا رشتہ اب بھی قائم ہے۔ اگرچہ خط وکتابت کا سلسلہ بہت حد تک منقطع ہو گیا ہے۔ دوستی میں خط وکتابت بہت نمایاں رول ادا کرتی ہے۔ دوستیاں الفاظ کے سہاروں پر نہیں جذبات کی بنیادوں پر زندہ رہتی ہیں۔''۹۷

سفرنامہ نگار جب لاہور میں داخل ہوتا ہے۔ انہیں بالکل وہی منظر دکھائی دیتا ہے جو وہ پنجاب میں پیچھے چھوڑ کے آیا تھا۔ کوئی بھی فرق نظر نہیں آتا۔ ویسے ہی کھیت کھلیان، ویسے ہی لوگ، ویسی آب وہوا اور وہی زمین۔ وہ اشاروں اور کنایوں میں تقسیم کے المیے کی حقائق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اقتباس دیکھئے:

''میں کار کی کھڑکی سے باہر سڑک کے ساتھ لگتے کھیتوں کو دیکھتا رہا۔ جو دونوں ملکوں میں ایک ہی جیسی فصلیں اگاتے ہیں۔ جن میں ایک ہی طرح کے کسان محنت مشقت کرتے ہیں اور جو ایک ہی جیسی بھوک کا سامنا کرتے ہیں۔''۹۸(ایضاً،ص:32)

یہ وہی پنجاب ہے جس کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ کیا کیا صدمے نہ سہے لوگوں نے۔ تقسیم، ہجرت، بھوک،

ت، کشت وخون ری، کیا کیا نہیں دیکھا عوام نے۔ دونوں طرف کے سادہ لوح عوام اس المیہ کا شکار ہوئے اور اس کا حصہ بن گئے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اب جبکہ حقیقت اور سچائی کے آشکار ہونے کے بعد محبت اور ہمدردی پھر سے ابھرنے لگی ہے۔ اب تمام کدورتیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور محبت اور عزت اور ا کو اولیت دی جا رہی ہے۔

اس سفر نامہ کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصنف کو پاکستان سے جذباتی لگاؤ رہا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو، بقول ان کے یہ مادر وطن (پاکستان) ان کی وہ ماں ہے جس کی کوکھ سے انہوں نے جنم لیا ہے اور ہندوستان وہ ماں ہے جس نے ان کو پروان چڑھایا۔ دونوں جگہوں سے جذباتی لگاؤ اور وابستگی ہے۔ پاکستان میں ان کے بچھڑے ہوئے عزیز، دو اور وہ ادبی حلقے مقیم ہیں جن کو یادوں کے چراغ وہ ہمیشہ جلاتے رہے ہیں۔ یہی لگاؤ اور اُنسیت انہیں عمر کے اس مقام پر بھی یہ سفر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی نہیں وہ دوستوں سے ملنے لاہور، اسلام آباد، کراچی، راولپنڈی اور سندھ کا سفر کرتے ہیں۔ ان کے میزبان اور دو ان کے اعزاز میں مختلف ادبی محفلیں، نشستیں منعقد کرتے ہیں۔ پُر تکلف دعوتیں دی جاتی ہیں۔ جس میں ادیب، صحافی اور فنکار شریک ہوتے ہیں۔ جس سے اندازہ میں ان کی پذیرائی ہوتی ہے۔ اس سے ادبی حلقوں میں ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان نشستوں میں ادب، فن اور شاعری پر مختلف زاویوں سے تبادلہ خیال کیا جاتا ہے۔ ادب میں موضوع، سمت و رفتار، تصانیف، اشاعت اور رسائل و کے تبادلہ کے حوالے سے بات ہوتی ہے۔ دونوں ملکوں کے درمیان امن و سکون کی بقاء اور مستحکم رشتے کی بحالی کی بات ہوتی ہے۔ وہ جہاں جہاں بھی جاتے ہیں وہاں ادبی شخصیات ملتے ہیں۔ جو ان سے محبت و خلوص سے ملتے ہیں۔ سفر نامے میں جا بجا مختلف محفلوں کی تفصیلات ان کی جزئیات کے ساتھ دی گئی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

> ''اس روز کی شام واقعی بہت حسین ثابت ہوئی!!!
>
> پرتو روہیلہ نے سبھی جانے پہچانے ادیبوں، شاعروں، دوں اور ادب نواز دوستوں کو جمع کر لیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق تو یہ میری وجہ سے ہوا تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس محفل کو کامیاب بنانے کے لیے اس نے پورا دن صرف کر دیا تھا۔ میرے لیے یہ شام ایک کبھی نہ بھلائی جانے والی شام تھی پاکستان کے اس علاقے کے چوٹی کے ادیب، شاعر اور داس محفل میں موجود تھے۔''99

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ سفر نامہ ایک ادبی نوعیت کے سفر کی روداد ہے۔ مصنف دو ہفتے پاکستان

میں رہے ۔مختلف شہروں میں گئے ۔لیکن کسی سیاحتی مقام کسی تفریحی مقامات کی سیر میں نہیں□ ارے بلکہ صرف ادیبوں سے □قات ،ادبی محفلوں، کتب خانوں، کتب فروشوں اور ادبی مرا□ □ ہی محدود رہے۔ یہ ا□ ادبی شخصیت کے مزاج وفطرت کے مطابق سف□ مہ ہے جو ا□ کامیاب اور دلچسپ سف□ مہ ہے۔اس سف□ مے میں سف□ مہ نگار کو نہ □ زاروں میں □ وفرو□ □ کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی مندروں، اور درگاہوں □ حاضری دیتے ہوئے □تے ہیں۔ بلکہ مصنف کو ادیبوں اور اہل علم سے □قات کرتے ہوئے اپنے دامن میں علمی، ادبی□ ر□ ،اقتصادی اور سماجی موضوعات□ □ یدہ سے□ یدہ معلومات سمیٹتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے □ کستان کی ادبی د□ ،ادبی اداروں، ادبی تنظیموں اور □ □ ز□ کے مقاصد، محرکات اور کارگذاریوں کے□ رے میں جاننے اور خود کو ان ادبی تنظیموں کے ساتھ جوڑنے میں کوشاں □ آتے ہیں:

''اقبال اکیڈمی کی رکنیت کا فارم بھر کر ان کی □مت میں پیش کر□ ۔اب میں اقبال اکیڈمی □ کستان کا□ قاعدہ رکن ہوں۔ میں اسے اپنے لیے بہت□ ا اعزاز سمجھتا ہوں۔''[۱۰۰]

کشمیری لال ذاکر کے اس سف□ مے میں□ کستان کے ادیبوں، تخلیق کاروں اور قلمکاروں کے کا□ موں، تحر□ ں، ادبی ر□ ت اور سرکاری طرف سے ادیبوں کی حوصلہ افزائی اور ادب کے فروغ کے لیے مختص اسکیموں □ مفصل□ ت کی گئی ہے۔ سف□ مہ کے مطالعہ سے یہ□ ازہ ہو□ ہے کہ□ کستان کے ادیبوں اور فنکاروں کو سرکاری طرف سے بہترین سہولیات اور مراعات حاصل ہیں۔ ر□ یو، ٹیلی □ ن، ثقافتی مرا□ ،صحافتی ادروں، سرکاری دف□ غرض ہر جگہ اردو ادیبوں کے تقرر کو لازمی قرار□ □ ہے۔ادیبوں کے لیے کتابوں کی اشا □ ،□ اجات، □ زمت، معقول تنخواہ، سرکاری حقوق اور د□ مراعات حاصل ہیں۔ بعض صورتوں میں سرکاری طرف سے رہا□ مکان □ فراہم کی جاتی ہے۔ نوآموز ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اسکالر□ □ کا معقول انتظام ہے۔ او□ اجم کے مرا□ میں بہت عمدہ کام ہو رہے ہیں۔ جو بہت خوش آئن□ ت ہے۔ مصنف علم وادب کی اس طرح کی سر□ ستی سے کافی مت□ □ ہے۔

دوران سفر انہیں ا□ □ ربھی ایسا نہیں لگا کہ وہ غیر ملک میں اجنبی لوگوں کے ساتھ ہیں بلکہ میز□ نوں کی محبت وخلوص انہیں □ انے وقتوں کی رواداری کی□ ددلاتے ہیں۔ فلش بیک تکنیک کے ذریعے سے ماضی کو بہترین □ از میں بیان کیا□ ہے□ وہ تقسیم کا سا□ □ ۱۹۶۵ء کی لڑائی□ تقسیم سے پہلے کے حالات ہو جس سے مصنف اور اس کی روداد سے□ □ تیں واضح ہو جاتی ہے۔ □ ان کا قافلہ گجرانوالہ سے□ □ ہے تو وہ یکلخت پچاس سال قبل کی ماضی میں

پہنچتا ہے۔ وہ ان گلی کوچوں کے خاک چھاننے لگتا ہے جس کی خوشبو، یہاں کے بچھڑے ہوئے□ اپنے□ سیوں اور اس وقت کے گھروں کو تلاش کرنے لگتا ہے۔ پھر وہ اس گھر کے دہلیز□ پہنچتا ہے جس میں ان کا□ یوار رہا کر□ تھا۔ اُس اجڑے ہوئے□ ر کی روداد سناتے ہوئے مصنف جذ□ تی ہو جاتے ہیں۔ یہاں□ فلش بیک تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے اس منظر کی عکاسی کی گئی ہے۔ اقتباس دیکھئے:

> ''پھر □ ادھر آ □ گے آپ؟'' میں پنجابی محلے میں اس گھر کے سامنے کھڑا تھا جہاں میرے بہنوئی رائے زادہ سوہن لال□ لی رہا کرتے تھے۔ کون کر رہا تھا مجھ سے یہ سوال؟ شا□ یہ سوال اس گھر کی□ ی سی ڈیوڑھی نے کیا تھا۔ جو بند تھی اور اس میں کوئی تبد□ نہیں آئی تھی اتنے سالوں میں۔ وہ ان دنوں اکثر بند ہی رہا کرتی تھی اور میری بہن اس وقت اس ڈیوڑھی کو کھولتی تھی۔ □ کوئی اس کی سانکل بجا□ تھا۔''۱۰۱

اس سفر□ مے میں□ ات، تجر□ ت و مشاہدات، سفر کی روداد، □ قاتوں، □ قاتیوں کو تفصیل سے بیان کیا □ ہے۔ ان کی قوت مشاہدہ کی ا□ عمدہ مثال دیکھئے:

> ''□ ہم گاڑی سے اسلام□ د کی حدوں میں داخل ہوئے تو طبیعت خوش ہو گئی۔ کیا□ نکا شہر تھا۔ چنڈی گ□ ھ□ وں کے سامنے گھوم □۔ جوں جوں گاڑی اسلام□ د کے شہر کی طرف □ ھتی جا رہی تھی۔ مجھے یہ احساس ہو□ جا رہا تھا کہ اسلام□ د اور چنڈی گ□ ھ دونوں شہروں کا □ ر□ پس منظر ا□ ہی ہے۔ دونوں شہر نئے□ د ہوئے تھے۔ دونوں کے تعمیر کے□ ائن اور □ ازا□ دم ماڈرن ہے۔ دونوں شہروں کی اپنی□ ئی□ دی کوئی نہیں □ ہر سے آنے والے لوگوں نے ہی انھیں□ د کیا تھا۔ دونوں شہر سرکاری لوگوں کے شہر تھے۔ لیکن دونوں شہروں میں اتنی مطابقت کے□ وجود ا□ فرق بھی تھا۔ وہ تھا جغرافیائی ماحول۔ اسلام□ د مرگلا کی پہاڑیوں سے تین طرف گھرا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ شہر□ دہ دلکش اور جاذب□ □ تھا۔ چنڈی گ□ ھ میں یہ کمی تھی۔''۱۰۲

''یہ صبح ن□ ہ رہے گی'' میں سفر□ مہ نگار کی شخصیت، کردار، داخلیت، سوچ و افکار، تحر□ و□ ت اور ذاتی ن□ گی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی ہو جاتی ہے۔ ا□ سیدھے سادھے مخلص اور شریف الطبع اد□ کی ذات سامنے آ جاتی

ہے۔ان کی شخصیت تکبر، غرور، بغض و کینہ اور ت جیسے منفی ت سے پ ک آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ دوران سفر جتنے بھی لوگوں سے ملتے ہیں میں یہی خوبیاں انہیں آتی ہیں۔

چو یہ سفر مہ ا کہانی کار کے قلم سے نکلا ہوا سفر مہ ہے اس لیے اس میں جا بجا کہانی پن ہے۔موقع محل اشعار کے علاوہ مختلف محاورے، قول اور تشبیہات و استعارات کا بخوبی استعمال کیا ہے۔افسانوی از نے تحریکو ا اور اچھا پن کیا ہے۔جس سے قاری کی دلچسپی قرار رہتی ہے۔اور ا سسپنس مز آ گے پڑھنے ابھا ہے۔یہی مصنف کی تحریوں کی پہچان ہے۔عام سادہ اور روزمرہ کی نگی کی سادہ اور آسان ن کا استعمال کیا ہے۔ ہندی اور اردو کے امتزاج سے ن کی دلکشی لا ہو جاتی ہے۔معاصر شعراء کے اشعار جا بجا استعمال کئے گئے ہیں جس سے اس کی خوبصورتی میں اضافے کے ساتھ ساتھ ادبی ر نوعیت کا بھی احساس ہے کہ کس مشاعرے اور کس حالات میں کس شاعر نے کون سے شعر کہے اور معاصرین کون کون تھے۔مصنف کی اعزاز میں منعقدہ ا مشاعرہ کا ذکر کرتے ہوئے ن کا ا غزل جو سفر مے میں کیا ہے۔ حظہ فرما :

جفا دور جاتی ہیں کم دشہروں میں
وفا دور جاتی ہیں کم دشہروں میں
صدا کی ہو، افسوس کی آہ بھرنے کی
صدا دور جاتی ہیں کم دشہروں میں
ہیرا۔ ہوتو اغ راہ ان کی
شعا دور جاتی ہیں کم دشہروں میں
دشہروں کے مکینوں کی ہوالے کر
ہوا دور جاتی ہیں کم دشہروں میں ۱۰۳

الغرض ''یہ صبح ہ رہے گی'' ا خالص ادبی سفر مہ ہے۔جس میں اول آ علم و ادب اور ادیبوں کے متعلق تیں ہیں۔ ن و بیان تو کشمیری لال ذاکر کو قدرت حاصل ہے ہی۔اس کے علاوہ ان کے منفر از تحری اور افسانوی از نے اسے ا چلتی پھرتی تصوی سفر مہ ہے۔جسے پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہے۔ اسے دہ سیمین پ دکھا جارہا ہو۔یہی ا کامیاب سفر مے کی پہچان ہوتی ہے۔الغرض تمام فنی محاسن اور لوازمات کے

ساتھ یہ ایک مکمل سفرنامہ ہے۔

شہرہائے نور (سفرنامہ حج) 2010: ڈاکٹر نیلوفر زنجوی قادری: یہ سفرنامہ ڈاکٹر نیلوفر زنجوی قادری کے حج کے سفر کی روداد پر مشتمل ہے۔ جو 2010 میں قادری پبلیکیشن سے کتابی صورت میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ چونکہ مصنفہ ایک بہترین اور سلجھی ہوئی افسانہ نگار بھی ہیں اس لیے حقیقت کو کہانی کے انداز میں روانی کے ساتھ لکھنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ ارض مقدس کا سفر یوں بھی صرف جسمانی سفر تک محدود نہیں رہتا ہے اس میں انسان کی داخلیت اور اندرون ذات یعنی روح کا بھی سفر ہوتا ہے۔ جسمانی صعوبتوں پریشانیوں، رنج والم اور تکالیف سے نجات ورا حت کے لیے خارجی سہولیات کا سہارا لیا جاتا ہے۔ لیکن داخلی اور روحانی تکالیف اور پریشانیوں سے نجات حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ داخلی تناؤ اور اضطراب سے راحت تبھی میسر ہوسکتی ہے جب انسان اپنے رب سے رابطہ کرے۔ اور اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے رب کو راضی کرے۔ جو کبر و انا کو مار کر ہی ممکن ہے۔ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے جسمانی مشقت جھیلنی پڑتی ہے، صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا ہے تبھی جا کے اس مقام تک پہنچتا ہے کہ بندہ اپنے رب کے روبرو ہو جائے اور جب وہ ابلیسی ہتھکنڈوں اور نفس کے وسوسوں کو مار کر رب کو راضی کرتے ہوئے اس سے رابطہ کرتا ہے تبھی یہ روحانی سفر کامیاب ہوتا ہے۔ یہ سفرنامہ بھی اسی نوعیت کے صبر آزما اور روح پرور سفر کی داستان ہے۔ سفرنامہ نگار سفر کے آغاز سے لے کر اختتام تک اپنے رب کو پانے کی جستجو میں کوشاں رہتی ہیں۔ رقیق القلبی اور سوز و گداز سے بھرپور اس سفر میں مصنفہ کی اندرون ذات میں متلاطم جذبات مترشح ہوتے ہیں۔ یہ ایک سبق آموز سفرنامہ ہے۔ جس سوز و گداز کے ساتھ وہ ارکان حج کی ادائیگی کے لیے جہاں جہاں جاتی ہیں وہ ہر جگہ، ہر شے میں اپنے رب کی متلاشی نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے دیرینہ خواب کی تکمیل کے لیے اپنے شوہر کے ہمراہ حج کے سفر محمود پر نکلتی ہیں۔ گھر سے نکلتے وقت جذباتی ہو کر سفر پر روانہ ہوتی ہیں اور اس عظیم شہر کی خوبصورتی اور کعبہ کی عظمت کو دیکھ کر دم بخود رہ جاتی ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مغرب کی نماز کے بعد جو نور الٰہی میں نے خانہ کعبہ کے اندر دیکھا۔ وہ میری نگاہوں میں بس گیا۔ خانہ کعبہ کے اوپر ایک اکیلا ستارہ واحد ستارہ چمکا۔ ہر جگہ روشنی ہی روشنی، ہر طرف اجالا

ہی اجالا، ہر طرف اللہ کا نور ہی نور دیکھنے میں آ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔آپ گھنٹوں خانہ کعبہ کو دیکھتے رہیے مجال ہے کہ آپ کی آنکھیں تھک جائیں یا آپ کا دل سیر ہو جائے۔ دل کرتا ہے اس سیاہ چادر والے کعبہ کو دیکھتے رہیں۔"(۱۰۴)

حج اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے جو ہر صاحبِ استطاعت مسلمان پر فرض ہے۔ ہر مومن کے دل میں یہ تمنا اور یہ دعا ہوتی ہے کہ سفرِ محمود اس کا نصیب ہو، ایک بار وہ بھی شہر ہائے نور "مکہ و مدینہ" کی گلیوں کی خاک چھان سکے۔ اس انفرادی تجربہ کو مصنفہ نے بڑے سلیقے اور خوبصورتی سے اس انداز میں پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا اس سفرِ محمود کے لیے بیقرار ہو جاتا ہے۔ مصنفہ نے ان مقاماتِ مقدسہ کی ایک ایک چیز کو اپنی آنکھوں میں سما کر دل میں اتار رکھا ہے اور انہیں صفحہ قرطاس پر اس دلگداز انداز میں اتارا ہے کہ اندازہ ہو جاتا ہے گویا قاری خود بھی اس سفرِ محمود سے مشرف ہو رہے ہو۔ اور ان کے خلوص اور رقیق القلبی کا ثبوت ہے کہ جذبات متلاطم ہوتے ہیں اور آنکھیں بے اختیار اشک بار ہو جاتی ہیں۔ اقتباس دیکھئے:

"نور الٰہی تو یہاں بھی برستا ہے۔ آخر کیوں نہ برسے، یہ تو اللہ کے اپنے محبوب ﷺ کا شہر ہے آپ ﷺ کا شہر جو "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" ہے۔ جس کی ذات مبارک پر خود اللہ تعالیٰ اور زمین و آسمان میں رہنے والے درود پڑھتے ہیں۔ جسکی عمر مبارک کی قسم اللہ تعالیٰ نے کھائی ہے۔ اور جس کی شفاعت کا فیض قیامت کے دن مرسلین کو بھی ملے گا۔ ہر طرف نور ہی نور ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے یہ کچھ بنایا ہے۔ مسجد کے ستونوں پر نظر پڑتی ہے تو آپ اس کو چھو کر دیکھتے ہیں کہ کس طرح ان کو بنایا گیا ہوگا۔ اور ان ستونوں کے اندر ائیر کنڈیشنر ڈالا گیا ہے۔ اس مسجد میں کبھی کبھی چھتیں سرک جاتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس مسجد میں چھتیں اس طرح بنائی گئی ہیں۔ کہ جب بہت زیادہ گرمی ہو جاتی ہے تو آٹو میٹک (خود بخود) چھت اپنی جگہ سے سرک جاتی ہے اور جب درجہ حرارت پھر سے کم ہو جاتا ہے اور ٹھنڈ ہونے لگتی ہے تو چھت واپس اپنی جگہ پر آتی ہے۔ چھت سرکنے پر جب آسمان نظر آتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں برسنے کے لئے چھت کھل جاتی ہے۔"(۱۰۵)

خلوص دل سے تحریر کردہ یہ سفرنامہ ایک بہترین حج گائیڈ ہے۔ جس میں مکۃ المکرّمہ اور مدینہ منورہ اور ہر ایک مقدس مقامات کی جغرافیائی تفصیلات دی گئی ہیں۔ ساتھ میں ان جگہوں کی تاریخی و مذہبی اہمیت وافادیت بھی واضح کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں فرض ومسنون ارکان کے ساتھ ساتھ دوسرے اہم مراحل اور مقامات کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ جیسے مسجد قُبا کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس سے جڑی روحانی وابستگیوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

''یہ مسجد مدینہ شریف کے جنوب میں مسجد نبوی سے کوئی تین میل کی دوری پر واقع ہے۔ یہ مسلمانوں کی اولین مسجد ہے۔ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقع پر اپنے جان نثار صحابہ کرام کو ساتھ لے کر اپنے دست مبارک سے اس کی بنیاد رکھی۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے گھر سے وضو کر کے مسجد قُبا آئے اور یہاں دو رکعت نماز ادا کی۔ اس کے لیے ایک عمرہ کا ثواب ہے۔ مسجد الحرام، مسجد نبویؐ، اور مسجد اقصیٰ (یروشلم کی مسجد جو قبلہ اول تھی) کے بعد مسجد قُبا ہی دنیا بھر کے مساجد سے افضل ہے۔''[۱۰۶]

خانہ کعبہ کا طواف، وہاں کا منظر اور وہاں پر ملنے والے ذہنی، قلبی اور روحانی سکون کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''خانہ کعبہ کو دیکھ دیکھ کر اور طواف کر کر کبھی جی نہیں بھرتا تھا۔ عصر پر بھی پہلے طواف کرتے تھے اور اس کے بعد عصر کی نماز پڑھتے تھے۔ مغرب کی نماز تک تلاوت کلام پاک کرتے اور مغرب کی نماز کے بعد ایک بعد پھر طواف کرتے یا تلاوت کلام پاک وغیرہ کرتے۔ اگر کچھ نہیں تو بھی حرم شریف میں بیٹھ جاتے۔ دنیا بھر کے لئے دعا ئیں مانگتے اور ان رحمتوں کے امیدوار ہوتے جو کعبہ کو دیکھنے والے پر برستی ہیں۔''[۱۰۷]

حج کے سفر میں حاجیوں کے اپنے اپنے الگ تاثرات، مشاہدات اور تجربات ہوتے ہیں۔ لیکن مقصد سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔ سب کو اپنے رب سے ملنا ہے، فرض کی ادئیگی ہوتی ہے۔ حج سے واپس آ کر حاجی اپنے عزیز واقارب کو سفر کی داستان، حالات وکیفیات اور رحمتوں اور برکتوں کی کہانی سناتے ختم نہیں ہوتی۔ ایک غیر تعلیم یافتہ حاجی بھی اپنے ساتھ یادوں کی ایک پوری کتاب لے کر آتا ہے۔ وہ حج کے روداد سناتے سناتے نہیں تھکتا۔ مصنفہ کا تعلق علم وادب سے ہے۔ چونکہ وہ ایک فاضل ادیبہ ہیں یہی وجہ ہے انھوں نے اپنے مشاہدات اور معلومات کو من وعن صحت کے ساتھ،

بلاکم وکاست بیان کیا ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری اس سفرنامہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر نیلوفر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔اسی لیے انہوں نے دوران سفر اپنے مشاہدات اور معلومات حتی الامکان علمیت اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔انہوں نے مناسک حج اور دیگر امور کے دائرے میں اپنی علمیت کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ عازمین حج کے لیے رہنمائی کا کام کرسکتی ہے۔
> ۱۰۸''

سفرنامہ نگار چونکہ ایک ہمہ گیر ادبی شخصیت ہیں۔درجنوں افسانوں کی خالق ہیں۔جن کے ذریعہ وہ کشمیری عوام کے دکھ و درد کی کہانی بیان کرتی رہتی ہیں۔اس کے علاوہ مجبور ومقہور انسانوں کی آواز بن کے سماج میں ہو رہے ظلم و زیادتی کے خلاف ہمیشہ آواز اٹھاتی رہتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس سفر محمود میں بھی وہ امت مسلمہ اور کشمیر کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتی ہیں۔

مختصراً یہ ایک بہترین سفرنامے کے ساتھ ایک مکمل حج گائیڈ ہے۔جس سے عازمین حج مستفید ہو سکتے ہیں۔اس کے علاوہ یہ ایک ادبی سرمایہ تو ہے ہی۔سادہ اور سلیس زبان میں ہر ایک منظر کی خوبصورتی سے عکاسی کی گئی ہے۔ساتھ میں جزئیات نگاری بھی قابل تحسین ہے۔فنی اور تکنیکی لحاظ سے یہ ایک مکمل سفرنامہ ہے۔

''دوشیزہ دنیا'': ڈاکٹر نصرت آرا: یہ سفرنامہ معروف جموں وکشمیر کی عالمی شہرت یافتہ ادیبہ ڈاکٹر نصرت آرا کے کینیڈا کے سفر کی روداد ہے۔ڈاکٹر نصرت آرا کی پیدائش 9 اگست 1960ء میں سری نگر کے ایک اعلیٰ گھرانے میں ہوئی۔ان کے والد مہاراجہ کشمیر کے دربار میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔اور اپنے دور کے ایک منجھے ہوئے شاعر تھے۔ڈاکٹر نصرت آرا نے ایم اے اردو اور پی۔ایچ۔ڈی (ایجوکیشن) کشمیر یونیورسٹی سے حاصل کی۔پروفیسر آرا ضیا پنجابی کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئیں۔جن سے ان کے دو بیٹے ہیں۔افسانوی وغیر افسانوی ادب اور شاعری پر مشتمل درجنوں اردو، انگریزی اور ہندی کتابوں کی وہ مصنف ہیں۔وہ بین الاقوامی سطح پر ایک معتبر ادیبہ کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں۔انہوں نے خود کو ادب اور کشمیر اور کشمیری عوام کے لیے وقف کیا۔کشمیری عوام کے مسائل اور

کشمیر کی تاریخ وتہذیب سے دنیا کو روشن کرانے میں ہمہ تن مصروف رہی ہیں۔جس میں انہیں بھرپور کامیابی ملی اوران کی آواز کشمیر اور کشمیری عوام کی ترجمان بن گئی۔حقوق انسانی کی پامالی کے خلاف وہ ہمیشہ سینہ سپر رہیں اوراس کے سدباب کے لیے اور حقوق انسانی کی بحالی کے لیے وہ دنیا بھر کا سفر کرتی رہیں۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں منسٹری آف کلچر سے لائف ٹائم فیلوشپ کی اعزاز سے نوازا گیا۔کشمیر اور دنیا بھر کے مظلوموں اورغریبوں کا درد اپنے دل میں لیے وہ فقط ساٹھ برس کی عمر میں 20 مئی 2021ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئیں۔ان کی تصنیفات کی فہرست لمبی ہیں جن میں ابابیلیں لوٹ آئیں گی،اجنبی جزیروں میں برف آشنا پرندے،مورتی،غیرہ قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر ترنم ریاض چونکہ منسٹری آف کلچر اور ساہتیہ اکادمی جیسے ادارے سے وابستہ تھیں اس لیے انہیں کسی نہ کسی ثقافتی یا ادبی پروگرام میں شرکت کے لیے اندرون اور بیرون ملک سفر کرنے کے مواقع ملتے رہتے تھے۔کینیڈا کا سفر بھی اسی نوعیت کا ایک سفر تھا۔انہیں کینیڈا کے شہر ٹورنٹو،اور ینٹو اور اوسکروا جیسے شہروں میں جانے کا موقعہ ملا۔کینیڈا کے مختلف شہروں کے علاوہ دیہات، سیاحتی مقامات اور تاریخی آثار دیکھنے کا موقعہ ملا۔وہ ایک وفد کے رکن کی حیثیت سے سفر کررہی تھیں۔اس سفر کی روداد کو ''دوشیزۂ کینیڈا'' کے نام سے انہوں نے صفحہ قرطاس پر بکھیرا۔ممبئی سے کینیڈا تک کے ہوائی سفر کے دوران جن کیفیات سے وہ گزریں اور ذہن میں پیدا ہونے والے وسوسوں اور خدشات کو مفصلاً بیان کیا ہے۔جہاز میں دوران پرواز ایک نومولود کی پیدائش کے خوشگوار واقعہ کو جس خوبصورتی سے پیش کیا ہے اس کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

> ''ننھا مسافر ایک ننھی سی جان تھی جو جہاز میں دو مسافروں کی مدد سے اس دنیا میں آئی تھی۔ایک ماہر امراض اطفال تھے دوسرے سرطان کے ماہر۔حفاظت کو خصوصی عملہ اس منی سی بیٹی کے تحفظ کے لیے تعینات تھا۔اس کے والدین کلدیپ کور اور رنجوت سنگھ کا خیال تھا کہ بچے کا جنم کینیڈا کی سرزمین پر ہوگا۔جب اس نے کرہ ارض کی فضا میں پہلی سانس لی تو وہ افغانستان سے ملتی ہوئی روس کے سرحد کے قریب کی ہوائی حدود تھیں۔نوزائیدہ کی شہریت روسی طے پائی۔''۱۰۹

اس سفرنامے کا عنوان بھی بڑا خوبصورت ہے۔چونکہ وہ ایک حساس،اور باریک بین ادیبہ ہیں اس لیے وہ دوران سفر آنے والی ہر شے کے فطری پہلوؤں کا باریکی سے مشاہدہ کرتی ہیں اور جس چیز سے متاثر ہوجاتی ہیں جو شے

انہیں بھا جائے وہ اسے ہر زوایے سے د□ ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ □ آ□ ر میں تیرتی کشتی Maid of the mist سے متا□ ہو کر اپنے سفر□ مے کا عنوان ہی ''دوشیزہ□'' رکھا۔ وہ ا□ جہاں د□ ہ خاتون تھیں ۔ انہوں نے مختلف ملکوں اور مقامات کا سفر کیا۔ مختلف جگہوں کے عوام کو دیکھنے سمجھنے اور ان کے طرز □ گی کا مطالعہ کیا۔ وہ جس جگہ بھی جاتیں اس جگہ کی□ ریخ، تہذ□ و تمدن، ثقافت، معاشرت، سماجی اور اقتصادی حا□ اور عوامی طرز □ گی کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کرتیں ۔ اس لیے بشر□ کے حوالے سے ان کا □ یہ اور تجربہ بھی منفرد اور وسیع ہے ۔ ا□ مثال دیکھئے:

> '' ا□ ان □ ہوا کتنا معصوم □ □ ہے، دوسرے جا□ اروں کی طرح ۔ ہر جا□ ار کھا ہی کر سکون سے کہیں □ □ جا□ ہے اور ا□ حضرت ا□ ان ہیں کہ رزق کمانے سے ذرا فرصت ملی تو □ ت اور حسد، طاقت اور لالچ، بغض و عناد، □ و□ ل اور نئے نئے مسئلے کھڑے کر□ ہے اور اس منفی□ کو دوسروں □ مسلط بھی کر دیتا ہے۔''۱۰ا

اس سفر□ مے میں مصنفہ نے اپنے ہمراہ کینیڈا گئے ہوئے ادیبوں کے وفد کی سر□ میوں کو تفصیل سے لکھا ہے۔ کینیڈا کے □ ے □ ے شہروں، دیہاتوں، خوبصورت مناظر قدرت اور د□ تمام چیزوں کو جو انہوں نے اس سفر میں دیکھا اور جس نے ان کو محظوظ کیا □ کو مفصلاً لکھا ہے۔ اونچے اونچے □ ف پوش پہاڑوں، □ جنگلوں، مرغزاروں اور دلفر□ وادیوں کے ساتھ ساتھ □ □ طرز کے □ □ فتہ شہروں اور عمارتوں کا بھی خوبصورت خاکہ کھینچا ہے ۔□ ان میں انہیں تصنع اور بناوٹ □ □ ہے ۔ بقول مصنفہ کشمیر کے نسبت ان میں وہ خوبصورتی، دلکشی، دلفر□ اور حُسن دکھائی نہیں دیتی ۔ وہ لمحے بھر کے لیے بھی اپنے عز□ وطن سے غافل نہیں رہتیں ۔ یہ نہ صرف ان کی حُب الوطنی اور وطن سے روحانی وابستگی کا □ ہے بلکہ وہ ہمدردی اور احساس ہے جو انہیں اپنے شاہکار وطن اور اس کے مفلوک الحال عوام سے ہے۔ اقتباس □ حظہ کیجئے:

> ''ہمیں اپنے وطن کشمیر کی وا□ ں اور مرغزا□ د آ جاتے جو صدیوں سے غیروں کی حکومتوں اور لالچ کے مارے لوگوں کے عتاب کا شکار رہتا □ ہے۔ چناروں سے سجے نکھرے ہوئے □ غات □ رشوں سے دھلے در□ اور شام کو شاخوں کے □ راڑتے پھرتے طیور ۔ فرق صرف اتنا تھا کی میری وادی کو صدیوں کسی نے سنوارا تھا نہ نکھارا تھا □ دشاہت کے بعد یہ وادی کسی لاوارث او□ لغ دو□ مند کی طرح رہی جس کا راجے، مہاراجے اور سیاستیں

مسلسل استحصال کرتی رہیں۔''۱۱

ڈاکٹر نم یض بیک وقت ایک بہترین شاعر اور ایک منجھی ہوئی کہانی کار ہیں۔اس لیے ان کی تحریروں میں افسانوی رنگ غالب ہے اور ساتھ ہی ساتھ شاعرانہ رنگ بھی واضح ہے۔سفرنامے میں مصنفہ وہ روح پھونک دیتی ہے کہ اس میں ارضی حُسن اور جمالیات نمایاں ہوجاتی ہیں۔اس سفرنامے میں مغربی ممالک کی تاریخ، تہذیب، طرز معاشرت، سماجی واقتصادی صورت حال اور وہاں پر رونما انقلابی تحریکوں کے بارے میں واضح معلومات ملتی ہیں۔مغربی ممالک کے مختلف ملکوں میں حکومت کے بنیادی نظام کی صورت حال کو بھی بیان کیا ہے اور ان سے خفگی کا اظہار بھی کیا ہے۔اطراف کے ممالک کے باشندوں کی چالوں سے اپنی بنیادی حقوق کھو دینے والے امریکہ کے مقامی باشندوں'' ریڈ انڈین'' کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا ہے تاریخ اسے فراموش نہیں کرسکتی۔اسی طرح قیام کینیڈا کی تاریخ اور واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

> ''گورے صاحب نے یہاں بھی اپنے شاطر قدم جمالیے۔جو یہاں کے اصل باشندے تھے، ان کا ظاہر ہے وہی حال ہوا ہوگا جو امریکہ کے ریڈ انڈین باشندوں کے ساتھ ہوا تھا۔کسی بسے بسائے ملک کو جبراً گھس کر قتل وغارت گری کے بعد قابض ہوجانا حریص وطامع افراد کی غالباً'' جینیا''شناخت ہے۔اس میں تعجب کی بات کہاں ہے۔کینیڈا میں ابھی بھی اصل باشندوں (Aborigin) کی لڑکیاں کبھی نہ ملنے کے لیے غائب ہوجاتی ہیں اور توقع انسانی حقوق کے حامی کچھ نہیں کرپاتے۔ان لوگوں کو غلام بنا کر رکھنا جو قتل ہونے سے کس طرح بچ گئے ہوں گے اور اپنی ہی سرزمین پر جانوروں کی طرح رہنے پر مجبور کرنا ایسے فاتح کی خاصیت ہے۔''۱۲

اس مختصر سے سفرنامے میں اپنے سفری روداد کے علاوہ مختلف جگہوں کے حالات وکوائف کے ساتھ ساتھ وہاں کی تہذیب وتمدن اور تاریخ پر مجملاً بحث کی ہے۔اور سفرنامے کے تمام فنی لوازمات کا خیال رکھا گیا ہے۔

''میم چوبے'' ڈاکٹر نم یض: ''میم چوبے'' ایک مختصر لیکن خوبصورت اور اعلیٰ انداز میں لکھا گیا ایک سفرنامہ ہے۔یہ سفرنامہ ڈاکٹر نم یض کے دہلی سے گوہاٹی کے سفر کی روداد ہے۔جو پہلی بار ماہنامہ'' شاعر'' کے

اکت□ 2005 ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ 2005ء میں ساہتیہ اکادمی کی جا□ب سے ا□ poetess meet کے سلسلے میں انہیں اردو کی شاعرہ کے طو□پ گوہاٹی مدعو کیا□ تھا۔ جس کے لیے وہ دہلی سے گوہاٹی□ رہ□یعہ ہوائی جہاز پہنچتی ہیں۔ یہاں ان کی □قات اور د□□نوں کی شاعرات سے ہوتی ہیں۔□ ''میم چوبے'' کی شخصیت انہیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جوا□ کم گو اور شرمیلی منی پوری اد□ ہیں۔ جس کی کہانی بھی کشمیر کی ان بیوہ عورتوں سے مختلف نہیں ہوتی۔ جن کے شوہروں کو بے قصور مار□ جا□ ہے۔ میم چوبے کی کہانی اور اس کے درد و تکلیف کے احساس سے مغلوب ہوکر ان کی□د میں یہ سف□مہ لکھتی ہیں۔ بقول مصنفہ:

''اُس نے خود کو اکیلا اس لیے کہا تھا کہ ملیٹنسی، انسرجینسی، اور انکاونٹر انسرجینسی سے دوچار اس کے خطے میں ا□ حادثے کے دوران، د□س پہلے اس کے شوہر کا انتقال ہو□ تھا۔ اس کے چار بچے ہیں اور چاروں لڑکے۔ اُس کی بیٹی کوئی نہیں۔۔۔ اس لیے وہ اکیلی ہے۔ اُس نے کہا تھا۔

(بیٹیاں تو ماں کی دو□ں ہوتی ہیں اور □ت بیٹوں کی وہ ما□ □ہی جا□ ہیں جنھیں اللہ نے بیٹی کی نعمت سے محروم رکھا ہو۔ اور میں اور ا□ دونوں اس زمرے میں شامل ہے۔۔۔ اس کی □تیں □ رہے۔)''۱۱۳

سفر کا آغاز دہلی سے ہو□ ہے۔ ان کے ساتھ د□□نوں کے شاعرات ہوتی ہیں۔ جیسے ملیالم، ہندی، پنجابی، اوڑیہ، تمل وغیرہ۔ جنوری کی شدت کی سردی اور دھند کی وجہ سے فلا□ اڑان نہیں بھ□تی اس لی□ خیر ہوتی ہے۔ تمام لوگوں کو ائیرپورٹ□ انتظار ک□□ ہے۔ انتظار گاہ میں رکنے کے دوران ہم خیال شاعرات اور ادیبات کے ساتھ□ر ے لمحوں کے تج□ت سے ہم صنفوں کے تئیں محبت، خلوص اور اپنائیت کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مثال دیکھئے:

''اب وہ خود کرسی□ تھی او□ؤں سوٹ کیس کے ا□ ۔ شا□ گہری نیند میں اس نے ایسا ہی کیا ہو کہ اُس کی ساڑی دامن ک□س سے تھوڑا سا ا□ اٹھ گئی تھی۔ ا□ پنڈلی گٹھنے سے کچھ نیچے □□ں ہوگئی تھی (گو کہ اس کے موٹے سے اونی موزے بھی تھے) میں نے دھیرے سے اس کی ساری کا دامن□ کیا□ وہ گھبرا کر جاگ گئی۔۔۔ اور نہا□ معصومیت سے سوالیہ نگاہوں س□ کا۔ ارے کچھ نہیں ہوا۔۔'' میں شرمندہ ہوگئی اس کی نیند میں مخل ہوکر۔

یہ عورت کی وہی فطری اور ازلی احتیاط تھی جو چھٹی حس بن کر اس کی حفاظت کرتی ہے۔''۱۴؎

National Poetess Meet میں شریک مختلف زبانوں کی ادیبات اور شاعرات نے اپنے خیالات پیش کیں۔ادب، تہذیب وثقافت، رسم و رواج، تاریخ، جغرافیہ، معاشرہ وغیرہ مختلف موضوعات پر بات ہوئی، بحث و مباحثے ہوئے، بقول مصنفہ ان کے تجربے میں جو بات سب کی شاعری میں مشترک پائے جانے والی تھی، وہ تھی عورتوں کی آزادی۔اقتباس دیکھیے:

'' شاعرات میں ایک چیز مشترک پائی کہ ہر شاعرہ کی کم سے کم دو نظمیں خالص احتجاجی تھیں۔ اپنے اوپر بے جا لادی گئی بندشوں پر احتجاج۔شوہر کے بناؤ کے بوجھ کا قلمی احتجاج کہ گھر کے پڑے رہنے کو اس کی امن پسند طبیعت اس حد سے کیسے تجاوز کر سکتی تھی۔

ہر زبان کی شاعرہ کی زبان پر اس طرح کی بات ضرور آئی۔تو یہ آزادی، یہ برابری، یہ حق کہاں ہے؟ کیا آج بھی مرد کسی نہ کسی طرح عدم تحفظ کا مظاہرہ نہیں کرتا ؟ عورت کے من کی کوئی بات مان بھی لیتا ہے تو اسے اس پر احسان کی طرح جتانا نہیں رہتا۔عجیب موضوعات تھے۔اب عورت ہر طرح کے موضوعات پر قلم اٹھاتی ہے۔۔۔۔علاقائی زبانوں کی شاعری کے تیور جیسے حیرت انگیز طور پر چونکا دینے والے تھے۔۔۔جسم۔۔۔جبلت۔۔۔محرومی۔۔۔ اور نہ جانے کیا کیا۔''۱۵؎

اس سفرنامے میں مصنفہ کے احساسات، تجربات، خیالات کے ساتھ ساتھ ان کی وسیع معلومات اور آگاہی کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔وہ عورتوں کے لیے ایک دردمند سہیلی، بیٹیوں کے لیے ماں، اور کشمیر کے لیے بیٹی بن کر ان کے تکلیفوں پریشانیوں اور درد کی تاریخ کو صفحہ قرطاس پر اس طرح رقم کر کے گئی ہے کہ اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

''دو پنچ دریاؤں کا'' (2017): خالد حسین: یہ سفرنامہ ریاست جموں و کشمیر کے معتبر اور اردو، پنجابی اور ڈوگری زبانوں کے نامور ادیب خالد حسین کے پاکستان کے اسفار کی روداد پر مشتمل ہے۔جن کے افسانوں اور کہانیوں میں ریاست جموں و کشمیر کی صدیوں پرانی تہذیب و تاریخ، سماج، سیاست اور طرز معاشرت کے عکس اور آثار

ملتے ہیں۔جنہوں نے جموں وکشمیر میں شاہی ایمپائر سے لے کر جمہوریت تک کی تبدیلیوں کو اپنے آنکھوں سے دیکھا اوراس کا تجربہ وہ اپنے افسانوں میں بیان کرتے ہیں۔سیاسی اتھل پتھل،اورسماجی انقلاب وتبدیلیوں میں عوام کے ساتھ ہونے والے المناک حادثوں کو دیکھا اور بدلتے زمانے کے مزاج کو سمجھا،زمانے کی نشیب وفراز نے انہیں کچھ ایسے درد دئے کہ اُن کے وجود میں درد،تنہائی،اور مایوسی نے گھر کرلیا۔تقسیمِ ہند اور جموں میں رونما ہونے والے سانحات و فسادات نے ان کی ذہن و وجود پر کچھ ایسی کہانی نقش کردی جس کی داستان آج تک ان کی کہانیوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔مشترکہ پنجاب پانچ دریاؤں (ستلج،بیاس،راوی،جہلم اور چناب) کی زمین کی مناسبت سے ''پنج آب'' سے موسوم ہے۔جس سے اس سرزمین کا نام پڑا۔تقسیم ہند کے بعد اب اس طرف تین دریا ستلج،بیاس اور راوی بہتے ہیں۔ جبکہ جہلم اور چناب پاکستانی پنجاب کو سیراب کرتے ہیں۔''درد پانچ دریاؤں کا''اسی سرزمین میں مصنف کے سفر کی روداد پر مشتمل ہے۔جو پہلی بار جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز کے زیر اہتمام شائع ہونے والے مجلہ ''شیرازہ''میں شائع ہوا۔

یہ سفرنامہ مصنف کے ان دو اسفار کی روداد ہے جو انہوں نے ۲۰۰۴ء اور ۲۰۰۵ء میں پاکستانی پنجاب کا کیا تھا۔۲۰۰۴ء میں عالمی پنجابی کانفرنس جو لاہور میں منعقد ہوا اس میں اس وقت کے ہندوستانی پنجاب کے چیف منسٹر امریندر سنگھ کے قیادت میں ہندوستانی ادیبوں کے ایک وفد نے بھی شرکت کی۔جس میں صوبہ پنجاب کے وزیر تعلیم، وزیر ثقافت،وزیر تجارت سمیت مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسروں،ادیبوں،فنکاروں،اور صحافیوں کی ایک بھاری تعداد نے شرکت کی۔جموں وکشمیر سے وہ واحد ڈلیگیٹ تھے۔یہ ایک خیر سگالی کا اور آپسی منافرت کو مٹا کر باہمی ہم آہنگی اور شانتی کی طرف ایک قدم تھا۔جو حقیقی معنوں میں ایک کامیاب اور پُرلطف تجربہ رہا۔جیسا کہ ہند و پاک کے ہر سفرنامہ نگاروں کے تجربہ سے واضح ہے اور ایک فطری امر بھی ہے کہ جب بھی سرحد پار سے کوئی آتا ہے یا سرحد کے اس طرف کوئی جاتا ہے تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔یہ شاید تقسیمِ ملک کے اُس گھاؤ اور زخم کو بھروانے کی ایک فطری خواہش ہوگی۔جس نے دونوں طرف کے عوام کے بیچ ایک نہ ٹوٹنے والی ناقابل تسخیر دیوار کھڑی کر رکھی ہے۔اگرچہ ان کا دورہ لاہور تک ہی محدود تھا لیکن بعض شرکاء کے ایما پر پاکستانی صوبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ پرویز الٰہی انہیں دیگر مقامات کے دورے کی نہ صرف اجازت دیتے ہیں۔بلکہ سرکاری گاڑی بھی فراہم کی جاتی ہیں۔راستے میں ملنے والا ہر فرد محبت و

خلوص سے پیش آتے ہیں۔ ایسے ہی ایک واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''چنانچہ دوسرے دن پروفیسر رسنگھ سدھو، شاعر بلونت اور میں محکمہ ٹورازم کی کار میں ساہیوال کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں اوکاڑا کا قصبہ آتا ہے۔ ہم تینوں کو پیاس لگی تھی۔ ہم نے ڈرائیور سے کار رکوائی اور نیچے اتر کر کنوؤں کا جوس پیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
> ہم نے پیسے دینے چاہے تو وہ چھابڑی فروش پیسے لینے سے انکاری ہو گیا اور کہنے لگا آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آپ سے پیسے نہیں لے سکتا۔ ہم نے اصرار کیا لیکن وہ نہیں مانا۔ اور اس نے پیسے نہیں لیے۔ ان میں سے کئی لوگوں نے کہا کہ وہ مشرقی پنجاب سے رفیوجی بن کر آئے تھے۔ اور انہیں بھی اپنے آبائی گھروں کو دیکھنے کا شوق ہے۔ ہم کار میں بیٹھے اور ساہیوال کی طرف چل پڑے۔ راستے میں ڈرائیور نے بتایا کہ چھابڑی فروش نے کنوں کے دو لفافے ہمارے لیے کار میں رکھے ہیں۔''۱۱۶

دونوں ملکوں کے عوام کی ایک دوسرے سے ملنے کی چاہت، آپسی رشتوں کو استوار کرنے کی خواہش اور راہ میں حائل رکاوٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میں عوام کے پیار محبت اور سادگی کا قائل ہو گیا۔ دونوں ملکوں کے عوام ایک دوسرے سے ملنا چاہتے ہیں۔ آپسی رشتوں کو استوار کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ لوگوں میں کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ان کی زبان ایک ہے۔ ان کا کلچر ایک ہے۔ لوک گیت اور لوک کہانیاں سانجھی ہیں۔ صوفی سنت سانجھے ہیں۔ دونوں ملکوں کے حاکم اور سیاستدان ایسا ہونے نہیں دیتے۔ یہ سیاسی لوگ جوڑنے کے بجائے توڑنے کا کام کرتے ہیں۔''۱۱۷

دوسرا سفر:

تقسیم ہند کے بعد تقریباً نصف صدی سے زائد عرصے میں پہلی بار دونوں ملکوں کے سربراہوں کو یہ خیال آیا کہ دونوں طرف کے عوام، جن کے خاندان، احباب بچھڑ چکے تھے۔ ان کی ملاقات کرائی جائے۔ اسی تناظر میں ۲۰۰۵ء میں دونوں حکومتوں کے مابین امن اور خیر سگالی کو لے کر ایک فیصلہ ہوا کہ امن و آشتی کے نام پر حد متارکہ کے دونوں جانب رہنے والوں کو اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں سے ملنے کی اجازت دی جائے۔ جس کے لیے'' کاروانِ امن'' کے

جموں سے سری نگر سے مظفرآباد کے لیے ایک بس سروس شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اوڑی اور چکوٹی کے درمیان سرحد پر بنے کمان پل کو ''امن سیتو'' کا نام دیا گیا۔ جس سے یہ ''کاروانِ امن'' خوشحالی، امن اور خیر سگالی کا پیغام لے کر اور نئی امیدوں اور آشاؤں کے ساتھ گزارا کرے گی۔ کاروان امن کے اس پہلے قافلے میں مصنف بھی اپنی اہلیہ کے ہمراہ اپنے عزیز و اقارب سے ملنے پاکستان جاتے ہیں۔

عوام والہانہ انداز میں اس ''کاروانِ امن'' کے مسافروں کی استقبال کے لیے امڈ آتے تھے۔ اس قافلے کو مظفرآباد میں داخلے پر ایک استقبالیہ دعوت دی گئی۔ اس واقعہ کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''چکوٹی سے مظفرآباد تک کی سڑک کو پھولوں اور محرابوں سے سجایا گیا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف لوگ پھولوں کی پتوں سے ہمارا سواگت کر رہے تھے۔ جب بس چکوٹی سے چناری پہنچی تو وہاں ہم سب کو مقامی لوگوں نے دودھ پلایا۔ پھر بس ''امراساون'' پہنچی۔ وہاں مقامی لوگوں نے ہم سب میں مٹھائیاں تقسیم کیں۔ جب ہم ''گُھاں سیداں'' پہنچے تو وہاں ہمیں مقامی لوگوں نے چائے پلائی۔۔۔۔ مظفرآباد میں وزیر اعظم سکندر خان حیات کی طرف سے مہمان مسافروں کو عشائیہ دیا گیا جس میں آزاد کشمیر کے صدر جنرل انور خان، ساتھ ہی وزیر اعلیٰ، انتظامی افسران اور مظفرآباد سول سوسائٹی کے معزز اراکین نے شرکت کی۔''[118]

خالد حسین اپنی اہلیہ کے ساتھ مختلف شہروں کا سفر کرتے ہیں۔ ان شہروں میں جاتے ہیں جہاں ان کی اہلیہ کے رشتہ دار جو جموں سے ہجرت کر کے پاکستان کے مختلف شہروں جیسے سیالکوٹ، راولپنڈی، اسلام آباد، لاہور اور مری وغیرہ میں مقیم تھے۔ وہاں مقیم جموں نواسیوں سے ان کی ملاقات ہوتی ہے۔ ایک ہی محلے میں رہنے والے عزیزوں سے اب برسوں بعد ملاقات ہو رہی تھی تو دونوں طرف جذباتی لمحہ تھا۔ اس سفرنامے میں ایک چیز بہت شدت کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے کہ ہند پاک کے عوام ایک دوسرے سے ملنے کے آرزومند ہیں۔ جموں واسیوں سے ملاقات ان کے سفر کا مقصد تھا جس میں وہ کامیاب ہو گئے۔ اس لمحے کی تصویر کشی کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

> ''بہر حال رضیہ خالہ نے ہمارے آمد کی اطلاع سبھی قرابت داروں اور جموں سے ہجرت کر کے لاہور میں آباد جموں نواسیوں کو دی تھی۔ اور رات کے کھانے کا انتظام سب کے لیے کیا تھا۔ ایک میلہ لگ گیا۔ ہم سے ملنے والے زیادہ عمر رسیدہ تھے۔ 70 تا 80 سال کی عمر کے ہوں

> گے۔ جموں کے بازاروں میں باتیں ہونے لگیں۔ ۱۹۴۷ء کی یادیں تازہ کی جانے لگیں۔ جموں کے محلوں، بازاروں اور اپنے گھروں کے بارے میں پوچھ تاچھ ہونے لگی۔ تقریباً سبھی ایک بار جموں آنا چاہتے تھے کہ اپنے گھروں اور ان محلوں کو دیکھ سکیں جہاں ان کا بچپن گزارا تھا۔''[۱۹]

ایک ادیب اور تخلیق کار کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ امن کا بول بالا ہو۔ محبت، پیار، ہم آہنگی اور رواداری قائم ہو۔ بچھڑے ہوئے ملیں۔ منافرت اور کدورتیں مٹ جائیں۔ اور خلوص و محبت قائم ہو۔ اس کے لیے ادیب اپنی آواز اٹھاتا ہے۔ اقتباس دیکھئے:

> ''گزشتہ سے قبل تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ سری نگر سے آئے بھارتی مسافروں کے گروپ لیڈر کے طور پر میں نے بھی تقریر کی اور بھارت پاکستان کے اس فیصلے کو ایک مثبت قدم قرار دیا اور گذارش کی کہ پونچھ۔ راولکوٹ، کرگل۔ اسکردو، کوٹلی۔ نوشہرہ اور جموں۔ سیالکوٹ کے راستے بھی کھولے جائیں تاکہ لوگ سرحد کے دونوں اطراف آجا سکیں۔ اسی طرح آپسی تجارت کو بھی شروع کیا جائے۔''[۲۰]

اس سفرنامے میں سفرنامہ نگار نے اپنے دو مرتبہ پاکستان کے دورے کو بہت مختصر مگر مکمل انداز میں بیان کیا ہے۔ واقعات و حادثات کو افسانوی اور ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے جس سے سفرنامے کے فن میں ایک نیا پن اور اچھوتا انداز پیدا ہوا ہے۔ برسوں سے بچھڑے ہوئے دوستوں عزیزوں سے ملاقات اور وصال کی گھڑی ان کے لیے کافی جذباتی لمحہ ہوتا ہے۔ مصنف نے اپنے منفرد اور پُر اثر انداز اور آسان و عام فہم زبان میں اسے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قاری جذبات کی لہروں میں کھو جاتا ہے۔

''اسفارِ شہاب'' (2020) از پروفیسر شہاب عنایت ملک: 'اسفار شہاب' یہ جموں وکشمیر کے اردو کے ایک فعال و متحرک استاد پروفیسر شہاب عنایت ملک کے مختلف سفرناموں کا مجموعہ ہے۔ موصوف کا مقصد حیات اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج ہے اور اسی عزم کے لیے وہ اندرون و بیرون ممالک مختلف مقامات کا دورہ کرتے رہتے ہیں۔ موصوف کے ان اسفار کی روداد مختلف قومی اور بین الاقوامی رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے

رہے۔جنہیں 2020ء میں ان کی اہلیہ ڈاکٹر شہناز قادری نے مرتب کر کے ''اسفار شہاب'' کے عنوان سے قاسمی کتب خانہ سے شائع کروایا۔ 11 ابواب پر مشتمل اس کتاب میں پروفیسر موصوف کے بیرون اسفار کا ذکر ہے۔ جسے ترتیب دیتے ہوئے مرتبہ نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ سفر کے سن اور مقامات کے اعتبار سے ابواب بندی کی جائے۔ بقول مرتبہ پہلے ملکی اور پھر غیر ملکی سفرناموں کو پیش کیا گیا ہے اور دونوں جگہوں پر بہ اعتبارِ سنین ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مرتبہ نے ایک طویل مقدمہ لکھ کر اس کتاب کا پورا خلاصہ لکھا ہے اور ان کے مقدمے سے سفرنامے کی اہمیت و افادیت، تاریخ و روایت اور موجودہ صورت حال پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک کے اسفار کے اغراض و مقاصد ان کی اہلیہ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر شہناز قادری ''پروفیسر ملک جتنے سادگی پسند ہیں سفر بھی وہ اتنی ہی سادگی سے انجام دیتے ہیں۔ گھر سے تن تنہا نکلتے ہیں نہ اپنے ساتھ زیادہ اسباب رکھتے ہیں نہ زیادہ زر۔ کم پیسوں میں زیادہ جگہ کور کرنے کا معاملہ ہے بالکل درمیانہ سٹنڈرڈ کے سفر کرنے کو فوقیت دیتے ہیں۔ ایک بات کا اندازہ ہمیں بھی ہو جاتا ہے کہ موصوف جہاں جہاں جاتے ہیں بازاروں، شاپنگ مال، تفریحی مقامات، اور بڑے بڑے بازاروں سے گزرتے وقت مختلف اشیا کا معائنہ تو ضرور کرتے ہیں اور قیمت بھی جان لیتے ہیں لیکن بے جا کی خریداری سے اجتناب کرتے ہیں۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک آج کے دور کے اردو کے ایک فعال و متحرک شخصیت ہیں۔ انہوں نے جموں یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں جتنی ترقی کی ہے اس کی مثال کم ملتی ہیں۔ وہ اکثر اردو کے ماہرین، ادیب، شاعر اور فنکاروں کو شعبۂ میں مدعو کر کے طلبہ سے روبرو کرواتے ہیں۔ ان سے لیکچرز سنواتے ہیں۔ مختلف ادبی پروگرام منعقد کرتے رہتے ہیں۔ جس سے اردو دنیا میں زندگی قائم رہتی ہے۔ وہ خود بھی بیرون ریاست اور بیرون ملک مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں سیمناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ اور اکثر لیکچر دینے کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ اپنے ذوق سفر اور سفرنامہ نگاری کے محرکات کے متعلق پروفیسر شہاب عنایت ملک کا کہنا ہے:

> ''چنانچہ بچپن سے ہی راقم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے کا شوق رہا ہے۔ اس شوق کو اس وقت زیادہ جلا ملی۔ جب میں شعبۂ اردو میں بحیثیت استاد متعین ہوا۔ شعبے میں آنے کے بعد مجھے ملک کے مختلف علاقوں میں جانے کا موقع ملا۔ یعنی لکھنو، بہار، حیدرآباد، سولن، علی گڑھ وغیرہ ہندوستان کے یہ وہ علاقے ہیں جن کی اپنی الگ سے تہذیب اور سماجی تاریخ ہے۔ میں جب بھی ان علاقوں میں کسی کام سے گیا تو یوں محسوس ہوا کہ یہاں کی تہذیب کو

یہاں کے رہن سہن کو اور یہاں کے سماجی، سیاسی اور ادبی زندگی کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دینا چاہئے اور یوں میں نے قلم اٹھایا اور متعدد ملکی سفرنامے تحریر کر کے ہند و پاک کے مختلف اخبارات میں شائع کروائے۔ جنہیں کافی پذیرائی ملی۔ ۲۰۰۶ء سے میرا غیر ممالک کا سفر کرنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے پاکستان، انگلستان، مصر، بنگلہ دیش، ماریشس وغیرہ ممالک کے اسفار کیے اور ان تمام اسفار کی روداد میں نے ہند و پاک اور بیرون ہند و پاک کے مختلف اردو اخبارات کے لیے تحریر کی۔ میرے ان سفرناموں کو قارئین نے بے حد پسند کیا۔''[۱۲۱]

پروفیسر شہاب عنایت ملک کو فن تحریر میں قدرت حاصل ہے۔ وہ جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس متعلقہ صنف ادب کے فنی اسلوب اور تکنیک کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں بھی یہی اصول اور ضابطگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے سفرناموں میں اپنے مختلف مشاہدات کا ذکر کرتے ہیں۔ اور چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی ایسے نکتے ابھارتے ہیں کہ جس سے ان کے عمیق مشاہدے اور وسعت علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ 'میری پہلی لکھنؤ یاترا' میں اپنے پاکستانی دورے کا ضمنی اشارہ کرتے ہوئے مشرقی ممالک میں Birthday منانے کی پروان چڑھتی روایت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادھر مغرب کے نقش قدم پر ہمارے یہاں بھی کچھ روایتیں فروغ پا گئیں۔ جن کی ہم اندھا دھند تقلید کرنے لگے۔ ان میں جنم دن منانے کی بھی ایک روایت ہے۔ جس کا احساس مجھے ۱۰ مارچ ۲۰۰۶ء کو اس وقت ہوا۔ جب میں نے پاکستان کے ایوان صدر میں جنرل مشرف کے ساتھ ملاقات کی۔ ملاقات کے بعد اسلام آباد کے سب سے بڑے ہوٹل 'سرینا' کے کمرے میں جب پہنچا تو دیکھا کہ وہاں کے انتظامیہ نے میرے کمرے میں ایک نہایت خوبصورت کارڑ کے ساتھ Birthday cake رکھا تھا۔ تب ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ پاکستان میں بھی اس دن کی اہمیت قدرے زیادہ اس لیے بھی ہے کہ ہوٹل کے اہلکاران نے جو انتظام میرے جنم دن کا رکھا تھا وہ بالکل انگریزوں کی طرح ہی سا تھا۔''[۱۲۲]

'میری پہلی لکھنؤ یاترا' موصوف کے لکھنؤ کے سفر کی روداد ہے۔ جو موصوف نے ۱۰ مارچ ۲۰۱۱ء میں کیا تھا۔ اس

سفرنامے میں انہوں نے لکھنؤ شہر کی تاریخ، سماج، ورثہ، تہذیب و تمدن، عوامی زندگی، زبان، طرز معاشرت غرض تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اس کم مدت میں شہر کے چہار سو گھومتے ہیں تاریخی مقامات کی زیارت کرتے ہیں بازاروں گلیوں، کوچوں اور طوائفوں کے ٹھکانوں تک دیکھنے جاتے ہیں اور اپنے تاثرات و مشاہدات کو بہترین انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اودھ کی تاریخ کی عظمت رفتہ کا جہاں ذکر کرتے ہیں وہاں اس تہذیب کی زوال اور موجودہ صورت حال سے وہ رنجیدہ نظر آتے ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے پرانے کیمپس کے دورے کا ذکر کرتے ہوئے اس کی پوری تاریخ بیان کی ہے۔ جس سے مصنف کے وسیع مطالعے اور باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''لکھنؤ یونیورسٹی مشہور ندی گھومتی پر آباد ہے۔ یہ یونیورسٹی ۱۹۲۱ء میں قائم کی گئی۔ اسے بادشاہ باغ میں قائم کیا گیا تھا جو لکھنو کے نوابوں کا ایک خوبصورت باغ ہے۔ یونیورسٹی کی پرانی عمارت کے گنبد ایک عجیب قسم کا منظر پیش کرتے ہیں۔ پوری یونیورسٹی کے سائن بورڈ ہندی میں تحریر کیے گئے ہیں۔ اسی یونیورسٹی میں ایک بارہ دری بھی ہے جو یونیورسٹی کی انتظامیہ کی لاپرواہی کی وجہ سے نہایت ہی خستہ حالت میں ہے البتہ اس بارہ دری کی مسجد میں نماز متواتر ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کی ٹیگور لائبریری قدیم طرز پر بنی ہوئی عمارت بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ پورے ہندوستان میں اس لیے مشہور ہے کیونکہ یہاں قدیم اردو فارسی اور عربی کے قلمی نسخے محفوظ ہیں۔''[۱۲۳]

مصنف کو ہندوستانی تہذیب و تمدن، ادب و ثقافت اور زبان سے گہرا لگاؤ ہے۔ وہ جہاں بھی جاتے ہیں اس جگہ کی تہذیب و تمدن کو اپنے مقامی میں زبان کی بنیاد پر اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا سفرنامہ ''دریائے توی سے موسیٰ ندی تک'' تہذیب و تمدن اور زبان و بیان کا ایک مرکب سفرنامہ ہے۔ یہ سفرنامہ موصوف کے شہر حیدرآباد کے سفر کی روداد ہے۔ جب وہ حیدرآباد دکن ال یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر اور ان کے دو ست پروفیسر بیگ احساس کی دعوت پر ایک زبانی امتحان کے لیے حیدرآباد پہنچتے ہیں۔ شہر حیدرآباد میں بڑی صنعتی ترقیوں سے وہ بے حد متاثر ہوتے ہیں اپنے شہر اور نئے شہر میں تقابل کرتے ہیں۔ نئے بستیاں آباد ہو رہی ہے۔ جس سے تہذیب میں فرق نمایاں ہو رہی ہے۔ اس بات لیتے ہوئے تہذیب و تمدن اور صنعتی ترقی اور نئی اور پرانی تہذیب کے تصادم سے معاشرہ میں ایک خلیج سی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس خلیج گیپ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں جب اپنے شہر اور اس کی تہذیب و تمدن کا نقشہ کھینچتے

ہوئے اوراسکا مقابلہ نئے شہر سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پرانا حیدرآباد بے حد گنجان ہے۔ جس کی وجہ سے سڑکیں نہایت خستہ حالت میں ہیں۔ یہاں مسلمان کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ گوشت کی دکانیں اور حیدرآبادی بریانی کے اسٹال جگہ جگہ موجود ہیں۔ مکانات قدیم طرز کے ہیں۔ مسلمان عورتوں میں پردے کا رواج عام ہے۔ یہاں اکثر اردو کی محفلیں بھی سجائی جاتی ہیں۔ چوڑیوں کا مشہور بازار چار چنار*، سالار جنگ میوزیم پیلس، نواب حیدرآباد میر عثمان علی خان کی پرانی حویلی بھی پرانے شہر میں موجود ہے۔......اس کے برعکس نیا حیدرآباد جدید تہذیب کی زندگی کا مظہر ہے۔ کشادہ سڑکیں اور ان پر گھومتی ہوئی مغربی تہذیب سے متاثر لڑکے لڑکیاں جدید طرز کی بڑی بڑی عمارتیں، ہائی ٹیک سٹی بڑے بڑے عمدہ شاپنگ مال جدید تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہاں حیدرآباد دکن کا سب سے بڑا شاپنگ مال Harbit** انٹرنیشنل مال بھی موجود ہے۔''[۱۲۴]

(نوٹ: 'چارمنار' کی جگہ 'چار چنار' وارد ہوا ہے۔ جو صریحاً کمپوزر کی سہوا ہے۔

*(Harbit Mall)** سے مصنف کی مراد Inorbit Mall ہوسکتی ہے۔ جو ممکن ہے کمپوزر کی سہو سے ہوا ہو۔)*

اس مجموعے میں شامل سفرناموں میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کی تہذیب وتمدن، تاریخ وادب، ثقافت و معاشرت، رہن سہن اور فن تعمیر پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں اردو تہذیب وتمدن، اردو زبان، اس زبان کی لسانی صورت حال اور ممکنہ مستقبل کے بارے میں بھی فاضل مصنف نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ سفرنامہ 'مندروں کے شہر سے گوتم بدھ کی سرزمین تک' میں شہر دربھنگہ کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دربھنگہ نہایت ہی گنجان شہر ہے۔ یہ شہر گلیوں اور کوچوں کا شہر ہے۔ اس شہر کی ایک تاریخی حیثیت بھی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد بہادر شاہ ظفر کے پوتے زبیرالدین گوگالی نے اسی شہر میں پناہ لی تھی۔ یہ صاحب دیوان شاعر بھی تھے اور دارابخت کے صاحبزادے تھے۔ دربھنگہ تالابوں، مچھلیوں اور پان والوں کا شہر بھی کہلاتا ہے۔ اس شہر کی عکاسی میتھلی زبان کے مشہور شاعر سوم دیو نے ان اشعار سے کی ہے

پوکھ مانچھ مکھاں

سرس بولی ملی مکھ پان

یہ شہر خانقاہوں کا شہر بھی کہلاتا ہے۔ جگہ جگہ خانقاہیں اور مزارتیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں حضرت شاہ مخدوم شاہ کشمیریؒ کی مزار کو دیکھنے کا موقعہ بھی نصیب ہوا۔ یہ صوفی بزرگ تھے جو پندرہویں صدی میں پلوامہ کشمیر سے یہاں آئے تھے۔ اور اپنی کرامات کی وجہ سے دربھنگہ میں بے حد معروف ہوئے۔''۱۲۵

'اسفارِ شہاب' میں بیرون ملک کے سفرنامے بھی شامل ہیں۔ ان میں 'مملکت خداداد پاکستان) میں چند روز'، 'لندن سے لندن تک'، 'بے نظیر سے بے نظیر تک' (ماریشس کا سفرنامہ)، 'بنگلہ دیش کے شب وروز اور 'دیارِ یوسف (مصر) میں چند روز' شامل ہیں۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک آج ایک عالمی پہچان کی شخصیت ہیں۔ وہ اکثر ملکی و غیر ملکی سیمناروں، کانفرنسوں اور پروگراموں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ اس کے تحت انہوں نے کئی ممالک کا سفر اختیار کیا ہے۔ ماریشس جیسے خوبصورت ملک میں جانے کا بھی موقع ملا ہے۔ اس سفرنامے کا عنوان ''بے نظیر سے بے نظیر تک'' رکھا ہے۔ دراصل یہ ماریشس انسانی ہاتھوں سے تخلیق کیا ہوا ملک ہے۔ اس میں قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ انسانی صناعی کی عظیم الشان عمارتیں اور شہر قابل دید ہے۔ مصنف نے اپنی تحریر کے جادو سے ایسی منظر کشی کی ہے جس سے اس جزیرے کے خوبصورت مناظر آنکھوں کے سامنے آتے ہے:

'' سب سے پہلے وہ مجھے اس جگہ پر لے گئیں جہاں بارش کا پانی جمع کرکے اسے فلٹر کرنے کے بعد پورے ماریشس کو مہیا کیا جاتا ہے۔ یہ جگہ ایک خوبصورت جھیل کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ دور تک جھیل کا صاف وشفاف پانی دکھائی دیتا ہے۔ جھیل کے ساتھ چائے کے کھیت اور شفاف راستہ اس کی خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ کرتے ہیں۔ آگے جاکر ہم چائے کے سرسبز باغات میں پہنچ گئے۔...یہ راستہ دونوں طرف سے سرسبز اور شاداب درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ دونوں طرف درختوں کی شاخوں نے راستے کے اوپر چھت ڈالنے کا کام انجام دیا تھا۔ جب ہم اس راستے سے گزر رہے تھے تو محسوس ہورہا تھا کہ ہم سرسبز ٹنل سے گزر رہے ہیں۔ یہ منظر میرے دل کو بہت بھایا

۔جنگل سے جاتا ہوا یہ راستہ ایک خوبصورت پہاڑ پر ختم ہوتا ہے۔ یہاں پہاڑ پر دوایک آبشار دیکھنے کا بھی موقع ملا۔''۱۲۶

پروفیسر شہاب عنایت ملک کے سفرناموں کی نوعیت عموماً علمی ہوتی ہے۔ بقول مصنف تجارت، سیاست اور سیاحت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ان کے سفرنامے ان کے مشاہدات و تجربات پر مبنی ہیں۔ اس لیے ان سفرناموں سے علمی و ادبی دنیا کی سیر ہو جاتی ہے۔ جس میں علمی و ادبی شخصیات، طلباء اور لائبریریوں و دانشگاہوں کا ذکر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے مقامی لوگوں کی تہذیب و تمدن، طرز زندگی کو explore کیا ہے۔ کسی بھی سفرنامہ میں سفرنامہ نگار کے لیے متعلقہ مقام کی تہذیب و تمدن، زبان و ادب اور تاریخ و معاشرت کو سمجھنے کے لیے مقامی لوگوں سے بات چیت، مقامی بازاروں اور گلیوں کوچوں میں گھومنے سے ہوتا ہے۔ کیونکہ ان جگہوں میں مقامی لوگوں سے گفتگو کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ جس سے ان لوگوں کی عادات و اطوار، رہن سہن اور مزاج و نفسیات کا پتہ چلتا ہے۔ ان سفرناموں میں بھی یہی اصول اور ضابطہ کارفرما ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ سفرنامے مکمل اور کامیاب سفرنامے بن جاتے ہیں۔ 'دیار یوسف میں چند روز' میں مصر کی زرخیز تہذیب و تمدن کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''نہر کے کنارے بے شمار درخت اور جھاڑیاں اگائی گئی ہیں۔ نہر کے پانی میں ہی فرعونی دور کے ان خداؤں کے بت نصب کیے گئے ہیں۔ جن کی اسلام سے پہلے لوگ پوجا کیا کرتے تھے۔ گاؤں میں کھیت بھی اگائے گئے ہیں جن میں ہل جوتتے ہوئے کسان بھی نظر آئے۔ کبوتر، مرغ، بھیڑ اور بکریاں بھی اس گاؤں میں رکھے گئے ہیں۔ فرعونی دور کے طرز پر کھیل کا میدان بھی اس گاؤں میں تعمیر کیا گیا ہے۔ اس دور کی طرح مٹی سے بنے ہوئے گھر، پوجا کرنے کی جگہ، امیر لوگوں کے گھر اور ان میں استعمال ہونے والی چیزیں، اناج جمع کرنے کی جگہ، غریبوں کا رہن سہن، کاغذ بنانے کا طریقہ، بانس سے بنی ہوئی کشتیاں، شہد نکالنے کا طریقہ، مٹی کے برتن یہ تمام چیزیں فرعونی دور کی تہذیب و تمدن کی عکاسی کرتی ہیں۔ لکڑی کاٹنے کے اوزار، فصل کاٹتی ہوئی عورتیں، عورتوں کے اس زمانے کے زیورات، یہ سب کچھ دیکھ کر انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس دور میں بھی مصر اتنا ترقی یافتہ تھا۔ گاؤں میں چند دوکانیں بھی ہیں جہاں مصری تہذیب سے متعلق بہت ساری چیزیں سیاحوں

کی ترویج وفروغ کے لیے رکھی گئی ہیں۔''۱۲۷

کسی بھی سفرنامے کی کامیابی اس بات پر منحصر ہے کہ سفرنامہ نگار نے جو کچھ آنکھوں سے دیکھا، جو کچھ کانوں سے سنا، اور جو کچھ اس نے محسوس کیا اس کو من وعن اس طرح بیان کرے کہ اس کے مشاہدات کہ جھلک اس کی تحریروں میں آجائے۔ جس سے قاری کو تلذذ کے ساتھ ساتھ اس کی علم وآگاہی میں بھی اضافہ کا باعث بنے۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک کے سفرناموں میں ان باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان سفرناموں کے مطالعے سے نہ صرف قاری کے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ اس کی تفریح طبع بھی ہوجاتی ہے۔ مختصراً یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ سفرنامے یقیناً اردو کے ادبی سرمائے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سفرنامہ حج (2020): محمد الیاس مضمر : یہ سفرنامہ حاجی محمد الیاس مضمر کے سفر حج کی روداد پر مشتمل ہے۔ مضمر کا تعلق خطہء لداخ کے علاقہ دراس سے ہے۔ وہ درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہیں اور ادب سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اردو زبان ان کی مادری زبان نہیں ہے لیکن اپنی محنت سے اس کسبی زبان میں اتنی استطاعت ضرور پیدا کی ہے کہ اپنے حج کے مقدس سفر کی روداد کو سفرنامے کی صورت میں پیش کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس خطہ میں جہاں اردو شاعری، فکشن اور سوانح ادب میں یہاں کے مقامی ادیب اپنی تخلیقات منظر عام پر لا رہے ہیں اور اس سمت میں تیز رفتاری دیکھنے کو ملتی ہے۔ لیکن سفرنامہ کی طرف معدودے چند لوگوں نے ہے توجہ دی ہے۔ اس لیے اس سفرنامے کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کی ادبی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ مصنف کا تعلق خطۂ لداخ کے اس علاقے سے ہے جہاں کے عوام کے لیے اردو ثانوی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو ان کی مادری زبان نہ ہونے کے باوجود بھی اردو سے اُنسیت ومحبت کا نتیجہ ہے کہ اپنے روداد سفر کو اردو میں لکھنے کو ترجیح دی۔ اس کتاب کے لکھنے کے اغراض ومقاصد بقول مصنف خطۂ لداخ کے حاجیوں کے لیے ''سفر محمود'' کے فرائض انجام دینے کے لیے بنیادی معلومات فراہم کرنی ہے۔ چونکہ بیشتر حاجی اردو خواندگان ہوتے ہیں اس لیے یہ کتاب ان کی رہنمائی کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ سفرنامہ نگار نے آسان وسلیس زبان کا استعمال کیا ہے تاکہ عام زائرین (حاجی) حج کے متمنی اس کتاب کو پڑھ کر سفر کے آغاز و اختتام تک تمام بنیادی احکامات، لوازمات اور ارکان بہ آسانی ادا کر سکے۔ جس سے سفر حج میں سہولیتیں میسر ہو

ں۔حاجی کے سفر کی شروعات سے ہوتی ہے۔اس کی تکمیل کے لیے وسائل اہم ہے، پھر کاغذی کاروائی، صحت کا معائنہ، رقومات کی ادائیگی اور قرعہ اندازی جیسے صبر آزما مراحل سے ہے۔مصنف نے اس کتاب میں اپنے اس سفر کے ایک ایک واقعات کو بیان کیا ہے کہ کس طرح تین مرتبہ قرعہ اندازی میں نام نہ آنے پر مایوسی چھا گئی تھی لیکن ایک آس اور امید تھی جس سے مایوسی کے بادل چھٹ جاتے تھے۔آخر صدق دل سے مانگی ہوئی دعا قبول ہو جاتی ہے اور وہ اپنی عمر رسیدہ والدہ کے ہمراہ سفر حج کے لیے ہیں۔ایک حاجی کا اپنے گھر سے نکل کر دیارِ حبیب کا سفر، تی، روحانی اور انی ہے جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں ۔مضمر نے حتی المقدور اس کیفیت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔دراس ہندوستان کا سے زیادہ سرد ترین رہائشی علاقہ ہے۔جو سال کے آٹھ مہینے برف سے ڈھکا رہتا ہے۔سردی کی شدت نقطہ انجماد سے ۵۰ ڈگری نیچے جاتی ہے۔زندگی کی بنیادی وسائل بھی بہت مشکل سے ملتی ہیں۔ایسے علاقے میں جہاں وسائل محدود ہو اور ضروریات لامحدود، ایک سرکاری تنخواہ پیشہ شخص کے لیے سفر محمود کا خواب دیکھنا آسان نہیں تھا۔لیکن ،عزم اور توکل نے اس سفر کو یقینی اور ممکن بنایا۔سال 2015 سے لگاتار قرعہ اندازی میں نام نہ سے انہیں اللہ کا سفر ناممکن محسوس ہو رہا تھا کیونکہ لگاتار چار مرتبہ کام ہو چکے تھے اس حوصلہ شکن اور آزمائش بھرے عرصے سے نکل کر آخر 2019ء میں اس عظیم سفر کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جاتا ہے۔مصنف اپنی والدہ کے ہمراہ حج کے لیے ہیں۔اس وقت کی رقت آمیز لمحے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آخر کار ۲۰۱۹ء میں اللہ رب العزت کی نگاہ کرم ہوئی اور صبر کی گھڑی ختم ہوگئی۔اس عظیم سفر کی اجازت ملی جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے کہ'' بیت اللہ کا سفر کرنے والا میرا مہمان ہے'' جو اللہ کا مہمان ہو میں اس سے بڑا شرف اور کیا حاصل ہوگا۔ایسے سفر کا کیا کہنا جس کہ ہی کچھ یوں ہو'' میں صرف اور صرف رضائے الہیٰ کے لیے بیت اللہ کا سفر اختیار کروں گا اللہ رب العزت میرے اس سفر کو آسان فرمائے اور سفر مبرور کرے''
> آمین!۔''[۲۸]

یہ ایک اہم بات ہے کہ مصنف اپنی عمر رسیدہ ماں کو حج کروانے لے جاتے ہیں۔والد کے گزر جانے کے بعد والدہ کے سفر حج کی خواہش اور فرائض کو پوری کرنے کی ذمہ داری انہوں نے بحسن خوبی نبھائی۔حالانکہ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی۔یعنی اس عمر میں لوگ زمت اور د امور و پیشے میں مصروف رہتے ہیں۔انہوں نے ایک فرض شناس اولاد

ہونے کا فرض ادا کیا۔ اور اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوئے۔ سفرنامے کے مطالعہ سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ دوران حج اپنی تمام عبادات اور ارکانِ حج کی ادائیگی کے دوران بھی گھڑی بھر کے لیے اپنی والدہ سے غافل نہیں رہتے ہیں۔

حج ایک فرد اور اس کے خدا کے درمیان تمام تر تعلقات کو مستحکم کرنے اور روحانی وقلبی قربت حاصل کرنے کے لیے ادا کیا جاتا ہے۔ حج تمام صاحبِ استطاعت مسلمانوں پر فرض ہے۔ ایک بندہ مومن حج کے چالیس دن کے سفر کے لیے تمام عمر انتظار کرتے ہیں یہ چالیس روز کے لمحے زندگی کے سب سے افضل ترین لمحات ہوتے ہیں مصنف نے دوران حج انجام دیے جانے والے امور کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ ان تمام ضروری اسباب اور اشیائے خورونوش کی بھی تفاصیل دی ہیں:

''اکثر دکانوں کے باہر بڑے بڑے بورڈ لگے ہوئے ہوتے ہیں کہ یہاں پر سامان سفر حج کی سبھی چیزیں دستیاب ہیں۔ ایسی ہی ایک دکان میں میں بھی اپنی ضرورت کی چیزیں لینے گیا تو اس نے بہت ساری چیزیں میرے ہاتھ میں تھما دی جو کتاب میں بھی میری نظر سے نہیں گزری تھیں۔ کچھ چیزیں تو میں نے واپس کردی صرف احرام کی چادریں ایک تولیہ والی اور دوسری لٹھہ والی، سفری چٹائی، کمر بند، موٹے جراب، سات دانے والی تسبیح، ہوائی چپل دو جوڑے، دو سوٹ ایک سفید اور دوسرا کسی اور رنگ کا۔ نائلون رسے۔ پوری والا ٹی شرٹ، ایک سوئیٹر، الیکٹرا کیٹل، الیکٹرک کوکر، موبائل پاور بنک، تھوڑا سا ستو، سوکھی دال، سوکھی سبزیاں، نمکین چائے، نمک پیکٹ، ہلدی اور مرچی کی پیکٹ، لیپٹن چائے کی ایک پیکٹ، چینی دو کلو، سوکھا فروٹ اور فی الحال آٹھ کلو چاول اپنے ساتھ لے لیا۔''[۱۲۹]

مصنف نے اپنے روداد سفر کے واقعات اور تجربات ومشاہدات کو بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔ سفر حج محض جسمانی سفر اور مشقت کا ہی نام نہیں ہے بلکہ یہ روحانی سفر اور آزمائش کے مراحل کا نام ہے۔ ان دونوں مراحل سے گزر جانے کے بعد قبولیت کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ مقاماتِ محمود پر دنیا بھر سے حاجی جمع ہوتے ہیں، لاکھوں کی تعداد میں دنیا بھر کے تمام ممالک سے حاجی آتے ہیں ظاہر ہے بھیڑ بھاڑ اور ہجوم سے کئی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ یہی آزمائش کی گھڑی ہوتی ہے کہ حاجی اپنے صبر اور خو کو قربان کرے۔ بیت اللہ میں دوران طواف ہونے والے منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ اللہ کے گھر کا رکن عراقی کو چھوتے ہوئے پھر رکن یمنی کو چھوتے ہوئے ایک لائن سی بنی ہوئی تھی جو بہت دھیرے دھیرے چل رہی تھی، کبھی تو زور کے دھکے کے لائن سی بنی ہوتی تھی، تو کبھی آگے کے دھکے سے پیچھے نکل جاتی تھی، کوئی کمزور آدمی تو جلد سے نکل جانے کی کوشش کرتا تھا۔ تو کوئی پانی پانی کہہ کر۔۔۔ کئی لوگ تو پہنچتے پہنچتے لائن سے نکل جاتے تھے آخر کار تین گھنٹے کی کافی جد وجہد کرنے کے بعد اللہ کا کرم ہوا۔ میں اور امی جان کو حجر اسود کا بوسہ نصیب ہوا تو دل سے کوئی بھاری چیز اٹھائی گئی ہوا یہ مسرت سی حاصل ہوئی ایک ایسی مسرت جو لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتی تین گھنٹے کی محنت و مشقت سے جو تھکاوٹ بدن سے ہوتی تھی وہ پل بھر میں ختم ہوگئی۔ پھر اس کے بعد حطیم کے اندر دو رکعت نماز ادا کی۔ مطاف میں صبح و شام حاجیوں کا ہجوم زیادہ رہتا ہے۔ سے گروپ کی صورت میں آنے والے حاجی صاحبان کا گائیڈ اتنی زور سے دعا وغیرہ پڑھتا ہے۔ جس کی وجہ سے انفرادی طور پر دعا پڑھنے والوں کو بہت مشکل ہوتی ہے۔''[۱۳۰]

اس کتاب میں سفر حج کے تمام لوازمات اور ارکان کی تفصیلات بیان کی گئی ہے۔

من جملہ اس مختصر سفرنامے میں حج کے تمام اراکان، فرائض و سنن وغیرہ کی ادائیگی، ایک مقام سے دوسرے مقام سفر کرنے کے لیے ذرائع کی سہولیات، مدینہ منورہ، مکہ معظمہ اور جدہ وغیرہ میں مقدس مقامات اور دیگر مقامات پر حاضری دینے کے بارے میں تمام تفصیلات، کس مسجد میں نماز کی ادائیگی زیادہ افضل ہے اور کہاں نماز ادا کی جائے، یہاں تک کہ راستے میں ملنے والی اشیائے خورونوش اور دیگر سہولیات وغیرہ کی تفصیلات کو بھی سفرنامہ نگار نے سلیقے سے قلمبند کیا ہے۔ اس کے باوجود بیجا طوالت سے گریز کیا گیا ہے۔ اکثر سفرناموں میں مصنف اپنی آپ بیتی اور لمبی داستانوں کو بیان کر کے سفرنامے کو طویل بناتے ہیں اس سفرنامہ میں کسی طرح کی بے سروپا اور لایعنی باتوں سے احتراز کیا گیا ہے۔ چونکہ مصنف کا مقصدِ واحد یہی ہے کہ اسے بطور حج گائیڈ قاری استعمال کرے۔ شاید یہی وجہ ہے اس میں سفر محمود کے دوران پیش آنے والے امور کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔ عام فہم زبان میں لکھے گئے اس سفرنامہ میں سفرنامہ نگاری کے تمام اصولوں و ضوابط کی پابندی کی گئی ہے۔

غیرمر□ب سفر□ ے:

وہ سفر□ ے جومختلف اخبارات ورسائل میں قسطوار شائع ہوتے رہے اور مر□ب صورت میں د□ یب نہیں ہیں۔

□ ج□ یمی کا سفر□ مہ ''بمبئی سے بمبئی □''(۱۹۸۸):۔ □ ج□ یمی نے ۱۹۸۰ء میں کشمیر کے سرکاری اسکولوں سے بھارت درشن کے لئے آئے ہوئے بچوں اوران کے اسا□ ہ کے ساتھ بمبئی سے گواہ□ کا سفر کیا، اور سفر کے اس روداد کو ''بمبئی سے بمبئی'' □ کے□ م سے ای□ سفر□ مے کی شکل دی اور اپنی کتاب ''چندتحر□ یں'' میں شامل کر کے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔ اس سفر کی تفصیلات، انہوں نے جس اسلوب اور□ از سے مناظر کی تصو□ یکشی کے ساتھ کی ہے، وہ قابل تعریف ہے۔

سورج صراف کا سفر□ مہ ''جموں سے سرؤیں سر۔ مشہور صحافی لالہ ملک راج صراف کے فرز□ اور شہرۂ آفاق تصنیف 'جموں درشن' کے مصنف 'ڈ□ ہ رتن' ا□ □ یفتہ صحافی واد□ ب سورج صراف کا سفر□ مہ ہے۔ جس میں جموں سے سرؤیں سر کے سفر کے روداد کو خوبصورت افسانوی □ از میں پیش کیا□ ہے۔

خواجہ ثناءاللہ □ کا سفر□ مہ□ کستان کا سفر'':۔ روز□ مہ ''آفتاب'' کے□ نی خواجہ ثناءاللہ □ جو اپنے کالم 'خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے' سے جانے جاتے ہیں، نے اپ□ کستان دورے کی واقعات کو سفر□ مہ کی شکل میں □ □ ب دے کر '□ کستان کا سفر' کے عنوان سے 'آفتاب' میں قسطوار شائع کیا۔ اس سفر□ مہ کے ذریعے انہوں نے سرحد کے دونوں اطراف میں بسنے والے لوگوں کے دلی تجر□ ت کو بیان کیا ہے۔ وہ □ □ دینا چاہتے ہیں کہ دونوں ممالک کے عوام آپس میں ملنے کے متمنی ہیں □ حکومتیں اور سیاستدان انہیں ملنے نہیں دیتے۔

صوفی غلام محمد کا سفر□ مہ ''روس کا سفر'': روز□ مہ 'سرینگ□ ٹمنز' کے□ نی صوفی غلام محمد کا 'روس کا سفر' کے□ م سے یہ سفر□ مہ ان کے اپنے اخبار میں قسط وار چھپتا رہا۔

□ ڈوکیٹ غلام نبی ہا□ و کا سفر□ مہ ''سفر□ مہ جینیوا'' : ا□ نی حقوق کے لیے سر□ م اور□ ی □ کے

معروف قانون دان غلام نبی ہا□ و۱۹۹۳ء میں ا□نی حقوق سے متعلق ا□ سیمینار میں شمولیت کے لیے جنیوا گئے اور واپسی □ اپنا سفر□ مہ ''سفر□ مہ جنیوا'' لکھا۔ ہا□ وکا ا□ اور سفر□ مہ ''□ا□'' اور لندن کا سفر'' کے عنوان سے ہے۔

وجیہہ احمد□ رابی کا سفر□ مہ '' □ کستان کا سفر'': وجیہہ احمد□ رابی نے اپنے □ کستان کے سفر کے احوال کو ''□ کستان کے سفر'' کے□ م سے تحر□ کیا جو ہفتہ وار ''چٹان'' میں قسط وار چھپتا رہا۔

غلام نبی شیدا کا سفر□ مہ ''سفر□ مہ □ کستان'': ''وادی کی آواز'' کے مد□ غلام نبی شیدا نے بھی اپنے □ کستان کے سفر کی روداد کو ''سفر□ مہ □ کستان'' کے عنوان سے تحر□ کر کے قسطوں میں اخبارات میں شائع کر□ ۔ اپنے اس سفر□ مے میں انہوں نے مکہ اور مدینہ کے بعد □ کستان ہی کو مقدس سرزمین ٹھہرا□ ہے۔

عبدالغنی شیخ کا سفر□ مہ ''اسلامی جمہوریہ □ ان کا سفر'': خطئہ لداخ کے□ مور محقق اور متنوع اصناف کے قلمکار اور اد□ عبدالغنی شیخ نے اپنے □ ان کے سفر کا احوال اپنے اس سفر□ مہ میں پیش کیا ہے۔

□ تپال سنگھ □ ب کے سفر□ مے:۔ ''□ پ□ مہ'' اور ''لاہو□ مہ'' □ تپال سنگھ □ ب کے سفر□ مے ہیں۔

ان سفر□ موں کے جا□ ے کے بعد □ ت وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ □ □ میں د□ اصناف ادب کی طرح سفر□ مے کا فن بھی اعلیٰ ر□ ت قائم کر چکے ہیں۔ اور سفر□ مے کا یہ درخشاں سفر رواں دواں ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱) اردو ادب میں سفر□ مہ، انور سدی□ ، ڈاکٹر، مغربی□ پ کستان اردو اکیڈمی، لاہور، ص:۴۷

(۲) اردو سفر□ ے انیسویں صدی میں، قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص:۲۰

(۳) اردو ادب میں سفر□ مہ، انور سدی□ ، داکٹر، ص:۴۸

(۴) ایضاً، ص:۴۸

(۵) اردو سفر□ ے کی مختص□ ریخ، مرزا حامد بیگ، ص:۱۲

(۶) اردو سفر□ ے کی مختص□ ریخ، انور سدی□ ، ڈاکٹر، ص:۵۲۔۵۳

(۷) موسموں کا عکس، جمیل زبیری، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص:۹

(۸) اردو سفر□ ے انیسویں صدی میں، قدسیہ قریشی، ڈاکٹر، ص:۱۲

(۹) اردو سفر□ موں کا تنقیدی مطالعہ، خالد محمود، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص:۶۱

(۱۰) عجائبات فر□ ، یوسف خان کمبل پوش، مر□ تحسین فراقی، مکہ بکس، ارد□ زار لاہور، ۱۹۳۸ء، ص: ۶۴۔۶۵

(۱۱) مسافران لندن، مولوی سمیع اللہ خان، مر□ اصغر عباس، ایجوکیشنل □ ہاوس، علی□ ھ، ۲۰۱۲ء، ص۲۵

(۱۲) اردو سفر□ ے کی مختص□ ریخ، مرزا حامد بیگ، ص:۶۸

(۱۳) سفر□ مہ روم و مصر و شام، شبلی نعمانی، دار المصنفین، عظم□ ھ، ۱۳۴۰ھ، ص:۴۰

(۱۴) کشمیر میں اردو، حصہ دوسرا، سروری □ وفیسر، ص:۱۰۱

(۱۵) ایضاً، ص:۱۰۱۔۱۰۲

(۱۶) کشمیر کے دو ادی□ دو بھائی، سروری □ وفیسر، ص:۱۱۹

(۱۷) ایضاً، ص:۱۲۰

(۱۸) جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو□ □ ر□ یمی، ڈاکٹر، رچنا □ □ ، جموں، ۱۹۹۲ء، ص:۲۲

(۱۹) سفر□ مہ کشمیر، منشی محمد الدین فوق، کشمیری □ ین لاہور، دسمبر ۱۹۰۷ء، ص:۹۴

(۲۰) □ش آپ □ نمبر،۱۹۵۶ء،ص:۱۴۹۴

(۱۲) فوق الکشمیر ،اجمل□زی،ڈاکٹر،سنگ میل □ □ ،لاہور،۱۹۹۰ء ،ص:۵۷۷

(۲۲) سف□ مہ کشمیر،منشی محمد الدین فوق،ص:۴۔۵

(۲۳) ایضاً،ص:۵۱

(۲۴) ایضاً،ص:۷

(۲۵) ایضاً،ص:۲۲

(۲۶) ایضاً،ص:۷

(۲۷) ایضاً،۲۸

(۲۸) ایضاً،ص:۳۲۔۳۳

(۲۹) ایضاً،ص:۵۲

(۳۰) ایضاً،ص:۱۱۔۱۲

(۳۱) ایضاً،ص:۵۱۔۵۰

(۳۲) آئینہ کشمیر، . □ بےنظیر کشمیر، پیرزادہ محمد عارف حسین،مخزن لاہور،اکت□ ۱۹۰۶ء،ص:۔۔۔

(۳۳) ایضاً،ص:

(۳۴) ایضاً،ص:

(۳۵) ایضاً،ص:

(۳۶) ایضاً،ص:

(۳۷) ایضاً،ص:

(۳۸) ایضاً،ص:

(۳۹) ایضاً،ص:

(۴۰) ایضاً،ص:

(۴۱) ایضاً،ص:

(۴۲) ایضاً،ص:

(۴۳) ایضاً،ص:

(۴۴) ایضاً،ص:

(۴۵) ایضاً،ص:

(۴۶) ایضاً،ص:

(۴۷) ایضاً،ص:

(۴۸) ایضاً،ص:

(۴۹) جنوبی ہند میں دو ہفتے، جگن ناتھ آزاد، پروفیسر، دہلی، ۱۹۵۱ء، ص:۲۴

(۵۰) ایضاً،ص:۳۱۔۳۲

(۵۱) ایضاً،ص:۴۶

(۵۲) ایضاً،ص:۶۶۔۶۷

(۵۳) ایضاً،ص:۵۳

(۵۴) سحر ہونے تک، آغا جانی کشمیری، ، ۱۹۶۲ء، ص:۲۳

(۵۵) ایضاً،ص:۱۱

(۵۶) ایضاً،ص:۲۹۱۔۲۹۲

(۵۷) ایضاً،ص:۲۹۵۔۲۹۶

(۵۸) ایضاً،ص:۳۱۶

(۵۹) ایضاً،ص:۱۸

(۶۰) نہال کے اس پار، خورشید، ورنگ پبلیشرز، میر پور، ۱۹۸۸ء، ص:

(۶۱) ایضاً،ص:۴۷

(۶۲) ایضاً،ص:۶۴۔۶۵

(۶۳) ایضاً،ص:۱۰۳

(۶۴) اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت، مرتب خواجہ اکرم الدین، پروفیسر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص:۲۱۹

(۶۵) کاروان خیال، غلام نبی خیال، کشمیر راٹس کالنس، ۱۹۹۸ء، ص:۲۵۴

(۶۶) ایضاً،ص:۲۵۳

(۶۷) ایضاً،ص:۲۶۴

(۶۸) ابھی نہ ہے، ملک راج صراف، راج محل پبلیشرز، جموں، ۱۹۸۲ء، ص:۳۵

(۶۹) ایضاً،ص:۴۷

(۷۰) ایضاً،ص:۵۸

(۷۱) ایضاً،ص:۶۲

(۷۲) ایضاً،ص:۷۰

(۷۳) ایضاً،ص:۶۷

(۷۴) ایضاً،ص:۵۶

(۷۵) پاکستان میں دودن، اوم پرکاش صراف، مشمولہ□ □ ابھی ن□ ہ ہے، ص:۸۸

(۷۶) ایضاً،ص:۹۱

(۷۷) پشکن کے دیس میں، جگن ناتھ آزاد پروفیسر، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی ۱۹۸۶ء، ص:۱۱

(۷۸) ایضاً،ص:۴۷

(۷۹) ایضاً،ص:۵۴

(۸۰) ایضاً،ص:۵۷،۵۸

(۸۱) ایضاً،ص:۵۲

(۸۲) ایضاً،ص:۶۴،۶۵

(۸۳) ایضاً،ص:۸۳

(۸۴) ایضاً،ص:۸۴

(۸۵) کولمبس کے دیس میں، جگن ناتھ آزاد پروفیسر، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص:۲۸

(۸۶) ایضاً،ص:۳۲

(۸۷) ایضاً،ص:۳۷

(۸۸) ایضاً،ص:۵۷

(۸۹) انجمن آرزو، حامدی کشمیری پروفیسر، ادارۂ ادب، مسعود منزل، شالیمار، سری نگر، ۱۹۸۸ء، ص۱۸

(۹۰) ایضاً،ص:۲۵

(۹۱) ایضاً،ص:۳۰

(۹۲) ایضاً،ص:۳۸

(۹۳) ایضاً،ص:۵۹

(۹۴) ایضاً،ص:۹۶

(۹۵) ایضاً،ص:۱۲۰

(۹۶) یہ صبح ن□ ہ رہے گی (سفر□ مہ پاکستان)، کشمیری لال ذاکر، سما□ □ پرکاش، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، ص:۱۸

(۹۷) ایضاً،ص:۲۳

(۹۸) ایضاً،ص:۳۲

(۹۹) ایضاً،ص:۱۶۹

(۱۰۰) ایضاً،ص:۶۶

(۱۰۱) ایضاً،ص:۱۶۵

(۱۰۲) ایضاً،ص:۱۶۰

(۱۰۳) ایضاً،۱۸۹

(۱۰۴) شہرہائے نور (سفر□ مہ حج)، نیلوفر□ زنحوی، ڈاکٹر، قادری □ کیشن، سری نگر، ۲۰۱۰ء، ص:۲۵،۲۴

(۱۰۵) ایضاً،ص:۳۵

(۱۰۶) ایضاً،۴۲،۴۳

(۱۰۷) ایضاً،ص:۵۰

(۱۰۸) ایضاً،ص:۱۰۸

(۱۰۹) دوشیزہ ء□ □ نم□ یض،داکٹر،مشمولہ شاعر،ص:۳۔۲

(۱۱۰) ایضاً،ص:۱

(۱۱۱) ایضاً،ص:۴

(۱۱۲) ایضاً:ص:۷

(۱۱۳) میم چوبے□ نم□ یض،ڈاکٹر،مشمولہ ماہنامہ شاعر۔اکت□ ۲۰۰۵ء،ص:۴۳

(۱۱۴) ایضاً،ص:۴۰

(۱۱۵) ایضاً:ص:۴۲

(۱۱۶) د□ پنچ د□ یؤں کا،خالد حسین،جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز،سری نگر،۲۰۱۷ء،ص:۹۹

(۱۱۷) ایضاً،ص:۱۰۰

(۱۱۸) ایضاً:ص:۱۰۳

(۱۱۹) ایضاً:ص:۱۰۷

(۱۲۰) ایضاً،ص:۱۰۳

(۱۲۱) اسفار شہاب،مرتبہ:شہناز قادری،ڈاکٹر،قاسمی کتب خانہ جموں،۲۰۲۰،ص:۴۳

(۱۲۲) ایضاً،ص:۴۵

(۱۲۳) ایضاً،ص:۵۳

(۱۲۴) ایضاً،ص: ۱۱۳۔۱۱۴

(۱۲۵) ایضاً،ص:۸۹

(۱۲۶) ایضاً،ص:۱۸۱۔۱۸۲

(۱۲۷) ایضاً،ص:۲۳۲۔۲۳۳

(۱۲۸) سف□ مہ حج،محمد الیاس مضم□،میزان ببلیشرز،سری نگر،۲۰۲۰،ص:۱۹

(۱۲۹) ایضاً،ص:۲۵

(۱۳۰) ایضاً،ص:۵۷

باب ہفتم : ریاست جموں کشمیر میں رپورتاژ نگاری

رپورتاژ نگاری اردو کی ایک بہترین صنف ہے، جس میں فنی طور پر علمی مجلسوں، ادبی محفلوں، سیمیناروں، کانفرنسوں اور اجتماعات کی روداد پیش کی جاتی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ صنف طویل وقت گذر جانے کے بعد بھی ایک تجربہ کا درجہ رکھتی ہے، جس میں افسانوی انداز کی بجائے اور غیر افسانوی طرز کی روداد نگاری کارفرما ہوتی ہے۔ عام طور پر چشم دید واقعات کو خیال آرائی اور ان کو چاشنی کے ساتھ بیان کرنا رپورتاژ سمجھا جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے رپورتاژ میں جہاں واقعہ کا تفصیلی ذکر ہوتا ہے، وہیں احساسات اور تاثرات کو بھی روداد کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے بیان میں ادبیت اور رومانیت کی روداد ایک جذباتی تصویر کو ابھارتی ہے، اس خصوصیت کی وجہ سے رپورتاژ نے ایک غیر افسانوی صنف ہونے کے باوجود افسانوی انداز کی کارفرمائی کے ذریعے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا۔

کسی واقعہ یا خبر کی رپورٹ اس طرح تیار کی جائے کہ اس میں افسانہ کا انداز پیدا ہو جائے یا مصنف کی شخصیت ابھر آئے تو یہی "رپورتاژ" ہے۔ اس تحریر میں فسوں کا بھی عمل دخل ہے۔ یہ صنف اردو میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر وجود میں آئی۔ اس کا نام فرانسیسی ادب کی دین ہے۔ "رپورتاژ" اس کا فرانسیسی تلفظ ہے۔ انگریزی میں اسے (Reportage) کہا جاتا ہے۔ اردو میں اس ادبی صنف کو رپورتاژ کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انگریزی لغات کے مطالعہ کر کے رپورتاژ کی معنی و مفہوم اور تعریف کا تعین کرتے ہیں تو درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

Reportage

1. The act or technique of reporting news .

2. Reported News.

3. a written account of an act , event , history , etc . based on direct observation or on thorough research and documentation.

انگریزی میں یہ صنف آج بھی صحافت اور ادب کے درمیان ایک اہم کڑی بن کر رہ گئی ہے۔ چونکہ صحافت میں اس کا رجحان زیادہ ہونے کے سبب انگریزی ادب میں اس کی وسعت اہمیت و قدر گھٹتی جا رہی ہے۔ البتہ اردو میں رپورتاژ صرف رپورٹ ہی نہیں بلکہ ایک ادبی صنف کی حیثیت سے اپنا ایک ادبی مقام رکھتا ہے۔ رپورتاژ کا انحصار سچائی اور

حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اکثر رپورتاژ شعوری کوشش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ موضوع کی وحدت برقرار رکھتے ہوئے رپورتاژ میں سلسلہ وار واقعات پیش کیے جاتے ہیں اور اس میں زندگی کے ہر پہلو، واقعے یا حالات سے متعلق گفتگو کی جا سکتی ہے۔ واقعات و حادثہ کی پیش رفت کے روداد کو قلمبند کرنے کا عمل صحافت میں بھی ہوتا ہے۔ خبر نویسی یا رپورٹنگ کی صورت میں۔ ادب میں اس کی خصوصیت اور اہمیت و افادیت کے حوالے سے مختلف محققین کے آراء:

علی سردار جعفری کے مطابق:

''رپورتاژ یہ صحافت اور افسانہ کی درمیانی کڑی ہے۔''

عبدالعزیز لکھتے ہیں:

''رپورتاژ کو عام طور پر رپورٹ اور روزنامچہ کے قبیل کی صنف کہا جاتا ہے یعنی بیتے ہوئے گذرے ہوئے واقعات کی سرگزشت ہے۔''

فرہنگ ادبیات میں رپورتاژ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

> ''رپورتاژ (Reportage): غیر رسمی، غیر صحافیانہ اور بے تکلف اسلوب میں لکھی گئی کسی واقعے یا تقریب کی روداد جس میں بیان کے توضیحی اور تشریحی طریقے بیک وقت بروئے کار لائے جاتے ہیں اور تخیل کی کارفرمائی، مکالموں کے فطری انداز اور انشائیہ کی غیر متفکرانہ آزادی سے خوب کام لیا جاتا ہے۔ محمود ہاشمی کی تحریر ''کشمیر اداس ہے'' اس کی عمدہ مثال ہے۔''[1]

رپورتاژ کی ادبی خصوصیات اور خوبیوں کے باعث ہی اس صنف نے ادب میں اپنا ایک پہچان بنایا ہے ورنہ یہ صحافت تک محدود رہتا۔ اس میں فن، تکنیک، اظہار بیان، زبان و بیان اور زماں و مکاں میں ندرت و وسعت نہ ہوتی۔

رپورتاژ کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہمیں ڈاکٹر سجاد احمد خان کی ان باتوں سے ہو جاتا ہے۔ وہ یوں لکھتے ہیں:

> ''رپورتاژ میں واقعہ کو تمام تر صداقت کے ساتھ پیش کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ اس صنف نے حقیقت کو لطیف، دلکش اور پرکشش انداز میں پیش کر کے قاری کا دل جیت لیا ہے۔ رپورتاژ صرف سماجی اور ادبی اقدار کا حامل نہیں ہوتا بلکہ تاریخی اور سیاسی نقطۂ نگاہ سے حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ زماں و مکاں کا تعین اس طور پر ہوتا ہے کہ اکثر

[illegible]تیں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ رپورتاژ نگار عینی شاہد کی شکل میں واقعہ میں بذات خود شامل رہتا ہے اور اس کے دل میں جو گذرتی ہے اسے وہ رقم کرتا ہے۔ رپورتاژ داخلی اور خارجی احساسات کا حسین امتزاج ہے۔'' ۲

رپورتاژ کی پہچان اس کی اپنی ہیئت سے زیادہ اس کے اظہار میں پوشیدہ ہے۔ اس صنف میں کوئی بھی گذرا ہوا واقعہ اظہار کی تہوں تک پہنچتا ہے اور تخلیق کار کے اندر چھپے ہوئے رومانی احساس کو جگاتا ہے اور پھر مصوّرانہ چابکدستی کے ساتھ ایسی تخلیق کو اجاگر کرتا ہے جو واقعات کی پلیٹ میں مرقع کاری کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو واقعات کی ادبی اور محرکاتی رپورٹ کہہ سکتے ہیں، جس رپورٹ میں جذبات اور واقعات کی عکاسی ہوتی ہے، جس کہ وجہ سے اس صنف میں جذبات اور احساسات کا گذر نہیں ہوتا۔

ان خصوصیات کی وجہ سے رپورٹ کو بہر کیف رپورتاژ سے ایک علٰحدہ صنف ہی تصور کیا جائے گا۔ اس میں رپورتاژ نگار عینی شواہد کے طور پر ٹھوس، صحیح واقعات اور گزرے ہوئے حالات کا بیان کچھ اس انداز سے کرتا ہے کہ اس کے جذبات اور احساسات کی شمولیت بھی ہوتی ہے اور اس کارفرمائی کی وجہ سے اس میں اور نامہ نگاری میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

کسی حادثے، فساد، مفاہمت، [illegible] بندی، لڑائی، ادبی محفل، جلسہ، مشاعرے، کانفرنس، شادی، گھریلو چھوٹی چھوٹی تقاریب وغیرہ۔ ان واقعات کی تفصیلات پیش کیے جاتے ہیں تو ان کی تفصیل رپورٹ یا روداد کہلاتی ہیں۔ رپورٹ میں زبان و بیان کی لطافت، اظہار کی چاشنی اور جزئیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ضروری نہیں ہے۔ یہ مصنف کے تخیل اور قوت حافظہ پر انحصار کرتا ہے کہ وہ اس رپورٹ میں کیسے پیش کرے۔ زبان و بیان کی لطافت، اظہار کی چاشنی، منظر کی دلکشی اور جزئیات کی پیش کشی کو کس طرح اس رپورٹ میں شامل کر کے پیش کیا جائے کہ یہ ادب میں ایک نمایاں درجہ حاصل کر لے۔ کسی واقعے کی خبر یا رپورٹ اس طرح تیار کی جائے کہ اس میں افسانے کا انداز پیدا ہو جائے۔ اس میں صنف کی شخصیت جھلک اٹھے تو یہی رپورتاژ ہے۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

''رپورتاژ کو ہم واقعات کی ادبی محاکاتی رپورٹ کہہ سکتے ہیں ادب کی یہ شکل نہ ہو تو بہت واضح ہے اور نہ اتنی پرانی حدود متعین کئے جا سکے۔'' ۳

رپورتاژ میں مخصوص خبر اور جذبات کی شمولیت کی وجہ سے اس کی تخلیقی حیثیت ایک آزاد صنف کی ہو جاتی ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بیشتر رپورتاژ نگار اپنے اسلوب میں افسانوی طرز کو شامل کر کے اس صنف کو دلکش اور دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو میں بیشتر رپورتاژ نگار یا تو ناول نویس ہیں یا پھر افسانہ نگار ہیں۔ جس کی وجہ سے رپورتاژ کا اسلوب غیر افسانوی ادب سے دور اور افسانوی ادب سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ رپورتاژ کا وہ ظاہری ڈھانچہ، جسے بنیاد بنا کر اس صنف کی شناخت ہو سکتی ہے وہی ہیئت طوالت، ایجاز و اختصار اور ہمہ گیری سے مربوط ہے۔ رپورتاژ میں ابہام افسانوی نوعیت کا نہیں ہوتا بلکہ ان پر حقیقت کا گہرا اثر ہونے کی وجہ سے اس کی ہیئت اور نوعیت افسانوی نہیں بلکہ حقیقت پسند اور غیر افسانوی طرز کی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سجاد احمد خان لکھتے ہیں:

> ''رپورتاژ کی پہچان اس کی اپنی ہیئت سے زیادہ اس کے اظہار میں پوشیدہ ہے۔ اس صنف میں کوئی بھی گذرا ہوا واقعہ اظہار کی تہوں تک پہنچتا ہے اور تخلیق کار کے اندر چھپے ہوئے رومانوی احساس کو جگاتا اور پھر مصورانہ چابکدستی کے ساتھ ایسی تخلیق کو اجاگر کرتا ہے جو واقعات کی لپیٹ میں مرقع کاری کا درجہ رکھتا ہے رپورتاژ کو ایک غیر افسانوی صنف کا درجہ حاصل ہے۔ جس میں افسانویت اور کہانی پن کا وجود نہیں ہوتا بلکہ گذرے ہوئے واقعات کی دلچسپ انداز میں تصویر کشی ہوتی ہے۔''[۲۴]

ساخت، معنی اور اظہار کے ذریعے کسی فن پارے کا وجود عمل میں آتا ہے، چنانچہ رپورتاژ کی صنف میں بھی ایک ہیئتی اکائی رکھنے کے باوجود معنی اور اظہار کے معاملے میں افسانوی اور غیر افسانوی دونوں طرز اسلوب سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ جس سے اس کے طرز بیان میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔

موضوع اور مناسب الفاظ کے سہارے صحافی واقعے یا حادثے کی رپورٹنگ کرتا ہے۔ جب کہ رپورتاژ کے لیے لازمی ہے کہ وہ واقعہ کے بیان اور تصویر کشی کے دوران اس قدر ڈوب جائے کہ اس کی شخصیت واقعہ سے منسلک ہو کر واقعے کے ایک جز کا درجہ حاصل کر لے۔ اس عمل سے گزرنے کے بعد لکھا جانے والا رپورتاژ ہی حقیقی روداد پیش کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔

رپورتاژ میں افسانویت کا عمل اظہار کی حد تک رکھا جاتا ہے، اس صنف میں افسانویت کا دخل ہونا ایک ایسا عمل ہے، جس کی وجہ سے مواد اور ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ اس کے اظہار میں حسن اور جمالیاتی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔

کسی حادثہ، واقعہ پہ ام کا رپ یہ ا ایسا عمل ہے جو حقیقت کی ہی کہ ہے۔ واقعہ کو ئیات کے ساتھ بیان کہ ضروری ہے کہ اس صنف کی دی ضرو یت کی تکمیل ہو سکے سیل کے لیے اختصار کی جانے والی ن نہ صرف الفاظ و معنی اور مفہوم کو ادا کرتی ہے بلکہ پیکر ، ایمائیت پھر جمالیاتی احساس کے ذکر کا ذریعہ اظہار ہے، جس کی وجہ سے ذوقِ سلیم کی ۔ اور مفہوم کی ادائیگی کا حق ادا ہے۔ ہر فن پ رہ کے اظہار کے لیے قوتِ تحر اس کی صنفی حیثیت کے لحاظ سے مختلف ہو جاتی ہے۔

اس میں اد ، صحافت، افسانوی اور روما کا حسین امتزاج ہے جس کی وجہ سے رپو ژ کی قوتِ تحر اظہار کی تمام لذت اور ادبی از کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس صنف میں سوا از، خاکہ کی کیفیت، ا ئیہ کا دوربست، ڈرامے کی مکالماتی روش کے ساتھ ساتھ سفر مے کی حقیقت، صحافت کی مبصرانہ شان اور روداد رپورٹنگ کی ہمہ گیری کا ایسا تسلسل پ جا ہے۔ جس کی وجہ سے اس صنف میں د ی اصناف کی ی ی ں ہونے لگتی ہے۔

موضوع کی وحدت کو قرار ر ہوئے رپو ژ میں سلسلہ وار واقعات اکثر پیش کئے جاتے ہیں۔ رپو ژ نگار کسی ا واقعہ کے دامن میں چھوٹے چھوٹے بہت سے واقعات کو موضوع سے متعلق ہوں اور جن سے وحدتِ ژ مجروح نہ ہو اس صنف کے دامن میں سمیٹ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ فروع توں کو چھو ' از ک بھی ضروری ہے۔ حالا ی ب رکھا جا ہے کہ رپو ژ نگار کے لیے لازم ہے کہ وہ جس طرح، جس شکل میں، جس وقت واقعات و حادثے کو دیکھے اسے اسی طرح کسی قسم کی کمی پیشی ی ردّ ب ل کے بغیر تحر یر کر دے نہ اسے سوچنے کا حق ہے کہ آگے کیا ہوگا اور نہ اسے واقعات کی معنوی میں ہی کمی ہو جا چاہئے لیکن اکثر رپو ژ واقعات کے کچھ پہلوؤں کو از کر ہے ی ان پ کم توجہ دیتا ہے اور کچھ پ ی دہ توجہ دیتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی یہ بھی ہے کہ واقعے ی حادثے کا اظہار کرتے ہوئے غیر شعوری طو پ ماضی کی ی دوں کا دفتر کھل جا ہے۔

رپو ژ ا ایسی صنف ہے جس میں خار ی اور داخلیت کا حسین امتزاج ہے۔ وہ ا دوسرے سے شیر و شکر ہوتی ہیں اور دونوں ہی اس صنف کے معیار کا تعین کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ رپو ژ صرف چشم واقعات پ لکھا جا سکتا ہے۔ سنے سنائے واقعات پ لکھی گئی کوئی تخلیق افسانہ ول ی ڈراما تو ہو سکتی ہے رپو ژ نہیں۔ رپو ژ

میں فن کار عصر حاضر کی تصویر پیش کرتا ہے اور اسرار کے پردے فاش کیے جاتے ہیں۔ رپورتاژ میں واقع نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری، جزئیات نگاری کے بہترین نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ اپنے عہد کی دستاویز ہوتی ہے۔ رپورتاژ میں جزئیات کی پیش کشی کسی ناول یا افسانے کے بیان کی طرح ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے رپورتاژ کی صنف میں اور دوسرے غیر افسانوی ادب کے مقابلے میں زیادہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صنف میں زبان و بیان سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اردو میں رپورتاژ نگاری کے آغاز اور پہل کے متعلق پروفیسر مجید بیدار رقمطراز ہیں:

> ''اردو میں باضابطہ رپورتاژ نگاری کا آغاز ۱۹۴۰ء میں سجاد ظہیر کے لکھے ہوئے رپورتاژ ''یادیں'' سے ہوا۔ جب ۱۹۴۵ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہوئی تو اس کی روداد کرشن چندر نے ''پودے'' کے نام سے لکھی جو ممبئی کے ہفتہ وار ''[illegible]م'' میں شائع ہوئی بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی۔ اس تفصیلات کے مطابق سجاد ظہیر کی تصنیف ''یادیں'' کے بعد کرشن چندر کی تصنیف ''پودے'' کو اردو کا دوسرا رپورتاژ کہا جائے گا۔''۵

کسی بھی فن پارے کی شناخت، پہچان اور ہئیت کو قائم رکھنے کے لیے کچھ اصول وضوابط کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے کہ اس کی ہئیت اور ساخت کی وجہ سے وہ دوسری اصناف سے جدا ہو۔ ڈاکٹر سجاد احمد خان نے رپورتاژ کو رپورٹ، روزنامچوں اور دوسری اصناف سے ممتاز اور ممیّز کرنے کے لیے کسی بھی متن میں درج ذیل اصولوں کی جانچ کو ضروری قرار دیا ہے۔

(۱) اسلوب (۲) ہئیت (۳) صحافت (۴) رومانیت (۵) افسانویت (۶) واقعیت (۷) قوتِ تخیل (۸) اقتباسی عمل (۹) جریدہ [illegible]ازی۔

(۱) اسلوب : رپورتاژ میں مخصوص خبریہ اور جزئیات کی شمولیت کی وجہ سے اس صنف کی تخلیقی حیثیت ایک آزاد صنف کی ہو جاتی ہے۔ خاص قسم کی لفظیات جو عمیق مشاہدہ کے نتیجہ میں فنکار پر اثر انداز ہوتی ہیں اور رپورتاژ کی اسلوب کی شکل میں اختیار کر لیتی ہیں۔ کیونکہ رپورتاژ کا ایک مخصوص ڈکشن ہوتا ہے اس لیے اس کا اسلوب دوسری اصنافِ سے بالکل مختلف ہے۔

(۲) ہئیت : واقعہ کی ہمہ گیری یا اس کی وسعت کے بیان کے لیے رپورتاژ نگاری میں جو طرز اختیار کیا جاتا ہے

اسے ہئیت کہا جاتا ہے۔ رپورتاژ کا وہ ظاہری ڈھانچہ جسے بنیاد بنا کر اس صنف کی شناخت ہو سکتی ہے وہ ہئیت طوالت، ایجاز و اختصار اور ہمہ گیری سے مربوط ہے۔

(۳) صحافت: مبصرانہ شان اور روداد نگاری کی خصوصیات ایک رپورتاژ میں صحافت کے ذریعے پیدا ہوتی ہے۔ صحافت کا مقصد ترجمانی، اظہارِ واقعہ اور اطلاع دینا ہے جس کے لیے موزوں اور مناسب الفاظ کے سہارے صحافی اصل حادثے یا واقعہ کی رپورٹنگ کرتا ہے۔ اگرچہ صحافت کی جملہ ضروریات کی تکمیل رپورتاژ نگاری میں ہوتی ہے لیکن رپورتاژ اور صحافی میں بنیادی فرق یہی ہے کہ صحافی واقعہ کی روداد بیان کرنے کے دوران معروضی طرز اختیار کرتا ہے اور اپنی شخصیت کو روداد سے علیٰحدہ رکھ کر صحافت کی رپورٹنگ کا حق ادا کرتا ہے جبکہ رپورتاژ نگار کے لیے لازمی ہے کہ وہ واقعہ کے بیان اور تصویر کشی کے دوران اس قدر ڈوب جائے کہ اس کی شخصیت واقعہ سے منسلک ہو کر واقعہ کے ایک جُز کا درجہ حاصل کر لے۔

(۴) رومانیت: عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جنس اور جذبہ کا اظہار رومانیت ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ خاص قسم کی لفظیات اور یکساں طرز اور جذباتی وابستگی کو مخصوص انداز میں بیان کرنا بھی رومانیت ہے۔ رپورتاژ نگاری میں اس قسم کی رومانیت کا سہارا لیا جاتا ہے۔ لفظوں کا تسلسل، احساسات کی ہم آہنگی اور جذبات کی برافروختگی کے ساتھ ساتھ تخیل اور تعین کا ایک ایسا جادوئی سلسلہ جو واقعہ یا روداد بیان کرنے کے دوران اختیار کیا جاتا ہے وہ رپورتاژ نگاری کی روح ہے۔

(۵) افسانویت: واقعات، کردار، پلاٹ اور آغاز و اختتام سے مربوط من گھڑت واقعہ کو افسانہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ چونکہ افسانہ میں کردار حقیقی نہیں ہوتے اور واقعہ بھی خیالی ہوتا ہے اس لیے اس کے بیان کرنے کے لیے اختیار کیا جانے والا طرز مخصوص لفظیات اور جمالیاتی احساس کی وجہ سے افسانویت کی دلیل سمجھا جائے گا لیکن رپورتاژ میں اس کا دخل حد درجہ کم ہی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ رپورتاژ نگار حقیقی واقعہ کو افسانویت کے ذریعہ دلفریب بنا کر جذباتیت پیدا کرنا چاہتا ہے

(۶) واقعات: کسی حادثہ، واقعہ یا ہنگامہ کا رونما ہونا ایک ایسا عمل ہے جو حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے۔

چنانچہ کسی واقعہ یا حادثہ سے روداد بیان کرتے وقت اس کے لوازمات اور جزئیات کو اپنی قوتِ تمیز سے پیش کرنے کا عمل ایک علیٰحدہ صنف تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن سماجی، معاشی، ادبی اور معاشرتی سطح پر رونما ہونے والے کوئی بھی مرحلہ بہر حال واقعات کی دلیل ہوتا ہے۔

(۷) قوتِ تحریر: رپورتاژ نگاری کی قوتِ تحریر میں حقیقتوں کی عکاسی، شعوری رویوں کی دلی وابستگی اور اجتماعی کیفیتوں کی معرکہ آرائی اس طرح کارفرما نظر آتی ہے جس میں قوتِ تحریر کا ایک اچھوتا انداز نمایاں ہوتا ہے۔

(۸) اقتباسی عمل: رپورتاژ میں اقتباسی عمل غیر افسانوی نثر سے زیادہ افسانوی ادب سے مستفید ہوتا ہے۔ صرف داستان نگاری کو چھوڑ کر افسانہ، ناول، ڈرامہ وغیرہ کی بے شمار خصوصیات رپورتاژ میں دکھائی دیتی ہیں۔

واقعات و حادثات: رپورتاژ میں صرف یہ کام نہیں ہے کہ واقعات و حادثات کو سطحی نظر سے دیکھ کر فیصلہ کرے بلکہ گزرے ہوئے واقعات و حادثات اور لمحات کی تہہ تک جائے اور ہر نکات کو عمدہ طریقہ سے تحقیق کر کے تجزیہ کرے۔ یہ بات بھی ہمیں ذہن نشین رکھنا ہے کہ جو عام تجزیہ کر رہے ہیں اسے سادگی کے پیرائے میں بالکل نئے طرز و انداز بلکہ اچھے، پُر لطف اور دل کو موہ لینے والے انداز میں پیش کریں۔ بقول ڈاکٹر طلعت گل:

> ''رپورتاژ نگار اپنے کانوں پر بھروسہ نہیں کرتا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور دل میں محسوس کرتا ہے کچھ لوگوں کو خیال ہے کہ آنکھوں سے دیکھنے کے علاوہ سنے سنائے واقعات و حادثات پر بھی رپورتاژ لکھا جا سکتا ہے۔ یہ درست نہیں کیونکہ رپورتاژ میں مصنف کا موضوع سے براہ راست تعلق بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور رپورتاژ کا بیان مستند ہو جاتا ہے۔''[۶]

رپورتاژ نگاری کو ایک صنف کا درجہ حاصل ہونے سے پہلے اس طرزِ تحریر نے مختلف انداز میں سفر کیا۔ اس کے نقوش داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، خاکہ، سفرنامہ جیسے اصناف میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی صنفی تعین سے قبل اس کی جھلک مختلف اصناف ادب میں ملتی ہے۔ لیکن اردو ادب میں مکمل طور پر رپورتاژ ترقی پسند تحریک کے نتیجے میں وجود میں آئی، اس کا فن، اسلوب اور تکنیک کے پیمانے کے لحاظ سے لکھنے والے ادیب سجاد ظہیر ہیں جنہیں اردو کا پہلا رپورتاژ نگار کہا جاتا ہے۔ جنہوں نے ترقی پسند تحریک کے سہ میوں کی رپورتاژ ''یادیں'' کے عنوان سے لکھی۔ اس کے بعد کرشن چندر کے ''پودے'' منظر عام پر آئی جس میں 1945ء کے ترقی پسند تحریک کے کانفرنس کی روداد کو قلمبند کیا ہے۔ اس کے بعد اس کی

فہر □ لمبی ہے۔قرۃ العین حیدر،عصمت چغتائی،ظفر پیامی،ظ۔ا□ ری،□ ابراہیم جلیس،فکرتو□ی□ جوف سامری، شاہداحمد دہلوی،انورعظیم،□ یحیٰ مستور،□ افاضلی ،انورعظیم،عبداللہ ملک،نعیم ا □ وغیرہ نے اس صنف کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔

□ □ جموں وکشمیر میں ر□ ژ نگاری کی□ ریخ اورروا□ □ تحقیق کرنے کے لیے کتابوں و د□حوالا جات اورد□ ذرائع سے استفادہ کرکے اس کی پوری□ ریخ دیکھی لیکن ا□ مایوس کن□ ت یہ سامنے آئی کہ پوری ا□ صدی سے زا□ عرصے کی ادبی□ ریخ میں جموں وکشمیر میں آج □ صرف گنتی کے چند ہی ر□ ژ منظر عام□ آئے ہیں □ ضابطہ طور کسی نے اس صنف کی طرف توجہ نہیں دی اور مستقل طور□ اسے وسیلہ اظہار نہیں □ البتہ مختلف رسائل میں اس کے نمونے ملتے ہیں لیکن ان میں سے بھی بیشتر کا موضوع ا□ مخصوص طبقہ فکر کی حما□ کی□ ہے۔جو علیحدگی پسند اور عسکری تحر□ں کی روداد کی رپورٹوں□ مشتمل ہیں۔علاوہ ازیں ان میں وہ ادبی جان نہیں کہ جن کی بنا□ ان کو کامیاب ر□ ژ کہا جا سکے۔اور ایسے ر□ ژ کو یکجا کرکے کام کی□ بھی بے مقصد سا ہوگا۔کیو□ ان میں کسی بھی پہلو سے□ ر□ ادبی□ ت نہیں ہوتی۔□ یہ ا□ خوش آئند□ ت ہے اس کمی کا ازالہ محمود ہاشمی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''کشمیر اُداس ہے'' لکھ کر کی۔''کشمیر اُداس ہے''□ □ جموں وکشمیر میں واحد ر□ ژ ہے جو مختلف اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ جس کو اردو ادب میں ا□ ممتاز مقام اور اہمیت حاصل ہے۔

''کشمیر اُداس ہے'' (1950): سلطان محمود ہاشمی: اردو کے ا□ خوبصورت اور اہم ر□ ژ ''کشمیر اُداس ہے'' کے مصنف سلطان محمود ہاشمی کا تعلق مظفر□ د مقبوضہ کشمیر سے ہے۔انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے اور علی□ ھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے'ایل ایل بی' کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۴ء میں□ نس آف ویلز کالج جموں اور پھر امر سنگھ کالج سری نگر میں بطور لکچرار□ مات سرا□ م دیں۔۱۹۴۷ء کے□ آشوب اور ہنگام□ ور دور میں محمود ہاشمی ،شیخ عبداللہ کی امن فوج جسے عرف عام میں ہوم گارڈ کہتے تھے میں ا□ کم□ ر کی حیثیت سے کام کرتے رہے پھر تقسیم کے بعد جنوری ۱۹۴۸ء میں وہ□ کستان چلے گئے۔ان کے کشمیر اور ہندوستان چھوڑنے کی وجہ اور □ کی پوری داستان اس ر□ ژ سے عیاں ہوجاتی ہے کہ کس طرح سے کشمیر سے ہوتے ہوئے انہیں□ کستان کا رخ کر□ ا۔۱۹۴۸ء سے

۱۹۵۳ء تک مختلف اوقات میں حکومت مقبوضہ کشمیر کے چیف پبلسٹی آفیسر اور حکومت پاکستان کے محکمہ تعلقات عامہ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور ریسرچ آفیسر مقرر رہے اور اس دوران میں وہ ریڈیو مقبوضہ کشمیر سے ادبی اور تہذیبی نوعیت کے پروگرام بھی نشر کرتے رہے۔

مقبوضہ کشمیر کی صورت نئی حکومت قائم ہوئی تو محمود ہاشمی مقبوضہ جموں وکشمیر کے چیف پبلسٹی آفسر کے منصب پر فائز ہوگئے یہاں اپنی منصبی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کی تسکین کا سامان بھی کرتے رہے بقول قدرت اللہ شہاب:

> ''اچانک ایک خبر ملی کی محمود ہاشمی کی کتاب 'کشمیر اداس ہے' شائع ہو کر بازار میں آ گئی ہے۔ میری طرح جس کسی نے اس کتاب کو پڑھا وہ اس سے بے حد متاثر ہوا۔ یہ کشمیر سے تعلق اس سے بہتر رپورتاژ اور کسی نے نہیں لکھا مجھے آج تک اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ جنجال ہل میں ہم سب کی نظر بچا کر محمود ہاشمی نے ایسے عجیب وغریب کتاب اور کیسے تصنیف کر ڈالی؟ ۔۔۔۔ کشمیر کا مسئلہ لٹکتا رہے یا حل ہو جائے اس کتاب کی ادبی اہمیت و افادیت دونوں صورتوں میں برقرار رہے گی۔''[ے]

۱۹۵۳ء میں محمود ہاشمی انگلستان چلے گئے جہاں انہوں نے لیڈر یونیورسٹی لندن اور برمنگھم یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویٹ اسناد حاصل کیں پھر ۱۹۶۱ء میں انہوں نے لندن سے اردو کا پہلا ہفت روزہ ''مشرق'' جاری کیا لندن سے اردو اخبار کے اجرا کے باعث وہاں کے ادبی حلقوں میں وہ ''بابائے اردو صحافت'' کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

> ''۱۹۵۳ء میں محمود ہاشمی اچانک انگلستان چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو لیے پہلے محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے اور پھر (Race Relations) کے اداروں کے ساتھ منسلک ہو گئے اور اس کے بعد لندن میں اردو کا پہلا باقاعدہ اخبار ہفت روزہ 'مشرق' عنایت اللہ مرحوم کے تعاون سے جاری کیا اس اخبار کا ڈنکا کئی برس تک بجتا رہا پھر یہ ریت چل نکلی اور رفتہ رفتہ اردو صحافت نے انگلستان میں اپنے پاؤں جما لیے ۔۔۔۔ انگریزوں کی سرزمین میں اردو کا پودا لگانے کا سہرا محمود ہاشمی کے سر ہے۔''[۸]

□ طا□ میں قیام کے دوران میں ان کی علمی و ادبی کاوشوں میں ’ہم یہاں کیسے پہنچے‘‘ مطبوعہ افکار کراچی ۔
’’□ طا□ کے سرکاری اسکولوں میں اردو تعلیم‘‘ (مطبوعہ مقتدرہ قومی □ ن اسلام □ د) اور ’’اردو سیکھنے کا قاعدہ‘‘ وغیرہ
شامل ہیں لیکن ان کی قابل ذکر اور قابل قدر تصنیف ’’کشمیر اُداس ہے‘‘ ہی کو قرار □ جا□ ہے۔

ہمارے ہاں کسی اد□ شاعر کی اہمیت اور قدر و قیمت کا تعین اس کی شہرت سے کر لیا جا□ ہے لیکن یہ ا□ غیر
حقیقت پسندانہ رجحان ہے کیو□ شہرت ہی کو کسی کا ادبی مقام متعین کرنے کی واحد کسوٹی مان لیا جائے تو اردو شاعری اور
ادب کے بہت اہم □ م بھی شہرت کی بلندی کو نہیں چھو سکے لیکن ادب میں ان کا □ قابل فراموش ہے۔ □ دکنی اہم
شاعر نہیں لیکن انہیں وہ شہرت حاصل نہیں جو □ اور غا□ کے حصے میں آئی اور اسی طرح اردو □ میں میر امن کی اہمیت
سے کسی کو انکار نہیں لیکن انہیں وہ شہرت حاصل نہیں ہوتی جو □س بخاری کو نصیب ہوئی چنانچہ ہم کہہ □ ہیں کہ شہرت
اپنی جگہ اور اہمیت اپنی جگہ محمود ہاشمی اردو ادب کا ا□ ایسا ہی □ م ہے جنہیں شہرت تو □ دہ حاصل نہیں ہوئی لیکن ان کی
ادبی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

محمود ہاشمی کی تصنیف ’’کشمیر اُداس ہے‘‘ پہلی □ ر ۱۹۵۵ء میں چھپی اس کا دوسرا □ □ چوالیس سال بعد ۱۹۹۹ء
میں منظر عام □ آ□ ۔ دو سو صفحات □ مشتمل یہ کتاب ان چار ابواب □ مشتمل ہے، ’’چناروں کے آگے‘‘، ’’پیر پنجال کے
قیدی‘‘، ’’□ت کے درمیان‘‘ اور ’’جموں ا□ شہر تھا عالم میں انتخاب‘‘۔ کتاب کے دوسرے □ □ میں چوالیس سال
بعد ’’کچھ اپنی □ تیں‘‘ کے عنوان سے مصنف نے انتہائی دلنشیں □ از میں اپنی اس چوالیس سالہ □ گی کی جھلک اس
طرح پیش کی ہے کہ کچھ اضافوں کے ساتھ یہ حصہ از خود ا□ دلچسپ کتاب اور مصنف کی سوانح کا درجہ حاصل کر سکتا
ہے۔

’’کشمیر اُداس ہے‘‘ کے □ رے میں یہ جملے لکھتے ہوئے مجھے کوئی جھجھک محسوس نہیں ہو رہی کہ:

’’کشمیر اُداس ہے‘‘ اردو کا بہترین رپو□ ژ ہے۔

’’کشمیر اُداس ہے‘‘ ا□ سچا رپو□ ژ ہے۔

۱۹۴۷ء کا مبارک سال □ صغیر میں آزادی کی نو□ لے کر آ□ ۔ انگر□ وں کے اقتدار کا سورج ڈوب چکا تھا۔ قیام
□ پکستان نے اہل کشمیر کو بھی ا□ □ بہ اور آزادی کا پیغام □ تھا۔ انہوں نے اس پیغام □ لبیک کہتے ہوئے اپنی آزادی

کے لیے مسلح □ وجہد کا آغاز کیا۔ مہاراجہ کشمیر نے کشمیر کی عوام کی مرضی کے خلاف مسلم اکثریتی □ دی کی اس □ □ کا الحاق ہندوستان سے کر □ حالا □ مذہبی، جغرافیائی اور تمدنی ہم آہنگی کے □ □ کستان کا حصہ ہونے □ زور دیتے رہے کچھ لوگ علیحدہ رہنے کے حق میں تھے۔ قہر درویش □ جان درویش کے مصداق کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ (شیر کشمیر) جو اس وقت □ مسلم □ ن کشمیر کے حقوق کے □ سبان اور محافظ تھے اب ون □ اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کی دوستی میں مبتلا ہو کر مہاراجہ کشمیر اور ہندوستانی نقطہ □ کے ہمنوا ہو چکے تھے اور اب وہ کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

مہاراجہ ہری سنگھ اور شیخ محمد عبداللہ کے اس یکطرفہ فیصلے کے خلاف اہل کشمیر نے مسلح □ وجہد کا آغاز کر □۔ اس □ وجہد کا آغاز ان علاقاتوں سے جو اب مقبوضہ کشمیر میں شامل ہیں۔ وہاں کی طرف سے قبائیلی لوگوں نے □ رہمولہ کی طرف سے حملہ کر □۔ سری نگر سے چند میل دور مہورہ کے بجلی گھر □ کنٹرول حاصل کیا۔ جس سے سری نگر میں مہاراجہ ہری سنگھ کے محلات □ ریکی میں ڈوب گئے۔ سری نگر کے عام مسلمان ان فا □ کو خوش آمد □ کہنے کے لیے بیقرار تھے، ڈ □ ہ مہاراجہ اس حملے کی □ ب نہ لا کر اپنے اہل وعیال سمیت سری نگر سے □ گ چکا تھا، قبائلو □ عرف عام میں مجاہدوں کا سری نگر کو فتح کر □ یقینی تھا لیکن اس سے پہلے ہی سری نگر کے ہوائی اڈے □ ہندوستانی فوجیں □ چکی تھیں۔ اب ڈ □ ہ فوج اور ہندوستانی فوج کو ہندوستانی فوج اور فضائیہ کا مکمل تعاون حاصل ہو □ یہ صورت حال قبائلوں کے لیے □ دہ حوصلہ افز □ □ نہ ہوئی چنانچہ صورت حال یکسر □ ل گئی۔ شیخ محمد عبداللہ نے قبائلوں سے مقابلے کے لیے ہندوستانی فوج کی تعاون سے کشمیر میں جو امن فورس قائم کی تھی جس کا مقصد مجاہدین کی یلغار کو روکنا اور اقتدار کو بچا □ تھا۔ 'کشمیر اُداس ہے' کے مصنف محمود ہاشمی بھی اس امن فورس کے ا □ □ کما □ ر کے طور □ اپنے فرائض سرا □ م دے رہے تھے۔ بقول مصنف شیخ محمد عبداللہ کے □ عاقبت □ یشانہ فیصلے نے آزادی کا خواب دیکھنے والی آنکھوں کو نم کر □ ''کشمیر اُداس ہے''، اسی پس منظر اور المناک □ ر □ حقیقت □ □ ر □ □ ثر ہے۔ بقول مصنف:

> ''۱۹۴۷ء کے آ □ ی مہینوں میں □ سیا □ □ یہ □ نئے پینترے □ ل رہی تھی۔ میں سری نگر کے امر سنگھ کالج میں □ ھ □ کر □ تھا پھر حالات نے مجھے بھی زمانے کی اس نئی رو کے ساتھ بہا □ اور ہوم گارڈز کے ا □ □ کما □ ر کی حیثیت سے نیشنل کا □ نس کے احکام کے تحت نومبر میں جموں کے صوبے میں امن کا □ چار کرنے کے لیے بھیج □ □ ---- یہ کتاب میرے انہی

دنوں کے مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ ان میں میرے تخیل کو ذرا بھی دخل نہیں صرف طرزِ بیان میرا ہے اور اس میں جن کرداروں کا ذکر آیا ہے وہ سارے اصلی ہیں۔ سارے میرے جانے پہچانے۔''[9]

''کشمیر اُداس ہے''، جس دور میں لکھی گئی وہ رپورتاژ لکھنے کے لیے بڑا مناسب وقت تھا کیوں کہ بقول ممتاز شیریں:

''ہنگاموں کے دوران عموماً یہ چیز دکھائی دی ہے کہ تخلیقی تحریروں کی بجائے صحافت نگاری اور فکشن کے درمیان کی چیزیں جیسے رپورتاژ وغیرہ زیادہ رواج پاتی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں کچھ نہیں تو انگریزی ادب میں رپورتاژ اس کثرت سے لکھے جانے لگے کہ جان لیمن کو خوف ہونے لگا کہ کہیں انگریزی ادب میں ہمیشہ کے لیے یہی صنف حاوی نہ ہو جائے۔''[10]

محمود ہاشمی ۱۹۴۷ء کے ان حالات و واقعات کے صرف چشم دید گواہ ہی نہیں بلکہ خود ان واقعات کا حصہ بھی رہے ہیں اور اس طرح اس تصنیف کی حیثیت دوچند ہو جاتی ہے کہ جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ محض کتابوں اور روایت کے سہارے لے کر بیان نہیں ہوئے بلکہ آنکھوں دیکھے ہیں۔ مصنف نے کشمیر میں، صوبہ جموں میں، نہال، رام بن اور بٹوٹ میں جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے بڑے خلوص اور فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا خود کو اس تاریخ کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔

''کشمیر اُداس ہے'' کے پہلے باب ''چناروں کی آگ'' میں مہاراجہ ہری سنگھ کے خلاف ہونے والی عام بغاوت کو بیان کیا گیا ہے۔ ''پیر پنجال کے قیدی'' میں قاری کو اس بغاوت کا ردِ عمل کرداروں کے اندر دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ ''قوتوں کے درمیان میں'' یہ بتایا گیا ہے کہ ایک قومی سیاسی پارٹی کا پرچار کرنے والوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا لاوا کس طرح کھول رہا تھا۔ آخری باب ''جموں ایک شہر تھا عالم میں انتخاب'' میں جموں اور یہاں آباد مسلمانوں کی تباہی کا خصوصی ذکر ہے۔ ان میں سے ہر حصہ ایک مکمل اکائی بھی ہے اور دوسرے حصوں کے ساتھ باہم مربوط بھی۔

رپورتاژ کا یہ وصف ہے کہ اس میں واقعات کا بیان بالکل صحافتی اور خارجی انداز میں ہوتا ہے اور ناول اور افسانے کی طرح بالکل تخیلی اور داخلی بلکہ حقیقتاً یہ صحافت اور افسانے کے درمیان کی چیزوں میں سے ہے۔ ''کشمیر اُداس

ہے'' کا موضوع اکتوبر ۱۹۴۷ء سے جنوری ۱۹۴۸ء کا درمیانی زمانہ ہے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ وہ زمانہ ہے جب کشمیر کے مختلف محاذوں پر جنگ جاری تھی لیکن رپورتاژ میں صحافتی انداز میں اس جنگ کے واقعات بیان کرنے کے بجائے مصنف نے جنگ کے نتیجے میں لوگوں کے اذہان وقلوب پر مرتب ہونے والے اثرات کو ہنرمندی سے قلمبند کیا ہے۔ان اثرات کو ایک خاص صورت حال میں لوگوں کے اعمال وافعال اور گفتگو سے ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ کیا کچھ سوچ رہے ہیں۔'' پیر پنجال کے قیدی'' میں امین صاحب کا کمرہ ایک ایسا مرکزی جگہ ہے جہاں کشمیر کی سیاست سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد آتا ہے۔ یہاں عموماً نیشنل کانفرنس کے لوگ آتے ہیں اور ہندوستان کے ساتھ الحاق کے حق میں بات گفتگو کرتے ہیں۔اور کشمیر اور جموں میں مسلمانوں پر ہورہے ظلم وستم اور عوام کے دکھ درد کو نظرانداز کر کے سیاسی پروپیگنڈا کرتے تھے۔۱۹۴۷ء میں جموں وکشمیر میں جو افراتفری ہوئی اس کے ذمہ دار کچھ سیاسی لوگ تھے لیکن اس کے منفی اثرات لاکھوں عوام پر پڑے لیکن یہ سیاسی لوگ عوام کو جھوٹا دلاسہ دیتے رہے۔اس کتاب میں بانہال میں موسم سرما میں پیر پنجال میں شدید برف باری کی وجہ سے بانہال میں پھنسے ہوئے ان ہوم گاڈرز کے دستے کی کہانی ہی نہیں بلکہ جموں وکشمیر کی وہ تاریخ ہے جس کے بارے میں آج تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو پایا۔مصنف ان ہوم گارڈز کے جوانوں اور بانہال کے سیاسی لوگوں کے خیالات کا مشاہدہ کرتے ہوئے آنے والے دنوں کی صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔امین صاحب کے ہاں مدراسی میجر راؤ بھی آتا ہے اور وہ خود اس کے سپاہی کشمیر کی جنگ کو اپنی جنگ نہیں سمجھتے اور فکرمند ہے کہ اس پرائے دیس میں اس کے جوانوں کے حوصلے پست ہورہے ہیں۔ یہاں ہوم گارڈز ہیں جن کی اکثریت مسلمان ہے ان کے کمانڈر صاحب کے ہندو اور یہ کمانڈر پاکستان اور کشمیر کے مذہبی اور اقتصادی رشتوں سے آگاہ ہیں اور کبھی کبھی اس کا اظہار بھی کرتے ہیں یہاں ایوب جیسا شخص بھی ہے جسے اپنی ساری روشن خیالی کے باوجود پاکستان جانے والی سڑک کا نام تک گوارا نہیں ان سب کرداروں کے اعمال وافعال اور گفتگو ''کشمیر اُداس ہے'' کے واقعات کو سلیقہ شعاری اور منطقی انداز میں آگے بڑھاتے ہیں۔

رپورتاژ سوچے ہوئے واقعات کا بیان نہیں بلکہ گذرے ہوئے واقعات کا بیان ہے اس لیے اس میں واقعات کی صحت وصداقت کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے ان واقعات میں رنگ میں رنگ آمیزی محض چیزوں کو مصلحتاً چھپانا اور

بعض کومصلحتاً ابھا ا یک مجرمانہ فعل ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے بیان میں ہمارے بعض ادیبوں اور مورخوں نے کچھ اس طرح رنگ آمیز اور حاشیہ آرائی کی ہے کہ ان کی اصل صورت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ ''کشمیر اُداس ہے'' اس اعتبار سے ایک منفرد تصنیف ہے کہ اس میں حقائق پر نہ کوئی پردہ آئی ہے اور نہ ہی مبالغہ۔ یہی وجہ ہے ممتاز شیریں نے اسے ایک سچا رپورتاژ قرار دیا ہے۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں مصنف خود شیخ محمد عبداللہ کی امن فورس میں کمانڈر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے یہ فورس مظفرآباد کی طرف سے حملہ آور ہونے والے قبائلوں کی یلغار کو روکنے اور انہیں کام بنانے کے لیے منظّم کی گئی تھی مصنف چاہتے تھے اپنی ذمہ داریوں کو مقدس بنانے کے لیے شیخ محمد عبداللہ کے اقدامات کو جائز قرار دیتے لیکن انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کی ہندوستان نوازی کو اس طرح طشت از بام کیا کہ شیخ محمد عبداللہ کا اصل چہرہ واشگاف آیا ہے۔ ''چناروں کی آگ'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ نیشنل کانفرس کا جلوس ہے اور یہ لوگ اپنی تیاریوں کا مظاہرہ لگا رہے ہیں نیشنل کانفرس کس کے لیے تیار ہے؟ کیا حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے؟ وہ لوگ جن کے ذہن میں شیخ عبداللہ کی دہلی کی دعوت طعام والی دو ہی دن پہلے والی تقریر ابھی تازہ ہے یہ سن کر حیران رہ گئے۔ کیا نیشنل کانفرنس حملہ آوروں کا مقابلہ کرے گی اور یہ کیا لوگ واقعی حملہ آور ہیں؟ یہی تو وہ لوگ ہے جو کچھ دن پہلے پونچھ میں تھے اور جن کے بارے میں نیشنل کانفرنس کے صدر شیر کشمیر شیخ عبداللہ نے کہا تھا کہ ''ان پر دربار کشمیر کی طرف سے ظلم توڑے جا رہے ہیں اور ان لوگوں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے تحریک شروع کر رکھی ہے اور یہ فرقہ وارانہ قسم کی ہرگز نہیں یہی تو وہ مظلوم ہیں جو کچھ روز پہلے پونچھ میں تھے، جو پرسوں مظفرآباد میں تھے آج صبح اوڑی میں تھے اور اب مہورہ میں ہیں۔ کیا شیخ عبداللہ ان کے بارے میں جو کچھ دہلی میں کہا تھا و نیشنل کانفرنس نے نہیں سنا اور کیا ان کے صدر کی آواز ان کے کانوں میں اب تک نہیں پہنچی؟''۔[۱۱]

شیخ محمد عبداللہ جو کل تک کشمیری مسلمانوں کی مظلومی اور بے بسی کی بات کر رہے تھے ان کی آزادی اور مستقبل کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ''عہد نامہ امرتسر توڑ دو کشمیر چھوڑ دو'' کے نعرے لگواتے تھے آج ان کی زبان پر ہندوستان کے

قصیدے تھے رہنماؤں کی غلطیوں کا خمیازہ قوموں کو صدیوں □ بھگتنا□ ہے۔شیخ محمد عبداللہ کی غلطیوں کا خمیازہ بھی کشمیری قوم گذشتہ ستر سال سے بھگت رہی ہے اور نہ جانے مز□ کتنی مدت □ اہل کشمیر کو اس صورت حال کا شکار رہنا □ڑے گا۔محمود ہاشمی نے چند صفحات میں شیخ عبداللہ کی اس المناک داستان کو اس خوبی اور مہارت کے ساتھ بیان کی ہے۔□ ریخ کی بعض □ی ضخیم کتابیں □ڑھ کر بھی ہمیں واضح نہیں ہوتی۔

محمود ہاشمی نے ا□ □ آشوب دور کی□ ریخ اور سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کو اس فن میں پیش کرنے کی ا□ خوب صورت کوشش کی ہے اس طرح کی صورت حال قلمبند کرتے ہوئے اکثر لکھنے والے اعتدال اور توازن کا دامن کھو □ ہیں چنانچہ تح□ یں میں کبھی فنی پہلو غا □ آجا□ ہے او کبھی حقائق کا دم □ لگتا ہے چنانچہ ایسی تح□ یر□ یں تو محض اچھا ادب □ رہ ہوتی ہیں □ یا پھر□ ریخ کی روکھی سوکھی کتاب۔لیکن محمود ہاشمی کے یہاں□ ریخ اور فنی لوازم اس طرح ساتھ ساتھ اور متوازن چلتے ہیں کہ فن کہیں بھی دستا□ کے سامنے □ نہیں □ ۔چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ڈاکومنٹری اور آرٹ کے خوبصورت امتزاج کے ساتھ ''کشمیر اداس ہے'' ا□ منفرد رپو□ ز کا درجہ ر□ ہے۔

یہ رپو□ ژ مقصد د□ خوبیوں کے ساتھ کردار نگاری کے اعتبار سے ا□ منفرد مقام کی حامل تصنیف ہے۔ مصنف نے کرداروں اور واقعات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان میں عصری سیا □ او□ ریخ کا □ ازہ بخوبی ہو□ ہے۔ محمود ہاشمی نے کشمیری ہانجیوں، مہاراجہ کے □ روں اور ہوم گارڈز کے سپاہیوں کے کرداروں کو اس مہارت سے پیش کیا ہے کہ ان کی ا□ جیتی جاگتی صورت ان کی شخصیت کے مختلف پہلو لیے سامنے آجاتی ہے۔''پیر پنجال کے قیدی'' اور '' □توں کے درمیان'' میں مصنف اپنے ساتھ اپورب اور ہوم گارڈ کے سپاہی کے ساتھ □ ف□ ری کے□ □ نہال اور بوٹ میں رک جاتے ہیں تو ان سپاہیوں □ قیامت ٹوٹ □ڑتی ہے اس موقع □ سپاہی عجب کشمکش کا شکار ہیں اور یہ اپنی کمزوری اور بے چینی کا □ بھی روتے ہیں اور مستقل مزاجی اور فرائض کے ساتھ لگن کا اظہار بھی کرتے ہیں ان کی اس کیفیت پیش کرتے ہوئے □ے خوبصورت □ از میں پلاٹون کما□ ر کی گفتگو کو بیان کیا ہے۔اس کے ساتھ □ تی سپاہی عزت افزائی کے خاطر اسے صرف میجر ہی کہتے۔کما□ ر کے ساتھ اس کے ساتھیوں کا ''میجر'' کی گفتگو سے اس کی ساتھیوں کے کردار کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سناؤ میجر کیا حال چال ہے؟ ہم پوچھتے ہیں۔اٹن شن کی حالات میں ا□ کر تمام فوجی اداب کو□ وئے کار لاتے ہوئے ہمارا ''میجر'' ہم سے کہتا ہے کہ صا □ ہم سے خوش ہے۔ہم نے

فوج میں بہت سال پہلے بھی نوکری کیا ہے۔اس لیے ہم خوش ہے۔ہم فوج کا □ قانون
جا□ ہے۔اس واسطے ہم مرجا □ گا□ منہ سے نہیں بولے گا کہ صاب ہمارا انتظام کرو۔ہمارا
کپڑا بہت میلا ہے اور بوٹ کا دکا□ ار ہم کو صابن نہیں دیتا ہم خود بھی میلا ہے اور بوٹ کا
لوگ ہم کو اپنے چشمے□ نہانے نہیں دیتا کیو□ وہ ہندو ہے اور ہم کو مسلمان بولتا ہے۔صا □
ہم ہر وقت خوش ہے ہم آپ سے کبھی نہیں بولیں گا□ اب صا □ نے خود پوچھا ہے اس لیے
ضروری بولیں گا اور اس لیے بولتا ہے کہ۔۔۔۔دیکھو صا □ ۔اب اس وقت اس واسطے
□ ہر کھڑا تھا□ رش کا □ □ ہمارا ہاتھ□ تھا اور ہم اس لیے اپنا ہاتھ مل مل کر صاف کر رہا
تھا۔ہم □ کچھ اس طرح صاف کر□ ہے۔بہت سال فوج کی نوکری کیا ہوں اس لیے
جا□ ہے۔''[۱۲]

''کشمیر اُداس ہے'' میں محمود ہاشمی نے کئی اور دلچسپ اور معنی خیز کردار بھی پیش کیے ہیں اور ان میں کرسیل□ م کا
ا□ ہندو نوجوان جو اپنی نو بیاہتا بیوی کو گھر چھوڑ کر ہوم گارڈز میں شامل ہو□ ہے۔وہ ہوم گارڈز میں شمولیت کو محبت اور
فرض کی کشمکش میں فرض کو فتح قرار دیتا ہے۔حالا□ اصل وجہ یہ ہے کہ راولپنڈی روڈ کی بندش کے□ □ اس کے □ ں
کے□ غ اس کے لیے فائ□ ہ مند نہیں رہے اور وہ اقتصادی□ حالی سے بچنے کے لیے ہوم گارڈز میں بھرتی ہوا ہے۔
مصنف نے□ سیل کی داخلی کشمکش اور کیفیات کو□ ی خوبی سے□ یں کیا ہے۔

ایورب ا□ اہم کردار مصنف کے دو □ اور ہوم گارڈز کے کما□ ر ہے جو مسلم ماحول میں پلا ہوا ا□
ذہین ہندو کمیونسٹ اور اپنے □ یت کے پیش □ بظاہر لسانی اور مذہبی □ دو□ فرقہ بندی اور ا□ رکو قطعاً پسند نہیں
کر□ ۔اسے غا □ اور اقبال کی شاعری کے ساتھ ساتھ اردو□ ن سے بھی گہری محبت ہے۔□ ھا لکھا ہونے کے□ □
مسلمانوں کے احساسات و□ ت سے بخوبی واقف ہیں اس کا یہی نفسیاتی ادراک اور معاملہ فہمی مصنف کے ساتھ اس
کے تعلقات□ کبھی آنچ نہیں آنے دیتی۔مصنف نے ایورب کا کردار پیش کرتے ہوئے اس کے شخصی تضادات، افکار و
□ یت اور □ ت و احساسات کی تص□ اس خوبی سے کی ہے کہ اس کی شخصیت کا ہر پہلو کھل کر سامنے آ□ ہے۔ا□
عیسائی□ دری کے ساتھ ایورب کا مکالمہ اس کی ذات اور مذہب سے متعلق اس کے □ یت کا پتہ دیتا ہے۔سرراہ
□ قات□ دری کے ساتھ ایورب کا مکالمہ □ حظہ فرما □ :

''کہیے آپ لوگ کل سارا دن کیا کرتے رہے؟ کہیں □نہیں آئے؟ ہم لوگ اپنے کمرے
میں ہی رہے اپورب کہتا ہے'' میں بھی کبھی کبھی سارا دن اپنے کمرے میں ہی رہتا ہوں اور
تنہائی میں □ا کی صحبت سے لطف اٹھا□ ہوں لیکن ہم لوگ ا□ دوسرے کی صحبت سے ہی
لطف اٹھا رہے ہیں اور یہ تجربہ خاصا خوشگوار تھا۔ □ا کی صحبت سے بھی □دہ خوش گوار تھا۔
اپورب ڈاؤننگ کو چھیڑ□ ہے۔۔۔ڈاؤننگ سمجھ کے موڈ میں ہے□اپورب سمجھ□ نہیں کہ□ اور
کہتا ہے مسٹر ڈاؤننگ! میں نہیں ما□۔ میرا یقین ہے کہ□ انے ا□ان کو پیدا نہیں کیا آپ
کہتے ہیں کی □ انے ا□ان کو اپنی شبیہ کے مطابق □یا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ا□ان کی دماغ
نے □ا کا تصور پیدا کیا ہے اور پھر اسے □ی قدرت والا حکمت والا ظاہر کرتے ہوئے اپنے
□ بہ□ کو تسلی دینے کے لیے یہ بھی کہ □ا کی شبیہ اس ا□ان کی سی ہے۔۱۳

محمود ہاشمی نے ہوم گارڈز کی گفتگو کے ذریعے اس وقت کے کشمیر کی صورت حال کو اتنا واضح کر□ ہے کہ قاری اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے مناظر کو دیکھتا □ جا□ ہے۔ ہندوستانی فوج کے ہاتھوں اہل کشمیر کی چار دیواری کی تقدس کو جس□ی طرح□ پامال کیا□ ہے وہ ا□ عبرت□ک داستان ہے لیکن شیخ محمد عبداللہ اور ان کے حواریوں کا یہ خیال تھا کہ'' ہندوستانی فوج کے اکا دکا عمل واقعات کے ردعمل کا نتیجہ ہیں اور یہ واقعات اس نوعیت کی ہر□ نہیں جن□ تشویش اور اضطراب کی ضرورت ہو، اس کے□عکس کشمیر کے عوام اور ہوم گارڈز اس پیر پنجال میں شد□ □ف□ری کو ہندوستانی فوج کے اعمال کے□ □، پیر پنجال کی□ راضگی قرار دیتے ہیں اور ا□ ہوم گارڈز اپنے کم□ر اپورپ اور ڈپٹی کم□ر کے ر□ وحاضر ہوکر یہ اعلان کر□ ہے:

''صاب'' □ف کا یہ □ تکلیف ہندوستانی فوج کی وجہ سے ہے'' ''وہ کیسے؟'' میں اور
اپورب دونوں چو□ □ڑے اور عرض رپورٹ کرنے والا ہوم گارڈ اب ا□ بہت□ے
سیا□ دان کی ما□ اپنے چہرے کو□لکل غیر□تی بنائے سکون سے کہتا ہے صاب اس
□نہال میں ہندوستانی نے بہت ظلم کیا۔ پہلے جو □لہ کا رجمنٹ تھا وہ مسلمان گھروں میں
جا کے عورتوں کو بے□دہ کر دیتا تھا اور □نہ پکا کرنے کے لیے ہر وقت راہ گذرنے والوں□
گولی □□ تھا اور اب جو ملٹری آ□ی ہے وہ شراب بہت پیتا ہے ہر وقت □ میں □ رہتا ہے،

اس لیے پیر پنجال ان پر ناراض ہے اور اس نے ان کا اسی واسطے راستہ بند کر دیا ہے۔'' اور پھر وہ دفعتاً جذباتی بن جاتا ہے۔ ہائے شیر کشمیر! ہمارا مائی باپ ہے اس نے کیا کر دیا وہ ان کو یہاں کشمیر میں کیوں لایا۔ اب ہمارا راستہ بند ہو گیا اور یہ پیر پنجال ابھی اور بھی عذاب لائے گا توبہ توبہ صد بار توبہ اور اس کی انگیاں کانوں پر جا ٹکتی ہیں۔''[۱۴]

یہ صرف ایک فرد کے جذبات نہیں بلکہ یہ لاکھوں کشمیریوں کے دل کی آواز اور ان کی بیان ہے۔ محمود ہاشمی کے یہ حقیقی کردار بعض اوقات علامتی کردار کے روپ میں پورے معاشرے اور پوری قوم کے ترجمان بن جاتے ہیں اور ان کا ذاتی دکھ پوری قوم کا دکھ بن کر کشمیر کی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

محمود ہاشمی نے کشمیر کی کہانی لکھنے کے لیے ایسی سلیس زبان اپنائی ہے جو عام فہم بھی ہے اور ادبی رچاؤ کی حامل بھی۔ طرز بیان میں کہیں کہیں صراحت کے بجائے رمز و کنایہ کا استعمال اپنایا ہوا ہے۔ رمز و کنایہ کا یہ استعمال برمحل اور موزوں ہے اور تحریر کی معنویت اور فصاحت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال دیکھیے:

> ''بھئی گندے انڈوں کا پتہ کیسے چلے گا؟ 'پانی میں ڈال کر'۔ ''اور پھر''۔ پھر جو ہلکے ہوں گے وہ اوپر ہی اوپر تیرتے رہیں گے اور بھاری ڈوب جائیں گے۔ بس اس سے اندازہ ہو جاتا ہے۔'' 'یہ تو نہ کوئی بات' اچھے انڈے ہلکے ہوتے ہیں یا بھاری؟''' ''اور اس وقت میں بھول جاتا ہوں کہ اچھے انڈے ڈوبا کرتے ہیں یا برے لیکن عین اسی وقت ایک خیال میری مدد کو آموجود ہوتا ہے۔ عام طور پر انڈوں میں اچھے زیادہ ہوتے ہیں اور برے کم اور اسی لیے میں کہتا ہوں اگر زیادہ انڈے ڈوب جائیں تو سمجھو ڈوبنے والے اچھے ہیں اور اگر زیادہ انڈے تیرتے رہیں تو سمجھو کہ وہی اچھے ہیں۔ یہاں بھی اکثریت کا بول بولا ہے سیاست کی طرح۔''[۱۵]

اس رپورتاژ کا موضوع تاریخ بھی ہے اور سیاست بھی لیکن اس میں نہ تو تاریخ امور خانہ انداز میں بیان کی گئی ہے اور نہ ہی سیاست کا بیان اخباری ہے بلکہ بڑی فنکاری سے کرداروں اور واقعات کی مدد سے فنکارانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ زبان و بیان کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ کرداروں کی زبان ان کی شخصیت، منصب اور حیثیت کے مطابق ہو۔ محمود ہاشمی کی یہ خوبی قاری کو خاص طور پر بہت متاثر کرتی ہے ان کے کرداروں کی زبان ان کے حسب حال ہے ان کی

تحریروں میں بسا اوقات ان کے ذاتی تاثرات اور محسوسات کی کسک بھی محسوس کی جاتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے ان فسادات میں جموں کے مسلمانوں پر کیا بیتی یہ ایک ایسی المناک داستان ہے جسے پڑھنے کے لیے غیر معمولی حوصلہ اور ہمت کی ضرورت ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کو پاکستان لے جانے کے بہانے فوجی ٹرکوں پر لاد کر ایک مقتل گاہ لے جایا گیا جہاں ہندوستانی فوج اور سکھ جیالے اپنی مشین گنوں اور شمشیروں کے ساتھ گھات لگائے بیٹھے تھے جونہی مسلمان قافلے اسی مقتل گاہ میں پہنچے یہ درندے ان بے خبر مسلمان مرد و زن اور بچوں پر ایک قیامت بن کر ٹوٹ پڑے۔ منزل کی تلاش میں سرگرداں اس قافلے کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا گیا اور نوجوان عورتوں کو بے آبرو کیا گیا۔ اس مقتل گاہ میں مصنف کی آنکھوں نے سفاکی اور درندگی کے ایسے بھیانک منظر بھی دیکھے ہیں جو قاری کو حیرت کی اتھاہ گہرائیوں میں غوطہ زن کر دیتے ہیں اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ عالم امکان میں ایسا بھی ہو سکتا ہے؟۔

یہ رپورتاژ کشمیر کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کی داستان ہی نہیں کشمیری مسلمانوں کی آرزوؤں اور امنگوؤں کی تصویر بھی ہے جہاں وطن کی آزادی، ظلم کے خاتمے اور پاکستان کے ساتھ الحاق کی بڑی بڑی آرزوئیں ہیں۔ وہاں بعض ایسی آرزوؤں کا بیان بھی ہے جو صرف کسی فنکار کا دل ہی محسوس کر سکتا ہے۔ جموں میں ایک کہن سالہ بڑھیا اپنا سب کچھ کھونے کے باوجود اپنے تن من میں آس کی چنگھاری جلائے ہوئے ہے۔ جموں کے محلّہ استاد میں پناہ گزین اس بڑھیا سے مصنف کی ملاقات کا حال اور اس کی وہ آرزوئیں حظہ فرمائیے جو بظاہر بہت معمولی ہے لیکن اس کے لیے زندہ رہنے کا جواز ہے:

> ’’ سب سے پہلے ایک شناسا بڑھیا سے ملتا ہوں جو کسی زمانے میں ریزیڈنسی روڈ پر رہا کرتی تھی جو اپنا بہت سا سامان اپنے گھر میں بند کر کے اسے قفل لگا کر چابیاں اپنے ازار بند کے ساتھ باندھ کر قافلے کے ساتھ پاکستان جا رہی تھی کہ راستے میں حملہ ہوا اور ان کے جوان بیٹے اور بیٹیاں ان کی آنکھوں کے سامنے مارے گئے اور پھر بڑی مشکلوں کے بعد نے کہاں کہاں دھکے کھاتے وہ اس محلّہ استاد میں پہنچی اب سوائے گھر کی چابیوں کے اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ ان چابیوں کو وہ اس لیے استعمال نہیں کر سکتی کے حاکم لوگ اسے ریزیڈنسی روڈ کی طرف نہیں جانے دیتے۔ کہتے ہیں کہ وہ مسلمان ہے اگر اسے کسی نے مار دیا تو کون ذمہ دار ہوگا اور اس لیے بڑی یہ لوکنجیوں کا گچھا اور جس طرح بھی ہو سکے میرا مکان کھول کے اس میں

سے مجھے ایک رضائی لا دو کوئی پرانی سی ہو میں اب بڑھاپے میں نئی رضائیوں کو اوڑھ کر کیا کروں گی۔ کوئی شوق تو نہیں بس بوڑھی ہڈیوں کو ذرا سردی سے بچانے اور پھر بیٹے اور بیٹیاں مر گئے تو کیا ہوا پوتے پوتیاں تو اب بھی سیالکوٹ میں زندہ ہیں۔ نئی رضائیاں وہیں سنبھالی رہیں ان کے کام آجائیں گی۔"[۱۶]

محلّہ استاد کی اس بڑھیا سے خیالی ملاقات مصنف کے ذاتی تاثرات اور محسوسات کی کسک کی آئینہ دار ہے۔ یہ چیز رپورتاژ کی وصف میں شامل ہے کہ اس میں واقعات سے متعلق لکھنے والے کے لیے اپنے تاثرات و جذبات، محسوسات بھی ہوں جس سے فنکار کی شخصیت کے پرتو دیکھنے کو ملتا ہے۔

ایسی تحریریں لکھتے ہوئے مصنف کا اپنی ذات کو واقعات میں ملوث نہ کرنا بہت دشوار مرحلہ ہوتا ہے کیونکہ خود کو خارج کر کے واقعات اور کہانی کو آگے بڑھانا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے اس لیے بعض منجھے ہوئے ادیب بھی اپنی تخلیقات میں خود کو شامل کرنے کی ادبی غلطی کا شکار رہے ہیں۔ "کشمیر اُداس ہے" کی بطور رپورتاژ ایک اہم خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اپنی ذات کو ابھارنے کی کوشش کبھی نہیں کی ہے۔ مصنف نے اکثر خود کو پس پردہ رکھا ہے اور کہیں وہ صورت حال پر مختصر تبصرہ کرتے نظر آتے ہیں اور کہیں بات کو آگے بڑھانے کے لیے ظاہر ہوتے ہیں۔

"کشمیر اُداس ہے" کی بہت سی خوبیاں اس تحریر کو رپورتاژ سے بڑھ کر ایک افسانے کی قریب لے جاتی ہیں۔ اس رپورتاژ میں داخلیت اور خارجیت کا امتزاج، واقعات سے متعلق مصنف کے ذاتی جذبات کی کسک، اپنی ذات کو صرف ضروری حد تک ملوث کرنا، بیان میں ایک منطقی ترتیب کو مدنظر رکھنا، کردار نگاری کے فنی تقاضوں کو نبھانا اور واقعات کے فنکارانہ بیان کے ساتھ ساتھ صداقت اور حقیقت کو مدنظر رکھنے کی خصوصیات اس تحریر کو فنی لحاظ سے ایک اچھے افسانے کے قریب لے آتی ہے۔

جب کبھی کسی بھی سماج میں انقلاب رونما ہوتا ہے تبدیلی، انتہا راوی پرانے اقتدار کو کھو کر نئی طرز زندگی اپناتے ہیں۔ سماجی انقلاب میں تمام انسانی روایات، تہذیب اور طرز معاشرت بدل جاتا ہے۔ انسان فطرتاً انقلاب پسند ہوتا ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا پسند کرتا ہے تاریخ، تہذیب وتمدن اور ثقافت میں بھی یوں تبدیلی آتی ہے۔ معاشرتی و معاشی حالات میں تبدیلی آتی ہے۔ انسانی تاریخ میں بے شمار ایسے بھی انقلاب آئے ہیں جن کی زد میں انسان کو بے شمار نقصان اٹھانا پڑا ہے اور عوام جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہے ہیں۔ ایسے ہی تبدیلیوں کو صرف حساس

فطرت کے ادیب ہی محسوس کرتے ہیں۔ اور اس سیاہ دور کو بھی لکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جموں میں ہونے والے سیاسی حالات اوران سوز حالات سے شاعروں و ادیبوں کے اذہان پر کیسے اثرات پڑے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''شاید یہی وجہ ہے کہ اب دینو بھائی پنت شاعری نہیں کہتا۔ اب میں ڈوگری کی اس شاعر سے ملا تو اس کے پاس مجھے سنانے کے لیے کوئی نئی نظم نہ تھی۔ میری شاعری کا جموں مر چکا۔ اب میں کس پر کیا لکھوں''۔ اور جب میں نے کہا کہ موت بذات خود بھی ایک موضوع ہے'' تو وہ بولے ''مرثیے آج تک میں لکھ سکا ہوں اور نہ لکھوں گا اور پھر ایک زہر خند اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔''[۷]

من جملہ یہ رپورتاژ نہ صرف جموں و کشمیر کی ادبی تاریخ میں ہی نہیں بلکہ اردو ادب میں بھی ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ محمود ہاشمی نے صنف رپورتاژ کی فنی لوازمات اور روایت و امکانات کو صحیح معنوں میں ملحوظ رکھ کر ۱۹۴۷ء کی اس المناک تاریخ کو اس کتاب میں رقم کیا ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء سے جنوری ۱۹۴۸ء تک کے عرصے پر محیط اس رپورتاژ میں ان تاریخی حقائق کی آئینہ داری ہوئی ہے جسے عموماً مورخین اور صحافی پردہ راز رکھتے ہیں یا ایک طرفہ سچائی کو نمایاں کرتے ہیں اور بہت سے قلم کار تو حکومت کی منظوری اور خوشنودی کے لیے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ محمود ہاشمی واحد رپورتاژ نگار ہے جنھوں نے زمینی حقائق اور ذاتی مشاہدات کو مضبوط دلائل بنا کر بیان کیا ہے۔ اس رپورتاژ میں جموں و کشمیر کی جغرفیائی اور تاریخی پس منظر کو بہترین انداز میں ابھارا ہے کیونکہ ایک حقیقت کی وضاحت کے لیے اس ماحول کو ابھارنا بھی ضروری تھا۔ کشمیر سے ہوتے ہوئے نہال، بٹوت اور جموں پہنچتے ہیں۔ ان مقامات پر ہندو مسلمان ایک دوسرے کے لیے نفرت اور جانی دشمن بن چکے تھے۔ عوام میں یہ نفرت پھیلانے والے ایک طرف مہاراجہ کی طاقت اور عوام میں امن قائم کرنے کی کوشش میں شیخ محمد عبداللہ کوشاں تھے۔ لیکن شیخ محمد عبداللہ بھی اپنے مقصد کے لیے عوام کو ایک دوسرے کے لیے قریب لانے کی کوشش میں رہتا ہے۔ مصنف کو جب ان تمام مفاد پرست لوگوں کے اصول، اصلیت، سچائی اور عوام پر ریاست کو استعمال کرنے والے منصوبوں کا علم ہوتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس ریاست میں نہیں رہ سکتا ہے اور اپنا رخت سفر باندھ کر غریب الوطنی کی ہوا کھانے لگتے ہیں۔

بات کو سمیٹتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کی پوری ایک صدی میں جموں و کشمیر میں صرف ایک کامیاب اور مکمل

رپو□ ژ ''کشمیر اُداس ہے'' منظر عام پ□آ□ یہ ہے جس میں تقسیم ملک کے ہنگامہ خیز دور میں جو مناظر و حالات خصوصاً جموں و کشمیر میں رو□ ہوئے ان کی پوری□ ریخ کو بیان کیا □یہ ہے۔ دونوں طرف کے عوام ہجرت کر رہے تھے۔ ا□ی نئے ملک میں آ□ بہ دہونے اور بسانے کے لیے کن کن دشواریوں کا سامنا ک□ن□ پڑا اور کیسے کیسے اپنے لیے ٹھکانہ □یہ۔ مصنف نے آنکھوں دیکھا حال بٹوت میں کوٹلی کے سکھ کے وراد کے قصہ کو بیان کر کے پورا پس منظر پیش کیا ہے۔ سیاسی سطح پھر جموں و کشمیر میں پیدا ہونے والے مسائل کی□ جمانی کرتے ہیں۔ الغرض یہ رپو□ ژ جموں و کشمیر کی□ ریخ، تہذ□یب، سیاسی و سماجی منظ□ مہ کی ا□ی بہترین معلوماتی کتاب ہے۔ واقعات کی صداقت اور صحت کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس میں اس دور کی سیاسی حالات او□ ریخ کا بیان حقیقت□پ□ ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

(۱) فرہنگ ادبیات، مرتبہ سلیم شہزاد، قومی کو□□ ائے فروغ اردو□ ن، نئی دہلی، ۲۰۱۸ء، ص: ۴۱۷

(۲) اردو میں رپو□ ژ نگاری کا تنقیدی تجزیہ، سجاد احمد خان، ڈاکٹر، عرشیہ□ □ ، دہلی، ۲۰۱۹ء، ص: ۲۹

(۳) اردو میں رپو□ ژ نگاری، عبدالعز□، مکتبہ شاہراہ، ارد□ زار دہلی، ۱۹۷۷ء، ص: ۳۳

(۴) اردو میں رپو□ ژ نگاری کا تنقیدی تجزیہ، سجاد احمد خان، ڈاکٹر، عرشیہ□ □ ، ۲۰۱۷ء، ص: ۳۴

(۵) اردو کی شعری و□ی اصناف تحقیق وتنقید، مجید بیدار□ وفیسر، ص: ۲۴۰-۲۴۱

(۶) اردو میں رپو□ ژ کی روا□ ، طلعت گل، داکٹر، شبانہ□ □ ، محلّہ قبرستان□ کمان گیٹ دہلی، ۱۹۹۲ء
ص: ۳۷

(۷) شہاب□ مہ، قدرت اللہ شہاب، فر□ □ ڈپو، نئی دہلی، چوتھا□ □ ، ۲۰۱۴ء، ص: ۳۵۰

(۸) ایضاً، ص: ۳۵۱

(۹) کشمیر اداس ہے، محمود ہاشمی، قومی کتب خانہ، راولپنڈی (□ کستان) ۱۹۵۰ء، ص: ۴۵

(۱۰) ایضاً، ص: ۶۰

(۱۱) ایضاً، ص: ۷۱

(۱۲) ایضاً، ص: ۲۰۲-۲۰۳

(۱۳) ایضاً، ص: ۲۰۰

(۱۴) ایضاً، ص: ۱۷۸

(۱۵) ایضاً، ص: ۱۳۰

(۱۶) ایضاً، ص: ۲۵۳-۲۵۴

(۱۷) ایضاً، ص: ۲۳۵

مقالہ

ریاست جموں و کشمیر میں غیر افسانوی ادب کا تنقیدی تجزیہ

برائے

پی ایچ۔ڈی (اردو)

(2022)

مقالہ نگار

سارہ بتول

اندراج نمبر: A171548 (17PHUR007HY)

نگراں

ڈاکٹر بی بی رضا خاتون

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اردو

اسکول برائے السنہ، لسانیات اور ہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی حیدر آباد-32

حاصل مطالعہ

□ی □ جموں وکشمیر میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ اسلامی تہذ□ی□ کی داغ بیل□ڑ گئی تھی۔ چودھویں صدی میں رنچن شاہ کے قبول اسلام کے ساتھ اسلامی سلطنت کی داغ بیل□ڑی۔ چو□ کشمیر پہلے سے ہی علوم وفنون کا مر□ تھا۔ اسی زمانے میں مشرقی وسطیٰ اور د□ مما لک سے مبلغین کے علاوہ علم وعرفان کے متلاشی بھی کشمیر کی طرف رخ کرنے لگے۔ اس طرح کشمیر مختلف تہذیبوں کی آماجگاہ بن گئی۔ علم وادب کے سوتے پھوٹنے لگے۔ چو□ اس دور میں فارسی □ن کا چلن تھا□ی □ کے ادیبوں اور عالموں نے فارسی □□ دونوں میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ فارسی □ن اشرافیہ اور اہل علم طبقے □ ہی محدود تھی عوام کی اکثر□ اس □ بلد تھی۔ کثیر اللسانی□ی □ میں عوام ا□ دوسرے کی □ن سے بھی□ آشنا تھے اور بیرونی د□ کے اختلاط سے رابطے کے لیے ہندوستانی □ن کا استعمال ہونے لگا تھا۔ جسے عرف عام میں '' اردو '' کہا جا□ ہے۔ جس کی وجہ سے عوام ا□ دوسرے کو سمجھنے اور ا□ دوسرے کے قری□ آنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے آتے آتے اردو اپنی □ڑیں مظبوط کر چکی تھیں اور یہ نہ صرف□ قاعد عوامی رابطے کی □ن بن چکی تھی بلکہ افکار وخیالات کے اظہار کا وسیلہ بھی □ جارہی تھی۔ ڈ□ ہ حکمرانوں کے لیے یہ ا□ خوش آئن□ت تھی۔ انہوں نے اس کی خوب□ائی کی۔ دھیرے دھیرے ادبی اور غیر ادبی تح□یں بھی منظر عام□ آنے لگیں۔ رنبیر سنگھ کے دور حکومت □ اردو نے اپنی مستحکم جگہ بنا لی تھی۔ ہر□ن کی طرح □ی □ میں اردو کی تح□ی روا□ کا آغاز □ سے ہوا۔ اس کی شروعات میر پور (□ کستان کے □ی قبضہ کشمیر میں واقع ہے) کے غلام محی الدین میر پوری کی مثنوی ''گلزار فقیر'' سے ہوئی جو ۱۱۳۱ھ □ بق 03-1702ء میں تح□ی کی گئی۔ □ی تح□ی کا آغاز اس کے کافی عرصہ بعد کیا □ی۔ جو غیر ادبی □ کی صورت میں سرکاری اشتہارات، اعلا□ موں اور فرامین □ مشتمل ہیں۔ محققین نے □ی □ کی ابتدائی □ی تح□ی مہتہ شیر سنگھ کے ''سف□ مہ بخارا'' کو □ ہے جو 65-1864ء میں تح□ی کردہ سرکاری وفد کے سفری روداد اور کوائف □ مشتمل رپورٹ ہے۔ پنڈت ہر گو□ ل کول خ□ کے ''جغرافیہ کشمیر'' (1975) اور ''گلدستہ کشمیر'' (1977) کو اولین مربوط □ی تح□ی □ □ی ہے۔ اردو □ن کی مقبولیت کے پیش □ ڈ□ ہ سرکار نے اسے سرکاری □ن کا درجہ□ی۔ ''□ی بلاس سبھا'' کے قیام کے ساتھ مختلف علوم وفنون کی کتابوں کا اردو میں □ جمہ کیا □ی اور ''□ی بلاس'' اور ''رنبیر'' جیسے سرکار کی پشت پناہی میں شائع ہونے والے اخباروں نے اس کو مز□ فروغ □ی۔ ا□ چہ

اظہارِ خیال پر پابندی تھی اور پریس پر سرکاری اجارہ تھا۔ اس کے باوجود درجنوں ادیبوں کے نام ملتے ہیں جنہوں نے بیرونِ ریاست شائع ہونے والے اخبارات کے ذریعے اپنی ادبی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مختلف اصناف ادب کے فن پارے وجود میں آنے لگے۔ ابتدائی دور کی تخلیقات میں پنڈت ہرگوپال کول خستہ کی 'جغرافیہ کشمیر'، 'گلدستہ کشمیر'، 'گلزارِ فوائد'، سالگ رام کول سالک کی 'گنجینۂ فطرت'، 'تحفۂ سالک'، محمد الدین فوق کی 'تاریخ کشمیر'، 'سیر شاہی کشمیر'، 'تاریخ اقوام کشمیر' اور 'سفرنامہ کشمیر' وغیرہ اہم ترین تصنیفات ہیں۔ چونکہ ادب سماج کا پرتو اور آئینہ ہوتا ہے اس لیے اس دور کی تحریروں میں اس انتشار اور [illegible] کے دور کی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی صورتحال کی واضح جھلک دیکھنے کو ملتی ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ہی مختلف موضوعات اور اصناف پر درجنوں تصنیفات منظر عام پر آ چکی تھیں۔ پرنٹنگ پریس کی سہولیات کے ساتھ شعری اور افسانوی ادب کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی ادب کے اعلیٰ نمونے منصۂ شہود پر آنے لگے۔ جو مختلف سیاسی، سماجی، ادبی اور مذہبی موضوعات پر محیط ہیں۔ خودنوشت سوانح عمری، خاکے، انشائیے، سفرنامے اور رپورتاژ کے اعلیٰ نمونے جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جن میں استحصال کا درد اور کرب، آمرانہ استبداد کے نتیجے میں بلند آہوں اور صداؤں کی بازگشت ان تحریروں سے ہویدا ہیں۔ ریاست میں لکھی گئی بیشتر خودنوشتوں اور سوانح عمریوں میں ریاست کی سیاسی و سماجی صورتحال کی واضح جھلک ملتی ہیں۔ بیشتر آپ بیتیاں ایسی شخصیات کی ہیں جن کا براہ راست تعلق ریاست جموں و کشمیر کی سیاسی مختلف تحریکات سے ہے۔ ان شخصیات کی ذات کا مطالعہ براہ راست ریاست کی تاریخ کے مطالعہ کے مترادف ہے۔ ان خودنوشت سوانح عمریوں میں محمد الدین فوق کی 'سرگذشت فوق'، شیخ محمد عبداللہ کی 'آتش چنار'، چودھری غلام عباس کی 'کشمکش'، قدرت اللہ شہاب کی 'شہاب نامہ'، ڈی ڈی ٹھاکر کی 'یادوں کے چراغ' اور بیگم خورشید ظفر کی 'میرے شب و روز' قابل ذکر ہیں۔ غیر سیاسی شخصیات کی خودنوشتوں میں آغا جانی کشمیری کی 'سحر ہونے تک'، پروفیسر حامدی کشمیری کی 'رہگذر در رہگذر'، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی 'میرے گزشتہ روز و شب'، کاچو سکندر خان سکندر کی ''افکارِ پریشاں''، عبدالرشید ہنجورہ کی ''چنار کے سائے میں'' اور پروفیسر شہاب عنایت ملک کی 'یادوں کی لمس' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سوانح عمریوں میں پنڈت پریم ناتھ بزاز کی 'کشمیر کا گاندھی'، نرسنگداس نرگس کی 'زور آور سنگھ'، لالہ ملک راج صراف کی 'شیرِ ڈوگرہ لالہ ہنس راج'، عبدالغنی شیخ کی 'صنم بو'، مصرہ مریم (اہلیہ

حامدی کشمیری) کی 'حامدی کشمیری' وغیرہ اہم ین سوانح عمریں ہیں۔

جو چیز ان خودنوشتوں میں یکساں ہیں وہ ہے جموں وکشمیر کی سیاسی، سماجی، معاشرتی اورادبی صورتحال اور جو چیز ان خود نوشتوں کو ای دوسرے سے منفرد بناتی ہیں وہ ہیں مصنفین خود نوشت نگاروں کی مختلف تحریکوں، تنظیموں اور مختلف مکاتب فکر کے ساتھ وابستگی اور کسی مخصوص سوچ وفکر کی نمائندگی۔ جہاں 'آتش چنار'، 'سفرِ زندگی' اور اس قبیل کے خودنوشتوں میں ہندوستاں سے الحاق کی وجوہات اور اس کی کارروائیوں کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہیں تو وہیں 'کشمکش'، 'شہاب نامہ' جیسے پاکستان نواز مصنفین کی خودنوشتوں میں پاکستان کے ساتھ الحاق کی تجاویز اور ہندوستان مخالف تحریکات کا عندیہ ملتا ہے۔ 'روداد قفس'، 'زندانِ وجود' جیسی تصنیفات سے کشمیر میں چل رہی مختلف تحریکوں کے محرکات اور موجودہ انتشاری صورتحال کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ جبکہ 'رہگذر در رہگذر'، 'میرے گزشتہ روز و شب'، 'افکارِ پریشان' اور 'یادوں کے لمس' جیسی خودنوشتوں میں کی خالص ادبی اور علمی صورتحال کی تصویر ملتی ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ خودنوشت میں ہر بات سچی نہیں ہوتی۔ ان میں سے بیشتر جھوٹ اور سچ پر مشتمل داستان ہوتی ہیں جس کے ذریعے سے مصنف اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے اور اپنے وجود کو منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے باوجود اس حقیقت سے بھی روگردانی نہیں کی جاسکتی کہ یہ اس خاص زمانے کی اُس سماجی اور معاشرتی صورتحال کی نمائندگی کرتی ہے۔ جس زمانے سے مصنف کا تعلق ہوتا ہے۔ اس لیے کے مصنفین کی خودنوشتوں اور سوانح عمریوں کے حوالے سے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کی مدد سے یہاں کی تاریخ اور اس سے جڑے پیچیدہ مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہیں۔

بیسویں صدی کے ابتدائی ایام میں میں قلمی چہرے قلمی تصویر کے نام سے خاکے بھی منظر عام پر آنے لگے تھے۔ جو عموماً مارتنڈ، رتن، ہمارا ادب، آج کل اور ش جیسے موقر ادبی رسالوں کی زینت بنتے رہے۔ اسی دور میں کے ای مورصا قلم پنڈت دینا ناتھ مٹو دلگیر، بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے کشمیری ادیبوں میں پیش پیش تھے۔ جو علامہ صدیقی سا ی' کے فرضی نام سے ''مارتنڈ'' کے ادبی شمارے میں اپنے معاصر ادیبوں اور شاعروں کے خاکے لکھا کرتے تھے۔ مارتنڈ کا ای کالم ''آرا کین محفل ادب''، محض ان خاکوں کے لیے مختص ہوتا تھا۔ اسی دور کے

خاکہ نگاروں میں پنڈت موتی لال ساقی، مول اغ حسن حسرت، میر غلام رسول زکی وفیسر جگن تھ آزاد وغیرہ کا م اہم ہے۔ ی میں خاکہ نگاری کو نئی سمت دینے کا سہرا شمیم احمد شمیم کے سر جا ہے۔ جنہوں نے اپنے بے ک اور کھلنڈرے از سے خاکے لکھ کر خاکہ نگاری کو ای نئی دی۔ ی دور کے خاکہ نگاروں میں کشمیر لال ذاکر کا م اہم ہے۔ ان کے خاکوں کے تین مجموعے منظر عام آ چکے ہیں۔

ی جموں و کشمیر میں ا ئیہ نگاری کا ارتقائی سفر بھی نہای شا ار رہا ہے۔ ابتدائی دور میں ا ئیوں کے کئی عمدہ نمونے منظر آئے۔ افسوس کہ یہ ادبی شاہکار امتداد زمانہ کے ہاتھوں تلف ہو گئے۔ اب ان کے آ ر صرف حوالہ جاتی کتابوں ہی محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ ابتدائی ی م کے ا ئیہ نگاروں میں پنڈت ہرگو ل کول خس، پنڈت سالگ رام کول سالک، پنڈت وش تھ درہ، پنڈت ائن جو رینہ عنقا، تیرتھ کا ی، پنڈت دی تھ واریکھو المعروف بہ شاہد کا ی، کشب بندھو، صا ادہ عبدالرحمن ذکی، اغ حسن حسرت وغیرہ کے م قابل ذکر ہے۔ سالگ رام سالک کے ا ئی مجموعے 'گنجینۂ فطرت' ی 'مناظر کشمیر' وا کشمیر کی خوبصورتی اور ی ستی عوام کے مسائل کی جمانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

بیسویں صدی کے اختتام ا ئیوں کی ای خواطر خواہ کھیپ تیار ہو چکی تھیں۔ اس زمانے کے ا ئیہ نگاروں میں پنڈت دی تھ م، شمیم احمد شمیم اور وفیسر مرزا محمد زماں آزردہ جیسے مای زا ئیہ نگاروں کے م اہم ہیں۔ شمیم احمد شمیم چو ای بے ک اور صاف گو صحافی تھے انہوں نے اپنے تیز و طرار از سے اپنے ا ئیوں اور کالموں کے ذریعے حکومت کے ایوانوں میں ہلچل مچا دی۔ وفیسر زماں آزرہ نے ی میں اس صنف کو استحکام بخشا اور ا ئے کوئی جہتوں سے متعارف کر ی اور ای قلیل عرصے میں ان کے ا ئیوں کے کئی مجموعے منظر عام آئے۔ فن ا ئیہ نگاری کو انہوں نے ی میں ایسی وسعت او قی دی کی آج ی جموں و کشمیر میں ا ئیے کے حوالے ت کی جاتی ہے تو ذہن میں بے ساختہ وفیسر مرزا محمد زماں آزرہ کا ہی م آ ہے۔ 'غبار خیال'، 'شیرین کے خطوط'، 'غبار کاروان'، 'کا '، 'گلدستہ' اور 'سن تو سہی' ان کے ا ئیوں کے اہم مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے کشمیری ا ئیوں کے بھی کئی مجموعے منظر عام آ کر داد شہرت چکے ہیں اور ان کا قلم اب بھی رواں ہے۔

ظر نہ تھا یا اور ہلکے پھلکے انداز میں بڑی سے بڑی بات بآسانی کہی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے استبدادی اور آمرانہ حکومتوں کے دور میں بھی انشائیہ نگار اپنی بات عوام تک پہنچاتے رہے۔ حکومت کے غیر انسانی رویوں اور افسر شاہی قوتوں کے استحصالی عزائم کو طشت از بام کرنے میں انشائیہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ جس سے حکومت کے ایوانوں میں سنسنی پھیل جانا لازمی تھا۔

موجودہ دور کے انشائیہ نگاروں میں شفیع احمد، کاچو اسفندیار خان، مشتاق احمد کینی، زاہد کھوکھر، منصور احمد منصور وغیرہ اپنے انشائیوں کے ذریعے سے سماج میں شعور پیدا کرتے ہوئے سماجی برائیوں کا قلعہ قمع کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ انشائیہ کا سفر کامیابی کی طرف گامزن ہے۔

جہاں تک جموں و کشمیر میں اردو سفرناموں کا تعلق ہے تو اس صنف کی روایت کی بنیاد بھی اسی زمانے میں ہی پڑی۔ جب اردو میں سفرنامے کی ابتدا ہی ہوئی تھی۔ یہاں سفرنامے کی روایت کی خوش نصیبی کہیے یا نیک فالی کہ یہاں اردو میں جو پہلا سرکاری دستاویز وجود میں آیا وہ سفرنامہ ہی تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مہاراجہ رنبیر سنگھ نے روسی ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات استوار کرنے کی غرض سے اپنے ایک درباری مہتہ شیر سنگھ کو ۱۸۶۷ء میں وسطی ایشیا یعنی ترکستان اور ایران کے سفر پر روانہ کیا وہ کشمیر سے چل کر استر قند، سمرقند اور بخارا پہنچا پھر واپسی پر کابل، خوقند، ختن اور کاشغر کے راستے تبّت اور لداخ سے ہوتا ہوا واپس کشمیر پہنچا۔ اس سارے سفر میں انہیں لگ بھگ ایک سال کا وقت لگا اور واپسی پر انہوں نے اپنے احوال سفر اور مختلف مقامات کے حالات و کوائف پر مشتمل ایک رپورٹ ''سفرنامہ بخارا'' کے نام سے ڈوگرہ سرکار کو پیش کیا۔ اس طرح سے اس سرکاری دستاویز کو یہاں کا اولین سفرنامہ مانا جاتا ہے۔ اور سفرنامہ کو باضابطہ ایک ادبی صنف کے طور پر متعارف کرانے کا سہرا پنڈت سالگرام سالک کے سر ہے جنہوں نے ''*تحفہ سالک*'' لکھ کر یہاں میں ادبی سفرنامے کی بنیاد رکھی۔ منشی محمد الدین فوق کے ''سفرنامہ کشمیر'' (۱۹۰۷ء) سے یہاں میں اس صنف کو دوام حاصل ہوئی۔ فوق ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے ہر صنف سخن پر قلم اٹھایا اور یہاں کو ادبی بلندیوں پر پہنچایا۔ فوق اگر چہ پیدا یہاں نہیں ہوئے لیکن تمام عمر رہے۔ انہوں نے ہر سطح ہر مقام پر یہاں کی ترجمانی کی۔ اور اپنی ہر تحریروں سے کشمیر کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کرتے رہے۔ فوق نے اپنے سفرنامے کی مقبولیت اور قارئین کی بڑھتی ہوئی مانگوں کے مد نظر سیّاحوں کے لیے ایک

سفری رہنمائی کتاب ''رہنمائے کشمیر'' اور مغل بادشاہوں کی سیاحتِ کشمیر کے روداد پر مشتمل ''شاہی سیرِ کشمیر'' لکھی۔ اس کے علاوہ بھی ان کا ایک غیر مطبوعہ سفرنامہ ''نہرو کا سفرنامہ کشمیر'' اہم ہے۔ جس میں ہمسری کی وارادت کو ذاتی مشاہدات کی روشنی میں بڑے سلیقے سے بیان کیا گیا ہے۔' ڈاکٹر محمد اجمل خان نیازی کے مطابق فوق کے اور بھی غیر مطبوعہ سفرنامے موجود ہیں اگرچہ وہ بوسیدہ حالات میں ہیں۔''دیہاتی و پنچایتی سفرنامہ'' اور ''سفرنامہ ڈھاکہ'' اس کی مثالیں ہیں۔ سفرنامہ کشمیر'' میں کشمیر کے قدرتی حسن، آمدورفت کی مشکلات اور ڈوگرہ راج کی طرف سے اہل کشمیر کے استحصال کو خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد مختلف سفرنامے معرض وجود میں آئے۔ جن سے ریاست میں اس صنف میں ترقی ہوئی۔ ان میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے سفرنامے، جنوبی ہند میں دو دن، پوشکن کے دیس میں، کولمبس کے دیس میں، آغا جانی کشمیری کی، میڈل ایسٹ کا سفر، بیگم خورشید نہال کے اس پار، لالہ ملک راج صراف کا ابھی ابھی نئ ہ ہے (سفرنامہ پاکستان)، کشمیری لال ذاکر کا 'یہ صبح نئ ہ رہے گی' (سفرنامہ پاکستان)، ڈاکٹر نیلوفر ناز نحوی قادری کا 'شہر ہائے نور' (سفرنامہ حج) پروفیسر شہاب عنایت ملک کے سفرنامے (جن کو ڈاکٹر شہناز قادری نے ''اسفارِ شہاب'' کے نام سے مرتب کیا ہے) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ متعدد سفرنامے ایسے ہیں جو مختلف اخبارات میں قسطوار شائع ہوتے رہے لیکن مرتب صورت میں دستیاب نہیں ہیں۔ ان میں خواجہ ثناء اللہ بٹ کا سفرنامہ پاکستان (روزنامہ آفتاب)، غلام نبی شیدا کا سفرنامہ پاکستان (روزنامہ وادی کی آواز)، وجیہہ احمد اندرابی کا سفرنامہ پاکستان کا سفر (روزنامہ چٹان) وغیرہ اہم ہیں۔ ان سفرناموں کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہے کہ ریاست میں اس صنف کا سفر خوش کن اور حوصلہ افزا ہے۔

ریاست میں اگرچہ رپورتاژ نگاری کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اور اگر بعض رپورتاژ لکھے بھی گئے ہیں تو وہ ادبی نوعیت اور پایہ کے نہیں ہیں۔ وہ محض علیحدگی پسند عسکری تنظیموں کی سرگرمیوں پر رپورٹس ہیں۔ ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ اس کمی کا ازالہ محمود ہاشمی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'کشمیر اداس ہے' لکھ کر کیا۔ جو ریاست میں واحد رپورتاژ ہے جو مختلف اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ عالمی اردو ادب میں بھی اس کی اہمیت مسلم ہے۔ اور اردو کے کامیاب اور مکمل رپورتاژ میں یہ سرفہرست ہے۔ بقول ممتاز شیریں یہ ایک سچا اور بہترین رپورتاژ ہے۔

من جملہ کہہ سکتے ہیں دیگر اصناف ادب کی طرح ریاست جموں و کشمیر میں غیر افسانوی ادب کی تمام اصناف

میں کافی ذخیرہ موجود ہے اور نتیجہ حوصلہ افزا ہے۔

☆☆☆